خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

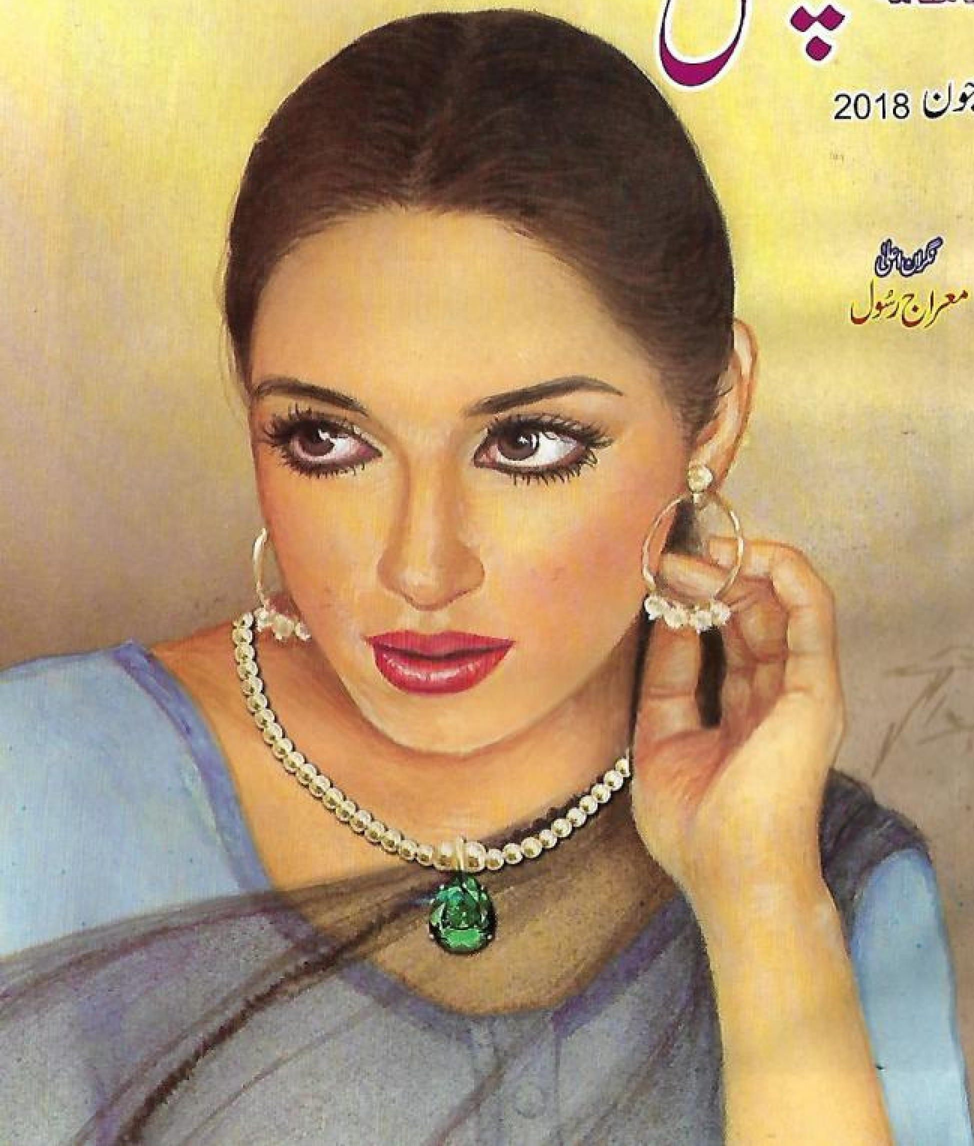
ماہنامہ

سسپنس ڈائجسٹ

جون 2018

نگرانِ اعلیٰ

معراج رسول



سسپنس ڈائجسٹ
CPNE
MEMBER APNS

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

مدیرہ یمنیٰ احمد
نائب مدیر اطہر حسین

مینجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن مینجر
سید منیر حسین
0333-3285269

جلد 47 • شمارہ 06 جون 2018 • زرِ سالانہ 900 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 70 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313(021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پرو پرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس [illegible] کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس [illegible] کراچی

انشائیہ

جون ایلیا

امید

ابھی چند لمحے پہلے تک میں نے، میرے ہمزاد نے اور میرے بھائی معراج رسول نے جو کچھ سوچا اور کہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حکومت اور ریاست کے جن نظاموں کا انسانوں نے اب تک خصوصی تجربہ کیا وہ تین ہیں یعنی بادشاہی، آمریت اور جمہوریت۔

جہاں تک بادشاہی کا تعلق ہے تو ہماری تاریخ دراصل بادشاہی اور جہاں پناہی کے نظام، بے شرم اور بے حیا نظام کے مجرمانہ روز و شب ہی کی تاریخ ہے۔ اس نظام کے باجبروت آقاؤں یعنی بادشاہوں کو بے ضمیر اور چاپلوس مورخوں نے ظل اللہ اور نائب اللہ کے گستاخانہ لقب سے یاد کیا ہے۔ حقیقتِ واقعہ یہ ہے کہ مورخوں نے ان ذلیل درندوں یعنی بادشاہوں، جمشید جاہوں اور جہاں پناہوں کی صرف مدح ہی نہیں کی، ان کی حمد بھی کی ہے اور انہیں ''خداوند'' قرار دیا ہے۔ اس مستعدی سے خدا کی حمد و ثنا بھی نہیں کی گئی جس مستعدی سے بادشاہوں کی حمد و ثنا کی گئی۔ ان جابر اور قاہر خداوندوں کے جبر و قہر کا اس بات سے پوری طرح اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شاعروں کو بھی جو حسن، خیر اور صداقت کی زبان رہے ہیں اپنی خودداری، عزتِ نفس اور اپنی انا سے دست بردار ہو کر ان کی مدح و ستائش کرنی پڑی اور کتنی قابلِ شرم مدح و ستائش۔

یہاں مجھے فارسی کے نامدار اور نادرہ کار شاعر ظہیر فاریابی کا خیال آرہا ہے۔ ظہیر فاریابی کے بارے میں کسی شاعر نے ایک شعر کہا ہے جو فارسی شاعری کے قارئین کے عالمی حلقے میں بہت معروف اور مشہور ہے۔ وہ شعر یہ ہے۔

دیوانِ ظہیر فاریابی...... در مکہ بدزد اگر بیابی

یعنی اگر تمہیں ظہیر فاریابی کا دیوان مکے میں بھی (جہاں کوئی چیز چرانا یکسر حرام ہے) مل جائے تو اسے چرالو۔

اس شعر سے ظہیر فاریابی کی شاعرانہ عظمت کا پوری طرح اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اسی عظیم شاعر نے آذر بائیجانی اتابک حکمران قزل ارسلان کی مدح میں ایک قصیدہ کہا جو فنی اعتبار سے فارسی شاعری کا تخلیقی شہ پارہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس قصیدے کا ایک شعر سنیے اور بے دلی کی حالت میں اپنے صحن کے تنکے چنیے۔ نہ کرسیِ فلک ہند اندیشہ زیر پا...... تا بوسہ بر رکابِ قزل ارسلاں دہد

یعنی خیال نو آسمانوں کی کرسی پر چڑھتا ہے تاکہ قزل ارسلان کے گھوڑے کی رکاب کو بوسہ دے سکے۔

یہ تھی بادشاہی اور جہاں پناہی کی وہ کارفرمائی جس کا ادب سے تعلق ہے۔ باقی کارفرمائیوں کے بارے میں آپ مجھ سے بہت زیادہ جانتے ہیں۔ اس نظام نے انسانی اقدار کا جتنا مذاق اڑایا اتنا مذاق شیطان بھی نہیں اڑا سکا۔

اب رہی آمریت تو یہ نظامِ بادشاہی کا بے حد عیارانہ روپ ہے۔ اس روپ کی دلداری اور عشوہ کاری نے ہمیں جس طرح نوازا ہے اس کا کیا کہنا۔ ہماری زندگی کی کتنی قیمتی مدت اس نظام کی مرحمت کے سائے میں گزری۔ اس کی برکتوں نے ہمیں جو فیض پہنچایا ہے اس کی شکر گزاری کے لیے آنے والی کئی نسلوں کی عمر درکار ہے۔ جو بات بلکہ جو حقیقت سب سے زیادہ الم ناک ہے، وہ یہ ہے کہ ہم اس لمحے تک آمریت کے خدشے اور خطرے سے محفوظ نہیں ہیں اور یہ ہماری سب سے بڑی بد نصیبی ہے۔

بچی جمہوریت تو حکومت کے تمام نظاموں میں یہی ایک نظام ہے جو مہذب انسانیت کو زیب دیتا ہے۔ حسنِ اتفاق سے ان دنوں ہم اسی نظام کے تحت زندگی گزار رہے ہیں۔ یہاں جو بات کسی دغدغے کے بغیر کہہ دینی چاہیے وہ یہ ہے کہ اس جمہوریت کو جمہوریت کے صحیح ترین معنی اور مفہوم کے اعتبار سے جمہوریت قرار دینا کوئی آسان بات نہیں لیکن جو کچھ بھی ہے وہ بھی بہت غنیمت ہے۔ ہے یوں کہ ہم تو جمہوریت کے نام پر، محض نام پر بھی پوری زندگی گزار سکتے ہیں۔

مشکل یہ ہے کہ ہمارے سردھرے جو خوش فعلیاں کر رہے ہیں ان سے طرح طرح کے خدشے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر ہمارے ان سردھروں کی خوش فعلیاں کارگر ہو گئیں تو ہمیں بہت مہنگی پڑیں گی۔ عوام اس بات سے بہت خوف زدہ ہیں کہ وقت انہیں قدرے کم تر جمہوریت سے بھی محروم نہ کر دے۔ اسی لیے وہ اپنے صاحبانِ امر کو زیادہ سے زیادہ رعایتیں دینے کے لیے تیار ہیں۔ مگر اس حقیقت کو پوری طرح ذہن میں رکھا جائے کہ وہ نعرہ بازی کے ہنر سے بے حد بددل ہو چکے ہیں۔ ان کے دل کی یہ گہری خواہش ہے کہ جمہوریت کے نام کو نباہنے کی دیانت دارانہ کوشش کی جائے اور وہ امید رکھتے ہیں کہ یہ کوشش کی جائے گی۔

☆☆☆



آپ کا خط

عزیزانِ من

السلام علیکم!

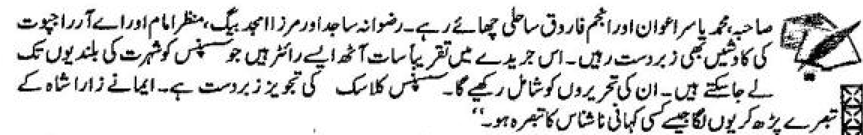
جون 2018ء کی کاوش آپ کے زیرِ نظر ہے۔ کاغذ کی قیمتوں میں ہوش ربا اضافے کے باعث ادارہ قیمت بڑھانے کے بجائے سسپنس ڈائجسٹ کے صفحات اس ماہ سے کم کرنے پر مجبور ہوگیا ہے، امید ہے کہ ہمارے کرم فرما بھی ہمارا ساتھ ضرور دیں گے شکریہ۔ اگرچہ ہر سال موسم گرما بڑے جنونی انداز میں اپنے آنے کا احساس دلاتا ہے اور پھر اس میں مزید اذیت کا تڑکا بجلی کا محکمہ کچھ اس طرح لگاتا ہے کہ ہر انسان گرمی کی شدت سے بلبلاتا دکھائی دیتا ہے۔ اب تو دہائی دینے والے بھی تھک گئے مگر افسوس بے حسی ہے کہ الامان الحفیظ۔ بے حسی کی اس کیفیت پر ایک ہی محکمے کی اجارہ داری نہیں ہے بلکہ ہر ادارہ اس سے فیضیاب ہو رہا ہے مثلاً پاکستان میں اگر کسی فیلڈ میں معاشی لحاظ سے کاروبار مستحکم ہوا ہے تو وہ ہے میڈیکل اور ایجوکیشن...... اور یہ دونوں ہی فیلڈز انسانیت کی خدمت کا نعرہ لگاتے ہوئے عوام کی کھال اتارنے میں کسی بھی انداز میں پیچھے نہیں ہیں۔ آئے دن قیمتوں میں اضافے کی خاطر اچانک مارکیٹ سے کسی بھی دوا کا شارٹ کر دینا...... اب مریض اور اہلِ خانہ پر چاہے جو بھی بیت جائے...... اس کے علاوہ ایک اور دو نمبر ناقص دواؤں کا استعمال...... انسانی خدمت گاروں یعنی مسیحاؤں کی سنگ دلی اور بے حسی کی اعلیٰ مثال...... ذرا گورنمنٹ اسپتالوں کا حال تو ذرے داران دیکھیں اور پرائیویٹ اسپتال کے طور طریقے جیسے کسی نازک اندام ماڈل کی ناز برداریاں، اف...... معالجین اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق خوب انسانیت کی خدمت میں مگن نظر آتے ہیں۔ دوسری جانب اسکولوں کا ماحول...... تعلیمی معیار اور دیگر مسائل ایک طرف جبکہ فیس اور دیگر اخراجات کی حد دوسری طرف مگر اس وقت سوال یہ ہے کہ موسم گرما کی چھٹیوں کی بھی فیس...... اسکول کس ضمن میں لیتے ہیں...... کیا یہ سفید پوش طبقے پر اضافی بوجھ نہیں ہے؟ نہ صرف اسکول بلکہ کوچنگ کی مد میں بھی یہی طریقہ کار جاری ہے۔ کم از کم گرمائی تعطیلات پر تو والدین کو کچھ اطمینان کا سانس لینے کا موقع دے دیا جائے۔ پاکستان میں تعلیم کو واقعی ایک کامیاب کاروبار بنا دیا گیا ہے۔ اب چاہے عوام میں تعلیمی قابلیت کا گراف بلند ہوتا ہے یا نیچے جاتا ہے، اس سے کسی سیاستدان یا کسی قائد کو کوئی غرض نہیں البتہ زیادہ فیس اور دیگر اخراجات سے ضرور اس ادارے کی قابلیت کا اعتراف کیا جاتا ہے...... تو کون ہے ایسا جو اس طرف بھی کوئی فعال کردار ادا کر سکے۔ اگرچہ الیکشن کی بساط پر ووٹ لینے والے بازی گروں کا کھیل جاری ہے جبکہ متاثرہ طبقے کی دہائیاں اور بند ذہنوں اور مُردہ ضمیروں پر ہماری دستک بھی اپنی جگہ مسلسل جاری و ساری ہے۔ دیکھیے کیا نتائج سامنے آتے ہیں۔ جناب یہ تو ہوگئیں کچھ کڑوی کسیلی اور دنیاوی باتیں...... اب یہ بتائیے رمضان المبارک کی تیاریاں کیسی جا رہی ہیں۔ ویسے تو امتِ مسلمہ کی زندگی کا ہر پل آخرت کی تیاری میں گزرنا چاہیے مگر رمضان المبارک کی ساعتیں اور خاص راتوں کی عبادتیں ہمارے لیے ایک ایسا تحفہ ہیں جن سے جتنا بھی فیضیاب ہوا جائے اتنی ہی تشنگی میں اضافہ محسوس ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں اس ماہ مبارک کے ایک ایک لمحے سے فیضیاب ہونے کی توفیق دے۔ روزے کی حالت میں ہماری عبادتوں اور ریاضتوں کو قبول فرمائے۔ ہمارے اعمال میں مثبت تبدیلی آ جائے...... اس کے علاوہ ہمیں سفید پوش خاموش طبقے اور ضرورت مندوں کا بھی خیال رکھنے، ان کے کام آنے کی بھی توفیق عطا فرمائے۔ (الٰہی آمین) اور ان دعاؤں کے ساتھ ساتھ اب چلتے ہیں اپنی بزمِ دوستاں کی جانب جہاں دوستی کی ریت نرالی ہے۔

⌘ ام عبداللہ، عظیم پورہ کراچی سے تبصرہ کر رہی ہیں ”پیاری یمنیٰ بہن کو اور سب ادارے کو رمضان المبارک کی مشکبار ساعتیں (پیشگی) بہت بہت مبارک ہوں۔ اللہ عزوجل ہم سب کو گناہوں سے عملی کراہیت، نیکیوں سے محبت اور اپنی عبادت کے لیے کماحقہ رغبت عطا فرمائے۔ آمین۔ (آپ سب قارئین کو بھی ہماری طرف سے بے حد مبارک باد قبول ہو) سسپنس مئی 2018ء کا شمارہ اپنی مثال آپ ہے۔ سرورق دیدہ زیب اور جدت لیے ہوئے تھا۔ سرورق پر موجود نیلے کپڑوں میں ملبوس من موہنی سی دوشیزہ دلکش مسکراہٹ لیے بہاروں کی نوید سنا رہی تھی۔ ذاکر صاحب کی طبیعت کا پڑھ کر دلی افسوس ہوا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ انہیں صحت وتندرستی اور شفائے کاملہ عطا فرمائے۔ آمین۔ انشائیہ ہمیشہ کی طرح پُراثر، پُرمغز اور پُراسرار تھا۔ جون صاحب نے سولہ آنے

سچ کہا ہے۔ ایسی گہری بات کرتے ہیں، دل میں اُتر جاتی ہے۔ واقعی ہم کیسے دوسروں کی خوشی اور دکھاوے کی خاطر منافقت کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں۔ آنکھوں کی نمی کوئی نہیں دیکھتا۔ لبوں کی مسکراہٹ دکھائی دے جاتی ہے۔ آپ کے خط میں محترمہ چلبلی ہیر کا خط سرِفہرست تھا۔ تبصرہ سیر حاصل اور خوب صورت ہے۔ صدارت مبارک ہو۔ او بہناں! یہ آپ نے اتنا چلبلاتا ہوا نام کیوں رکھا ہوا ہے اپنا؟...... ہونٹوں پر خود بخود ہی مسکراہٹ آ جاتی ہے۔ دیکھ لیں، بڑھاپے تک پیچھا نہیں چھوڑے گا آپ کا یہ۔ زرین خان کا محبت بھرا انداز۔ اچھا تبصرہ لکھ لیتی ہیں آپ۔ اور جنید بھائی یہ سسپنس ہے ہی ایسا۔ ہم نے بھی کبھی ایسے ہی وقت گزاری کے لیے پڑھا تھا، اب اس کے گرویدہ ہیں۔ دوسرے مطبوعات کا بھی یہی حال ہے۔ سب اچھے اور معیاری ہیں۔ محفل شعروسخن ہمیشہ کی طرح اپنے عروج پر دکھائی دی۔ زرین خان، وزیر خان، جنید احمد ملک، ریاض بٹ، مسز بابر عباس کے انتخاب بہت پسند آئے۔ باقی لوگوں کے انتخاب کا بھی جواب نہیں۔ باجی! ایک درخواست ہے اگر ممکن ہو تو ساتھ میں (شعر کے) شاعر کا نام بھی لکھ دیا جائے۔ رامش، علی اختر کی خوب صورت تحریر، ماضی کے جھروکوں سے اپنے اندر معلومات کا خزانہ لیے ہوئے، بہت عرق ریزی سے کام لیا گیا ہے۔ محنت وصول ہوگئی۔ اے آر راجپوت کی رنگ آسماں پرانے دور کی مگر اپنے اندر جدت لیے ہوئے نکھری اور البیلی سسپنس کی سب سے خوب صورت کہانی جس نے سسپنس کے نکھار میں مزید اضافہ کیا ہے۔ حسام بٹ کی وقت ہے تو دلچسپ مگر طویل ہوتی جا رہی ہے۔ جیسا کہ اس میں لکھا ہوا ہے۔ کیا کریں؟ رضوانہ ساجد کی کاوش قابلِ قدر و لائقِ تحسین ہے۔ بہت محنت کرتی ہیں آپ۔ جزاک اللہ۔ آصفہ ضیا احمد کی ٹرمپ کارڈ جاندار تحریر ہے۔ لالچ اور ہوس کا انجام ہمیشہ برا ہوتا ہے۔ اسی طرح غلط فہمی اور بدگمانی اخلاقی برائیوں کی جڑ ہے جس کا تدارک نہ کیا جائے تو انسان شدید نقصان سے دوچار ہوتا ہے۔ جھرنا نے بروقت حکمتِ عملی اور ذہانت سے اُلجھی ہوئی گتھیاں خود ہی سلجھا لیں اور شیاما اور کانتا کو آئینہ بھی دکھا دیا۔ جادوئی چراغ، تنویر ریاض کی دلچسپ کہانی ہے۔ واقعی محبت کبھی نہیں مرتی اور خواہشوں کے پورا ہونے کا کوئی وقت نہیں ہوتا۔ پروین زبیر کی بازگشت خوب صورت کہانی ہے۔ اپنا تاثر جمانے میں کامیاب رہی۔ دیگر کہانیاں بھی دلچسپ تھیں۔“

⌘ منشی محمد عزیز میئے، لڈن ضلع وہاڑی سے محفل میں شریک ہوئے ہیں ”سرورق پر ایک خاتون سرخ آنکھوں سے زیرِ لب مسکرا رہی تھی۔ اس مرتبہ کے سرورق کی انفرادیت خاتون کے بالوں کے قریب مدھم سے خاکے میں ہے، جو کئی زاویوں سے اک اداس سی خاتون کی عکاسی کر رہا تھا۔ بہت خوب مصور صاحب۔ اللہ تعالیٰ ذاکر صاحب کو عمرِ خضر اور صحت کاملہ عطا فرمائے۔ اداریہ میں مرحوم جون ایلیا ہمارے معاشرتی تضاد پر شکوہ کناں تھے۔ خطوط کی محفل میں چلبلی ہیر کرسی صدارت پر بیٹھی دانت نکال رہی تھیں۔ آخر کو مجھ جیسا نائب صدر جو ساتھ تھا، خوشی تو ہونا ہی تھی۔ ہیر جی! آپ بھی ذرا سنبھل کر تشریف لایا کریں۔ احتساب تو سب ہی کا ہوگا۔ ساگر تکو کر سسپنس کلاسک سلسلے کے لیے بے چین تھے۔ ہم بھی ان کے ہمنوا ہیں۔ طلعت مسعود عرف طلعو میاں کی محبت کے کیا کہنے۔ محمد خواجہ، زرین خان آفریدی، ریاض بٹ، بابر عباس اور ایمانے زارا شاہ نے بھرپور تبصرہ کیا۔ بابر عباس! انشاء اللہ آپ کا ذکرِ خیر بھی ضرور ہوگا۔ علی اختر کی تاریخی کہانی رامش ایک ہندو شہزادی کی پُرخلوص محبت کی بہترین داستان تھی۔ رامش بلکہ رحمت بانو کی شہزادہ اعظم سے محبت مثالی تھی۔ ویسے اس کہانی میں بیان ہونے والے جشن پڑھ کر حیرت کے ساتھ افسوس بھی ہوا کہ مسلمان حکمران کس طرح مختلف جشنوں کے نام پر اپنی اصل ذمے داری سے بے بہرہ ہو جاتے تھے۔ اصلی نقلی میں سراغ رساں بلاوجہ ہی قتل وغارت گری کے دھندے میں الجھتا چلا گیا۔ فریک نے...... ”مالا“ کی خاطر کیا کیا جتن نہ کیے تھے۔ راہ نما میں شیر زمان نے اپنی خطا کا فراخدلی سے اعتراف کرتے ہوئے گویا اپنے گناہ کا ازالہ کر ڈالا۔ جادوئی چراغ کے نام سے تنویر ریاض انمول محبت کی بہترین کہانی ڈھونڈ کے لائے۔ جیٹ اور کلارا کی محبت کا انجام خوشگوار تھا اور اس سے بھی زیادہ دلچسپ جیٹ کا اپنی محبت جانچنے کا انداز تھا کہ اس نے کیسے منفرد طریقے سے کلارا کے دل کی کیفیت کو جان لیا۔ نافرمان میں اس مرتبہ مرزا امجد بیگ نے اپنے صحافی موکل کو موثر دلائل اور بھرپور وکالت کے زور پر آزاد کروالیا۔ جواز میں آج کل کے افسوس ناک اور سنگین جرائم کی عمدہ نقاب کشائی کی گئی ہے۔ کتنے ہی ایسے واقعات ہم روزانہ اخباروں میں پڑھتے ہیں اور انتہائی افسوس ناک بات یہ ہے کہ مجرم آزادی سے دندناتے پھرتے ہیں جو کہ لمحۂ فکریہ ہے۔ محفل شعروسخن میں چلبلی ہیر کا نام گزشتہ ماہ بھی انعام یافتہ اشعار میں تھا اور اس بار بھی وہ انعام کی مستحق ٹھہری تھیں۔ بہت خوب چلبلی ہیر! خصوصی مبارکباد۔ دیگر دوستوں میں محمد خواجہ، محمد آریز، ریاض بٹ، اعجاز احمد اور شگفتہ کا انتخاب بہترین رہا۔ عبداللہ احمد حسن نے کیتھی لکھ کر رُلا ڈالا۔ اس تحریر میں ایک باپ کی اپنی بیٹی سے لازوال محبت کو بڑے خوب صورت انداز میں پیش کیا ہے عبداللہ صاحب نے۔ بازگشت پڑھتے ہوئے آنکھیں بار بار نم ہو جاتی تھیں۔ تاہم انجام خوشگوار رہا۔“ (پسندیدگی کا بے حد شکریہ)

⌘ اکرم شاد دلہہ، سلطان پور سے چلے آ رہے ہیں ”مئی کے سسپنس نے پچھلی ساری کمی پوری کر دی۔ چھوٹی طبع زاد ترجمہ شدہ ناول کے بجائے اچھی معیاری، دلچسپ اور سسپنس شدہ تحریریں رسالے کی زینت بنائیں۔ اس شمارے میں زویا اعجاز



صاحب، محمد یاسر اعوان اور انجم فاروق ساحلی چھائے رہے۔ رضوانہ ساجد اور مرزا امجد بیگ، منظر امام اور اے آر راجپوت کی کاوشیں بھی زبردست رہیں۔ اس جریدے میں تقریباً سات آٹھ ایسے رائٹر ہیں جو سسپنس کو شہرت کی بلندیوں تک لے جاسکتے ہیں۔ ان کی تحریروں کو شامل رکھیے گا۔ سسپنس کلاسک کی تجویز زبردست ہے۔ ایمانے زارا شاہ کے تبصرے پڑھ کر یوں لگا جیسے کسی کہانی ناشناس کا تبصرہ ہو۔"

✠ بابر عباس، فضل عباس، گلیانہ روڈ، کھاریاں سے محفل کی زینت بنے ہیں "سرجی بڑی تگ و دو کے بعد اور جاں گسل انتظار کے بعد ماہ مئی کا سسپنس 20 اپریل کو ایسے ملا جیسے کسی مزدور کو بڑی اذیت کے بعد دیہاڑی ملتی ہے۔ سرورق کی عمر رسیدہ چلبلی ہیر کو دیکھ کر ایسا لگا جیسے عمارت کبھی خوب صورت تھی، وقت بدلتا ہے رنگ کیسے کیسے۔ سب سے پہلے ذاکر صاحب کی بات کروں گا۔ ان کی صحت کی خرابی کا پڑھ کر افسوس ہوا۔ خدا ذاکر صاحب کو صحتِ کاملہ عطا فرمائے۔ چلبلی ہیر صاحبہ خط تو کوئی خاص نہیں تھا، سرجی کی مہربانی کا شکریہ ادا کریں۔ (آپ کو کسی کا خط پسند بھی آتا ہے یا نہیں) جنید بن اقبال صاحب سب سے پہلے تو میں آپ کو اپنی اس پیاری سی اور خوب صورت محفل میں...... خوش آمدید کہتا ہوں دوسری بات سرجی کو زیادہ مسکا وغیرہ نہیں لگاتا۔ محمد خواجہ صاحب اتنی پیاری اور خوب صورت محفل میں آکر سیاسی باتیں نہیں کریں اگر سیاسی باتیں کرنی ہیں تو ٹی وی پر جائیں یا بیوی کو سنائیں۔ ایمانے زارا شاہ صاحبہ مجھے بجلی کے دو چار جھٹکے لگانے کے لیے آپ کو اپنا نام بدلنا پڑے گا یعنی اپنا نام بجلی رکھنا پڑے گا۔ بہت سے پرانے ساتھیوں کی کمی بہت شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ خوب صورت رنگ بکھیرتی رنگ آسماں کی زبردست تحریر جو اپنے اندر بہت کچھ لیے ہوئے ہے۔ رنگِ آسماں بہت بہتر طریقے سے آگے بڑھ رہی ہے۔ دوسرا نمبر حسام بٹ صاحب کی وقت کا تھا۔ یقین کریں سرجی بحالتِ مجبوری پڑھی۔ حسام بٹ صاحب خدا کے لیے وقت کو بہتر کریں۔ آخری صفحات پر ایک اور اچھی رائٹر کی معیاری کہانی بازگشت پڑھی۔ کہانی تو اچھی اور خوب صورت تھی مگر کہیں کہیں تشنگی رہی۔ بہرحال مجموعی طور پر پروین زبیر صاحبہ کی کاوش پسند آئی۔ شروع کے صفحات پر اس بار بال علی اختر کے پاس تھی۔ وہ رامنی کی راگنی لے کر آئے بس سو سوتھی۔ سرجی تاریخ تاریخ ہوتی ہے ضروری نہیں ہر بار ہندوستان کی تاریخ ہی لکھی جائے۔ دوسرے ملکوں کی بھی تاریخ ہے، اس کے بارے میں بھی لکھا جائے۔ حسام بٹ صاحب کی ایک اور تحریر بیگ صاحب کا کیس نافرمان کی شکل میں، حسبِ حال کامیابی نے بیگ صاحب کے قدم چومے۔ منظر امام صاحب کی راہنما نے بالکل اسی طرح متاثر کیا جس طرح آج کل چیف جسٹس سب کو متاثر کر رہے ہیں۔ بہت اچھے منظر امام صاحب...... راہنما پسند آئی۔ آصفہ ضیا احمد کی ٹرمپ کارڈ بھی ایک بہترین پیشکش تھی۔ دوسرے رائٹرز نے بھی حسبِ حال اور حسبِ معمول اپنا اپنا حصہ خوب ڈالا۔"

✠ رمضان پاشا کا گلشن اقبال، کراچی سے قلمی تعاون "مصور ذاکر بھائی کی علالت کی خبر پڑھ کر بہت دکھ ہوا، خدائے برتر و بزرگ سے دعا گو ہوں کہ انہیں جلد از جلد شفا عطا فرمائے، نیز طویل عمر بھی عطا فرمائے۔ آمین۔ مئی 2018ء کے سسپنس کا سرورق اچھا نہیں لگا۔ سرورق بنانے والے خود بیمار ہیں۔ سرورق کی حسینہ بھی بیمار نظر آرہی ہے۔ ایسا لگتا ہے لڑکی ابھی ابھی بخار سے اٹھ کر آئی ہے۔ خطوط کی محفل میں اول نمبر پر آنے والی محترمہ چلبلی ہیر صاحبہ کو مبارکباد، ان کا تبصرہ بھی اچھا لگا۔ اصلی نقلی کہانی واقعی شاندار اور جاندار تھی۔ ایسی ہی کہانی کی خاطر میں سسپنس خریدتا ہوں۔ راہنما منظر امام نے ہمیشہ اچھی کہانیاں پڑھنے کو دیں، مگر اس بار موصوف نے بہت مایوس کیا۔ رنگِ آسماں کا ٹیمپو ماہ بہ ماہ بہت تیز ہوتا جارہا ہے۔ ٹرمپ کارڈ بھارتی کہانی بڑی پھڑکتی پھڑپھڑاتی ہوئی کہانی تھی۔ ایسی کہانی تو بھارتی لکھاری رجنی چٹیل ہی لکھ سکتی ہیں۔ جادوئی چراغ یہ کہانی صرف دلچسپ تھی۔ نہ کوئی سبق نہ اثر پذیری۔ نافرمان بیگ صاحب کو اس بار بہت دلچسپ کیس ملا، عدالتی کارروائی میں بہت لطف آیا۔ جواز سابق تبصرہ نگار زویا اعجاز کو شاباش پیش کرتا ہوں، کہانی بہت عمدہ اور اثر انگیز تھی۔ کیتھی کہانی نے بہت متاثر کیا۔ حسام بٹ کا وقت بہت تیز دوڑنے لگا ہے۔ جنونی انتقام گڑے مردے اکھاڑنے کا یہ عمل خاصا سنگین تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے پس منظر میں لکھی گئی کہانیاں پڑھ رکھی ہیں، مگر زیرِ نظر کہانی زیادہ سفاک اور لرزہ براندام تھی۔ سودا اتنی بور کہانی سسپنس میں پہلے کبھی نہیں چھپی۔" (چلیں اس بار تو آپ کو کہنے کا موقع مل گیا نا) بازگشت کہانی بہت ہی دبنگ تھی۔ پروین زبیر صاحبہ نے آخری صفحات کا حق ادا کر دیا، مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اشعار کی محفل میں زرین آفریدی، زینب وزیر محمد خان، شگفتہ اور منظر امام کے اشعار قابلِ تحسین تھے۔ یہ منظر امام کیا سسپنس کے لکھاری ہیں یا کوئی اور؟" (جی جناب! یہ وہی منظر امام ہیں...... جتنے اچھے لکھاری ہیں اتنے ہی معتبر شاعر بھی ہیں)

✠ محمد رفاقت کے خیالات کی پرواز واہ کینٹ سے "آپ کا خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ نیا سسپنس میرے ہاتھ میں ہے۔ وقت پر ملنے سے اسے پڑھ کر اپنی رائے کا اظہار کر رہا ہوں۔ علی اختر کی سب سے پہلے جو کہانی پڑھی رامنی اس سے آسام اور ہندوستان کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے بارے میں بھی پتا چلا اور اورنگ زیب بادشاہ کے متعلق بھی معلومات میں اضافہ ہوا۔

دوسری کہانیوں میں اصلی نقلی انجم فاروق ساحلی کی، راہنما منظر امام کی، رنگِ آسماں، ٹرمپ کارڈ، جادوئی چراغ، نافرمان، جواز، کیتھی، وقت، جنونی انتقام، سودا۔ ہر کہانی اچھی تھی۔ پروین زبیر کی بازگشت بھی محنت سے لکھی بہت ہی اچھی کہانی تھی، پسند آئی۔ آتے ہیں خطوط کی طرف۔ صدارت کی کرسی آخر جھنگ کی چلبلی ہیر کے حصے میں آہی گئی۔ خوب صورت خط لکھا ہے، مبارک ہو۔ دوسرا خط جس میں منشی محمد عزیز، محمد جاوید خان، جنید بن اقبال، ساگر تکوکر، طلعت مسعود، محمد خواجہ، زرین خان آفریدی، ادریس احمد خان، ریاض بٹ (محترم رسالے سے آپ کی محبت نظر آتی ہے)، رمضان پاشا، بابر عباس، ایمانے زارا شاہ، محمد ہمایوں تتولی صاحب آپ سب کے خطوط خلوصِ دل اور محبت سے لکھے گئے ہیں۔ یہ بات ان خطوط کو پڑھ کر میں کہہ رہا ہوں۔ آپ سب کو بہت بہت مبارک ہو۔ مصور محترم ذاکر حسین صاحب اللہ تعالیٰ آپ کو صحت دے۔ آمین۔ جون ایلیا کے انشائیہ میں بھی اچھے انداز میں تصویر کشی کی گئی ہے۔ ہم لوگ اندر سے کچھ اور باہر سے کچھ نظر آتے ہیں یا آنے کی کوشش کرتے ہیں کہ معاشرے میں عزت بنی رہے۔ محفل شعر و سخن میں بھی اچھے اچھے شعر پڑھنے کو ملے جس میں زرین خان آفریدی، آذین رضوان، بابر عباس، زریان سلطان، محمد قدرت اللہ نیازی، عتیق الرحمٰن، محمد آریز، فرحان شیخ، محمد اکرم ندیم کے شعر اچھے تھے، باقی شعر بھی اچھے تھے۔"

✠ محمد صفدر معاویہ، خانیوال سے فرما رہے ہیں "تین ماہ کے وقفے کے بعد پھر حاضرِ خدمت۔ کچھ مصروفیت تو کچھ محکمۂ ڈاک کی مہربانی کی وجہ سے بھی محفل سے آؤٹ رہے۔ اللہ پاک کی ذات کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ مجھے بیٹی کے بعد ایک خوب صورت سا بیٹا محمد زین علی عطا کیا۔ (ارے واہ...... ماشاء اللہ۔ مبارک ہو...... مٹھائی کہاں ہے جناب!) سسپنس کے سرورق کو ایک خوب صورت سی ماڈل سے سجایا گیا۔ اپنی محفل میں آئے تو چلبلی ہیر صدارت پر قبضہ کر چکی تھیں۔ اچھا تبصرہ تھا باقی تمام دوستوں کے تبصرے بھی سیٹ رہے۔ ابتدائی صفحات پر علی اختر کی رامنی کیا خوب صورت تحریر تھی۔ تاریخ پر تحریر بہت ہی عمدہ رہی۔ رامنی کی محبت نے شہزادہ اعظم کو اس کے قدموں میں ڈھیر کر دیا۔ خلوص اور صاف نیت ہمیشہ منزل آسان کر دیتی ہے۔ اے آر راجپوت کی رنگِ آسماں بھی بہت ہی عمدہ طریقے سے آگے بڑھ رہی ہے۔ کہیں محبت کی چنگاری بھڑک رہی ہے کہیں سازشیں تیار کی جارہی ہیں تو کہیں مجاہد اپنے فرائض نبھاتے ہوئے خود کو مصیبت میں ڈالے ہوئے ہیں۔ فقط اللہ کے دین کی خاطر۔ حسام بٹ کی وقت بھی اب بہتر سے بہترین کی طرف گامزن ہے۔ آخرکار اسد علی اپنی ماں کے قاتل تک پہنچ گیا اور اس سے بدلہ بھی لے لیا۔ آخر میں خود بھی مشکل میں پڑتا ہوا نظر آیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بھی بہت ہی خوب صورت انداز میں آگے بڑھ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر الزام لگانے والوں کا حال قارون جیسا کر دیتا ہے۔ فرعون سے بڑا دھوکے باز کوئی نہ ہوگا۔ کئی وعدے کر کے مکر گیا۔ شاہ زین رضوان کی سودا بھی عمدہ رہی۔ آخری صفحات پر پروین زبیر کی بازگشت بہت ہی عمدہ تحریر تھی۔ تحریر پڑھتے ہوئے دل دکھی بھی بہت ہوا، پر آخر میں دل خوش ہوگیا۔ کہانی کا اینڈ بہت ہی پیارا تھا۔ بیگ صاحب کی نافرمان بھی سبق آموز تحریر تھی۔ والدین کا نافرمان ہمیشہ ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ عبداللہ احمد حسن کی کیتھی نے دکھی کر دیا جہاں بیٹی کی بات ہو دل آپوں آپ دکھی ہو جاتا ہے کیونکہ بیٹی خدا کی رحمت ہے تو رحمت کو رُلتا کون دیکھ سکتا ہے۔ زویا اعجاز کی جواز آج کے زمانے کا سچا قصہ ہے، دکھی اس نے بھی کر دیا۔ سب سے معذرت کے ساتھ عورت ہمیشہ پردے میں محفوظ بھی ہے اور خوب صورت بھی ہے۔"

✠ ایمانے زارا شاہ، اسلام آباد سے لکھتی ہیں "مئی کا مہینا عام عوام کے لیے جیسا بھی ہو مابدولت کے لیے تو پھول برساتا مہینا ہے کیونکہ اسی میں ہم نے دنیا میں آکر تباہی مچا دی تھی...... (ارے پھول اور تباہی کا کیا ملاپ......؟ بہرحال مبارک ہو) سرورق ٹھیک ہی لگا جیسا ہمیشہ لگتا ہے۔ آپ کے سوالیہ نشانات کے آگے دو چار ہماری طرف سے بھی سوالیہ نشان...... کیونکہ ہم بھی ہیں پاکستانی......! محفل میں سب سے پہلے اپنا تبصرہ ڈھونڈ کر پڑھا۔ آپ کی تعریف نے سیروں خون بڑھا دیا بالکل ایسے ہی جیسے کچھ کلاس میں کسی اچھے بچے کے لیے کلیپنگ کروادے۔ چلبلی ہیر کا ایقان سچ ثابت ہوا اور تبصرہ صدارت پر براجمان ہو ہی گئیں۔ بہت بہت مبارک ہو، اچھا شیریں تبصرہ تھا...... منشی عزیز مِے تبصرہ اچھا رہا لیکن آپ نے اس ماہ بھی پرانے گلے شکوے جاری رکھے۔ جنید بن اقبال کی فرمائش پر بے ساختہ ہنسی آگئی۔ بھئی اگر ذاکر انکل نے حسن کی دیوی بنا دی اور آپ ساکت ہو گئے تو آپ کے گھر میں موجود کوئی اور دیوی آپ کی پلکیں ضرور جھپکانے میں مدد کر دے گی۔ طلعت نے نہ سلام نہ دعا سیدھا ہی فرمائشی پروگرام شروع کر دیا۔ ویسے موت کے سوداگر والی تجویز سے ایک ہزار فیصد متفق ہوں...... اور پڑھتے ہوئے اسی گومگو کیفیت کا شکار ہیں کہ بقیہ اختتامی اقساط کہاں سے دستیاب ہوں گی؟ زرین خان آپ نے تو چلتے چلتے سب کی کلاس لے لی اور اتنا تفصیلی تبصرہ عمدہ رہا۔ میں نے بیچ بیچ میں جلدی جلدی میں تبصرہ لکھا تھا۔ محمد رفاقت ایسی کوئی بات نہیں، ہم شاید بھول گئے ہوں گے چلیں اب مبارکباد دے دیتے ہیں، ویسے بھی بقول منیر نیازی دیر کر دیتا ہوں...... کہانیوں میں وقت کے اسد علی نے ذہانت یقیناً مجھ سے مستعار لی



ہے۔ پرفیوم اور باڈی اسپرے سے بیچاری ڈیلفی کے کتوں کے کیمور یسپٹرز کا ہی کباڑا کر دیا...... بہت شاندار قسط تھی لیکن اب ایک سال ہو گیا ہے اب تو ڈیلفی کے جال میں پھنس جانا چاہیے تا کہ مزید انجوائے کر سکیں ہم...... کیونکہ پیتا ہمیں ایک آنکھ نہیں بھاتی...... وقت پر کچھ لوگوں کے اعتراضات دیکھ کر بس یہی کہنا چاہوں گی آپ لوگ وقت پڑھنا چھوڑ کر نونہال پڑھنا شروع کر دیجیے یا پھر لٹریچر یا ادب پر اپنی معلومات وسیع کر لیجیے کیونکہ ادب میں وہی کچھ شامل ہوتا ہے جو کسی معاشرے میں ہوتا ہے۔ کوئی خیالی، تصوراتی و نیکی کے مجسمے نہیں ہوتے نہ ہی کوئی فرشتے...... اور نہ ہی اعتراض کرنے والے فرشتے ہیں۔ رنگِ آسماں نے تو دماغ کی واٹ لگا دی۔ پے در پے تیزی سے رونما ہوتے واقعات کو ہم جوڑنے کی کوشش کر رہے ہیں اور یہ بچھو رام حقیقتاً بچھو ہی نکلا ہے۔ چوپائے لوگوں کی مزید تفصیلات ہونی چاہیے...... اور سائنٹیفک چیزوں کی توجیح پیش کرنی چاہیے ورنہ معصوم قاری اس کو سچ سمجھ بیٹھتے ہیں۔ جواز اچھی سبق آموز کہانی رہی۔ واقعی ہم خود ساختہ جواز گھڑ کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اصل میں تربیت کی بچیوں کی طرح بچوں کو بھی ضرورت ہے اگر ایک ماں اپنے بیٹے کی تربیت اس نہج پر کرے گی کہ ہر عورت کی عزت اس کی ماں یا بہن جیسی ہے تو کافی بگاڑ ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ باقی لباس کو ہم فیشن سمجھنے کے بجائے ڈھانپنے کا مقصد لے کر کریں تو یہ سب نہ ہو...... ویلڈن زویا آپی! ہمیشہ بہت بامقصد لکھتی ہیں۔ پروین زبیر کی بازگشت بس سو سو رہی کیونکہ اس میں اتفاقات کی بھرمار رہی ہے لیکن ایک بہترین سبق بہرحال اس میں بھی موجود تھا۔ گھر اور خونی رشتے محافظ ہوتے ہیں انہیں ٹھکرانے والے پھر گدھوں کے ہی ہاتھ لگتے ہیں......''

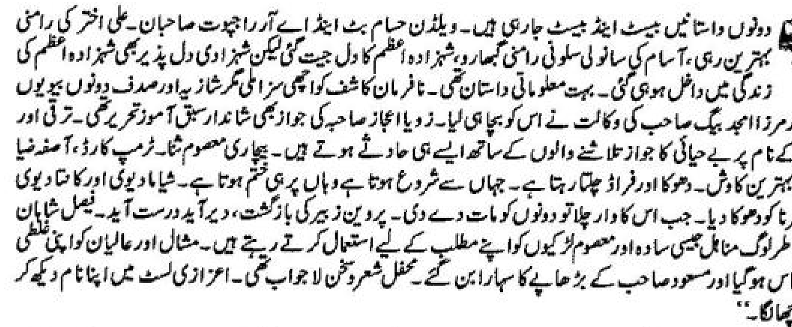
✠ ریاض بٹ، حسن ابدال سے حاضر ہوئے ہیں ''مئی 2018ء کا خوب صورت سرورق سے مزین، دل پسند شمارہ ہاتھوں میں ہے۔ انتظار کے لمحے بڑے ظالم ہوتے ہیں لیکن سسپنس کا شکریہ کہ وہ ہمیں ایسی اذیت سے دوچار نہیں کرتا ورنہ ہم کدو کی ہر بیل میں سوکھے پھول کی طرح لٹکتے رہ جائیں۔ حسبِ معمول سب سے پہلے محترم جون ایلیا کی تحریر پڑھی۔ یہ ایک ایسی تحریر ہے جو دل کی آنکھوں سے پڑھی جاتی ہے۔ واقعی ہم نے اپنے اوپر دوغلا پن طاری کیا ہوا ہے...... ہر وقت، ہر معاملے میں یہ سوچتے رہتے ہیں کہ لوگ کیا کہیں گے......؟ اور اس سلسلے میں مسلسل جھوٹ بولتے جا رہے ہیں، اپنے آپ کو دھوکا دینے کا اس سے بڑا مظاہرہ کیا ہوگا؟ اس کے بعد اپنی پیاری محفل آپ کے خط میں قدم رکھا۔ میں .... مدیرِ اعلیٰ کی باتوں سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں۔ لوڈ شیڈنگ ختم کرنے کے حکومتی دعوے دھرے کے دھرے رہ گئے ہیں۔ ابھی گرمیوں کی آمد ہے جب گرمی اپنے جوبن پر ہوگی تو عوام کا جو حال ہوگا اس کی تصویر بند آنکھوں سے بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ محفل میں اس بار چلبلی ہیر کرسیِ صدارت پر براجمان ہیں۔ اچھا اور خوب صورت خط ہے۔ دیکھیں آپ کا تبصرہ رواں دواں نہیں ہے بلکہ منزلِ مراد تک پہنچ گیا ہے۔ میرا تبصرہ پسند کرنے کے لیے شکریہ۔ محمد جاوید خان کیسے ہو۔ اتنا زبردست تبصرہ لکھنے پر مبارک باد کے مستحق ہو۔ جنید بن اقبال بھائی ...... مدیرِ اعلیٰ کی نصیحت کو پلے باندھ لو۔ ساگر ٹکوکر آپ کی حاضری بھی خوب ہے۔ طلعت مسعود موت کے سوداگر کے لیے آپ کی بے تابی بجا ہے۔ اس کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیے۔ علی اختر تاریخ کے اوراق سے کشید کردہ کہانی رامنی لے کر آئے۔ اورنگ زیب واقعی باقی مغل بادشاہوں سے مختلف تھا۔ اپنے ہاتھوں سے کلاہ اور ٹوپیاں بنا کر اپنی روزی کماتا تھا...... لیکن اگر تصویر کا دوسرا رخ دیکھا جائے تو اورنگ زیب نے تخت کے لیے نہ صرف اپنے دونوں بھائیوں دارا اور مراد کو قتل کرا دیا بلکہ باپ شاہ جہاں کو بھی نظر بند کر دیا۔ یہ اقتدار اور تخت چیز ہی بہت بری ہے۔ اس کے بعد مرزا امجد بیگ کی نافرمان تک چھلانگ لگائی کیونکہ میری روٹین ہی یہی ہے کہ تاریخی کہانی پڑھنے کے بعد ملک صفدر حیات اور مرزا امجد بیگ صاحب کی کہانیاں (جیسے حسام بٹ صاحب تحریر کرتے ہیں) پڑھتا ہوں۔ بیگ صاحب اس بار بڑے اسمارٹ نظر آئے۔ بڑے شاطرانہ انداز میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی علیحدہ کر دیا۔ زن اور زر نے مل کر جو فتنہ کھڑا کیا تھا ا ے اپنی مہارت اور چابکدستی سے آشکار کر . ۲. ہوئے اپنے موکل کو باعزت بری کروالیا۔ ویسے ایک بات ہے کہ آج کے دور میں نہ تو ملک صفدر حیات جیسے پولیس افسر ہیں اور : ۱۰ مرزا امجد بیگ صاحب جیسے وکیل۔ انجم فاروق ساحلی کی اصلی نقلی خوب رہی۔ پیچ در پیچ واقعات میں الجھی یہ کہانی مزہ دے گئی ا۱ جب حقیقتِ حال پتا چلی تو کچھ کرداروں کی بے وقوفی سے روشناس ہوئے۔ نقلی ماں نے کیا کیا گل کھلائے......؟ منظر امام ایک کہنہ مشق لکھاری ہیں۔ اس ماہ کی کہانی راہنما نے آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی بھر دی۔ انسان خطا کا پتلا ہے۔ اس سے غلطی سرزد ہو جاتی ہے۔ اپنی غلطی کو تسلیم کر کے اور اس کا ازالہ کر کے انسان دنیا اور آخرت میں سرخرو ہو جاتا ہے۔ اے آر راجپوت کی رنگِ آسماں کی ساتویں قسط بھی خوب رہی۔ اگلی قسط میں پتا چلے گا کہ بدری ناتھ کیسے انجام سے دوچار ہوا۔ سودا شاہ زین رضوان کی ایک ہلکی پھلکی تحریر تھی۔ جب عقل پر پتھر پڑ جائیں تو ایسا ہی ہوتا ہے...... آخر میں بات ہو جائے پروین زبیر کی کہانی بازگشت کی۔ اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ آخری صفحات کا حق ادا کر دیا گیا۔''

✠ زرین خان آفریدی، حیدر آباد سے خط لکھ رہی ہیں ''ماہ مئی کا ٹائٹل پسند نہیں آیا۔ ذاکر حسین انکل کی علالت کا ہمیں

پہلے ہی علم ہو چکا تھا، جب سسپنس کا سرورق کا انداز تبدیل ہوا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ وہ جلد صحت یاب ہوں، ساتھ میرے حق میں بھی دعا کی اپیل ہے۔ میری طبیعت کچھ عرصے سے ٹھیک نہیں۔ (اللہ تعالیٰ آپ کو بھی صحتِ کاملہ عطا فرمائے) انشائیہ بہت ہی شاندار رہا۔ آج کل دوغلا پن ہر دوسرے فرد کا وتیرہ ہے۔ اداریہ میں ہمیشہ سے شوق اور توجہ سے پڑھتی ہوں اور حالاتِ حاضرہ سے باخبر رہنا ضروری ہے۔ اپنی محفل میں داخل ہوئے تو میڈم چلبلی ہیر صاحبہ کو صدارت پر قبضہ کیے دیکھا۔ بہت بہت مبارک ہو۔ چٹ پٹے تبصرے محفل کی رونق بڑھا دیتے ہیں۔ منشی محمد عزیز جی...... ہیر کا رانجھا بے چارہ کان پکڑ کر بیٹھا ہوگا۔ محمد جاوید خان، جنید بن اقبال، ساگر ٹکوکر اور محمد خواجہ صاحب کے تبصرے پسند آئے۔ ادریس احمد خان اور ریاض بٹ، محمد رفاقت، رمضان پاشا، محمد ہمایوں تتولی اور ایمانے زارا شاہ بہترین تبصروں کے ساتھ رونقِ محفل رہے۔ بابر عباس جی آپ میرے لیے کیا لے کر راہوں میں کھڑے ہیں۔ آم یا پھول؟ ویسے آپ تو ہمیشہ کچے پکے تبصروں کے ساتھ محفل میں موجود ہوتے ہیں اور آپ کے تبصروں کی تعریف بھی کرتی رہتی ہوں۔ پروین زبیر کی بازگشت کافی عمدہ رہی۔ فیصل شاہان کی بدمعاشی اور منال کی بے وقوفی کا یہی انجام ہونا تھا۔ مرزا امجد بیگ کی نافرمان دو بیویوں کا سر کا تاج کاشف مرتے مرتے بچا۔ ٹرمپ کارڈ آصف ضیا کی ہندو کمیونٹی سے عمدہ اسٹوری تھی۔ سوستار کی ایک لوہار کی۔ شیاما دیوی اور جھرنا کی بہترین مثال رہی۔ زویا اعجاز جی کی جواز بھی بہترین اسٹوری تھی۔ جدت اور فیشن کے متوالے لوگ جب سب کچھ کھو دیتے ہیں تو ہوش آتا ہے۔ علی اختر کی رامنی گبھارو عرف رحمت بانو کا جادو شہزادے اعظم پر چل ہی گیا۔ شہزادی دل پذیر کو بھی اس کا حق مل گیا۔ بہت اچھی داستان رہی۔ شکر ہے وقت میں بھی حسام بٹ صاحب نے کچھ ہلچل مچائی۔ زبردست۔ اے آر راجپوت صاحب کی رنگِ آسماں مشرق و مغرب کا حسین امتزاج۔ داستان کسی فلم کی طرح چل رہی ہے۔ ویلڈن۔ محفل شعر و سخن میں اپنا قطعہ اول پوزیشن پر دیکھ کر بہت اچھا لگا۔ نوازش۔ ہیر بھی مسلسل اعزازی اشعار کی لسٹ میں ہے۔ باقی کے تمام اشعار بھی اے ون تھے۔ مراسلے بے حد پسند آئے۔ حضرت موسیٰؑ کا پانچواں حصہ پڑھا۔ لاجواب رہا۔ جزاک اللہ خیر۔''

✠ ادریس احمد خان، ناظم آباد، کراچی سے نامہ لے کر حاضر ہیں ''سرورق بہترین کاوش کا آئینہ دار تھا۔ ذاکر صاحب کی علالت کا پڑھ کر رب کائنات سے ان کے لیے دعا گو ہیں کہ ان کو اللہ شفائے کاملہ عاجلہ عطا فرمائے۔ آمین۔ اندر جون ایلیا کا انشائیہ حسبِ حال تھا کہ ہر نفس دورنگی زندگی بسر کر رہا ہے کہ یہ عادتیں اتنی پختہ ہو گئی ہیں کہ رگوں میں سرایت کر گئی ہیں جس کا علاج فی زمانہ مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں ہے۔ اندر اداریے میں بھی کوئی نئی تبدیلی نظر نہیں آئی کہ سب کچھ ویسا ہی چل رہا ہے جیسا ہم نہیں چاہتے مگر لب خاموش ہیں۔ ناموں پر نظر پڑی تو ہیر صاحبہ پر نظر پڑی، برمحل اور بروقت لکھتی ہیں۔ دیگر دوستوں کی حاضری بھی نظر آ رہی تھی۔ علی اختر صاحب نے ماضی کے دریچوں سے آگاہی کا درس دیا۔ انجم فاروق ساحلی نے اصلی نقلی سے متعارف کرایا۔ منظر امام صاحب نے راہنما تک راہنمائی کی پھر اے آر راجپوت کی رنگِ آسماں تک رسائی ملی۔ شروع دن والے رنگ میں پایا۔ کہانی خوب صورت انداز میں جاری و ساری ہے۔ جواز، زویا اعجاز کی اچھے انداز میں لکھی ہوئی کہانی تھی۔ محفل شعر و سخن میں اچھے اور معیاری اشعار نے کافی محظوظ کیا۔ کیتھی بھی اثر انگیز کہانی تھی۔ وقت نے تنگیِ وقت کا احساس دلایا۔ جنونی انتقام میں انتقام کی راہ میں حد سے بھی زیادہ...... ظلم کیا گیا جو حقیقت سے بھی قریب تر ہے۔ دلوں کو ایمان کی روشنی سے منور کر دینے والی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی داستان ابھی جاری ہے جس سے تشنگی کا احساس جاتا رہا۔ سودا میں محبت و رقابت کے جذبات سے کہانی کا آغاز و انجام ہوا۔ آخری صفحات کی خوب صورت کہانی بازگشت تھی جو پروین زبیر کے قلم سے لکھی گئی، تادیر اثر پذیر رہی۔ کترنوں نے بھی اپنے ہونے کا احساس دلایا۔''

✠ چلبلی ہیر کی جھنگ صدر سے چلبلاہٹ ''خوب صورت کہانیوں کا مجموعہ سسپنس ڈائجسٹ مئی 2018ء، اٹھارہ اپریل کو ملا۔ میرا چھوٹا بھائی 20 روپے کی رشوت لے کر بک اسٹال پر جاتا ہے۔ اس بار دو چکر لگے۔ پورے سو روپے کا ڈائجسٹ پڑا۔ ٹائٹل بھی پھیکی مسکراہٹ والی دوشیزہ کا تھا۔ انشائیہ بہرحال شاندار اور حقیقت پر مبنی تھا۔ اداریہ بھی اصلاحی اور دل لگتی کہہ رہا تھا۔ پھر ہم تو چلے اپنی محفل کی طرف...... اب جو ہیر کا خط فرسٹ نمبر پر دیکھا تو ہمارا دھمال، کمال شروع۔ اتنی خوشی ہوئی کہ اپنی امی کو گلے لگا کر چوم لیا۔ امی بولیں اس کو پھر پاگل پن کا دورہ پڑ گیا۔ بھئی خوشی اور اپنے دل کی مراد پا کر تو انسان پاگل ہو ہی جاتا ہے۔ (ہاں یہ تو ہے بھئی) منشی محمد عزیز انکل آپ میرے رانجھا کی فکر نہ کریں۔ وہ ماڈرن رانجھا ہے، بانسری نہیں گٹار بجاتا ہے۔ محمد جاوید خان انکل نے کافی مشکل مشکل لفظوں کے گھوڑے دوڑائے اپنے تبصرے میں۔ بہرحال تبصرہ اچھا رہا۔ جنید بن اقبال ہم کسی سے کم نہیں کا نعرہ لے کر محفل میں کود پڑے۔ ان کی کمی بیشی کا تو آگے پتا چلے گا۔ ساگر ٹکوکر کا تبصرہ پسند آیا۔ محمد خواجہ صاحب کم ... لر تے ہیں مگر ہوتے سیر حاصل ہیں۔ زرین خان آپی صاحبہ مجھے صدارت پر دیکھ کر کیسا لگا؟ رمضان پاشا انکل ہمیشہ دکھی ... لرتے ہیں۔ بابر عباس انکل آپ کس قسم کی نظرِ کرم چاہتے ہیں۔ میں زرین آپی سے سفارش کر دوں گی۔ سلسلے وار



دونوں داستانیں بیسٹ اینڈ بیسٹ جارہی ہیں۔ ویلڈن حسام بٹ اینڈ اے آر راجپوت صاحبان۔ علی اختر کی رامنی بہترین رہی، آسام کی سانولی سلونی رامنی گھبارو، شہزادہ اعظم کا دل جیت گئی لیکن شہزادی دل پذیر بھی شہزادہ اعظم کی زندگی میں داخل ہو ہی گئی۔ بہت معلوماتی داستان تھی۔ نافرمان کاشف کو اچھی سزا ملی مگر شازیہ اور صدف دونوں بیویوں نے اور مرزا امجد بیگ صاحب کی وکالت نے اس کو بچا ہی لیا۔ زویا اعجاز صاحبہ کی جواز بھی شاندار سبق آموز تحریر تھی۔ ترقی اور فیشن کے نام پر بے حیائی کا جواز تلاشنے والوں کے ساتھ ایسے ہی حادثے ہوتے ہیں۔ بیچاری معصوم ثنا۔ ٹرمپ کارڈ، آصفہ ضیا احمد کی بہترین کاوش۔ دھوکا اور فراڈ چلتا رہتا ہے۔ جہاں سے شروع ہوتا ہے وہاں پر ہی ختم ہوتا ہے۔ شیاما دیوی اور کانتا دیوی نے جھرنا کو دھوکا دیا۔ جب اس کا وار چلا تو دونوں کو مات دے دی۔ پروین زبیر کی بازگشت، دیر آید درست آید۔ فیصل شاہان جیسے شاطر لوگ منا ہل جیسی سادہ اور معصوم لڑکیوں کو اپنے مطلب کے لیے استعمال کرتے رہتے ہیں۔ مشال اور عالیان کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور مسعود صاحب کے بڑھاپے کا سہارا بن گئے۔ محفل شعر و سخن لاجواب تھی۔ اعزازی لسٹ میں اپنا نام دیکھ کر بہت اچھا لگا۔‘‘

☒ انجم فاروق ساحلی، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور سے حاضر محفل ہیں ’’اس بار ٹائٹل خوب صورت، جاذب نظر اور بیک گراؤنڈ مناظر سے خاصا منفرد معلوم ہوا۔ نوجوان حسینہ کا چہرہ اور آنکھیں آرزوؤں، امنگوں اور شاطرانہ چمک سے معمور ہیں۔ اصلی نقلی شائع کرنے کا بے حد شکریہ۔ کہانیوں میں رامنی، جادوئی چراغ، سودا، نافرمان، جنونی انتقام، حضرت موسیٰ اور بازگشت اچھی اور معیاری تحریریں تھیں۔ باقی ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ خطوط کی محفل میں قارئین نے سسپنس سے اپنے دلی لگاؤ اور والہانہ عقیدت کا اظہار کیا۔ سسپنس کے آتے ہی بک اسٹالوں کی رونق بڑھ جاتی ہے۔ سسپنس نے ہمیشہ کہانیوں کے متنوع اور پُرندرت زاویے شائع کرتے ہوئے قارئین کے ذوق کی آبیاری کی۔‘‘

☒ عبدالجبار رومی انصاری، قصور سے پچھلے ماہ کے شمارے پر اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں ’’اسٹوڈنٹ دوشیزہ نے مینڈھیاں تو ڈبل کر رکھی ہیں مگر بال اتنے لمبے نہیں ہیں۔ لڑکی خوب صورت ہے ہاں اگر اس کے بالوں میں پراندہ سجا ہوتا تو اور بھی خوب صورت لگتی...... پاکستانی قوم میں قوتِ برداشت بہت ہے جسے مرضی لوٹ کھسوٹ لیا جائے پھر بھی اُف تک نہیں کرتی اور سیاستدانوں کے لیے بار بار خود کو پیش کر دیتی ہے۔ اب جون بابا سے زیادہ ’’اندازہ‘‘ تو ہم نہیں لگا سکتے نا جنھوں نے بہت پہلے کہہ دیا کہ لوٹنے والوں کا بڑا ہتھیار دولت ہے۔ لٹنے والوں کے پاس سب سے مضبوط سپر جہالت اور یہ قوم کہاں تک متحمل ہو سکتی ہے یہ سوچنے کی بات ہے...... ہم سے اور سب سے بہت زیادہ محبت کرنے والے نہایت شفیق اور ملنسار ہمارے والد محترم 10 فروری کی صبح اچانک ہی انتقال کر گئے اور ہمیں سوگوار چھوڑ گئے۔ ابوجی جس طرح چلتے پھرتے گئے ہمیں تو یقین ہی نہیں ہو رہا کہ وہ اب ہم میں نہیں ہیں۔ (بہت افسوس ہوا یہ جان کر...... اللہ تعالیٰ آپ کے والد کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین) دوست محمد کی معاونت، رمضان پاشا کی تقویت، محمد رفاقت کی شرکت، منشی عزیز مٹے کی عمدہ رپورٹ، اشفاق شاہین کی زینت، ریاض بٹ کی دعائیں، مکھن لگاتی ایمانے زارا شاہ، حاضری دیتے کامران احمد، بابر عباس، انجم فاروق، محمد قدرت اللہ، ناہید یوسف اور آخر میں رائے سے نوازتی شاہانہ سلطان سب نے ہی زبردست تبصرے کیے۔ مصری قوم پر ایک سے بڑھ کر ایک عذاب نازل ہوا مگر وہ ہر بار ہی جادو سمجھتے اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی ہمت نہیں ہاری انھیں راہِ راست پر لانے کے لیے مصری قوم کو سمجھاتے ہی رہے۔ سبق آموز بہترین قصہ۔ آشیانہ کی امید نے اپنے ماموؤں کے لیے امید صبح پیدا کر دی اور باباجی نے بھی آخر میں گورے میاں کی ایک نہ چلنے دی، زبردست کہانی۔ اچھی لگی۔ وقت میں علی تو بیتا اور عظیم کے ساتھ مل کر میدان جنگ کا خوب سروے کر رہا ہے۔ ڈیلفینا بھی آ گئی ہے۔ بس ٹاکرا ہونا باقی ہے۔ رنگِ آسماں میں نجو بائی کی سازشیں تو دھری رہ گئیں۔ رینا کے خیمے بھی آگ کی زد میں ہیں البتہ وہ ڈائری پڑھ کر اپنے باپ کے قاتلوں تک پہنچنے کی تگ و دو میں ہے اور علی پولیس کے شکنجے میں کیا بازی لگاتا ہے، دیکھتے ہیں۔ محفل شعر و سخن سے چلبلی ہیر، جنید احمد ملک، اور انیلا رشید سیال کے شعر اچھے لگے۔‘‘ (آپ کا خط ہمیں دیر سے ملا...... بہرحال محفل میں جگہ مل گئی ہے)

☒ ناہید یوسف کی آمد اسلام آباد سے ’’سسپنس نے جانے کیا نشہ سا کر دیا ہے کہ پڑھے بغیر سکون ہی نہیں ملتا۔ چاہے کتنی مصروفیت کیوں نہ ہو، چاہے کوئی کچھ بھی کہے مگر ہم سسپنس کا دیدار کر ہی لیتے ہیں۔ اس چکر میں اپنے ’’میاں صاحب‘‘ سے متعدد بار ’’سن‘‘ چکے ہیں کہ ’’کیا ہر وقت ڈائجسٹ کے اوراق میں گم رہتی ہو؟‘‘ تو ہمارا جواب بس ایک دل آویز مسکراہٹ کی صورت میں ہوتا ہے۔ خیر اب تو تمام ملنے والے واقف حال ہو چکے ہیں۔ اس بار تو سسپنس نے مزہ دوبالا کر دیا۔ بہت ہی شاندار کہانیاں شامل تھیں۔ سب سے بہترین ہمیں دو کہانیاں لگیں جنھوں نے تادیر ہمیں اپنے ’’اثر‘‘ میں رکھا۔ پہلی کہانی زویا اعجاز صاحبہ کی تھی۔ زویا واقعی آپ کی تحاریر میں اثر ہے۔ قلم میں روانی ہے۔ یقین کریں یہ ہم دل کی گہرائی سے کہہ رہے ہیں۔ آپ نے انتہائی اہم



اور حساس موضوع کو جس طرح ڈسکس کرتے ہوئے معاشرے کی اس برائی کو ختم کرنے کا حل پیش کیا، یقین جانیے دل خوش ہو گیا۔ واقعی اگر ہم اپنے لباس اور رکھ رکھاؤ کا خیال رکھیں تو مذکورہ واقعات میں نمایاں کمی ہو سکتی ہے۔ فیشن کے نام پر اپنی ’’نمائش‘‘ سے اپنے ہی گھر کو آگ لگ سکتی ہے۔ والدین کو چاہیے کہ وہ خود...... اور اپنی بچیوں کو شروع سے ہی لباس میں توازن رکھنے کی تلقین کریں اور اس پر سختی سے عمل کرائیں۔ دوسری کہانی منظر امام صاحب کی راہنما تھی۔ منظر صاحب تو واقعی نئے نئے آئیڈیاز لاتے ہیں۔ کیا خوب صورت تحریر ہے۔ کہانی کو اس پیرائے میں بیان کیا ہے کہ مزہ آ گیا۔ واقعی شہیدوں کا بڑا رتبہ ہے۔ کہاں تو شیر زمان اپنے گناہ کی سزا پانے والا تھا مگر شہیدوں سے محبت نے اسے جہنم رسید ہونے سے بچا لیا۔ ویلڈن منظر صاحب۔ رنگِ آسماں بس ٹھیک ہی ہے۔ کہانی میں کچھ ایسے واقعات نہیں کہ انسان محویت سے پڑھ سکے۔ بس گزارے لائق چل رہی ہے۔ وقت بھی سوسو ہی رہی۔ کہانی کا ٹیمپو تیز کرنے کی ضرورت ہے۔ کہانی میں ٹھہراؤ مطلب سست روی ہے۔ علی فی الحال کوئی کارنامہ انجام دینے کے بجائے خالی خولی باتیں ہی کر رہا ہے یا پھر لوگوں کو چکر دینے میں لگا ہوا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام...... یقین کریں پڑھ کر دل کو سکون ملتا ہے۔ کیا روحانیت ہے اور جو واقعات ہیں اس میں ہمارے لیے نصیحت اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھنے میں ہی ہماری نجات کا پیغام دیتے ہیں۔ ویلڈن رضوانہ ساجد۔ علی اختر کی ’’رامنی‘‘ بھی اچھی تحریر تھی۔ تاریخ سے آگاہی حاصل ہوئی۔ ایسی تحاریر معلومات میں اضافے کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ نافرمان میں مرزا صاحب کے کمالات دیکھنے کو ملے۔ تنویر ریاض کی جادوئی چراغ بھی اچھی رہی۔ محبت کے حصول کے لیے جیٹ نے ’’جادوئی چراغ‘‘ کا سہارا لیا اور واقعی کلارا اسے مل گئی اور جادو چل گیا...... محبت کا۔ ٹرمپ کارڈ بس ٹھیک رہی۔ اس کے علاوہ سودا، اصلی نقلی اور کیتھی کہانیاں بس سوسو رہیں۔ بازگشت پڑھ نہیں پائی۔‘‘

☒ صبا سحر کی پہلی کاوش کراچی سے ’’سسپنس کافی عرصے سے پڑھ رہی ہوں۔ اشعار کی محفل میں بھی حاضری دیتی رہتی ہوں۔ بس خط لکھنے کا اتفاق پہلی بار ہو رہا ہے۔ ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ کے تمام پرچے شوق سے پڑھتی ہوں البتہ سسپنس سے خاص لگاؤ ہے کیونکہ سسپنس کی کہانیاں الگ انداز لیے ہوتی ہیں۔ سسپنس میں تصوف بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ اس کے علاوہ تاریخی صفحات بھی دلچسپی کا سبب ہیں۔ علی اختر کی رامنی بہت سکون سے پڑھی اور ایسا لگا کہ ہم ان کرداروں کے درمیان ہیں اور اپنی آنکھوں سے سب ملاحظہ کر رہے ہیں۔ حسام بٹ صاحب کی وقت بھی اچھی جا رہی ہے تاہم ہماری ہیرو سے گزارش ہے کہ وہ جلد ایکشن میں آئے اور دشمنوں کا ناکوں چنے چبوائے۔ شارو کو آزاد کرائے اور یہودیوں کے خلاف برسرِ پیکار ہو جائے۔ اے آر راجپوت کی رنگِ آسماں بس بہتر ہے۔ مگر ہماری ناقص رائے کے مطابق کہانی کو مزید بہتر بنایا جا سکتا تھا۔ خیر یہ تو رائٹر صاحب کو پتا ہوگا کہ وہ اپنے ذہن میں کیا ترتیب رکھتے ہیں۔ چھوٹی کہانیوں میں جادوئی چراغ تنویر ریاض، جواز زویا اعجاز اور راہنما منظر امام، پسند آئیں۔ تینوں کہانیاں لاجواب تھیں۔ اس کے علاوہ یاسر اعوان کی جنونی انتقام بھی زبردست کہانی تھی۔ جنگی قیدیوں کے ساتھ جو نفرت اور سلوک روا رکھا گیا، اس نے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ کیا ظالم عورتیں تھیں۔ ظلم کی انتہا کر دی۔ اصلی نقلی بھی ٹھیک لگی۔ نافرمان میں مرزا امجد بیگ پہلے کی طرح اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑتے نظر آئے۔ ٹرمپ کارڈ، کیتھی کچھ خاص متاثر نہ کر سکی۔ بازگشت بھی بس ٹھیک لگی۔ سودا شاہ زین رضوان کی بہتر لگی۔‘‘

☒ امتیاز احمد، پھالیہ سے نامہ لے کر حاضر ہیں ’’سرورق بہت خوبصورت تھا اور سسپنس کو اعزاز حاصل ہے کہ اس کے ٹائٹل ہمیشہ ہی لاجواب ہوتے ہیں اور یہی اس ڈائجسٹ کی انفرادیت ہے۔ جون ایلیا کا انشائیہ بھی بہت سبق آموز تھا۔ علی اختر صاحب نے ماضی کے دریچوں سے آشنائی کرائی علی اختر اچھا لکھتے ہیں ان کی تاریخی کہانیوں کے علاوہ بھی اچھی ہوتی ہیں مجھے ان کا طرزِ تحریر اچھا لگتا ہے اللہ ان کے قلم کو مزید روانی دے میری ان سے درخواست ہے کہ وہ برصغیر کی پوری تاریخ کو سلسلے وار تحریر کریں۔ اصلی نقلی سے انجم فاروق ساحلی نے آگاہ کیا۔ حسام بٹ صاحب کی وقت بھی اچھی ہے مگر ذرا ٹھنڈے مزاج کی ہے حسام بٹ صاحب نے وقت کو تیز دوڑانے کی کوشش تو کی ہے مگر میرا خیال ہے کہ وہ اسے وہ اسپیڈ دے نہیں پا رہے جو یہ مانگ رہی ہے۔ عمومی لحاظ سے دیکھا جائے تو وقت اچھا ہی گزر رہا ہے۔ چھوٹی کہانیوں میں ہمیں منظر امام صاحب کی راہنما، جواز، زویا اعجاز کی اچھے انداز میں لکھی ہوئی کہانیاں ... تھیں۔ محفل شعر و سخن میں اچھے اور معیاری اشعار نے کافی محظوظ کیا۔ اے آر راجپوت کی رنگِ آسماں کے بارے میں..... ہماری ذاتی رائے ہے۔ ہمیں اس کہانی میں ابھی تک کوئی دلچسپی کا سامان نظر نہیں آیا۔ آگے دیکھتے ہیں کہانی اپنا رنگ جماتی ہے۔ ٹرمپ کارڈ، کیتھی چھوٹی کہانیوں میں ہمیں اچھی لگیں۔‘‘

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

غلام فرید، چوک ظاہر پیر۔ رانا ارشد، قادر آباد۔ شاہینہ ریاض، لاہور۔ خلیل بشیر، میانوالی۔ لائبہ منیر، ملتان۔ سعدیہ مبشر، بنوں۔ عمران حیدر ناگرال، حسنین عباس، اسلام آباد۔ عامر رسول، ملتان۔ طاہر الدین ضیا، کراچی۔ ملک ریاض خان، سرگودھا۔



کانٹے

ڈاکٹر ساجد امجد

اگر دیکھا جائے تو کانٹے محافظوں یعنی پھولوں کے محافظوں کا دوسرا نام ہے مگر... یہ حفاظت بعض اوقات کچھ لوگوں کی آنکھوں میں کانٹوں جیسی تکلیف کا ہی باعث بن جاتی ہے کیونکہ ذاتی مفاد کے حصول میں ناکامی ذاتی عناد کو جنم دیتی ہے اور اس طرح کبھی نہ ختم ہونے والا ایک انتقامی سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ بالکل اسی طرح زیرنظر واقعات نے بھی ثابت کیا ہے کہ تاریخ کا چاہے جو بھی دور گزرا ہو... اختیارات... مفادات اور تختِ بادشاہی کی عنایات کی خاطر مصاحبین کے درمیان خانہ جنگی چلتی رہی ہے۔ وہ بھی ان مفاد پرست لوگوں کی نظروں میں کانٹے کے مانند کھٹک رہا تھا جس نے اپنے اختیارات کا بے محابانہ استعمال کرکے جانے کتنی دشمنی مول لے لی تھی مگر اسے آخری وقت تک ادراک نہ ہوسکا کہ وہ کتنی بڑی مشکل اور ذلت میں گھر چکا ہے لیکن... کوئی چاہے کیسے ہی داؤ پیچ اختیار کرلے... مقدر کے وار اور مکافات کے شکنجے سے بچ نہیں پاتا پھر وہ کیسے بچ جاتے۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات



حاکم دہلی تردی بیگ خاں نے بزدلی کا ایسا مظاہرہ کیا تھا کہ سلاطین چغتائی کی ہیبت دہلی اور آگرہ کے درمیان ہی کہیں دم توڑ گئی۔ عدلی شاہ کا گماشتہ ہیموں بقال آگرہ سے کوچ کرکے دہلی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مخبروں نے اس کے آنے کی خبریں تردی بیگ تک پہنچائیں تو وہ ایسا بدحواس ہوگیا جیسے ہیموں اس کے محل کے دروازے پر کھڑا دستک دے رہا ہو۔ اس نے یہ زحمت بھی نہیں کی کہ اطرافِ واکناف سے کمک حاصل کرکے ہیموں کے کان کھڑے کردیتا۔ رعایا کو شہر پناہ کی حفاظت پر مامور کرکے کمک بھیجنے کے لیے دربار میں لکھ بھیجتا۔ وہ کسی ویران قلعے میں نہیں بھرے پُرے شہر میں تھا۔ غذا کی قلت نہیں تھی۔ اگر ہوتی بھی تو بزدلی سے بہتر بھوک سے مرجانا تھا مگر اس نے تو احمقانہ قدم یہ اٹھایا کہ مختصر سی فوج لے کر شہر سے باہر نکل آیا اور سیدھے بادشاہی لشکر کا رخ کیا۔

ہیموں کے سامنے میدان صاف تھا۔ اس نے اطراف واکناف سب جگہ اپنے عمال اور کارپرداز مقرر کرکے ملک کا نظم ونسق سنبھال لیا۔

قسمت کا دھنی تھا کہ سلطان عادل (عدلی شاہ) کے عہد میں کوتوال سے وزیر بنا اور اب دہلی کے تخت پر بیٹھا تھا۔ اس کے خوشامدی امراء تخت کے پائے پکڑے بیٹھے تھے اور

اس کے منہ سے اپنی تعریفوں کے موتی برس رہے تھے۔

''تم نے دیکھا میں نے کس طرح آگرہ کو اپنے بس میں کیا اور دہلی کو کس طرح اپنی مٹھی میں بند کیا۔ یہ میری بہادری کا ادنیٰ سا کرشمہ ہے اور اس سے بھی زیادہ میرے ذہن کی براقی...... تم ادنیٰ عقلوں والو کیا سمجھو گے کہ جب بہادری اور ذہانت مل جائیں تو کیا کچھ ظہور میں آتا ہے۔ شہنشاہ ہمایوں جب دربدر کی خاک چھاننے کے بعد ہندوستان لوٹا تو انتشار کی آندھی چل رہی تھی۔ ملک کا سارا نظم ونسق بگڑ چکا تھا۔ اس بے چارے نے نظم ونسق کی رسی کو دونوں ہاتھوں سے تھاما، ازسرِنو سارے انتظامات کرائے۔ ابوالمعالی کو پنجاب کی حکومت دی۔ سکندر خاں کو آگرہ کا صوبہ دار مقرر کیا۔ سنبھل اور میرٹھ کے بندوبست پر علی قلی کو روانہ کیا۔ تردی بیگ خاں کو دہلی کی حکومت سپرد کی۔ وہی تردی خاں جو مجھے دیکھتے ہی دم دبا کر بھاگ گیا۔

''ہمایوں جتنے دن زندہ رہا، نظم ونسق کی درستی کے لیے سر کھپاتا رہا اور اسی آرزو میں دنیا سے چل بسا۔ اس کی جگہ اس کا یہ نوعمر جانشین تخت نشیں ہوا جو خود کو اکبر بادشاہ کہلواتا ہے لیکن حال یہ ہے کہ اس کا بندوبست صرف پنجاب تک محدود ہے۔ آگرہ میرے پاس، دہلی میرے پاس۔ چھوٹے بڑے زمیندار اپنے اپنے علاقوں پر قبضہ کیے بیٹھے ہیں۔ ان سے تو میں بعد میں نمٹ لوں گا، فی الحال مجھے اکبر کی طاقت کا گھمنڈ توڑنے کے لیے پنجاب کی طرف بڑھنا ہے۔ تم مجھ سے یہ مت پوچھنا کہ میں شاہی لشکر کا مقابلہ کس طرح کروں گا۔ میں جب آگرہ سے چلا تھا تو میرے ساتھ پچاس ہزار سوار تھے اور اب یہ تعداد ایک لاکھ تک پہنچ گئی ہے۔ یہ تعداد اکبر جیسے کم سن کو شکست دینے کے لیے بہت ہے۔ ہمیں ایسی کوئی جلدی بھی نہیں۔''

ہیموں حسبِ عادت عیش وعشرت میں مشغول ہوگیا۔ اس کے امراء نے بھی خوب شرابوں کی برسات کی۔ رقص وسرود کی محفلیں سجیں۔

تردی بیگ خاں ہیموں کے پھیلے ہوئے لشکر سے بچتا بچاتا جالندھر... کی طرف بھاگا جہاں اکبر بادشاہ سکندر کے فتنہ وفساد کو دفع کرنے میں مشغول تھا۔ تردی بیگ کی قسمت کہ جب وہ شاہی لشکر میں پہنچا تو اکبر شکار کے لیے باہر نکلا ہوا تھا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ بیرم خاں خانِ خاناں سے ملاقات کرے اور اس پر اپنی بے گناہی ثابت کر کے سفارش کے لیے راہ ہموار کرے۔ اسے تمام راستے یہ احساسِ جرم ستاتا رہا تھا کہ اس نے دہلی کو خالی چھوڑ کر غلطی کی ہے۔ وہ اب اس کے ازالے کا راستہ ڈھونڈ رہا تھا۔ یہ راستہ سیدھا خانِ خاناں کی قیام گاہ کی طرف جاتا تھا۔ خان خاناں کو معلوم ہوا کہ تردی بیگ ملنے کے لیے آیا ہے تو اس نے صاف انکار کردیا لیکن امراء کے سمجھانے بجھانے پر تیار بھی ہوگیا۔ غصہ ابھی تک برقرار تھا۔ تردی بیگ آیا تو اس کی طرف سے منہ پھیر کر بیٹھ گیا۔

''تردی بیگ، میں بزدلوں سے بات کرنا پسند نہیں کرتا۔''

''میں بزدل نہیں ہوں۔ جو کچھ بھی میں نے کیا، مصلحت کا تقاضا تھا۔''

''اسے مصلحت نہیں زنخاپن کہتے ہیں۔ مصلحت تو اس میں تھی کہ شہر پناہ کی حفاظت کرتے۔ اس وقت تک مقابلہ کرتے جب تک ہماری طرف سے کمک نہیں پہنچ جاتی۔''

''سوچا میں نے بھی تھا لیکن حالات میرے خلاف چلے گئے تھے۔''

''حالات کو اپنے حق میں موڑنا ہی بہادری ہے۔''

''آپ اسے میری کمزوری کہہ سکتے ہیں، بزدلی نہیں۔''

''تردی بیگ خاں!'' خان خاناں کی آواز اونچی ہوگئی۔ ''مجھے تمہیں زندہ دیکھ کر خوشی نہیں ہورہی۔ کاش! میں دہلی کے دفاع میں تمہاری سر بریدہ لاش دیکھ رہا ہوتا۔''

''ایسا نہ کہیے۔ میں کمک لینے ہی آیا ہوں۔ ہم پھر دہلی جائیں گے۔ میری تلوار ہیموں ... کا سر قلم کرے گی۔''

''تم زندہ رہو گے تو یہ نوبت آئے گی۔''

''موت اور زندگی تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔''

''اللہ کے حکم ہی سے میں تمہاری بزدلی کی سزا تمہیں دوں گا۔''

''فرار ہونا بھی جنگ کا حصہ ہوتا ہے۔''

''جنگ کے بعد فرار ہوا جاتا ہے، جنگ سے پہلے نہیں۔''

''میرے بادشاہ کے آنے سے قبل آپ کوئی حکم جاری نہیں کرسکتے۔''

''تم یہ بھول رہے ہو کہ ظلِ الٰہی کہہ چکے ہیں، یہ سلطنت ہماری ضرور ہے مگر اس میں اختیارات ہمارے نہیں آپ ہی کے ہیں۔''

''ضروری تو نہیں کہ آپ ہر اختیار استعمال کریں۔''

''میرے لیے ضروری ہے کہ میں حکومت کا وقار قائم رکھنے کے لیے جو چاہوں قدم اٹھاؤں۔''

اس کے بعد خان خاناں نے ضروری نہ سمجھا کہ کوئی اور بات کرتا۔ اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ تردی بیگ خاں کو قتل کردیا جائے۔

تردی بیگ کو مکان کی چھت پر لے جایا گیا اور پھر چھت سے نیچے پھینک دیا گیا۔ یہ عمل دوبارہ دہرایا گیا یہاں تک کہ اس کی روح اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔

تردی بیگ کو ٹھکانے لگانے کے بعد خان خاناں کو یہ فکر ضرور رہنے لگی تھی کہ اس قتل پر اکبر کا ردعمل نہ جانے کیا ہو۔ ادھر یہ خبریں بھی پہنچ رہی تھیں کہ ہیموں کی ہمت دراز ہوگئی ہے اور وہ پنجاب پر لشکر کشی کا ارادہ کررہا ہے۔ کسی وقت بھی دہلی سے کوچ کرجائے گا۔ خان خاناں نے راتوں رات چند بااعتبار آدمیوں کو شکارگاہ کی طرف دوڑایا اور اسے ہیموں کی نقل وحرکت کی خبر پہنچائی البتہ اپنے لوگوں کو سختی سے منع کردیا کہ وہ تردی بیگ کے قتل سے متعلق کوئی اطلاع نہ دیں۔

اکبر اس قتل سے لاعلم جب لشکر میں پہنچا تو خان خاناں کے مخالفوں نے تردی بیگ کے قتل کو نمک مرچ لگا کر اس تک پہنچایا۔ ہر شخص سہما ہوا تھا اور اس قتل کو خان خاناں کے حد سے تجاوز کرنے سے تعبیر کررہا تھا۔ اکبر پورے حالات سے بے خبر تھا اس لیے کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے خان خاناں کو طلب کرلیا۔

''یہ ہم کیا سن رہے ہیں خان بابا!''

''آپ نے بالکل درست سنا۔''

''آپ نے اس خبر کو ہم سے چھپایا کیوں؟''

''غلام کو یہ جسارت کہاں کہ آپ سے کچھ چھپائے۔ فدوی تو یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ سلطنت مغلیہ کے مخالفین یہ خبر آپ تک کس رنگ میں پہنچاتے ہیں۔''

''ایسا کون ہے جو سلطنتِ مغلیہ کا مخالف ہے۔''

''وہی لوگ جو میرے اختیارات کو حسد کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔''

''یہ اختیارات تو ہم نے آپ کو دیے ہیں۔''

''حسد کی وجہ آپ کی یہی مہربانیاں ہیں۔''

''کیا تردی بیگ کا قتل حسد کی اس آگ کو مزید ہوا نہ دے گا؟''

''مجھے اپنے وقار سے زیادہ سلطنت کا وقار عزیز ہے۔ تردی بیگ نے اس وقار کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ وہ اگر ہماری کمک پہنچنے تک دشمن کا مقابلہ کرتا تو دہلی کا سہاگ نہ اجڑا ہوتا۔ اگر میں تردی کو سزا نہ دیتا تو امراء شیر بن جاتے۔ سمجھ لیتے کہ دشمن کو پیٹھ دکھانے کی سزا کچھ بھی نہیں۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ حضور اپنے حلم وعفو سے کام لے کر اس قصور کو معاف فرمادیں کیونکہ میں نے یہ سزا صرف اس مصلحت سے دی کہ ان ہنگامی اور پریشان کن حالات میں حکومت کا وقار سخت گیری اور سزاؤں سے ہی قائم رہتا ہے۔ میں نے اس قتل میں ملک اور بادشاہت کی بھلائی دیکھی تھی۔ اس ہنگامہ خیز زمانے میں جبکہ ایک طرف تو ہیموں جیسے زبردست دشمن کی فوج ہمارے قریب ہی خیمہ زن ہے اور دوسری طرف خونخوار افغان سارے ہندوستان پر چھائے ہوئے ہیں، تردی بیگ کا خاتمہ نہ کرنا دانش مندی نہ ہوتا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے جرائم کے باوجود آپ اسے قتل کرنے میں تامل فرماتے اسی لیے میں نے آپ کے حکم کا انتظار کیے بغیر ہی اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔''

اکبر کی عمر اس وقت کچھ زیادہ نہیں تھی۔ وہ ابھی اس قابل نہیں تھا کہ ملکی معاملات کی گتھیوں کو از خود سلجھالیتا۔ اسی لیے تمام اختیارات خان خاناں کو سونپ دیے تھے۔ اس وقت بھی اس نے خان خاناں کے اس اقدام کی تحسین کی اور آگے بڑھ کر معانقہ کیا۔

''تمہاری مرضی اور تمہارا اختیار۔ تم اپنے دل میں کسی اندیشے کو نہ آنے دو اور حاسدوں کی نکتہ چینی کی فکر نہ کرو۔''

''میں ایک اور جسارت کروں گا۔''

''فرمائیے۔''

''تمام امراء کو بلا کر مجلسِ مشاورت منعقد کی جائے تاکہ انہیں میری اہمیت کا علم بھی ہوجائے اور ہمیں ان کے خیالات سے آگاہی ہو۔''

اکبر نے اس مشورے پر عمل کیا اور امراء کا اجلاس طلب کر کے تمام صورت حال ان کے سامنے رکھی۔ امیروں کو جب معلوم ہوا کہ دشمن کے لشکر میں ایک لاکھ سوار موجود ہیں اور بادشاہی فوج بیس ہزار سے زیادہ نہیں تو سب نے یک زبان ہوکر بادشاہ کو مقابلہ نہ کرنے کی صلاح دی۔

''مصلحت تو یہی ہے کہ اس وقت بادشاہ سلامت مقابلے سے ہاتھ اٹھا کر کابل چلیں اور وہاں سے لشکر کی تیاری کر کے دوبارہ ہندوستان کو فتح کرنے کی مہم پر تشریف لائیں۔''

خان خاناں نے اس رائے کی مخالفت کی۔

''یہ تو وہی اقدام ہوگا جو تردی بیگ سے سرزد ہوا تھا۔ اس نے بھی مورچا چھوڑ کر غلطی کی تھی، ہم بھی یہی غلطی دہرائیں گے۔''

''اگر یہ غلطی ہے تو شہنشاہ ہمایوں نے بھی ہمارے منہ میں خاک یہی غلطی کی تھی۔ انہوں نے بھی یہی مصلحت اختیار کی تھی اور پھر سب نے دیکھا تھا کہ وہ واپس آئے اور انہوں نے دوبارہ حکومت حاصل کی۔''

''وجہ یہ تھی کہ ان کی حمایت میں کوئی بیرم خاں نہیں تھا

مگر جب انہیں بیرم خاں مل گیا تو انہوں نے ہندوستان فتح کرلیا۔ آپ لوگ میری تلوار اور میری حکمتِ عملی پر بھروسا کریں۔ فتح ہمارے قدم چومے گی۔“

تمام تر بحث ومباحثے کے بعد اکبر، خان خاناں سے مخاطب ہوا۔

”خان بابا! آپ کیا کہتے ہیں، مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

”میں اپنی رائے دے چکا۔ ہمیں ہیموں کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ اگر ہم نے ہیموں کو شکست دے دی تو دوسری باغی طاقتیں خود بخود پانی کے جھاگ کی طرح بیٹھ جائیں گی۔ اس کے برخلاف اگر حضور کے قدم مبارک کابل کی طرف اٹھ گئے تو ہیموں کے قدم جم جائیں گے۔ دوسری طاقتیں باہم دست وگریباں ہوجائیں گی اور ہندوستان ہمیشہ کے لیے انتشار کا شکار ہوجائے گا۔ اس وقت صرف ہیموں ہے جس پر قابو پانا ہے۔ یہ وقت گنوا دیا تو بہت سی طاقتوں سے لڑنا پڑے گا۔“

اکبر نے خان خاناں کی رائے سے اتفاق کیا اور اسی وقت خواجہ خضر کو لاہور کا حاکم مقرر کرکے سکندر خاں کے مقابلے کا حکم دیا اور خود ہیموں سے مقابلے کی ٹھانی اور روانگی کا حکم جاری کردیا۔

☆☆☆

دہلی میں ہیموں بقال اپنے گھمنڈ کے ڈھول پیٹ رہا تھا اور خود کو راجا بکرماجیت مشہور کررکھا تھا۔ بڑے غرور وتکبر کے ساتھ خودمختار حکومت قائم کیے ہوئے تھا۔ اس نے جب سنا کہ اکبر نے اس کے مقابلے کے لیے کمر ہمت باندھ لی ہے تو اس نے افغان امراء کو اپنے ساتھ ملایا اور ایک زبردست لشکر کو اپنے ساتھ لے کر بادشاہ کے مقابلے کے لیے آگے بڑھا۔ اس نے افغانوں کی ایک جماعت کو بہت بڑے توپ خانے کے ساتھ اکبر کے ہراول دستے پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ بادشاہی ہراول سے اس جماعت کا مقابلہ ہوا۔ اکبری سپاہیوں نے افغانوں کو شکست دی اور ان کا توپ خانہ چھین لیا۔ ہیموں بقال پانی پت کے نواحی علاقے میں پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ چغتائی فوج قریب آگئی ہے۔ اس نے اپنے فوجی سرداروں میں ہاتھی تقسیم کیے تاکہ یہ سردار ہاتھیوں پر سوار ہوکر میدان کارزار میں جائیں۔

جاسوسوں نے خبر دی کہ دشمن آرہا ہے۔ شاہی لشکر کے ذی اقتدار امراء صفوں کی درستی میں معروف ہوئے اور دشمن سے مقابلے کی تیاری شروع کردی۔

ہیموں نے ان ہاتھیوں سے جو اس کے پاس تھے، شاہی فوج پر حملہ کردیا۔ اس کے متواتر حملوں سے شاہی فوج کے بائیں حصے میں بدنظمی کے آثار پیدا ہوگئے لیکن مغل سپاہی تردی بیگ خاں کا انجام دیکھ چکے تھے اس لیے فرار کا ارادہ بھی قریب سے ہوکر نہیں گزرا اور نہایت ثابت قدمی سے میدان کارزار میں جمے رہے۔ تیرانداز جوانوں کی کوشش، تلوار اور تیروں کے حملوں سے شاہی لشکر میں استقلال کے آثار پھر نمایاں ہونے لگے۔ یہ حال دیکھ کر ہیموں نے خود سوار ہونے کا ارادہ کیا۔ ہاتھی پر سوار ہوا، تین چار تجربہ کار سپاہیوں کو ساتھ لیا اور اپنے قلب لشکر سے جدا ہوکر شاہی فوج کی پہلی صف پر حملہ کردیا۔ اس صف کو منتشر کرنے کے بعد ہیموں نے شاہی فوج کے قلب پر جہاں علی قلی خاں موجود تھا جس کی وجہ سے یہ حصہ مستحکم تھا، حملہ کردیا۔ بیرم خاں کے سبھی ملازم قلب لشکر میں موجود تھے۔ انہوں نے بڑی بہادری اور جرأت مندی کا مظاہرہ کیا۔ شاہی لشکر نے اس پر تیروں کی بارش کردی۔ اسی ہنگامے میں ایک تیر ہیموں کی آنکھ کو چھوتا ہوا گزر گیا۔ اگرچہ اسے کاری زخم نہیں آیا تاہم اس کی آنکھ سے خون جاری ہوگیا۔ بس یہ حادثہ شکست کا سبب بن گیا۔ ان لوگوں نے جو اس کے قریب لڑ رہے تھے، ہیموں کو اس حال میں دیکھا تو کوشش سے ہاتھ کھینچ لیا اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ جنگجو سپاہیوں نے ان کا تعاقب کیا اور ان میں سے بہت سوں کو قتل کر ڈالا۔

وہ ہاتھی جس پر ہیموں سوار تھا، اس کا فیل بان مارا جاچکا تھا اور ہیموں ہاتھی کے ہودے میں زخمی پڑا ہوا تھا۔ ہاتھی جنگل میں ادھر ادھر مارا مارا پھر رہا تھا۔ اتفاق سے ایک امیر شاہ قلی خاں کی نظر اس ہاتھی پر پڑ گئی۔

”ارے یہ تو وہی ہاتھی ہے جس پر ہیموں بقال سوار تھا مگر اب وہ کہاں ہے۔ فیل بان بھی موجود نہیں۔ شاید دونوں مارے گئے۔“ شاہ قلی خاں نے اپنے مہاوت سے کہا اور اسے حکم دیا کہ وہ اس آوارہ ہاتھی پر قابو پاکر سوار ہوجائے۔ اس کا مہاوت اپنے ہاتھی کو اس کے برابر لایا اور اس آوارہ ہاتھی کی گردن پر سوار ہوگیا۔ یہ دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں کہ ہودے میں ہیموں بقال بے حس وحرکت پڑا ہوا ہے۔ اس نے چیخ کر شاہ قلی خاں کو اطلاع دی۔

”مالک! ہودے میں ایک شخص پڑا ہوا ہے۔ لباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہیموں بقال ہے۔“

”زندہ ہے یا مردہ؟“

”کچھ کہا نہیں جاسکتا۔“

”تم اسے لے کر میرے ساتھ ساتھ بادشاہ کی خدمت میں چلو۔“

بادشاہ اپنے لشکر سے دو تین کوس کے فاصلے پر پیچھے آرہا تھا۔ شاہ قلی ہیموں کو لے کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ہیموں ابھی زندہ تھا لیکن زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے نیم غشی کی حالت میں تھا۔

بیرم خاں بھی بادشاہ کے ہمراہ تھا۔ اس نے بادشاہ سے درخواست کی۔

”جہاد فی سبیل اللہ کو پورا کرنے کی نیت سے حضور خود اس غیر مسلم کو موت کے گھاٹ اتاریں۔“

اکبر نے ہیموں کے سر پر تلوار کا ایک ہاتھ مارا۔ اس وجہ سے وہ غازی کے لقب سے مشہور ہوا۔ اس کے بعد بیرم خاں نے اپنے ہاتھ سے ہیموں کا سر تن سے جدا کیا۔

دوسرے دن شاہی لشکر نے پانی پت سے روانگی کردی اور دہلی تک کسی جگہ قیام نہیں کیا۔ دہلی میں داخلے کے وقت تمام خاص وعام اور اکابر وامراء نے استقبال کیا۔

پانی پت سے دہلی تک کے راستے کے درمیان یہ معلوم ہوچکا تھا کہ ہیموں کی تمام اولاد اور اعزہ خزانوں اور دفینوں کے ساتھ میوات میں جمع ہیں۔ دہلی پہنچتے ہی اکبر نے بیرم خاں کے وکیل ملا پیر محمد شیروانی کو میوات روانہ کیا تاکہ ان لوگوں کو گرفتار کرکے اس کے حضور پیش کریں اور تمام مال ودولت سرکاری خزانے میں جمع کرائیں۔

شیروانی نے میوات پہنچ کر حکم کی تعمیل کی۔

اکبر نے سکندر خاں کی سرکوبی کے لیے خواجہ خضر کو مقرر کیا تھا۔ پھر وہ ہیموں بقال سے جنگ میں مشغول ہوکر اس طرف توجہ نہ دے سکا اور یہ بازی ہاتھ سے نکل گئی۔ خواجہ خضر نے شکست کھائی اور لاہور جاکر پناہ گزیں ہوگیا۔ اکبر نے یہ خبر بڑی تشویش کے ساتھ سنی اور کسی تاخیر کے بغیر سکندر کے خاتمے کے لیے بذاتِ خود روانہ ہوگیا۔ یلغار کرتا ہوا سکندر کی فوج کے بالکل نزدیک پہنچ گیا۔ سکندر میں اتنی سکت نہیں تھی کہ بادشاہی لشکر سے مقابلہ کرتا۔ قریب ہی قلعہ مانکوٹ تھا۔ وہ یہاں قلعہ بند ہوگیا۔ شاہی لشکر نے بھی قلعے کی راہ لی اور قلعے کے گرد گھیرا ڈال کر قلعہ فتح کرنے کی تدبیروں میں مشغول ہوگئے۔ یہ قلعہ سلیم شاہ نے گکھڑوں کی بیخ کنی کے لیے پہاڑی علاقے میں ایک بلندترین مقام پر تعمیر کروایا تھا۔ اس کا فتح کرنا دشوار ترین امر تھا۔ سکندر بھی یہ سوچ کر مطمئن تھا کہ اکبری فوج کب تک محاصرہ کیے رہے گی۔ تنگ آکر محاصرہ اٹھا کر لوٹ جائے گی۔ اس کا یہ سوچنا بجا بھی تھا کیونکہ محاصرے کو تین ماہ گزر چکے تھے اور اکبری فوج اس کی ایک اینٹ بھی نہیں ہلا سکی تھی۔ امراء میں ایک مرتبہ پھر بے چینی کے آثار پیدا ہوئے۔ وہ اس محاصرے سے تنگ آچکے تھے اور اکبر کو واپسی کے مشورے دے رہے تھے لیکن بیرم خاں کی ثابت قدمی اس وقت بھی کام دکھا رہی تھی۔ وہ قلعے کی فتح تک محاصرہ جاری رکھنے کے حق میں تھا۔

”سکندر خاں قلعے میں محصور ہے۔ کبھی نہ کبھی اسے غذائی قلت کا سامنا ہوگا۔ ہم نے اس کی رسد کے تمام راستے مسدود کردیے ہیں۔ اس کے سپاہی جب بھوک سے مرنے لگیں گے تو سکندر خاں باہر آنے پر مجبور ہوجائے گا۔ جنگ کرے گا یا صلح کا پیغام بھیجے گا جو ہماری شرائط پر ہوگی۔“

”یہ نوبت نہ جانے کب آئے گی۔ ہم کب تک ان پہاڑی راستوں سے سر پھوڑتے رہیں گے۔“ علی قلی خاں، خان زماں نے کہا۔

”یہ نوبت جلد ہی آئے گی۔ اگر اس وقت محاصرہ اٹھا لیا تو پھر کبھی سکندر پر فتح حاصل نہیں ہوسکے گی۔ ہمایوں بادشاہ کی مسلسل غیرحاضری نے ان افغانوں کو ہاتھ پاؤں پھیلانے کا موقع دے دیا تھا۔ ان کا قلع قمع کرنا ضروری ہے۔ یہ آخری کانٹا ہے، اسے نکالنے دو۔“ بیرم خاں کا رعب واثر دیکھ کر اس وقت تمام لوگ خاموش تو ہوگئے لیکن جو الفاظ زبان پر نہ آسکتے تھے، دل میں رہ گئے۔ اس کا اظہار رات کے اندھیرے میں علی قلی خاں کے سامنے ہوا جب تمام امراء بیرم خاں کی غیرموجودگی میں جمع ہوئے۔ علی قلی خاں نہایت بااثر امیر تھا۔ وہ اپنی بہادری کی وجہ سے خان زماں کے خطاب سے سرفراز ہوا تھا۔ اس وقت بھی سب کی نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔

”بیرم خاں اجتماعی خودکشی پر تلا ہوا ہے۔ اسے کیا خواب آیا ہے کہ قلعہ مانکوٹ میں غذا کی قلت کا سامنا ہونے والا ہے۔ ہم کب تک ان پہاڑوں پر پڑے رہیں گے اور سکندر شاہ آرام سے قلعہ بند رہے گا۔“

”اب تو ہم نے یہ سوچا ہے کہ ہم اپنے اپنے سپاہیوں کو لے کر نکل جاتے ہیں۔ پھر بیرم خاں جانے اور اس کا کام۔“

”کیا تم نے تردی بیگ کا انجام نہیں دیکھا؟“

”وہ تو بے خبری میں مارا گیا۔“

”یہاں سے نکل کر جاؤ گے کہاں؟“

”ہوسکتا ہے ہم کابل کی راہ لیں۔“

خان زماں ان امیروں کی باتیں سن رہا تھا لیکن صاف لگ رہا تھا کہ ان سے اتفاق نہیں کرنا ہے بالآخر اسے بولنا پڑا۔

''یہ سب باتیں وہ ہیں جن پر عمل کر کے نقصان اٹھاؤ گے۔ تم دربدر ہو جاؤ گے، بیرم خاں تو اپنی جگہ رہے گا۔ اگر ظلِ الٰہی اس پر اتنا بھروسا نہ کرتے تو بات دوسری تھی۔''

''پھر ہم کیا کریں؟''

''ہمیں کسی طرح بیرم خاں کی طرف سے ظلِ الٰہی کو بدگمان کرنا ہوگا اور یہ ایک دن میں نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے وقت کا انتظار کرو۔''

بات پھر وہیں کی وہیں رہ گئی۔ محاصرہ جاری رکھنا پڑا۔

اسی دوران میں خبر ملی کہ اکبر بادشاہ کی والدہ مریم مکانی (حمیدہ بیگم) دوسری بیگمات کے ہمراہ کابل سے ہندوستان تشریف لے آئیں۔ وہ تمام امراء بھی جو مرزا سلیمان کے فساد کو دفع کرنے کے لیے منعم خاں کی امداد کو کابل گئے ہوئے تھے، حمیدہ بیگم کے ہمراہ واپس آگئے تھے۔ اس خبر سے اکبر کو بے حد خوشی ہوئی۔

جب حمیدہ بیگم شاہی لشکر سے ایک منزل کے فاصلے پر پہنچ گئیں تو خود ان کے استقبال کے لیے جانے کا ارادہ کیا۔ یہ خبر بیرم خاں کے مخالفین تک پہنچی تو ان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ان کا خیال تھا کہ اب اکبر محاصرہ اٹھانے کا حکم جاری کردے گا لیکن ہوا اس کے برعکس۔ اکبر نے بیرم خاں کو لشکر میں چھوڑا اور خود ان کے استقبال کے لیے چلا گیا اور اس تاکید کے ساتھ کہ بیرم خاں کا حکم میرا حکم تصور کیا جائے۔

بات پھر وہیں کی وہیں رہ گئی لیکن بیرم خاں کے خلاف سازشیں تیار ہوتی رہیں۔

محاصرے کو چھ ماہ گزر گئے تھے کہ قلعے میں سامانِ رسد کی قلت ہونے لگی۔ بیرم خاں کا اندازہ ٹھیک نکلا۔ سکندر شاہ نے نہایت عاجزی کے ساتھ بادشاہ کی خدمت میں درخواست کی۔

''حضور اپنا کوئی معتبر امیر میرے پاس بھیجیں تاکہ میں اپنا مدعا بیان کر کے شاہی حکم کے مطابق عمل کرسکوں۔''

اکبر نے اس درخواست کے جواب میں اپنے ایک امیر اتکہ خاں کو قلعے میں بھیجا۔ سکندر خاں نہایت عاجزی سے پیش آیا اور اس طرح ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگیا جیسے اکبر کے سامنے ہو۔

''میرے جرائم اتنے زیادہ ہیں کہ بادشاہ کے سامنے جاتے ہوئے مجھے شرم محسوس ہوتی ہے لیکن میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ اپنے فرزند شیخ عبدالرحمٰن کو حضور شاہ میں بھیجوں اور خود بنگال روانہ ہوجاؤں۔ اگر مجھے جانے دیا جائے تو میں اس بات کا عہد کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی بادشاہ کے حلقۂ اطاعت سے باہر قدم نہیں نکالوں گا۔''

اتکہ خاں نے واپس آکر گفتگو کا خلاصہ اکبر کے سامنے پیش کردیا۔

شیخ عبدالرحمٰن، اکبر کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔

اب محاصرے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اکبر نے روانگی کا حکم دیا اور شاہی لشکر نے لاہور جانے کے لیے روانگی اختیار کی۔

ابھی لاہور دور تھا کہ راستے میں اکبر نے محض تفریحِ طبع کے لیے دو ہاتھیوں کو لڑایا۔ بیرم خاں بیماری کے سبب اس تماشے میں شامل نہیں تھا اور اپنے خیمے میں آرام کررہا تھا۔

دونوں دیوقامت ہاتھی ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے آپس میں ٹکرائے۔ دو پہاڑ تھے کہ ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ شور اور نعروں سے میدان گونج رہا تھا۔ ان میں سے ایک ہاتھی ہمت ہار بیٹھا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ دوسرا ہاتھی اس کے تعاقب میں بھاگا اور اتفاق یہ ہوا کہ دونوں ہاتھی بیرم خاں کے خیمے کے نزدیک پہنچ گئے۔ دونوں ہاتھیوں کے مہاوت پیچھے دوڑ رہے تھے لہٰذا اس سے پہلے کہ خیموں کو تہس نہس کرتے، انہوں نے ان ہاتھیوں پر قابو پالیا۔

یہ محض اتفاق تھا مگر سازشیوں کو موقع مل گیا۔ ایک امیر اس کے خیمے میں تیمارداری کے لیے گیا اور مزاج پرسی کے بعد اس واقعے کا ذکر چھیڑ دیا۔

''آپ نے دیکھا کس طرح بادشاہ کے ہاتھی آپ کے خیمے کی طرف دوڑے چلے آئے تھے؟''

''جی ہاں، دیکھا بھی اور یہ شکر بھی بھیجا کہ میں بچ گیا۔''

''آپ کیا سمجھتے ہیں، یہ محض اتفاق تھا؟''

''میں تو یہی سمجھتا ہوں۔''

''جی نہیں۔ گستاخی معاف۔ بادشاہ کے اشارۂ ابرو کے بغیر یہ ممکن نہیں تھا۔''

''آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس میں بادشاہ کی مرضی شامل تھی؟''

''دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں مگر ہمیں کہنے دیجیے کہ ہم یہی سمجھتے ہیں۔''

''ظلِ الٰہی ہم پر اتنے مہربان ہیں کہ آپ تصور بھی نہیں کرسکتے۔''

''وہ تو ہے لیکن بھڑکانے والوں کی بھی کمی نہیں۔ آپ کے خلاف کان بھرے جاتے ہیں۔ بادشاہ کو آپ کے خلاف کیا جارہا ہے جس کا ایک مظاہرہ آپ نے دیکھ بھی لیا۔''

''ہم نے ایسا کیا کردیا ہے کہ لوگ ہمارے خلاف بادشاہ کو بھڑکا رہے ہیں؟''

''بادشاہ کی وہ مہربانیاں جو وہ آپ پر نچھاور کرتے ہیں۔ آپ کو چچا کہتے ہیں، بعض لوگوں پر بہت گراں گزرتی ہیں۔ آپ کی مخالفت کا یہی سبب ہے۔ خصوصاً تردی بیگ کے قتل کو بعض لوگ اب تک نہیں بھولے ہیں۔ انہیں خدشہ ہے کہ اگر آپ رہے تو کل کسی اور کو قتل کرادیں گے۔''

''اس سازش میں کون کون لوگ شامل ہوسکتے ہیں؟''

''حضور رازداری کی قسم اٹھائیں تو ہم بتانے کو تیار ہیں۔''

''آپ اطمینان رکھیں۔ آپ کے نام کسی پر ظاہر نہیں ہونے دوں گا لیکن اپنا دفاع ضرور کروں گا۔''

''شمس الدین محمد خاں اتکہ اس کا ذمے دار ہے۔ اس کے علاوہ شہاب الدین خاں اور احمد خاں نیشاپوری جو ماہم اتکہ کے رشتے دار ہیں، حسد کی آگ میں جل رہے ہیں۔ انہیں جب بھی موقع ملتا ہے آپ کے خلاف بادشاہ کو مشتعل کرتے رہتے ہیں۔ خان زماں علی قلی خاں ان سب کی سربراہی کررہا ہے۔ ہوسکتا ہے یہ واقعہ ان کے بھڑکانے کا ہی نتیجہ ہو۔''

اس کے بعد یہی افراد خان زماں کے پاس پہنچ گئے۔

''تمام باتیں خان خاناں کے کانوں میں ڈال دی ہیں۔ اس کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوگا۔''

''خان خاناں کے دل میں یقیناً بدگمانی آگئی ہوگی۔ بس یہ پودا ذرا جڑ پکڑ لے تو وہ بادشاہ کے سامنے آکھڑا ہوگا اور نقصان اٹھائے گا۔''

''ہم نے یہ باتیں کر تو دی ہیں، کہیں وہ ظلِ الٰہی کے سامنے بیان نہ کردے۔''

''اتنا نادان تو وہ بھی نہیں ہے۔ بس تم یہ باتیں پھیلاتے رہو کہ خان خاناں اکیلے میں بادشاہ کے خلاف باتیں کرتا رہتا ہے۔''

یہی افراد یہاں سے اٹھے تو ماہم اتکہ کے خیمے میں پہنچ گئے۔

''آپ نے کل کا واقعہ دیکھ لیا۔''

''کون سا واقعہ؟''

''ہاتھیوں کی لڑائی کے دوران جو واقعہ پیش آیا تھا۔''

''ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔''

''ہوتا تو رہتا ہے لیکن خانِ خاناں کو یقین ہے کہ یہ سب آپ کے کہنے سے ہوا ہے۔''

''میرے کہنے سے؟ بادشاہ کیا میرے کہنے میں ہے؟''

''خان خاناں سمجھتے ہیں کہ آپ ظلِ الٰہی کے کان بھرتے رہتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے۔''

''آپ لوگ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ خان خاناں یہ سوچ رہے ہیں؟''

''لشکر میں ہر طرف یہی باتیں چل رہی ہیں۔ وہ ہر ملنے والے سے یہی کہہ رہے ہیں۔''

''مجھے ان باتوں کی پروا نہیں کیونکہ میرا دامن صاف ہے۔''

''ہم نے تو آپ کو ہوشیار کردیا ہے۔ خان خاناں آپ کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔''

''میں تردی بیگ نہیں ہوں۔ ویسے کوئی خبر ہو مجھ تک ضرور پہنچانا۔''

یہ لوگ کامران و کامیاب وہاں سے اٹھ آئے۔ انہیں رخصت ہوئے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ خان خاناں کا ایک ملازم انہیں بلانے کے لیے آگیا۔ ابھی جو باتیں ہوئی تھیں ذہن میں تازہ تھیں۔ غصہ ماتھے پر رکھا ہوا تھا۔ گستاخی تھی مگر انہوں نے بہانہ کردیا۔

''ان سے کہنا اب رات بہت ہوگئی ہے جو کچھ کہنا ہے صبح کہیے گا۔ صبح حاضر ہوجاؤں گا۔''

وہ سمجھ رہے تھے کہ کس لیے بلائے گئے ہیں۔ وہ اس غصے کے عالم میں خان خاناں کے سامنے جانا نہیں چاہتے تھے۔ سوچنے کے لیے کچھ وقت بھی درکار تھا۔

خان خاناں تک جب یہ پیغام پہنچا تو اس نے صبح ہونے کا انتظار نہیں کیا اور اسی وقت ایک رقعہ لکھ کر ماہم اتکہ کے پاس بھیج دیا۔

''مجھے علم نہیں کہ میری عقیدت اور اطاعت میں کیا خلل نظر آیا ہے کہ چند بدخواہوں کے بہکانے سے بادشاہ سلامت نے ہاتھیوں کو بازار کی طرف دوڑایا جس سے ہزاروں کو پریشانی اٹھانی پڑی اور اس بے گناہ کی خیمہ گاہ بھی ہاتھیوں کی زد میں آتے آتے رہ گئی۔''

اس پیغام نے ماہم اتکہ کو تازہ دم کردیا۔ جو بات وہ خانِ خاناں کی زبان سے سننا چاہتا تھا، اس پیغام میں لکھ دی گئی تھی۔ وہ اسی وقت تیار ہوا اور پالکی میں بیٹھ کر بادشاہ کے پاس پہنچ گیا۔ وقت نامناسب تھا لیکن اس کے اصرار پر پہرے داروں نے راستہ دے دیا۔

ماہم اتکہ وہی شخص تھا جس نے قلعہ مانکوٹ میں سکندر ..... سے ملاقات کی تھی اور اسے آمادہ کیا تھا کہ وہ بنگالہ چلا جائے اور بادشاہ کی اطاعت کا عہد کرے۔ بادشاہ کو اس کا یہ کارنامہ یاد تھا اور اسی لیے اس کی بہت قدر کرنے لگا تھا۔

ماہم اتکہ نے نہایت تشویش کے اظہار کے ساتھ وہ رقعہ اکبر کو پڑھ کر سنایا۔

”خان بابا (خان خاناں) کو ہماری جانب سے یہ کیسی بدگمانی ہو گئی ہے۔“ اکبر نے کہا۔

ماہم اتکہ کو کہنے کا موقع مل گیا۔

”آپ خود دیکھ لیں۔ حضور تو اس پر اس قدر مہربان رہتے ہیں اور اس کے ساتھ ایسی ایسی عنایتیں کرتے رہتے ہیں اور وہ حضور سے اس قدر بدگمان اور بدظن رہتا ہے۔“

”کوئی بات ضرور ہے ورنہ خان بابا ہم سے بدظن کیسے ہو سکتے ہیں۔“

”اگر کوئی اور کہتا تو مجھے بھی یقین نہ آتا لیکن یہ تو ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا رقعہ ہے۔ اس میں انہوں نے صاف لکھا ہے کہ بادشاہ سلامت نے ہاتھیوں کو بازار کی طرف دوڑا دیا۔“

”یہ بدظنی نہیں بدگمانی ہے۔ ہم ان کی غلط فہمی ضرور دور کریں گے۔ آپ خان بابا کی تسلی کے لیے ان کے پاس جائیں اور ہماری طرف سے یہ پیغام پہنچا دیں کہ ہاتھی تو بس اتفاق سے ادھر نکل گئے تھے۔ فیل بانوں کو آپ جو سزا دینا چاہیں دے دیں۔“

”غلام یہ پیغام ضرور پہنچا دے گا۔“

ماہم اتکہ ایک احساس فخر کے ساتھ تیار ہوا اور خان خاناں کے خیمے پر پہنچ گیا۔ خان خاناں کو اطلاع پہنچی تو اس کے احساس فخر نے سر اٹھایا۔ اس نے ملنے سے انکار کر دیا۔

”یہ کوئی وقت ہے ملاقات کا۔ صبح اگر میں نے چاہا تو ملنے آ جانا۔“

یہ صاف انکار تھا لیکن ماہم اتکہ کے ہاتھ میں بادشاہ کی سفارش رقعے کی صورت میں دبی ہوئی تھی۔ اس نے پہرے داروں سے سختی سے کہا۔

”ان سے کہنا، آپ کے نام بادشاہ سلامت کا اہم پیغام ہے۔ جو کہا جا رہا ہے وہ کرو۔ اپنے آقا تک یہ پیغام پہنچا دو۔ اس کے بعد وہ جو کہیں ان کی مرضی۔“

خان خاناں تک یہ پیغام پہنچا تو وہ نرم پڑ گیا۔ حالات خوشگوار نہیں ہیں۔ کیا خبر کیا پیغام ہو۔ اس نے اپنا غصہ ایک طرف رکھا اور ماہم اتکہ کو باریابی کی اجازت دے دی۔

خان خاناں اس کے سامنے ضرور آیا لیکن بے التفاتی کے ساتھ۔

”ہم ماہم اتکہ سے نہیں بادشاہ کے پیغام سے ملاقات کر رہے ہیں۔ کہو کیا پیغام لائے ہو؟“

”ظل الٰہی نے کہلوایا ہے کہ ہاتھی تو بس اتفاق سے ادھر نکل گئے تھے۔ آپ اپنے دل میں ملال کو جگہ نہ دیں۔ بدگمانی دور کریں۔ فیل بانوں کو آپ جو سزا دینا چاہیں دے دیں۔ آپ بااختیار ہیں۔“

”ان غریبوں کو ہم کیا سزا دیں گے۔ بادشاہ سلامت سے عرض کیجیے گا، ہماری بدگمانی جاتی رہی۔ یہ کوئی اور ہی قصہ ہے جسے ہم بعد میں ملاحظہ کریں گے۔“

ماہم اتکہ نے رخصتی کے لیے مصافحہ کیا اور باہر نکل آیا۔ فضا ایسی نہیں تھی کہ کوئی اور بات کی جاتی۔

اس واقعے کے بعد شاہی لشکر نے پھر سفر کا آغاز کیا اور لاہور پہنچ گیا۔ لاہور پہنچ کر جب خان خاناں کی طبیعت کچھ بحال ہوئی تو اس نے ماہم اتکہ کے سامنے پھر یہ ذکر چھیڑ دیا اور کہا۔

”اکبر بادشاہ سے جو بے مہری ظاہر ہوئی ہے، وہ تمہاری خباثت کا نتیجہ ہے۔“

ایسے برہنہ الفاظ سن کر ماہم اتکہ پریشان ہو گیا۔ اس نے اپنی صفائی میں بہت کچھ کہا اور جب اس سے بھی خان خاناں کی تشفی نہ ہوئی تو اس نے اپنے سب بیٹوں کو بلایا اور قرآن کریم کی قسم کھا کر خان خاناں کے شبہے کو اس کے دل سے دور کیا۔

”مجھے کسی نے یہی بتایا تھا کہ اس میں تمہاری نیت کا دخل تھا۔ میں نے تمہیں دل سے معاف کیا لیکن خان زماں کا کانٹا اب بھی دل میں کھٹک رہا ہے۔“

”میں کیا عرض کر سکتا ہوں لیکن مجھے ان خیالات سے دور ہی رکھیے۔“

”آپ بھی کوشش کیجیے گا کہ ان معاملات سے دور رہیں۔“

شاہی لشکر کو اب لاہور کی طرف روانہ ہونا تھا۔

خان خاناں کا دل ماہم اتکہ کی طرف سے تو صاف ہو گیا تھا لیکن بعض امراء کے کہے ہوئے یہ الفاظ اب بھی اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ ”تمام سازشیوں کی سربراہی خان زماں کر رہا ہے۔“

یہی حال خان زماں کا تھا۔ اسے بھی اپنی بہادری اور تدبیر سازی پر ناز تھا۔ خان خاناں اس کے بارے میں اپنے حلقہ بگوشوں کے سامنے جن خیالات کا اظہار کرتا رہتا تھا، وہ مزید رنگ آمیزی کے ساتھ خان زماں تک پہنچ جاتے تھے لیکن وہ کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا تھا کیونکہ بادشاہ کا دستِ شفقت ابھی تک خان خاناں کے سر پر تھا۔

خان خاناں کو یہ ہرگز گوارا نہیں تھا کہ وہ لاہور سے دہلی تک کے سفر میں لشکر کے ہمراہ ہو لہٰذا اس نے مشورہ دیا

کہ خان زماں کو ہراول بنا کر آگے بھیج دیا جائے۔

عام حالات میں یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہ ہوتی لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ خان خاناں کے مشورے سے ہوا ہے تو وہ دانت پیس کر رہ گیا۔ اب اس نے اپنے آدمیوں سے صاف کہہ دیا کہ جب بھی خلوت نصیب ہو، بادشاہ کو خان خانان کے خلاف بھڑکایا جائے۔

خان خاناں کا حال بھی مختلف نہیں تھا۔ وہ بھی موقع کی تاک میں تھا کہ کوئی کمزوری ملے تو وہ خان زماں کو اس کے منصب سے ہٹائے۔ دونوں پہلوان داؤ لگانے کی تیاری میں تھے۔

ابھی یہ لشکر جالندھر کے قریب پہنچا تھا کہ اکبر نے پڑاؤ ڈال دیا۔ سب حیران تھے کہ پڑاؤ کا یہ کون سا مقام اور موقع ہے۔ خود بیرم خاں کو معلوم نہیں تھا کہ اکبر کے دل میں کیا ہے۔ یہ عقدہ تو اس وقت کھلا جب اکبر نے اسے طلب نہیں کیا بلکہ خود ملنے آیا۔ یہ بات خود حیرت کی تھی۔ بیرم خاں خان خاناں نے کچھ نہیں تو آدھے کوس دور جا کر اس کا استقبال کیا اور نہایت احترام سے اپنے خیمے تک لایا۔

”آپ نے مجھے طلب فرمایا ہوتا۔ حضور نے کیوں زحمت فرمائی۔“

”بات اب رشتے داری کی ہے، آپ اور حضور کی نہیں۔“

”حضور کا کلام بلاغت نظام، غلام کی فہم سے باہر ہے۔“

”ہم چاہتے ہیں مرزا نور الدین محمد کی دختر ارجمند سلیمہ سلطان بیگم کا عقد مبارک آپ سے ہو جائے۔“

”میں اس اعزاز کا مستحق نہیں لیکن آپ کے حکم کو ٹالنا میرا شیوہ نہیں رہا ہے۔“

”یہ شادی اسی مقام پر ہوگی اور نہایت دھوم دھام سے ہوگی۔“

مرزا نور الدین محمد ہمایوں بادشاہ کا بھانجا تھا۔ سلیمہ سلطان بیگم حسن صورت اور حسن سیرت میں ممتاز تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہمایوں بادشاہ نے اپنی بادشاہی کے زمانے میں ہی سلیمہ سلطان کو بیرم خاں سے منسوب کر دیا تھا۔

خان خاناں نے شاہانہ جشن ترتیب دے کر اکبر سے شرکت کی درخواست کی۔ اکبر بادشاہ نے شرکت کر کے اس جشن کو رشکِ جنت بنا دیا۔

یہ رشتہ بادشاہ کے عزیزوں اور چغتائی امیروں کے لیے حسد کا باعث بن گیا۔ خان خاناں کے مخالفین میں مزید اضافہ ہو گیا۔ یہاں تک کہا جانے لگا کہ بادشاہ نے اپنی بادشاہت فروخت کر دی ہے جبکہ اکبر اپنے باپ ہمایوں کی وصیت کو پیش نظر رکھے ہوئے تھا اور خان خاناں کو ”خان بابا“ کے نام سے یاد رکھتا تھا۔ وہ جب تخت نشیں ہوا تھا، اس کی عمر تقریباً چودہ سال تھی لہٰذا اکبر نے اسے وکالت، اتالیقی اور سپہ سالاری کے عہدوں کے ساتھ ساتھ سارے اختیارات، ملک کا دروبست، سزا، بخشش، معزولی، تقرری غرض سارے معاملات اس کے سپرد کر دیے تھے۔

اسی لیے امراء کی بڑی تعداد خان خاناں کی مخالفت پر اتر آئی تھی۔ اس شادی کے بعد تو چغتائی امیروں کے حسد کی انتہا نہ رہی تھی۔ ان سب میں دکن کا ایک بوڑھا عالم ملا پیر محمد پیش پیش تھا۔ ان احسانات کو بھول گیا تھا جو خان خاناں نے اس پر کیے تھے۔ وہ نظام شاہی دربار میں تھا۔ وہاں سے جلاوطن ہو کر بیرم خاں (خان خاناں) کے پاس آیا جس نے اسے کتب خانے کا داروغہ مقرر کر دیا۔ بیرم خاں کی کوششوں ہی سے امارت کا منصب ملا اور اب اس شادی کی زبردست مخالفت کر رہا تھا۔

علی قلی خاں (خان زماں) بطور ہراول روانہ ہو کر دہلی پہنچ چکا تھا۔ دہلی پہنچتے ہی یہ خبر اس پر بجلی بن کر گری کہ خان خاناں اور اکبر کے تعلقات رشتے داری میں بدل گئے ہیں۔ وہ پہلے ہی نالاں تھا اب اور بدظن ہو گیا۔ اس نے قسم کھائی کہ وہ بیرم خاں کو اس کے منصب پر برقرار نہیں رہنے دے گا۔

اکبر بادشاہ دہلی پہنچا اور رعایا پروری و لشکر نوازی میں مشغول ہو گیا۔ خان خاناں کی قدر و منزلت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ ہفتے میں دو مرتبہ اعیانِ مملکت اور ارکانِ دولت کے ساتھ دیوان خانہ عالی میں آتا اور بادشاہ کو مشوروں سے نوازتا۔ اس کے مشوروں کے طفیل عدل و مرحمت کا دور دورہ ہوا۔

حالات کی رفتار یہ تھی کہ ایک نیا شگوفہ پھوٹا جس نے خان خاناں کے ہاتھ مضبوط کر دیے۔ وہ موقع ہاتھ آ گیا جس کی وہ تلاش میں تھا۔

ایک ساربان کا لڑکا جس کا نام شاہم بیگ تھا، حسین و جمیل بھی تھا اور شانِ دلیری بھی رکھتا تھا۔ اکبر بادشاہ کے قورچیوں (سلاحداروں) میں شامل تھا۔ ایک روز خان زماں کی نظر اس لڑکے پر پڑ گئی اور وہ اسے دل دے بیٹھا۔ اٹھتے بیٹھتے اس کا دم بھرنے لگا۔ بے تاب و بے قرار اتنا تھا کہ اپنے اس عشق کو چھپا ہی نہ سکا یا پھر یہ تھا کہ عشق اور مشک کبھی چھپائے نہیں چھپتا۔ ہر دم آہیں بھرتا اور شاہم بیگ سے ملنے کی تدبیریں سوچتا رہتا۔ اس کے قریبی لوگوں کو

معلوم ہوا تو انہوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن دیوانہ کب کسی کی سنتا ہے۔ اسے جتنا سمجھایا جاتا، اس کی آتشِ شوق اتنی ہی بھڑکتی چنانچہ بعض ہمدردوں نے سوچا کہ اس ہجر کو وصال میں تبدیل کردیا جائے۔ کسی طرح دونوں کی ملاقات کرادی جائے۔ بہت سے لوگ انعام کے لالچ میں آگے آئے۔ خان زماں نے اپنی پسند کے مطابق ایک ملازم کو شاہم بیگ کے پاس بھیجا۔ اس ملازم نے خفیہ طور پر شاہم سے ملاقات کی اور خان زماں کی حالتِ زار کو بیان کیا۔ انعام واکرام کا لالچ بھی دیا۔

''ذرا سوچو جس کی پسندیدگی عشق میں تبدیل ہوگئی ہو وہ تمہارے ساتھ کیسا اعلیٰ سلوک کرے گا۔ تمہیں سونے میں تول دے گا۔ تمہاری زندگی بن جائے گی۔ حکومت کرو گے حکومت۔''

شاہم بیگ ان باتوں سے متاثر تو ضرور ہوا لیکن اسے اکبر کی طرف سے خوف بھی تھا۔

''کیا ظلِ الٰہی میری اس گستاخی کو معاف کردیں گے کہ میں ان کی ملازمت چھوڑ کر خان زماں کے پاس چلا گیا؟''

''اس کی تم فکر مت کرو۔ یہ بات ہوچکی ہے۔ خان زماں اتنا اثر رسوخ رکھتے ہیں کہ وہ تمہارا قصور معاف کرادیں گے۔ بادشاہ سلامت ایک معمولی ملازم کے لیے زیادہ ضد نہیں کریں گے۔''

''اگر ایسا ہی ہے تو خان زماں ظلِ الٰہی کے علم میں لاکر مجھے اپنے پاس کیوں نہیں بلا لیتے؟''

''اس میں قباحت یہ ہے کہ اگر اس وقت بادشاہ نے انکار کردیا تو ان کے انکار کو اقرار میں نہیں بدلا جاسکے گا۔ لیکن جب تم خان زماں کے پاس پہنچ ہی جاؤ گے تو پھر انکار کی گنجائش نہیں رہے گی۔''

وہ کچھ اس طرح سے رام ہوا کہ خان زماں کی پیشکش کو قبول کرتے ہوئے اس کے پاس پہنچنے کا وعدہ کرلیا اور ایک رات کسی طرح خان زماں کے پاس پہنچ ہی گیا۔

خان زماں اس کے عشق میں ایسا اندھا ہوگیا تھا کہ اکبر کا خیال تو کیا آتا، خان خاناں کا خوف بھی اس کے دل سے جاتا رہا۔ اسے سوچنا چاہیے تھا کہ خان خاناں اس واقعے کو سامنے رکھ کر اس کے خلاف کوئی نہ کوئی قدم ضرور اٹھائے گا۔

بیرم خاں (خان خاناں) اس طرح شاہم بیگ کے غائب ہوجانے پر فکرمند تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ کوئی اہم شخصیت تھی بلکہ اس لیے کہ اسے خان زماں پر شک ہوگیا تھا۔ بعض گھر کے بھیدیوں نے پکی خبر دی تھی کہ خان زماں، شاہم بیگ کو معشوق بنا کر رکھے ہوئے ہے۔ ہر وقت اس سے ہم آغوش رہتا ہے۔ جس طرح سلاطین کے سامنے تواضع وانکسار کا اظہار ہوتا ہے، اسی طرح اس کی تعظیم بجالاتا ہے۔ اسے مسند پر بٹھاتا ہے اور خود دست بستہ اس کے سامنے کھڑا ہوکر بادشاہم بادشاہم (میرے بادشاہ، میرے بادشاہ) کہتا رہتا ہے۔

خان خاناں کو جب مکمل یقین ہوگیا کہ شاہم بیگ، خان زماں کے پاس ہے اور خلوت کا ساتھی بنا ہوا ہے تو وہ بادشاہ کے پاس پہنچ گیا اور نہایت سلیقے سے بات شروع کردی۔

''بادشاہ آپ ہیں یا کوئی اور؟''

''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔''

''اگر کوئی آپ کے علاوہ کسی اور کو بادشاہ تسلیم کرے اور مانے اور اس کا اظہار بھی کرے؟''

''اسے غدار سمجھا جائے گا۔''

''غدار کی سزا؟''

''موت۔''

''آپ کی سلطنت میں بلکہ آپ کے امیروں میں ایک ایسا بھی ہے جو آپ کے ایک غلام کو مسند پر بٹھاتا ہے، خود ہاتھ باندھ کر اس کے سامنے کھڑا رہتا ہے اور بادشاہم، بادشاہم کہتا ہے۔''

''کون ہے وہ شخص اور کون ہے وہ امیر؟''

''علی قلی خاں (خان زماں) نے آپ کے ایک سلاح دار شاہم بیگ کو اپنے پاس بلالیا ہے اور اسے معشوق بنا کر رکھا ہوا ہے۔ اسے سامنے بٹھاتا ہے اور بادشاہم بادشاہم کے نعرے بلند کرتا ہے۔''

''اگر یہ سچ ہے تو علی قلی کے دو جرم ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس نے میری اجازت کے بغیر میرے ملازم کو اپنے پاس بلایا۔ دوسرا جرم یہ ہے کہ ایسی بےحیائی کا کام کرتا ہے۔''

تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ خان خاناں اپنی بات میں درست ہے۔ اکبر نے فوراً خان زماں کے نام ایک فرمان صادر کیا۔

''شاہم کو بادشاہ کی درگاہ میں بھیج دو۔ اگر اس کے بھیجنے میں تم نے تاخیر کی تو سزا کے مستحق قرار پاؤ گے۔'' اس مختصر سے فرمان میں بہت کچھ چھپا ہوا تھا۔ خان زماں سر سے پاؤں تک کانپ گیا لیکن شاہم کو بھیجنے پر پھر بھی تیار نہیں تھا۔

حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

آخری معرکہ -/550

اندھیری رات کے مسافر -/475

ثقافت کی تلاش -/300

[illegible] -/625

اور تلوار ٹوٹ گئی -/550

گمشدہ قافلے -/500

داستانِ مجاہد -/300

پردیسی درخت -/450

یوسف بن تاشفین -/500

جہانگیر بکس

معظم علی -/475

خاک اور خون -/550

کلیسا اور آگ -/450

قافلۂ حجاز -/599

محمد بن قاسم -/425

پورس کے ہاتھی -/300

انسان اور دیوتا -/450

پاکستان سے دیارِ حرم تک -/300

آخری چٹان -/450

سو سال بعد -/225

سفید جزیرہ -/325

شاہین -/475

سبق آموز کتب سلسلہ

دو رنگی طباعت اور تصویری خاکوں سے مزین



اقوالِ حضرت علی المرتضیٰؓ -/165

اقوالِ آئمہ کرامؒ -/165

حکایاتِ گلستانِ سعدیؒ -/195

اقوالِ شیخ سعدیؒ -/140

حکایاتِ رومیؒ -/180

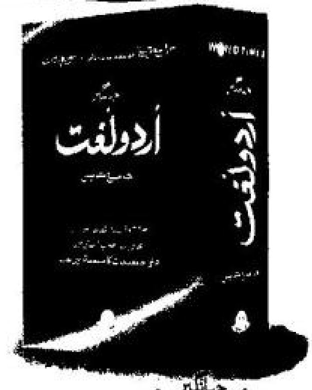
دلچسپ و عجیب حقائق -/170

حکایاتِ بوستانِ سعدیؒ -/199

دلچسپ و حیرت انگیز باتیں -/150

ایمان افروز و سبق آموز سچے واقعات -/180

بڑے لوگوں کے روشن واقعات -/165



جہانگیر اردو لغت (جامع ترین)

جہانگیر بک ڈپو

042-35757086 022-2780128

021-32765086 051-5539609 042-37220879

اسے یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ اکبر نے اس فرمان کے ساتھ ہی بعض امراء کے نام فرامین جاری کردیے ہیں کہ اگر خان زماں شاہم کے بھیجنے میں تاخیر کرے تو اس کے سر پر پہنچ کر اس کی نافرمانی کا مزہ چکھاؤ۔

خان زماں برابر اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ کسی طرح بادشاہ کے غصے کو ٹھنڈا کردے اور شاہم کو اپنے پاس رکھ سکے۔ اس نے اپنے ایک معتمد برج علی کو بارگاہِ شاہی میں بھیجا کہ شاید کام بن جائے۔ برج علی نے صحیح یا غلط یہ فیصلہ کیا کہ بادشاہ سے پہلے ملا پیر محمد سے ملا جائے۔ بادشاہ چونکہ اس پر بہت مہربان ہے۔ وہ اگر سفارش کردے گا تو کام بن جائے گا۔ وہ ملا پیر محمد سے ملا اور خان زماں کا پیغام پہنچایا۔ دورانِ گفتگو کچھ ایسی باتیں ہوئیں کہ پیر محمد کو غصہ آگیا۔ اپنے آدمیوں سے کہا کہ اس کو قلعے کے برج سے نیچے پھنکوا کر قتل کردو۔ اس کے آدمیوں نے برج علی کو قلعے کے برج سے نیچے پھینک کر اس کا کام تمام کردیا۔

اس قتل کی خبر جب خان زماں تک پہنچی تو وہ سمجھ گیا کہ بادشاہ کا موڈ اس وقت بہت بگڑا ہوا ہے۔ اس کے دشمن شاہم کے قصے کو بہانہ بنا کر اس کا کام تمام کرنا چاہتے ہیں۔ اسے شاہم کی جدائی گوارا نہیں تھی لیکن اب مفارقت کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اس نے شاہم بیگ کو بلایا اور اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"میرے بادشاہ! اب اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہیں ہے کہ ہم ایک دوسرے سے کچھ عرصے کے لیے علیحدہ ہوجائیں۔ جب بادشاہ میری خطاؤں کو معاف کردے گا تو تیری خطاؤں کی معافی کی درخواست کروں گا۔ حالات ٹھیک ہوتے ہی میں تجھے بلالوں گا۔"

"مجھے آپ دربدر بھٹکنے کے لیے کہاں بھیج رہے ہیں۔ میرا اور کہاں ٹھکانا ہے۔"

"اگر میں تجھے جانے کے لیے کہہ رہا ہوں تو کوئی ٹھکانا بھی ضرور ڈھونڈا ہوگا۔ جب تک معاملات درست نہیں ہوجاتے تم عبدالرحمٰن کی جاگیر پر جا کر رہو گے۔"

شاہم بیگ کے لیے عبدالرحمٰن اجنبی نہیں تھا۔ شاہم بیگ ہی کے ذریعے عبدالرحمٰن نے یہ ترقی کی تھی۔ جب شاہم بیگ کو یقین ہوگیا کہ اسے جانا ہوگا تو اس کی اصلیت سامنے آگئی۔

خان زماں کے پاس ایک طوائف آرام جاں کے نام سے رہتی تھی۔ پس پردہ شاہم بیگ سے بھی اس کے تعلقات ہوگئے تھے جو اب ظاہر ہوئے۔ شاہم بیگ نے اسے مانگ لیا اور اپنے ساتھ لے جانا چاہا۔ خان زماں اس کی کسی فرمائش کو ٹال نہیں سکتا تھا اور اس وقت تو مسئلہ اس سے جان چھڑانے کا تھا۔ اس نے آرام جاں کو اس کے حوالے کردیا۔

شاہم بیگ، خان زماں سے رخصت ہوا اور عبدالرحمٰن کی جاگیر پر پہنچ گیا۔ عبدالرحمٰن نے قدیمی تعلقات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی پذیرائی کی۔ آرام جاں اس کے ساتھ تھی۔

کچھ دن تو شاہم بیگ اور آرام جاں دونوں مزے لوٹتے رہے لیکن ہوس کی آندھی جلد ہی تھم بھی گئی۔ شاہم بیگ نے کسی کمزور لمحے میں یا عبدالرحمٰن کو ضرورت سے زیادہ خوش کرنے کے لیے آرام جاں کو اس کے حوالے کردیا۔ وہ عورت طوائف تو تھی ہی اسے تبادلہ بازیوں پر کیا اعتراض ہوسکتا تھا؛ وہ عبدالرحمٰن کے پاس چلی گئی لیکن عبدالرحمٰن نے اسے غیر شرعی طریقے سے اپنے پاس رکھنے کے بجائے اس سے نکاح کرلیا۔

بیرم خاں نے اکبر کے سامنے شاہم بیگ کی حوالگی کا پھر ذکر کیا۔ اکبر نے اپنے امیروں کو بھیج کر خان زماں کو بلالیا اور اس سے شاہم بیگ کے بارے میں معلوم کیا۔

"کیا تمہیں نہیں معلوم کہ ہم نے شاہم بیگ کی حوالگی کا مطالبہ کیا تھا؟"

"اس فرمان کو میں نے آنکھوں سے لگایا تھا۔"

"اس پر عمل کیوں نہیں ہوا؟ شاہم بیگ ابھی تک ہمارے پاس نہیں پہنچا۔"

"ظلِ الٰہی! وہ تو اب میرے پاس بھی نہیں۔ میں نے اسے آپ کے فرمان سے آگاہ بھی کردیا تھا۔ وہ حضور شاہ میں معافی کے لیے تیار بھی ہوگیا تھا لیکن بعد میں مجھ پر کھلا کہ اس نے مجھے مطمئن کرنے کے لیے رضامندی ظاہر کی تھی۔ رات کے کسی حصے میں وہ میرے پاس سے فرار ہوگیا۔ پھر اس کا کچھ پتا نہیں چلا کہ زمین کھا گئی یا آسمان۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میرے کسی دشمن نے اسے ٹھکانے لگادیا ہو یا اس نے خود ہی حضور کے عتاب کے خوف سے کسی دریا میں چھلانگ لگالی ہو یا ممکن ہے زندہ ہو اور جنگلوں کی خاک چھانتا پھر رہا ہو۔ میرے آدمی برابر اسے تلاش کررہے ہیں۔ جیسے ہی ہاتھ آیا حضور کے روبرو پیش کردوں گا۔"

"اسے تو ہم خود بھی تلاش کرہی لیں گے لیکن قصور تمہارا بھی ہے۔"

"بے شک خطا کا پتلا ہوں۔ بہت سے قصور ہوئے ہوں گے۔"

"یہ قصور بہت بڑا ہے کہ آپ نے ہماری اجازت کے بغیر شاہم بیگ کو اپنے پاس بلایا۔"

"حضور کے پاس غلاموں کی کمی نہیں۔"

"بات نافرمانی کی ہے۔"

"حضور کے غلام حضور کی چشم پوشیوں پر ہی تو اتراتے ہیں۔"

وہ ایسا چرب زبان تھا کہ اپنی باتوں سے اکبر کو شیشے میں اتار لیا۔ اس گفتگو میں ملا پیر محمد بھی موجود تھا جو بیرم خاں کی مخالفت کی وجہ سے خان زماں کو عزیز رکھتا تھا، اس نے بھی سفارش کی اور خان زماں کی جان چھوٹ گئی۔

بیرم خاں ان دنوں آگرہ گیا ہوا تھا ورنہ شاید یہ معاملہ اتنی آسانی سے طے نہ ہوتا۔ وہ واپس آیا تو اسے معلوم ہوا لیکن اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ بادشاہ کی زبان سے جو الفاظ ادا ہوگئے تھے، واپس نہیں ہوسکتے تھے۔ اس کے قریبی حلقوں نے اس واقعے کو خوب نمک مرچ لگا کر بیان کیا اور یہ ثابت کردیا کہ ملا پیر محمد کی بھرپور سفارش نہ ہوتی تو بادشاہ کبھی نرم نہ پڑتا۔ اس کے دل میں ملا پیر محمد کی طرف سے ایسی گرہ پڑی کہ آخر وقت تک نہ نکل سکی۔

خان زماں سے اس کے تعلقات بدستور کشیدہ تھے۔

☆☆☆

شاہم بیگ نے اس طوائف آرام جاں کو عبدالرحمٰن کے حوالے ضرور کردیا تھا لیکن کچھ دنوں بعد ہی اس کی ہرجائی طبیعت نے شور مچایا اور اسے پچھتاوا ہونے لگا۔ عبدالرحمٰن نے بھی احتیاط سے کام نہیں لیا۔ شاہم بیگ پہلے کی طرح اس کے مکان پر آتا جاتا رہا۔ اس میل جول نے دونوں میں آتشِ شوق کو بھڑکا دیا۔ چلمنوں کے پیچھے، جھروکوں کی آڑ سے اشارے بازیاں شروع ہوگئیں۔ عورت تو طوائف تھی ہی شاہم بیگ نے بھی کچھ خیال نہ کیا۔ شاہم بیگ جب بھی آتا، آرام جاں بن سنور کر کسی نہ کسی جھروکے سے اپنا دیدار کرادیتی۔ اشاروں اشاروں میں بتاتی کہ وہ اب بھی اس کی محبت کا دم بھرتی ہے۔ وہ بھی آہیں بھرتا اور چلا جاتا۔ عبدالرحمٰن اس کی نیت سے بے خبر اس کی خاطرداری میں لگا رہتا تھا۔

ایک دن شراب کا دور چل رہا تھا۔ جب نشہ خوب ہوگیا تو شاہم بیگ کو آرام جاں کی یاد آگئی۔

"عبدالرحمٰن! اگر اس وقت آرام جاں بھی ہو تو نشہ دوبالا ہوجائے۔"

"شاہم بیگ! اب تو کہہ دیا ہے اگر اب یہ الفاظ تمہاری زبان پر آئے تو میں دوستی کو ایک طرف رکھ دوں گا۔"

"میں نے ایسا کیا کہہ دیا۔ یہی کہا نا......"

"پھر وہی۔" عبدالرحمٰن نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "تم اس وقت نشے میں ہو۔ یہاں سے چلے جاؤ۔"

"مت بھولو کہ آرام جاں کو میں نے ہی تمہیں بخشا ہے۔"

"وہ میری رکھیل نہیں میری منکوحہ ہے۔"

"میں کون سا ہمیشہ کے لیے کہہ رہا ہوں۔ بس کچھ دیر کے لیے یہاں بلالو۔"

"ہرگز نہیں۔ وہ اب میری بیوی ہے۔ کسی کا دل بہلانے کے لیے نہیں۔"

"یہ جاگیر جس پر تم اترا رہے ہو، میری وجہ سے تمہیں ملی ہے۔"

"میرے اس احسان کو مانو کہ میں نے تمہیں پناہ دی ہے۔ اگر آج میں تمہیں یہاں سے نکال دوں تو اکبر کی فوجیں تمہاری تکا بوٹی کردیں۔"

"تم مجھے نکالو گے؟ میں تمہیں نکالوں گا۔" شاہم بیگ نے کہا اور قریب رکھی تلوار نیام سے باہر کرلی۔ عبدالرحمٰن نے بھی جواب میں تلوار نکال لی۔

خان زماں نے شاہم بیگ کو یہاں پہنچانے کے لیے سواروں کا ایک دستہ ہمراہ کردیا تھا۔ شور سن کر وہ سوار اوپر آگئے اور شاہم بیگ کے حکم پر عبدالرحمٰن کو گرفتار کرکے باندھ دیا اور اس کی بڑی بے حرمتی کی۔

اس ہنگامے کی اطلاع جب موید بیگ کو ہوئی جو ایک روایت کے مطابق عبدالرحمٰن کا باپ اور دوسری کے لحاظ سے اس کا بڑا بھائی تھا تو اس نے اوباشوں کی ایک جماعت کو ساتھ لیا اور مقابلے پر آگیا۔ شاہم بیگ کے آدمیوں سے ان کی خوب جم کر لڑائی ہوئی۔ اس لڑائی میں شاہم بیگ کو ایک تیر ایسا لگا کہ وہ اسی وقت ختم ہوگیا۔ شاہم بیگ کے ساتھ آئے ہوئے سوار اب لڑ کر کیا کرتے۔ انہوں نے مردہ شاہم بیگ کو اٹھایا اور وہاں سے چلے گئے۔ اب انہیں اس کی لاش لے کر خان زماں کے پاس جانا تھا۔

واقعہ تو پیش آگیا لیکن اب عبدالرحمٰن خوف زدہ ہوا کہ خان زماں بدلہ لینے ضرور پہنچے گا۔ وہ وہاں سے بھاگا اور ملا پیر محمد کے پاس بھاگ کر پناہ گزیں ہوگیا۔ پیر محمد اس وقت وکیل مطلق تھا۔ تمام ملکی امور میں اس کی طرف رجوع کیا

جاتا تھا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ارکانِ دولت اور اعیانِ شاہی کی جائے پناہ بن گیا تھا۔ عبدالرحمٰن اور اس کے بھائی کو امید تھی کہ خان خاناں کی مخالفت کے سبب وہ ان کی مدد کرے گا تاکہ خان خاناں اس واقعے کو بہانہ بنا کر خان زماں سے انتقام نہ لے سکے۔

یہ سیاسی پینترے بڑی خوش اسلوبی سے طے ہو رہے تھے۔

خان زماں کو جب اپنے محبوب کے قتل ہونے کی اطلاع ملی تو وہ آتشِ انتقام سے بھڑک اٹھا۔ عقل اور دوراندیشی کو پرے پھینکا اور ان دونوں بھائیوں کے قتل کا ارادہ کر کے روانہ ہوگیا۔ جب وہ دریائے گنگا کے کنارے پہنچا تو معلوم ہوا کہ عبدالرحمٰن ایک روز پہلے ہی دریا پار کر گیا۔

وہ مایوس۔۔۔لوٹ آیا۔

کچھ دنوں بعد اسے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ دونوں بھائی ملا پیر محمد کے پاس ہیں۔ ادھر پیر محمد نے انہیں بادشاہ کے سامنے پیش کر دیا اور یہ کہہ کر انہیں معافی دلوا دی کہ شاہم بیگ آپ کا مفرور تھا۔ اگر آپ کے ہاتھ لگ جاتا تو آپ بھی یہی کرتے جو ان دونوں بھائیوں نے غیرت کے نام پر کیا۔

اب خان خاناں بھی ملا پیر محمد کا ہمنوا بن گیا کیونکہ اگر عبدالرحمٰن شاہی عتاب میں آتا تو خان زماں کا مقصد پورا ہو جاتا۔ وہ بھی تو یہی چاہتا تھا کہ عبدالرحمٰن سے شاہم بیگ کا بدلہ لے۔ اب شاہم بیگ بھی قتل ہوگیا تھا اور عبدالرحمٰن بھی بچ نکلا تھا۔ یہی خان خاناں کی فتح تھی بلکہ اس نے تو ایک قدم آگے بڑھ کر خان زماں کو اپنے پاس بلا کر اسے سمجھایا اور یہ قصہ یہیں رفع دفع کرا دیا۔

خان زماں نے بھی مصلحت اسی میں جانی کہ اس وقت چپ سادھ لے۔

خان خاناں کی طرف سے اس کے دل میں کانٹا اب بھی کھٹک رہا تھا۔ ملا پیر محمد اور خان زماں کی خوب گاڑھی چھن رہی تھی۔ خفیہ ملاقاتیں بھی ہو رہی تھیں۔ پیر محمد اسے ہر ملاقات میں تسلیاں دے رہا تھا۔

”خان خاناں ایک مضبوط ستون ہے۔ اسے گرانے کے لیے جذبات کی نہیں عقل کی ضرورت ہے۔ میں تو کسی ایسے موقع کی تلاش میں ہوں جب بادشاہ کا دل اس کی طرف سے بالکل ہی پھر جائے۔ میں نے ظلِ الٰہی کی طبیعت پر بہت حد تک قابو پالیا ہے۔ خان خاناں بھی مجھے اپنا دوست ہی سمجھنے لگا ہے۔ میں اس کا وکیلِ مطلق ہوں۔ یہ میری ہی کوشش کا نتیجہ تھا کہ خان خاناں تمہیں اپنے پاس بلانے اور تمہیں سمجھانے پر مجبور ہوگیا ورنہ وہ تو یہ چاہتا تھا کہ شاہم بیگ کے قتل تک بات نہ ٹھہرے بلکہ تمہیں بھی تمہارے عہدے سے ہٹانے کی کوشش کرے۔ تم دیکھتے جاؤ، میں اسے غلط مشورے دے کر بادشاہ کی نظروں سے گرا دوں گا۔“

پیر محمد کو بہت جلد یہ موقع مل بھی گیا۔ ایک شخص مصاحب بیگ جو دربار میں اپنے موروثی تقرب کی وجہ سے بہت نازاں رہتا تھا۔ خان خاناں کا ملازم تھا لیکن اس میں ملازموں والی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ دوسروں کا تو کیا ذکر، خان خاناں تک کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ پیر محمد نے اس سے راہ و رسم پیدا کی اور اسے خان خاناں کی طرف سے برگشتہ کرنا شروع کر دیا۔ اس کی جانب سے ایسی رنگ آمیزی کی کہ وہ خان خاناں کے خلاف ہوگیا۔

دوسری جانب پیر محمد نے اس کی طرف سے خان خاناں کے کان بھرنے شروع کیے۔ مصاحب بیگ تمہارے خلاف یہ بات کر رہا تھا، فلاں جگہ بیٹھ کر یہ کہہ رہا تھا۔

اس طرح چڑھانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مصاحب بیگ، خان خاناں کے ساتھ گستاخی سے پیش آنے لگا۔ خان خاناں نے بارہا اسے ٹوکا لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ پیر محمد نے ایک روز خان خاناں کو اعتماد میں لے کر بتایا کہ ہوشیار ہو جاؤ، مصاحب بیگ تمہارے قتل کا ارادہ کر رہا ہے۔ اس سے پہلے تم اسے قتل کرا دو ورنہ اس کا داؤ چل جائے گا۔ یہ بات کچھ اس انداز میں کہی گئی کہ خان خاناں کو یقین آ گیا۔ پیر محمد نے دو تین جھوٹے گواہ بھی پیش کر دیے اور اس طرح خان خاناں کو اس کے قتل پر آمادہ کر لیا۔ اس نے مصاحب بیگ کو دھوکے سے بلایا اور قتل کرا دیا۔

یہ واقعہ امراء کے درمیان تنازع کا سبب بن گیا۔ خود اکبر کو بھی مصاحب بیگ کی موت پر افسوس ہوا۔ پیر محمد بادشاہ سے ملا تو اس نے بھی اس قتل کو خان خاناں کی خودسری قرار دیا۔ یہ پہلی مرتبہ تھا جب بادشاہ کی زبان سے یہ کلمات ادا ہوئے۔

”ہاں، میں دیکھ رہا ہوں کہ خان بابا حد سے تجاوز کرتے جا رہے ہیں۔“

اس مختصر سے جملے میں بہت کچھ چھپا ہوا تھا۔ پیر محمد کی تشفی ہوگئی۔

دہلی سے آگرہ پہنچنے کے بعد اکبر ملک کے نظم و نسق کو درست کرنے میں مصروف ہوگیا۔ تمام امراء بھی دارالخلافہ پہنچ چکے تھے۔

آگرہ پہنچتے ہی پیر محمد خاں بیمار پڑ گیا اور کئی دن تک گھر سے نہ نکلا۔ خان خاناں کو معلوم ہوا تو عیادت کے لیے اس کے گھر گیا۔ اس کے دربان غلاموں میں سے ایک نے سامنے آ کر کہا۔ ”جب تک آپ کی اطلاع ہو، آپ توقف کریں۔ ان کی اجازت کے بغیر ہم کسی کو اندر نہیں بھیج سکتے۔“

”تو کیا میں ان کی اجازت کا پابند ہوں؟“

”ہمیں تو یہی حکم ہے۔“

اس جواب پر خان خاناں خفا ہو کر جانے لگا۔ پیر محمد کو معلوم ہوا تو دوڑا ہوا آیا اور عذر و معذرت کرنے لگا۔

”معاف کیجیے گا، دربانوں نے آپ کو پہچانا نہیں ہوگا۔“

”دربانوں سے ہی کیا ہے۔ تم بھی تو اب تک مجھے نہیں پہچان پائے ہو۔“ خان خاناں نے کہا۔

ایک تو یہ بدمزگی پیدا ہوئی، دوسرے جب خان خاناں اندر جا رہا تھا تو اس کے ہمراہیوں میں سے صرف ایک دو آدمی ہی اندر جا سکے، دوسروں کو باہر ٹھہرنا پڑا۔ ظاہر ہے یہ حرکت اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ اس وقت تو کچھ دیر بیٹھنے کے بعد اٹھ کر چلا آیا لیکن یہ کانٹا اپنے دل سے نکال نہ سکا اور اسے راستے سے ہٹانے کی تدبیر سوچنے لگا۔ دو تین روز کے بعد اس نے اپنے چند ملازمین کو پیر محمد کے پاس بھیجا اور یہ پیغام کہلوایا۔

”تو گھومنے پھرنے والے طالب علموں کی طرح تھا اور فقیروں اور نامرادوں کی طرح قندھار میں آیا۔ چونکہ میں نے تجھ میں اخلاص محسوس کیا اور بعض کام تو نے میری مرضی کے مطابق بھی کیے لہٰذا میں نے تجھے درجۂ خانی و سلطانی تک پہنچا دیا۔ اب میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تیرا ظرف اس قابل نہیں ہے کہ عالی مرتبے کا تحمل کر سکے اور یہ اندیشہ ہے کہ کہیں کوئی فساد برپا نہ ہو جائے لہٰذا اس مصلحت کی بنا پر کچھ عرصے کے لیے تجھ سے غرور وجاہ کے ساز و سامان چھین رہا ہوں اور جب تک کہ تیرا مزاج اصلی حالت پر نہ آئے، مناسب یہ ہے کہ علم و نقارہ اور عز و جاہ کے تمام سامان تو واپس کر دے۔“ مرتا کیا نہ کرتا پیر محمد نے اسی وقت خانی و سلطانی کا سامان سپرد کر دیا۔

خان خاناں نے اس کی موجودہ حالت کو بھی اپنے لیے خطرہ سمجھا اور اسے گرفتار کر کے قلعہ بیانیہ پہنچا دیا اور وہاں سے مکہ معظمہ روانہ کر دیا۔

خان خاناں کے مخالفین کے لیے یہ ایک اچھا موقع تھا۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ اس خبر کو اکبر تک پہنچایا بلکہ ملا پیر محمد کی مظلومیت اس طرح ظاہر کی کہ اکبر بھی کبیدہ خاطر ہوا اور اس واقعے کو خان خاناں کی ہٹ دھرمی قرار دیا۔ اس کا مزاج دیکھ کر دوسرے امراء نے کھل کر اپنی ناراضی کا اظہار کیا لیکن خان خاناں اپنی طاقت میں ایسا چُور تھا کہ اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔ اس کی یہی طاقت تھی جو اسے نقصان پہنچا رہی تھی۔ اگر کوئی صحیح مشورہ دینا بھی چاہتا تھا تو اس کے خوف کی وجہ سے چپ رہتا تھا یا اس کی ہاں میں ہاں ملا کر اسے یہ احساس دلاتا تھا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے ٹھیک کر رہا ہے، اسے کبھی یہ گمان ہی نہیں گزرا کہ وہ غلطی پر ہے۔

جب یہ ماحول ہو تو سازشیں خودبخود جنم لیتی ہیں۔ اس کے گرد خوشامدیوں کا ٹولا جنم لینے لگا جو ایک طرف تو اس کے کاموں کی تعریف کرتے، دوسری جانب اس کے مخالفین کے سامنے جا کر معاملات کو کسی اور ہی رنگ میں پیش کرتے۔

اکبر کے دل میں خان خاناں کی طرف سے بال آ گیا تھا اور علی قلی خاں (خان زماں) کی تعریفیں اس کے روبرو بیان ہو رہی تھیں۔

وہ ابھی عمر کی ایسی منزل میں نہیں تھا کہ حقیقت کی تہ تک پہنچ سکتا۔ معاملاتِ حکومت بھی خان خاناں کے ہاتھ میں رہے تھے لہٰذا اسے یہ تجربہ بھی نہیں تھا۔ وہ ایک طرح سے خان خاناں کا محتاج بنا ہوا تھا۔ سب کی سن لیتا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے کبیدہ خاطر بھی ہو جاتا تھا لیکن پھر خان خاناں کی خدمات کا خیال کر کے آنے والے وقت کا انتظار کرنے لگتا تھا۔ خان خاناں اس گھمنڈ میں تھا کہ بادشاہ نے تمام نظم و نسق میرے ہاتھ میں دے دیا ہے، میں جو جی چاہے کروں۔ یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ جو کچھ کر رہا تھا، سلطنت کی بھلائی کے لیے کر رہا ہے۔

اس کے قریبی حلقوں نے جو دراصل دونوں طرف ملے ہوئے تھے، جب یہ دیکھ لیا کہ ملا پیر محمد خارج البلد ہوگیا تو اسے یہ مشورہ دیا کہ وہ عہدہ حاجی محمد سیستانی کے سپرد کر دے۔ یہ بھی سمجھایا کہ وہ آپ کے ملازموں میں ہے۔ ہمیشہ آپ کا احسان مند رہے گا اور آپ کے اشاروں پر چلے گا۔ یہ بات خان خاناں کے دل میں اتر گئی اور اس نے بادشاہ سے مشورہ کیے بغیر حاجی محمد سیستانی کو وکیلِ مطلق مقرر کر دیا۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر میر عبداللطیف قزوینی کو اکبر کے استاد ہونے کا شرف بخش دیا۔ اس سے پہلے یہ عہدہ بھی ملا پیر محمد کے پاس تھا۔

یہ دو تقرریاں ایسی تھیں کہ بادشاہ کو سخت ناگوار گزریں۔ اس خفگی کو خان خاناں نے بھی محسوس کیا۔

تقریوں کا ذکر نہ اکبر نے چھیڑا، نہ خان خاناں نے ذکر کیا لیکن وہ یہ تدبیر کرنے لگا کہ کسی طرح کوئی ایسا کارنامہ انجام دے کہ بادشاہ کی خوشنودی کا باعث ہو۔

خان خاناں ہفتے میں دو مرتبہ اکبر سے ملاقات کے لیے جاتا تھا اور مشوروں سے نوازتا تھا۔ اس روز گیا تو اکبر کا مزاج بگڑا ہوا دیکھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ گفتگو کے دوران اکبر نے اسے ''خان بابا'' کہہ کر نہیں پکارا۔ اس سے اس کی ناراضی کا علم ہوتا تھا لیکن خان خاناں نے کمال ہوشیاری سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ اس نے کسی بات کو بھانپ لیا ہے۔ باتوں باتوں میں قلعہ گوالیار کا ذکر چھیڑ دیا۔

''آپ نے قلعہ گوالیار کے متعلق بھی کچھ سوچا؟''

''سوچنا کیا ہے۔'' اکبر نے بے دلی سے کہا۔

''خدا کے فضل سے اب پورا ہندوستان ظلِ الٰہی کے قبضۂ اقتدار میں ہے۔ چند علاقوں کو چھوڑ کر تمام علاقے ہمارے زیرِ نگیں ہیں۔ پٹھانوں کا تو ہم نے قلع قمع کر دیا ہے۔ قلعہ گوالیار ابھی تک ان کے قبضے میں ہے۔ اب ہمیں اس قلعے کی طرف توجہ دینی چاہیے۔''

''ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو۔ اس قلعے کو فتح کرنے کے لیے کئی بار لشکر بھیجے گئے لیکن فتح نہ ہو سکا۔ کسی مناسب موقع پر اس کی فتح کے لیے بھی کوشش کریں گے۔''

''آپ کے اس غلام نے وقت کا انتظار کرنا نہیں سیکھا۔ اگر آپ کا حکم ہو تو میں لشکر ترتیب دے کر نکلوں؟ مجھے امید ہے اس مرتبہ ہمیں ناکامی نہیں ہوگی۔''

''آپ جو مناسب سمجھتے ہیں، وہی کرتے ہیں۔ اس مرتبہ بھی وہی کیجیے۔''

اس جواب میں ایک طنز بھی پوشیدہ تھا جسے خان خاناں محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''آپ سے ایک گزارش اور ہے۔''

''فرمائیے۔''

''اس مہم کو سر کرنے کی ذمے داری بلاشرکت غیرے میری ہوگی۔''

''جیسا آپ چاہیں۔''

''اس مہم کے اخراجات بھی خزانہ شاہی سے نہیں لوں گا۔''

''ہم اسے بھی آپ کا اخلاص کہیں گے۔''

''ظلِ الٰہی کا اقبال بلند ہو۔''

بادشاہ کی طرف سے اجازت ملتے ہی خان خاناں نے تیاری شروع کر دی۔ خان زماں کو اطلاع پہنچی تو اس نے اسے اپنی ہتک سمجھا کہ اتنی بڑی مہم کی تیاری ہو اور اسے اعتماد تک میں نہیں لیا گیا۔ اسے اپنی کوششیں بے کار جاتی نظر آ رہی تھیں۔ اس نے فوراً اکبر سے ملاقات کی۔

''قلعہ گوالیار کی مہم کے لیے وہ کتنے سواروں کو تیاری کا حکم دے؟''

''آپ فی الحال زحمت نہ کیجیے۔ خان خاناں نے اس مہم کو اکیلے سر کرنے کی ٹھانی ہے۔''

''کیا آپ نہیں سمجھتے کہ یہ ان کی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی ہے؟''

''انہوں نے ایسے مواقع پر ہمیشہ خوش تدبیری کا ثبوت دیا ہے۔ ایک مرتبہ اور سہی۔''

''اس مہم میں شاہی لشکر کو کئی مرتبہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔ میرے منہ میں خاک...... اس مرتبہ بھی خان خاناں کی ضد کام بگاڑ نہ دے۔ اگر ان کی زلف بن کر میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تو سلطنت کی بہبود کے لیے بہتر ہوتا۔''

''ہم ان سے وعدہ کر چکے ہیں کہ وہ بلاشرکت غیرے اس مہم کو سر کریں گے۔ ہمیں فخر ہے کہ ہمارے امرا ایسی مہمات میں پہل کرنے کے متمنی رہتے ہیں۔ آپ کو ہم کسی اور مہم پر روانہ کریں گے۔''

خان زماں کا یہ داؤ بھی خالی چلا گیا۔ اس نے اپنے ہم خیال امراء کو اپنے گھر طلب کیا اور تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس اجلاس میں حاجی محمد سیستانی بھی شریک تھا۔ یہ وہی شخص تھا جو خان خاناں کا ملازم اور وکیل مطلق تھا۔ وہ بھی درِ پردہ خان زماں کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ وہ اس وقت بھی ہر وہ بات کر رہا تھا جو خان خاناں کے خلاف جا سکتی تھی۔

''لشکر میں خان خاناں کے ساتھ میں بھی ہوں گا۔ میں کچھ ایسا انتظام کر دوں گا کہ قلعے میں رسد پہنچتی رہے۔ محاصرہ طویل ہو جائے گا تو بادشاہ لشکر کو واپس بلا لے گا یا خان خاناں مایوس ہو کر محاصرہ اٹھا لے گا۔''

''بادشاہ کی صحت پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ پہلے بھی مہمات ناکام ہو چکی ہیں، ایک یہ بھی ہو جائے گی۔ بات تو کچھ ایسی ہونی چاہیے کہ خان خاناں ہمیشہ کے لیے بادشاہ کی نظروں سے گر جائے۔'' خان زماں نے کہا۔

''بیمار ہاتھی کو مرتے مرتے بھی کچھ دیر ضرور لگتی ہے۔ خان خاناں کی طرف سے بادشاہ کے دل میں بال آ گیا ہے۔ وہ اکثر خان خاناں کے فیصلوں پر اعتراض کرتا ہے۔ اب پہلے جیسی بات نہیں رہی ہے۔ خان خاناں کو بھی اس کا احساس ہے۔ اسی لیے اس نے قلعہ گوالیار کی تسخیر کا ذکر چھیڑا ہے تاکہ

بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرے۔ اگر اس مہم میں اسے ناکامی ہوئی تو خان خاناں کی طاقت کا گھمنڈ ٹوٹ جائے گا۔ بادشاہ کے دل میں جو برائی آ گئی ہے، اس میں بھی اضافہ ہوگا۔ ہم غلاموں کو بھی باتیں بنانے کا موقع ملے گا۔''

''کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔ مجھ سے بھی جو کچھ ہو سکے گا ضرور کروں گا۔''

''آپ ایک کام کر سکتے ہیں۔ اس کے لشکر کے کچھ آدمیوں کو پیسوں کا لالچ دے کر توڑ لیں تاکہ میں وہاں جو کچھ کروں، وہ اس میں میرا ساتھ دیں۔''

''یہ کام مناسب نہیں ہوگا۔ امراء تو ہوا کا رخ دیکھ کر اپنا رخ تبدیل کر لیتے ہیں لیکن سپاہی وفادار ہوتا ہے۔ اگر کسی طرح یہ بات خان خاناں تک پہنچ گئی تو یہ میرے وقار کے منافی ہوگا۔ بس تم اتنا کرو کہ کسی طرح یہ مہم ناکام ہو جائے۔ اس سلسلے میں شیخ گدائی آپ کے کام آ سکتا ہے۔ شاہی خزانہ اس کے اختیار میں ہے۔ اس مہم پر آنے والے اخراجات یقیناً شاہی خزانے سے پورے ہوں گے۔ اگر شیخ گدائی رقم میں کٹوتی کر دے اور اتنی رقم نہ دے جتنی خان خاناں طلب کرے تو لامحالہ خان خاناں کو لشکر میں کمی کرنی پڑے گی اور کئی دوسرے اخراجات میں بھی کمی کرنی پڑے گی۔ مالی پریشانی کا اثر یقیناً اس مہم پر پڑے گا۔''

''بات تو درست ہے لیکن شیخ گدائی کو اس پر آمادہ کون کرے گا؟''

''اس کے لیے ماہم انکہ موجود ہے جو ان دنوں آگرہ آیا ہوا ہے۔ خان خاناں نے ایک مرتبہ اسے ذلیل کیا تھا اور اسے معافی مانگنی پڑی تھی۔ خان خاناں کی طرف سے اب تک اس کے دل میں رنجش ہے۔ شیخ گدائی سے اس کا یارانہ ہے۔ وہ خان خاناں کو نیچا دکھانے کے لیے یقیناً شیخ گدائی کو مجبور کر دے گا۔''

رات کے کسی پہر میں ایک پالکی خان زماں کی حویلی کے سامنے آ کر رکی۔ آنے والے کے ساتھ سپاہیوں کا دستہ بھی تھا۔ حویلی کے پہرے داروں کو پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ آنے والا کون ہے۔ اس لیے کسی کو کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑی اور اس شخصیت کو ہاتھوں ہاتھ مہمان خانے تک پہنچا دیا گیا۔ یہ شخص کوئی اور نہیں ماہم انکہ تھا۔

''آپ نے سن ہی لیا ہوگا کہ خان خاناں کی سربراہی میں ایک لشکر قلعہ گوالیار کی طرف جا رہا ہے؟''

''میرے کانوں تک بھی یہ بات آئی ہے۔''

''اگر خان خاناں نے یہ مہم سر کر لی تو اس کے وقار میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔''

''اسے روکا بھی تو نہیں جا سکتا۔ بادشاہ اس کی جانب سے ایسا بے فکر ہو گیا ہے کہ کسی بات پر سرزنش ہی نہیں کرتا۔''

''ہم سب بادشاہ کے اس رویّے ہی سے تو مجبور ہیں ورنہ خان خاناں کی عزت سربازار نیلام کی جا سکتی تھی۔''

''مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ اس نے بادشاہ کا غصہ مجھ پر کس طرح اتارا تھا۔ وہ آپ کو معلوم ہی ہے۔''

''کس امیر کی عزت اس سے محفوظ ہے۔''

''اس وقت فرمائیے آپ نے اس خفیہ ملاقات کا اہتمام کس لیے فرمایا؟''

''شیخ گدائی کو آپ نے کیسا پایا ہے؟''

''یہ کہ درِ پردہ وہ بھی خان خاناں کے خلاف ہے۔''

''اس وقت اسی سے کام آ پڑا ہے اور یہ کام آپ ہی کر سکتے ہیں کیونکہ شیخ گدائی کسی زمانے میں آپ سے بہت قریب رہا ہے۔''

''کام تو فرمائیے۔''

خان زماں نے تمام باتیں سرگوشی میں بتا بھی دیں، سمجھا بھی دیں۔ اس نے وعدہ کر لیا کہ وہ شیخ گدائی سے ملے گا۔ خان خاناں کی درخواست جب بھی پہنچے گی، وہ اس میں رکاوٹیں ڈالنے کے لیے تیار رہے گا۔

ماہم انکہ کو بھی موقع اچھا ہاتھ لگا تھا۔ اس کا دل خان خاناں کی طرف سے پوری طرح صاف نہیں ہوا تھا۔ وہ تو خود یہ چاہتا تھا کہ خان خاناں کو کہیں نہ کہیں خفت اٹھانی پڑے۔ اس نے پہلی فرصت میں شیخ گدائی سے ملاقات کی لیکن اسے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ خان خاناں کی طرف سے اخراجات کے لیے کوئی درخواست ہی موصول نہیں ہوئی۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ محض ایک دن جاتا ہے کہ خان خاناں روانہ ہو جائے گا۔

اب اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ خان زماں سے ملاقات کرتا۔ اس نے معاملہ شیخ گدائی پر چھوڑا اور دہلی چلا گیا۔ خان زماں کو یہ معلوم ضرور ہو گیا کہ اس نے شیخ گدائی سے ملاقات کی تھی لیکن نتیجہ کیا نکلا، اس سے وہ بے خبر ہی رہا۔

یہ دیکھ کر وہ بھی حیران ہوا تھا کہ دوسرے ہی دن خان خاناں نہایت کروفر کے ساتھ قلعہ گوالیار کو فتح کرنے کے لیے آگرہ سے نکلا۔

قلعہ گوالیار رفعت و استحکام میں مشہور تھا۔ بڑے بڑے راجاؤں کا مسکن رہا تھا۔ ہمایوں بادشاہ نے اس پر قبضہ کر لیا تھا پھر یہ قلعہ پٹھانوں کے قبضے میں چلا گیا اور ابھی تک

سلیم شاہ کا ایک غلام سہیل خاں محمد شاہ عدلی کی طرف سے قلعے کا منتظم تھا۔ جب آگرہ، اکبر کا دارالخلافہ بنا تو کئی مرتبہ اس کی تسخیر کی کوششیں کی گئیں لیکن ناکامی ہوئی اور اب خان خاناں ایک نئے عزم کے ساتھ اس قلعے کے سامنے کھڑا تھا۔

حاجی محمد سیستانی یہ عہد کر چکا تھا کہ وہ اس محاصرے کے درمیان ایک ایسا چور دروازہ تلاش کرلے گا جہاں سے قلعے والوں کو رسد فراہم ہوتی رہے۔ یہاں پہنچتے ہی اس نے ایک ایسی جگہ ڈھونڈ بھی لی تھی اور وہاں اپنے منتخب آدمیوں کو متعین کردیا تھا لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ابھی خان خاناں کے زوال کی گھڑی نہیں آئی تھی۔ قلعے کے منتظم نے جب دیکھا کہ اکبری فوجیں پہنچ چکی ہیں تو اس پر رعب شاہی طاری ہوگیا۔ اس نے ایک سوار کو راجا مان سنگھ کے پوتے رام سنگھ کی طرف دوڑایا اور اسے یہ پیغام بھیجا۔

''تمہارے اسلاف اس قلعے کے حاکم تھے۔ اب اکبر بادشاہ کی نظر اس قلعے پر ہے۔ اتنے عظیم الشان بادشاہ کے مقابلے پر میں قلعے کی حفاظت نہیں کرسکتا۔ بہتر یہی ہے کہ تم قلعے کو اپنے قبضے میں کرلو اور اس کے معاوضے میں مجھے جو کچھ دے سکو، دے دو۔''

رام سنگھ نے اس خوش خبری کو غیبی امداد تصور کیا اور قلعے پر قبضہ کرنے کے لیے روانہ ہوگیا۔ اس علاقے کے اکبری جاگیردار اقبال خاں نے اس کا راستہ روکا۔ رام سنگھ کو اپنی طاقت پر غرور تھا اور قلعے پر قبضہ کرنے کی جلدی بھی۔ اس جلد بازی نے ہی اس کو نقصان پہنچایا۔ وہ صفیں ترتیب دیے بغیر ہی اقبال خاں پر ٹوٹ پڑا۔ اس کا لشکر بے ترتیب تھا۔ اقبال خاں کی طاقت کا اندازہ بھی نہ کرسکا تھا۔ بہت جلد پسپا ہوگیا۔ رام سنگھ شکست کھا کر اپنے علاقے کی طرف دوڑ گیا۔ اقبال خاں نے اس کا تعاقب کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اپنے لشکر کو وہیں چھوڑا اور چند ساتھیوں کے ساتھ قلعہ گوالیار کی طرف روانہ ہوا۔ شاہی لشکر نے جو قلعے کا محاصرہ کیے ہوئے تھا، گرد و غبار اڑتے دیکھا تو یہ سمجھا کہ پٹھانوں کی مدد کے لیے کمک آگئی ہے لیکن قریب آنے پر اکبری علم نظر آئے تو راز کھلا۔ اقبال خاں، خان خاناں کی خدمت میں پہنچا اور خوش خبری سنائی کہ رام سنگھ جو سہیل خاں کی مدد کو آرہا تھا، اسے اس نے مار بھگایا ہے۔ لشکر میں شادیانے بجائے گئے جنہیں سن کر سہیل خاں کو یقین ہوگیا کہ کوئی انہونی بات ہوئی ہے۔

شاہی لشکر کی طرف سے بلند ہونے والے نعرے اس کا دل دہلا رہے تھے۔ ایک دن اور ایک رات اس نے قلعے میں گزارے پھر کسی ذریعے سے اسے رام سنگھ کی شکست کا حال معلوم ہوگیا۔ اب اس کے پاس اپنے بچاؤ کا ایک ہی راستہ رہ گیا تھا۔ اس نے اپنا ایک قاصد خان خاناں کے پاس بھیج کر اطاعت و فرماں برداری کا اقرار کیا۔ خان خاناں نے قلعے پر قبضہ کرلیا اور سہیل خاں کو اکبر کے پاس روانہ کردیا۔

جب یہ لشکر فتح یاب ہوکر آگرہ واپس آیا تو خان زماں کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ بغیر کسی بڑی جنگ کے قلعہ گوالیار پر قبضہ ہوگیا تھا۔ ایک مرتبہ پھر خان خاناں کے گرتے ہوئے وقار کو سہارا مل گیا تھا۔

خان زماں اکبر کے دل سے اپنے متعلق کدورت کو دور کرنے کا خواہاں تھا۔ یہ موقع اسے خود بخود مل گیا جب اکبر نے جونپور فتح کرنے کے لیے اسے متعین کیا جو سالہا سال تک سلاطین مشرقیہ کا دارالحکومت رہ چکا تھا اور اب افغانوں کے قبضے میں تھا۔ وہ ایک بڑے لشکر کے ساتھ اس ولایت میں پہنچا۔ جنگ ہوئی اور شاہی اقبال سے فتح یابی نصیب ہوئی اور وہ ملک قبضے میں آگیا۔

وہاں کے پٹھان سوری سلطنت کے قیام کا دعویٰ لے کر ہر طرف سے ٹڈی دل کی طرح اکٹھے ہوگئے تھے۔ خان زماں نے جان پر کھیل کر ان سے بڑی سخت لڑائیاں لڑیں اور دلیرانہ حملے کرکے کشتوں کے پشتے لگا دیے اور وہاں کے چند نامور امیروں کو شکست دے کر گنگا کے کنارے تک کے علاقے کو پٹھانوں سے بالکل صاف کردیا اور اس پورے علاقے کو اکبری سلطنت میں شامل کردیا۔

خان زماں کے اس اقدام کو سراہتے ہوئے اکبر اس سے مہربانی کرنے لگا۔ اکبر نے اس فتح کی خوشی میں ایک بڑا جشن منعقد کیا۔ خان زماں اور اس کے بھائی کو خلعت، کمر بند اور شمشیر مرصع عنایت کی۔

اس بڑھتی ہوئی قربت نے خان خاناں کو چونکا دیا۔ دونوں بڑے امیروں کی چپقلش کوئی بھی صورت اختیار کرسکتی تھی۔ کبھی ایک کا پلہ بھاری ہوجاتا تھا، کبھی دوسرے کا۔ اس وقت دونوں ایک سطح پر کھڑے ہوئے تھے۔ ایک نے قلعہ گوالیار فتح کیا تھا تو دوسرے نے جونپور کی ولایت کو اکبری سلطنت میں شامل کردیا تھا۔

خان خاناں کو ایک قدم آگے بڑھانا تھا۔ اس نے اپنے لیے ایک مہم اور تلاش کرلی۔ دہلی اور آگرہ کے نواح میں میواتیوں کا بڑا زور تھا۔ یہ لوگ نہایت شورہ پشت اور سرکش ہوگئے تھے۔ فتنہ و فساد ان کا پیشہ بن گیا تھا۔ خان

خاناں اس طرف متوجہ ہوا اور نہایت جانفشانی سے کام لے کر ان کا پوری طرح قلع قمع کردیا۔

مسلسل دو کارناموں کا اثر یہ ہوا کہ بادشاہ کی رنجش دور ہوگئی اور خان خاناں دوبارہ شاہانہ عنایات سے مستفید ہونے لگا۔

انہی دنوں شیخ کبیر شیخ محمد غوث گوالیاری ولایت گجرات اپنے مریدوں کے ساتھ آگرہ میں وارد ہوئے۔ اکبر کا دربار علماء اور مشائخ کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ شیخ محمد غوث تشریف لائے تو اکبر کی شاہانہ قدر افزائی کے حق دار ٹھہرے۔ شیخ گدائی اور ان کے درمیان کچھ کدورت تھی اور شیخ گدائی خان خاناں کا منہ چڑھا تھا لہٰذا وہ جب بھی خان خاناں سے ملتا، شیخ محمد غوث کو اچھے لفظوں میں یاد نہ کرتا۔ رفتہ رفتہ اس نے خان خاناں کو اس حال پر پہنچا دیا کہ اس نے سلوک کے دروازے بند کردیے۔ وہ رعایتیں جن کی خان خاناں سے شیخ گوالیاری امید رکھتے تھے، ظہور میں نہ آسکیں۔ وہ بھی اس کی طرف سے بددل ہوگئے۔

خان خاناں شاہانہ عنایت سے سرفراز ہو رہا تھا۔ حاسدوں کے دلوں پر چھریاں چل رہی تھیں۔ ہر ہفتے اور ہر مہینے وہ کوئی نہ کوئی شگوفہ چھوڑ دیتے تھے۔ ان دنوں ان کے ہاتھ ایک اور بات آگئی۔ وہ بادشاہ کے سامنے تاجروں کے ذریعے خان خاناں کے پاس شاہِ ایران کے خطوط اور تحفوں کے آنے کی داستانیں سنانے لگے۔ خان خاناں کے خلاف ماہم اتکہ، اس کے بیٹے ادہم خاں اور داماد نے اچھا خاصا محاذ بنا لیا۔ ان لوگوں نے شاہ غوث کے پاس پہنچ کر خان خاناں کی خوب برائیاں کیں اور جھوٹی سچی لگا کر ان کو بھی اپنا شریک و معاون بنا لیا۔ وہ ان جھمیلوں میں پڑنا نہیں چاہتے تھے لہٰذا جب خان خاناں کی بدسلوکی بہت بڑھی تو وہ رنجیدہ ہوکر گوالیار چلے گئے جو ان کا مسکن تھا۔ ان کے اس طرح آگرہ سے چلے جانے کا اکبر کو ازحد صدمہ ہوا۔ اس مرتبہ بھی خان خاناں نے بادشاہ کی بدگمانی دور کرنے اور اس کی توجہات دوسری طرف منعطف کرنے کی کوشش کی۔ اس نے ایک تیر سے دو شکار کھیلے۔ ایک طرف بادشاہ کو خوش کیا، دوسری طرف خان زماں کے زخموں پر مرہم رکھا۔ اس نے بادشاہ کو ''مالوہ'' تسخیر کرنے کی نوید سنائی اور اس کا سہرا خان زماں کے بھائی بہادر خاں کے سر باندھا۔ اس نے بہادر خاں کو طلب کیا جو پنج ہزاری امیر تھا اور ایک لشکر جرار کے ساتھ ولایت مالوہ کی طرف روانہ کیا۔

گزشتہ زمانے میں ''مالوہ'' خلجیوں کے قبضے میں تھا اور اس وقت باز بہادر اس پر قابض تھا۔ ان کاموں سے نمٹنے کے بعد اکبر نے شکار کا ارادہ کیا۔ اس وقت تک اکبر کے دل سے خان خاناں کی طرف سے بدگمانی کا کانٹا نکل چکا تھا۔ وہ تمام امورِ مملکت خان خاناں کے سپرد کرکے سکندرہ چلا گیا۔

بادشاہ نے دریائے جمنا کو عبور کیا اور دہلی کے مضافات تک چلا آیا۔ خان خاناں کے سخت ترین دشمن ماہم اتکہ اور ادہم خاں بھی ساتھ تھے۔ انہوں نے سوچا کہ اس سے بہتر موقع نہیں ہوسکتا کہ اکبر کو ترغیب دلا کر دہلی لے جائیں۔ ماہم اتکہ کا داماد شہاب الدین احمد خاں دہلی کا حاکم تھا، اس سے مل کر جو کچھ مناسب ہو کیا جائے۔

ماہم اتکہ اور ادہم خاں دونوں مل کر بادشاہ کے حضور پہنچے اور پہلے سے طے شدہ عرضی اس کے حضور پیش کی۔

''حضور! جان کی امان پائیں تو کچھ عرض کریں؟''

''کہو کیا کہنا ہے؟''

''گزارش یہ ہے کہ دہلی میں حضور کی والدہ مکرمہ بیمار ہیں۔ بہت کمزور ہوگئی ہیں۔ ہر وقت آپ کو یاد کرتی رہتی ہیں۔ دہلی یہاں سے کچھ زیادہ دور بھی نہیں ہے۔ اگر حضور ان کی عیادت کے لیے دہلی چلیں تو مناسب ہوگا۔''

''تم نے بالکل درست کہا۔ سلطنت کے کاموں میں ہمیں تو کچھ یاد ہی نہیں رہتا۔ اب اتنے قریب آگئے ہیں تو دہلی جانے میں کوئی حرج بھی نہیں۔''

بادشاہ کی رضامندی ملتے ہی ادہم خاں نے چند سوار دہلی کی طرف دوڑا دیے جو یہ اعلان کرتے ہوئے کہ بادشاہ ابوالفتح جلال الدین محمد اکبر کی سواری بادِ بہاری اس طرف سے گزرنے والی ہے، دہلی تک پہنچ گئے اور ماہم اتکہ کے داماد شہاب الدین خاں کو یہ خبر پہنچا دی کہ استقبال کی تیاری کرے۔ خفیہ طور پر یہ بھی بتا دیا کہ اکبر کے یہاں پہنچنے کے بعد کیا کرنا ہے۔

جب اکبر شاہانہ سامان و اسباب کے ساتھ دہلی پہنچا تو شہاب الدین خاں نے استقبال کیا اور بہت سے گراں قدر اور نادر تحفے اس کی خدمت میں پیش کیے۔

جب اکبر چند روز والدہ کی خدمت میں گزار چکا تو ایک روز شہاب الدین خاں اپنے ساتھیوں کے ساتھ آیا اور آتے ہی روتے ہوئے عرض کیا۔

''آپ کے اس طرح دہلی تشریف لانے پر خان خاناں کو بدگمانی ہوگی کہ آپ کی آمد ہماری تحریک سے ہوئی ہے اور وہ مصاحب خاں اور دوسرے مظلوموں کی طرح ہم

کو بھی ٹھکانے لگا دے گا۔ ہم میں اس کی عداوت کے مقابلے کی طاقت نہیں ہے۔''

ماہم انکہ نے بھی ہاتھ باندھ کر عرض کیا۔

''آپ کی یہی شفقت بہت ہوگی کہ ہمیں مکہ جانے کی رخصت مرحمت فرما دیں تاکہ ہم مکہ شریف جا کر حضور کی خدمت کے بجائے غائبانہ طور پر دعا میں مشغول رہیں۔''

اکبر چونکہ ماہم انکہ سے اس کی خدمات اور قدیم ملازمت کی وجہ سے بہت محبت کرتا تھا، لہٰذا وہ اس کی جدائی پر تیار نہ ہوا اور فرمایا۔ ''میں خان خاناں سے تمہاری تقصیر کی معافی کے لیے کہوں گا۔'' فوراً کاتب کو بلوایا اور خان خاناں کے نام یہ پیغام لکھوا دیا۔

''ہم قلعہ دہلی میں مریم مکانی کی عیادت کے لیے اپنی مرضی سے آئے ہیں۔ اس بات کو دوسروں پر محمول کر کے آپ بدظن نہ ہوں۔ ہم چونکہ تمہارے مشورے کے بغیر اتنی دور آ گئے ہیں لہٰذا ہمارے مقربین خوف زدہ ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ ان کو تم اپنی طرف سے تسلی کر دو تاکہ وہ خاطر جمع رہ کر خدمت گاری کو بہ حسن وجوہ انجام دیں۔''

اس پیغام کے بعد ایک مرتبہ پھر ماہم انکہ اور شہاب الدین نے صلاح کی اور یہ طے کیا کہ پیغام کا جواب آنے سے پہلے بادشاہ کا دل خان خاناں کی طرف سے بالکل پھیر دیا جائے تاکہ بادشاہ اس کی معذرت کو قبول نہ کرے۔

اس کے بعد شہاب الدین خاں نے اپنے چند ہمرازوں کی مدد سے بادشاہ کے سامنے خان خاناں کے خلاف چند ساختہ پرداختہ مقدمات پیش کیے اور کچھ کردہ ناکردہ معاملات کو بڑی مہارت سے ترتیب دے کر سامنے رکھا اور ان کی تصدیق و تائید کے لیے اپنے ہوا خواہوں کی شہادتیں بھی پیش کرا دیں اور بادشاہ کے دل کو خان خاناں کی طرف سے بالکل پھیر دیا۔

ان کی ورانداز یوں سے یہ نوبت آ گئی کہ جب فرمان شاہی کے جواب میں خان خاناں نے معذرت لکھ بھیجی اور شدید قسمیں کھا کر قرآن پاک کو حاجی محمد خاں اور دوسرے دو معتمد امیروں کے ساتھ خدمت میں بھیجا اور ان کی زبانی بھی پیغام دیا کہ ''جو بات حضور کے گوش گزار کی گئی ہے، وہ قطعاً میرے دل میں نہیں ہے۔ اس کا مجھے کوئی خیال تک نہیں آیا ہے۔'' تو بادشاہ نے یہ معذرت قبول نہیں کی۔ مخالفین نے جو باتیں خان خاناں کے خلاف کی تھیں اس کا اثر اس کے دل پر ایسا ہوا کہ اس نے نہ صرف یہ کہ معذرت قبول نہیں کی بلکہ خان خاناں کا جواب لانے والوں کو قید میں ڈال دیا۔

محلاتی سازشوں میں ہر خبر پر لگا کر اڑتی ہے۔ اس خبر نے بھی پرواز پکڑی۔ اکبر کے برہمیٔ مزاج کا شہرہ ہوتے ہی اپنے اور بیگانوں نے اسے خوب اچھالا۔ ہر طرف یہی قصہ موضوعِ بحث تھا۔ لوگ سرگوشیوں میں، کھلی زبانوں میں بھی اس قصے کو خوب ہوا دینے لگے۔ بادشاہ کی نظریں پھریں تو دوست بھی دشمن بن بیٹھے۔

خان خاناں کا اقبال مائل بہ زوال ہونے لگا۔

جو لوگ کل تک خان خاناں کا دم بھرتے تھے، شہاب الدین خاں اور ماہم انکہ سے رجوع کرنے لگے۔ شہاب الدین نے بھی خوب آؤ بھگت کی۔ جو شخص بھی آتا اس کو اس کے حالات کے مطابق منصب و جاگیر کا امیدوار کر دیتا۔

وہ اتنا مایوس ہوا کہ اپنے متعلقین کو خود اجازت دے دی کہ وہ اسے چھوڑ کر بادشاہ کے پاس چلے جائیں۔ یہاں تک کہ بہادر خاں کو جسے مالوہ کی مہم پر بھیجا تھا، واپس بلا لیا اور اسے بھی ان لوگوں کے ہمراہ بادشاہ کے پاس روانہ کر دیا۔

جب خان خاناں نے دیکھا کہ اس کی فلاح و بہبود کی کوئی راہ نہیں رہی اور بدگو مخالف ہر طرف کانٹے بچھانے میں کامیاب ہو گئے ہیں تو اس نے حج بیت اللہ کا عزم کر لیا اور بادشاہ سے اجازت طلب کی۔

اکبر نے یہ درخواست قبول کر لی اور اپنے استاد میر عبداللطیف قزوینی کو خان خاناں کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا۔

''ہم نے ابتدا میں اپنی کم عمری اور سیر و شکار کے شوق اور ناتجربہ کاری کی بنا پر خان بابا کو تمام امورِ سلطنت سپرد کر دیے تھے۔ اب ہم رعیت اور سلطنت کے معاملات خود سرانجام دینا چاہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ تم نے کعبۃ اللہ کا احرام باندھ لیا ہے اور کئی حیثیتوں سے تم پر حج کا فریضہ واجب اور لازم بھی ہے اس لیے اب تم کو علائقِ دنیا سے دست کش ہو جانا چاہیے۔''

ابھی یہ پیغام خان خاناں تک پہنچا ہی تھا کہ ایک دوسرا پیغام آ گیا۔

''تمام سامان از قسم علم، نقارہ، ہاتھی، گھوڑے بارگاہِ شاہی میں روانہ کر دو۔ ہندوستان کے پرگنوں میں سے جس قدر چاہو اپنی جاگیر میں مقرر کرا لو تاکہ گماشتے ان پرگنات کی آمدنی وصول کر کے تم کو بھیجتے رہیں۔''

خان خاناں کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اسے رخصت پر حج کے لیے نہیں بھیجا جا رہا ہے بلکہ خارج البلد کیا جا رہا ہے۔

یہ سب ان سازشوں کا حصہ تھا جو ماہم انکہ اور اس کے بیٹے ادہم خاں نے پھیلائی تھیں۔ اکبر کو یہ باور کرایا گیا تھا کہ خان خاناں کے عزائم کچھ اور ہیں۔ وہ آگرہ اس لیے چھوڑ رہا ہے کہ آگرہ سے نکل کر کوچ کرتا ہوا پنجاب تک پہنچے اور پنجاب فتح کر کے خود مختار حکومت قائم کرے۔ یہ خبر ایسی نہیں تھی جسے اکبر نظر انداز کر دیتا۔ اسی لیے اس نے علم و نقارہ رکھوا لیا۔ گویا خان خاناں کو بے دست و پا کر دیا۔

وہ میوات تک پہنچا تھا کہ اسے بادشاہ کا یہ پیغام پہنچا۔ وہ میوات سے ناگور چلا گیا اور چند امراء کے سوا باقی سب کو رخصت کر دیا۔ سامانِ شاہی بھی واپس کر دیا اور حج بیت اللہ کی تیاریاں کر کے کوچ کر لیا۔

اکبر بھی پنجاب فتح کرنے کے ارادے سے دہلی سے نکلا اور پرگنہ جھجر میں پہنچا۔

خان خاناں بہ ارادۂ حج ناگور سے روانہ ہوا تھا لیکن اب وہ خان خاناں نہیں تھا، محض بیرم خاں تھا اور وہ بھی بادشاہِ ہند کا ستاب یافتہ۔ سب کی ہمتیں دراز ہو گئی تھیں۔ جدھر سے گزرتا راستے کے زمیندار حملہ آور ہوتے۔ راہزن بھی تلاش میں تھے کہ جہاں موقع ملے لوٹ مار کریں۔ یہ خبریں بھی پہنچ رہی تھیں کہ مخالفوں نے اسے راستے ہی میں ہلاک کرا دینے کی سازش تیار کر رکھی ہے۔ اپنے عہدِ انتظامی میں اس نے جن حکام اور بااثر افراد کو سزائیں دی تھیں، وہ سب اس کے خلاف آ کھڑے ہوئے تھے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر اس کے اکثر ہمراہی بھی رفاقت ترک کر کے قافلے سے نکل گئے۔

☆☆☆

خان خاناں کی بساط الٹتے ہی اس کے پٹے ہوئے مہرے اٹھ اٹھ کر خانہ بندی کرنے لگے۔ ان میں سب سے آگے ملا پیر محمد تھا جسے خان خاناں نے مکہ معظمہ بھیج دیا تھا۔ وہ ان دنوں گجرات میں تھا اور موسم بدلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ موسم بدلتے ہی اس کے ساتھیوں نے خطوط لکھ کر اسے حالات سے آگاہ کر دیا۔ جب اس نے اچھی طرح جان لیا کہ معاملات بگڑ گئے ہیں تو جتنی جلد ممکن ہو سکا، اس نے خود کو بادشاہ کے حضور میں پہنچایا اور مراحمِ خسروانہ سے سرفراز ہوا۔ بادشاہ نے اس کے پچھلے زخموں کا ازالہ کرتے ہوئے ناصر الملک کا خطاب عطا کیا اور علم و نقارہ مرحمت ہوا۔ ماہم انکہ کو ایک موقع اور ملا۔ اس نے اکبر سے ملاقات کی اور خان خاناں کو مزید ذلیل کرنے کے لیے ایک اور پانسا پھینکا۔

''حضور! خان خاناں کے مظالم کی داستان بڑی

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

ماہنامہ سرگزشت کراچی

شمارہ جون 2018ء کی جھلکیاں

علم کار قلم کار

ایشیا، یورپ، امریکا و افریقا میں یکساں مقبول مصنف کی داستان

زخم نہاں

بھارتی فوجیوں کو تگنی کا ناچ نچانے والے غازی کو بھارتی کمانڈر انچیف دیکھنے کا شائق تھا

بے مثال

پاکستان کا ایک معروف اداکار جس نے ہوٹلوں میں بیرے کا کام کیا

واپسی

ایک ایسی سچ بیانی جو عرصہ تک یاد رہے گی

ان کے علاوہ دلچسپ سفر کہانی ''شمشال سے ٹورنٹو'' اور لاجواب طویل داستان ''ناسور'' ساتھ میں بہت سی دلچسپ سچ بیانیاں، سچے قصے اور سچے واقعات

بس ایک بار پڑھ کر دیکھیں آپ خود گرویدہ ہو جائیں گے

طویل ہے۔ اس نے انتظامی امور کو بہانہ بنا کر جن لوگوں پر مظالم کیے اس کی ایک مثال ملا پیر محمد بھی ہے۔ خان خاناں نے نہ صرف اس کا منصب اس سے چھینا بلکہ اس کو زبردستی مکہ معظمہ بھیجنے کی سعی کی۔ اب انصاف کا تقاضا تو یہی ہے کہ اسی ملا پیر محمد کو اس بات پر متعین کیا جائے کہ وہ بھی خان خاناں کے تعاقب میں روانہ ہو اور اسے زبردستی حج بیت اللہ پر روانہ کرے۔"

بادشاہ کو یہ مشورہ پسند آیا۔ اس نے ملا پیر محمد کو ایک جماعت کے ساتھ خان خاناں کے تعاقب میں متعین کیا کہ وہ اسے بزور مکہ معظمہ بھیج دے۔

ملا پیر محمد اس تعاقب کے لیے روانہ ہوا اور اکبر دہلی واپس آ گیا۔

خان خاناں اس وقت بیکانیر کے پرگنے میں تھا۔ رائے کلیان اور اس کا لڑکا رائے سنگھ اس نواح کے زمیندار تھے۔ انہوں نے جب بیرم خاں کو اپنے علاقے میں یوں بے یار و مددگار دیکھا تو ہاتھ جوڑ کر سامنے آئے۔

"مہاراج! آسمان ایسے رنگ بھی بدلتا ہے یہ تو ہم نے سوچا بھی نہیں تھا۔ کل تک جو ہندوستان کا مالک تھا، آج یوں دھوپ بھرے میدان میں کھڑا ہے۔"

"زندگی ہر طرح کے رنگ دکھاتی ہے۔"

"آپ نے اکبر بادشاہ کی سلطنت قائم رکھنے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کیے اور بادشاہ کا آپ کے ساتھ یہ سلوک......!"

"اس میں ان کا کوئی قصور نہیں۔ جو لوگ چاہتے تھے میرا نہیں ان کا اختیار قائم ہو، انہوں نے بادشاہ کو ورغلایا۔ ظلِ الٰہی کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ سیاہ کیا تھا، سفید کیا تھا۔"

"شاباش ہے آپ کی وفاداری کو...... جس نے آپ کا خطاب تک چھین لیا اسے آپ اب بھی ظلِ الٰہی کہہ رہے ہیں۔"

"اس لیے کہ ان کے احسانات ہیں مجھ پر۔"

"خدمات تو آپ کی بھی بہت ہیں۔"

"بادشاہی ان کا حق ہے۔ میرا کیا ہے، میں تو ان کا ملازم تھا۔"

"ہم بھی تو آپ کے ملازم ہیں۔ ہمیں خدمت کا موقع دیجیے۔ جو کچھ ہمارے پاس ہے، آپ ہی کا دیا ہوا ہے۔ جب تک آپ کا جی چاہے ہمارے پاس رہیے۔"

"میں تو کعبۃ اللہ کی زیارت کی نیت سے نکلا ہوں۔"

"کچھ دن ہمارے پاس رہ کر تھکن اتار لیجیے، اس کے بعد یہ نیک کام بھی کر لیجیے گا۔"

یہ دونوں باپ بیٹے نہایت خلوص کے ساتھ پیش آئے اور مہمان داری کے لوازم بجا لائے۔

بیرم خاں نے دوبارہ حج بیت اللہ کا ارادہ کر لیا تھا مگر اب اس نے سمتِ سفر بدل دی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ یہ سفر قندھار اور مشہد مقدس کے راستے سے کرے اور نجف اشرف کی زیارت کرتے ہوئے بیت اللہ جائے۔ اس نیت سے اس نے پنجاب کا رخ کیا۔ اپنے بیٹے جس کی عمر تین سال تھی اور متعلقین کو چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

جب اکبر کو یہ خبر پہنچی کہ خان خاناں پنجاب کی طرف چلا گیا ہے اور مخالفوں نے یہ اضافہ بھی کیا کہ اس نے حج بیت اللہ کا ارادہ ترک کر دیا ہے اور پنجاب میں خود مختار حکومت قائم کرنے کا خواہاں ہے تو اس نے ماہم انکہ کی سربراہی میں لشکر روانہ کیا۔ یہ خبریں سن کر وہ بھی فوج اور جمعیت فراہم کرنے اور مقابلے کی تیاریاں کرنے پر مجبور ہو گیا اور اس تیاری کے ساتھ قندھار جانے کے لیے عازم پنجاب ہوا۔

جب شاہی فوجیں قصبہ دکدار اور وہاں سے پرگنہ کوتاور پہنچیں تو انہوں نے بیرم خاں کو راستے میں روک لیا۔ بیرم خاں نے اپنا قاصد ماہم انکہ کے پاس بھیجا اور کہلوایا کہ وہ اس کا راستہ چھوڑ دے۔ اس کا ارادہ ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ پنجاب فتح کرے۔ وہ بذریعہ قندھار حج کو جانا چاہتا ہے لہٰذا اسے جانے دیا جائے لیکن ماہم انکہ تو دل سے یہ چاہتا تھا کہ خان خاناں بیرم خاں شاہی فوجوں سے ٹکرا جائے تاکہ وہ اس پر بغاوت کا الزام ثابت کر سکے۔ اس نے اس کے قاصد کو گرفتار کر لیا اور جنگ پر آمادہ ہو گیا۔ اب خان خاناں کے سامنے بھی جنگ کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ مجبوراً صفیں آراستہ کر کے شاہی لشکر سے مقابلہ کیا۔ طرفین میں خوب زور کی جنگ ہوئی۔ فریقین کے بہادر سپاہی ایک دوسرے کے خون کے دریا بہانے لگے۔ بیرم خاں کے سپاہیوں نے بڑی بہادری کا مظاہرہ کیا اور شاہی لشکر میں کھلبلی مچا دی لیکن کب تک؟ شاہی لشکر نے جب بیرم خاں کے قلب پر حملہ کیا اور کئی نامی گرامی لوگوں کو قتل کر دیا تو بیرم خاں میدانِ جنگ سے بھاگ نکلا اور کوہ "سوالک" کی طرف چل دیا۔

بادشاہی لشکر نے بھی خان خاناں کے تعاقب میں "سوالک" کی طرف حرکت کی اور "تلواڑہ" کے نواح میں پہنچا کہ جو کوہ سوالک میں راجا گوبند چند کے رہنے کی جگہ تھی اور بیرم خاں وہاں قلعہ بند ہو گیا تھا۔ راجا گوبند چند بیرم خاں کا حلیف تھا لہٰذا اس کے آدمیوں نے شاہی

لشکر سے جنگ کی۔ شاہی لشکر کو شکست ضرور ہو گئی لیکن راجا کے اتنے آدمی مارے گئے کہ بیرم خاں سخت افسردہ ہوا۔ وہ شخص جس نے ہزاروں کے سر کٹتے ہوئے دیکھے تھے، اس وقت بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا۔ اس نے اسی وقت اسی عالم افسردگی میں ایک معروضہ تحریر کیا اور اکبر کے پاس بھجوا دیا۔

"میرا خاندان تین پشتوں سے خانوادۂ عالیہ کا خدمت گزار رہا ہے لیکن میری ان موروثی دیرینہ خدمات کو حاسدوں اور دشمنوں نے اپنی سخن سازیوں سے پامال کر دیا اور مجھے حضور والا کا نمک حرام ٹھہرا دیا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ میرے خون کو حلال قرار دے کر قتل کا فتویٰ دے دیا ہے۔ اپنی جان کی حفاظت ہر مذہب میں واجب ہے لہٰذا میں چند رفیقوں کے ساتھ اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہوں لیکن میری اس کوشش کو بھی اہلِ عناد میری بغاوت پر محمول کر رہے ہیں چونکہ میں نے حج بیت اللہ کا ارادہ کر لیا ہے اس لیے خدمتِ والا میں حاضری کو اب میں کفر سمجھتا ہوں۔ ساری دنیا واقف ہے کہ ہم ترکوں کے خاندان میں کبھی کوئی نمک حرام پیدا نہیں ہوا۔ میں بھلا کس طرح اس گناہ کا مرتکب ہو سکتا ہوں۔ میرا تو ارادہ صرف یہ ہے کہ مشہد جا کر امام رضا کے روضہ نجف اشرف اور کربلا کے آستانوں کی زیارت کروں اور وہاں سے حضور والا کے حق میں دعا کرنے کے لیے از سرِ نو کعبۃ اللہ کا احرام باندھ کر روانہ ہو جاؤں اور اگر حضور مجھے نمک حراموں کے ذیل میں رکھ کر واجب القتل سمجھتے ہیں تو میری ایک درخواست ہے کہ آپ کسی ایک اپنے بے نام و نشاں غلام کو مقرر کر کے بھیج دیں کہ وہ بیرم کا سر کاٹ کر نیزے پر چڑھا دے اور بدخواہانِ دولت کی عبرت کے لیے اس کی تشہیر کرتے ہوئے حضور کے قدموں میں لے جا کر ڈال دے۔"

☆☆☆

جب اکبر کے سامنے یہ عرضداشت پڑھی گئی تو اس پر رقت طاری ہو گئی۔

بیرم خاں کا ستارۂ اقبال سیاہ بختیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ کوئی حیرت و استعجاب کا معاملہ بھی نہیں تھا کیونکہ اس دنیا میں ہر کمال کے لیے زوال اور ہر بلندی کے ساتھ پستی لگی ہوئی ہے۔ بیرم خاں کے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا۔ اپنوں سے زیادہ دوست اس کے ساتھ دغا کر رہے تھے۔ وہ جب ناگور سے روانہ ہوا تھا تو اس نے اپنا زائد الضرورت مال و اسباب درویش محمد خواجہ اور مشیر محمد خواجہ کے پاس رکھوا دیا تھا تاکہ وقت پڑنے پر وہ اسے مل جائے اور لوٹ مار کرنے والوں کے ہاتھ نہ پڑے۔ اب جو اس نے اپنے ایک محرمِ راز کو بعض ضروری اشیا لانے کے لیے بھیجا تو ان یارانِ قدیم نے اس شخص کو مجرم بنا کر قید کر دیا اور صاف انکار کر دیا کہ ان کے پاس کوئی امانت نہیں۔ درمیان میں اس مال و اسباب کے جو ذمے دار بنے تھے، ان سب کو ایسے ٹھکانے لگا دیا کہ کسی کا نام و نشان باقی... ...نہیں رہا۔ غرض اس نے جس طرف بھی رخ کیا، اس نے طوطا چشمی سے آنکھیں پھیر لیں۔

خان خاناں کی طرف سے بھیجی ہوئی عرضداشت اکبر کے ملاحظے میں آ چکی تھی۔ اسے رہ رہ کر خان خاناں کی خدمات یاد آ رہی تھیں۔ اس نے اپنے ایک معتمد مولانا عبداللہ سلطان پوری کو بعض شاہی مقربین کے ہمراہ حکم دیا کہ وہ خان خاناں کے پاس جائیں اور اس کو شاہانہ وعدوں سے مطمئن کر کے ہمارے حضور لے کر آئیں۔

اس شاہی فرمان کے مطابق تمام امراء و خوانین استقبال کے لیے گئے اور خان خاناں کو نہایت عزت و احترام کے ساتھ لشکر میں لائے۔

خان خاناں نے روئے عجز زمینِ نیاز پر رکھ کر معافی کی درخواست کی۔ اکبر نے بھی مراحمِ خسروانہ سے اس پر نوازش کی اور خلعتِ خاصہ عطا کیا اور نہایت رقتِ قلبی سے فرمایا۔

"ہمارے ذمے تمہارے موروثی حقوق ہیں۔ اگر تمہارا ارادہ دوبارہ ملازمت میں آنے کا ہے تو ہم کالپی اور چندیری کی جاگیریں عطا کرتے ہیں اور اگر حضور میں رہنا چاہو تو ہم کسی وقت بھی تمہاری طرف سے غفلت نہیں برتیں گے اور غم خوار و نگراں رہیں گے اور اگر تم بیت اللہ جانا چاہو تو تم کو عزت و آبرو کے ساتھ روانہ کر دیں گے۔"

بیرم خاں نے جواب دیا۔ "الحمدللہ انسان کی جو بڑی سے بڑی آرزو ہو سکتی ہے، وہ جنت آشیانی (ہمایوں) اور حضور والا کے رکاب میں بندے کو حاصل ہو گئی۔ اب تو میرے دل کی بس یہ مراد تھی کہ قدم بوسی کی تجدید کر کے اپنے قصوروں کو معاف کرا لوں اور کعبۃ اللہ جانے کی اجازت حاصل کر لوں۔ یہ نعمت حاصل ہو گئی ہے، اس کا شکر میں اپنے دل و زبان سے ادا نہیں کر سکتا۔ اب میں امیدوار ہوں کہ حضور اپنے فضلِ بے پایاں سے میرے قصوروں پر معافی کا خط کھینچ دیں گے اور بیت اللہ کے سفر کی اجازت فرمائیں گے۔"

اکبر نے پچاس ہزار روپے سفر خرچ کے لیے دیے اور

سفر کے لوازمات مہیا کر کے اسے رخصت کر دیا۔ خان خاناں گجرات روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

خان خاناں نے خود کو زوال آمادہ دیکھتے ہوئے بہادر خاں کو مالوہ کی مہم سے واپس بلا لیا تھا۔ اس طرح یہ مہم ادھوری رہ گئی تھی۔ اکبر کو اس وقت یہ خیال آیا کہ اس مہم کو تکمیل تک پہنچا کر ولایت مالوہ کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا جائے۔

اس طرح اسے یہ بھی دکھانا مقصود تھا کہ خان خاناں کے بغیر بھی وہ مہمات سر کر سکتا ہے کیونکہ اب سلطنت کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

ادہم خاں، ملا پیر محمد اور کئی دوسرے امراء اس ولایت کی فتح کے لیے متعین ہوئے اور کوچ پر کوچ کرتے ہوئے روانہ ہو گئے۔

مالوہ کا حکمران باز بہادر اس وقت ''سارنگ پور'' میں تھا لہٰذا لشکر نے اسی شہر کا رخ کیا۔ باز بہادر عیش و عشرت میں ایسا مشغول تھا کہ لشکر کی آمد سے بے خبر رہا یہاں تک کہ لشکر سارنگ پور سے دس کوس کے فاصلے پر پہنچ گیا۔ بڑی ہمت کر کے اس کے ملازموں نے اس کے رنگ میں بھنگ ڈالا اور اسے شاہی لشکر کی آمد کی اطلاع دی۔ اس نے غضب ناک نظروں سے ملازموں کی طرف دیکھا۔

''کاش! تم میں اتنی عقل ہوتی۔ ایسی منحوس اطلاع مجھے کچھ دیر اور نہ دیتے۔ بہرحال اب میں کچھ نہ کچھ کرتا ہوں۔'' وہ سارنگ پور سے نکلا اور دو کوس کے فاصلے پر واقع ایک قلعے میں محصور ہو گیا۔ یہ قلعہ ہرگز ایسا نہیں تھا کہ اس میں زیادہ دن محصور رہا جا سکتا لہٰذا باز بہادر نے باہر نکل کر لڑنے کی ٹھان لی۔

اس کے ساتھ جو افغان امراء تھے انہوں نے بھانپ لیا تھا کہ اگر شاہی لشکر سے مقابلہ ہوا تو ان میں سے کوئی بھی نہیں بچے گا۔ وہ تو اس امید پر باز بہادر کے ساتھ آ گئے تھے کہ انہیں محفوظ پناہ گاہ مل جائے گی لیکن جب جنگ کی نوبت آنے لگی تو وہ باز بہادر کا ساتھ چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ اب باز بہادر بے دست و پا تھا۔ شاہی لشکر نے قلعے کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ سیڑھیاں لگائی جا رہی ہیں تو اس نے ایک برج پر کمند ڈالی اور قلعے کی دیوار پر چڑھ گیا۔ یہاں سے اس نے دیکھا کہ قلعے کے نیچے ایک جگہ ایسی ہے جہاں اکبری سپاہیوں کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ اس کی محبوبہ روپ متی قلعے کے اندر تھی۔ وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ دیوار سے نیچے اترے اور روپ متی کو لے کر اس مقام سے باہر نکل جائے کہ شاہی لشکر قلعے کے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ قلعے میں ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ اس کی بچی کھچی فوج لڑ ضرور رہی تھی لیکن صاف نظر آ رہا تھا کہ اس کا مختصر سا لشکر بہت جلد مغلوب ہو جائے گا۔ اب اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ نیچے اترتا اور روپ متی کو ساتھ لیتا۔ اب تو حالات یہ تھے کہ اکیلا ہی فرار ہو سکتا تھا۔ اس نے اسی رسی کو جس سے چڑھ کر وہ اوپر آیا تھا، نیچے لٹکایا اور اتر آیا۔ قریب ہی ایک نالا تھا جو خشک پڑا تھا۔ وہ اس نالے میں اتر گیا۔ اسے معلوم تھا یہ نالا اسے کہاں پہنچا دے گا۔ وہ اس نالے میں چلتا رہا۔ یہ نالا ایک جنگل میں داخل ہوتا تھا۔ ایک جگہ ایک درخت نالے کے اندر جھکا ہوا تھا۔ اس نے اس درخت کی ایک موٹی شاخ پکڑی اور نالے سے باہر نکل آیا۔ یہ اس کا اپنا علاقہ تھا۔ وہ یہاں کے چپے چپے سے واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ جنگل ختم ہوتے ہی ایک گاؤں ہے۔ وہاں کے لوگ شاید اسے پہچان لیں۔ اگر نہ بھی پہچانے تو کوئی نہ کوئی مدد ضرور کریں گے۔ وہ چلتا رہا یہاں تک کہ جنگل ختم ہو گیا۔ کچھ دور چلنے کے بعد اسے ایک چشمہ نظر آیا۔ اس چشمے پر کچھ لوگ نہا رہے تھے۔ وہ وہاں پہنچا تو لوگوں کی نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ اس کا شاہی لباس دیکھ کر سب کو حیرت ہو رہی تھی۔ آخر ایک شخص نے اس سے پوچھا۔

''اے شخص! تو مسافر ہے...... کہیں کا بادشاہ ہے...... کیا ہے؟''

''اب تم نے پوچھ ہی لیا ہے تو میں تمہیں بتاؤں۔ میں تمہارا امیر ہوں باز بہادر۔''

''تمہارا کہنا سر آنکھوں پر لیکن ہم کیسے مان لیں۔ تمہارے پاس گھوڑا ہے نہ محافظ دستہ۔ تم یقیناً باز بہادر کے کپڑے چھین کر بھاگے ہو۔''

''اکبر بادشاہ کی فوجیں سارنگ پور تک آ گئی ہیں۔ مجھ میں ان کے مقابلے کی طاقت نہیں تھی۔ بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا ہوں۔ اگر تم مجھے کوئی اچھا گھوڑا فراہم کر دو تو میں بیجاگڑھ کی طرف نکل جاؤں۔ وہاں جا کر تیاری کروں اور اپنے علاقے کو دوبارہ فتح کروں۔''

''وہاں جا کر کیا تیاری کرو گے؟ تمہارے پاس تو سپاہی تک نہیں ہیں۔''

''بیجاگڑھ کے نزدیک ہی برہان پور ہے۔ وہاں کا حاکم میرا دوست ہے۔ اس کی مدد سے میں دوبارہ مالوہ کو فتح

کروں گا۔ اگر میں کامیاب ہو گیا تو تم لوگوں کا احسان کبھی نہ بھولوں گا اور اس گاؤں میں پکے مکانات بنوا دوں گا۔''

''ہم نے تمہاری بات سن لی۔ اب تمہیں گاؤں کے مکھیا کے پاس چلنا ہوگا۔ وہ تمہیں گھوڑا اور تمہاری حفاظت کے لیے آدمی مہیا کر سکتا ہے۔''

باز بہادر ان لوگوں کے ساتھ گاؤں کے مکھیا کے پاس چلا گیا۔ وہ ایک بوڑھا مگر صحت مند آدمی تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ باز بہادر اس سے ملنے آیا ہے تو وہ استقبال کے لیے پورے قد سے کھڑا ہو گیا۔

''میں نے آپ کو کبھی نہیں دیکھا لیکن میرا دل کہتا ہے کہ آپ ہی باز بہادر ہیں۔ میرے پاس ایک عربی نسل کا شاندار گھوڑا ہے۔ میں وہ آپ کو دے سکتا ہوں لیکن ایک شرط پر۔''

''میں اس کی قیمت دے دوں گا۔''

''اپنے ان داتا سے کوئی قیمت لیتا ہے۔ مجھے قیمت نہیں چاہیے۔ میری شرط تو یہ ہے کہ آپ ایک دن اور ایک رات میرے مہمان رہیں گے۔ مجھے خدمت کا موقع دیں گے۔ اس کے بعد بھلے تشریف لے جائیں۔''

باز بہادر ان لوگوں کی ضد کے آگے مجبور ہو گیا۔ اسے ایک بڑے مکان میں ٹھہرا دیا گیا جہاں کئی خدمت گار اس کی خدمت کے لیے موجود تھے۔

دوسرے دن اس کی خدمت میں گھوڑا پیش کر دیا گیا اور وہ روانہ ہو گیا اور بیجاگڑھ کے کوہستان میں جا کر پناہ لی۔ یہاں مالوہ کا سب سے مضبوط و مستحکم قلعہ تھا۔

اب باز بہادر کو حاکم برہان پور کی مدد کی ضرورت تھی۔

☆☆☆

باز بہادر جب سارنگ پور سے فرار ہوا اور اس کے فرار کی اطلاع پھیلی تو اس کی فوج نے اس لڑائی کو فضول سمجھا۔ ادہم خاں نے معمولی جھڑپوں کے بعد بہ آسانی پورے مالوہ پر قبضہ کر لیا۔

قلعے میں جتنی عورتیں تھیں، سب گرفتار ہو گئیں۔ انہی میں باز بہادر کی محبوبہ روپ متی بھی تھی جس کے حسن و جمال کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ ادہم خاں نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ عورتوں کے اس ہجوم میں روپ متی کو تلاش کریں۔ سپاہی قلعے میں گئے اور روپ متی کو تلاش کر لیا۔ ادہم خاں اس کے حسن و جمال سے لطف اندوز ہونے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔ اس نے اسے بلایا اور قربت کا مطالبہ کیا۔ روپ متی ایک وفا شعار عورت تھی۔ پہلے تو اس نے کبھی نرم ہو کر کبھی گرم ہو کر اس معاملے کو ٹالنا چاہا لیکن جب اس نے دیکھا کہ ادہم خاں کے سامنے کچھ پیش چلنے کی نہیں تو اس نے بڑی منت و عاجزی کے ساتھ ایک دن کی مہلت مانگی۔ دوسرے دن اس نے غسل کیا، بناؤ سنگھار کیا، کپڑے بدلے، عطر لگایا اور یہ مشہور کر دیا کہ آج وہ ادہم خاں سے ملنے جا رہی ہے لیکن ادہم خاں نے اس کی لاش کو دیکھا کیونکہ اس نے زہر کھا لیا تھا جس نے ادہم خاں تک پہنچتے پہنچتے اپنا کام کر دکھایا۔

ادہم خاں تلملا کر رہ گیا لیکن اس کی اشک شوئی کے لیے ابھی بہت سامان باقی تھا۔ باز بہادر نے بہت سی گانے والیاں اور طوائفیں جمع کر رکھی تھیں۔ ادہم خاں نے ان سب کو اپنے پاس روک لیا۔ صرف کچھ ہاتھی بادشاہ کے پاس روانہ کر دیے۔ اکبر کو عورتوں اور دوسرے مالِ غنیمت کو روک لینا ناگوار گزرا۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ ادہم خاں قلعہ گاگرون فتح کرنے کے لیے جا رہا ہے۔ اکبر نے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ ادہم خاں کا محتاج نہیں... خود قلعہ گاگرون کا عزم کر کے روانہ ہوا۔ صرف پانچ سو سوار اس کے ساتھ تھے۔ اس نے یہ سفر اس تیزی سے طے کیا کہ ایک ماہ کی مسافت ایک ہفتے میں طے کر کے قلعہ گاگرون کے دروازے پر اتر گیا۔ قلعہ دار ہوشیار تھا۔ لڑنے کے بجائے قلعے کی چابیاں لے کر حاضر ہو گیا۔

اکبر نے یہاں زیادہ ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔ اسے تو ادہم خاں کی خبر گیری کرنی تھی۔ ادہم خاں ابھی جو قلعہ گاگرون کے لیے روانہ ہوا تھا راستے میں تھا کہ اکبر اس کے سامنے آ گیا۔ ادہم خاں کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ اکبر مالوہ میں نظر آئے گا اور وہ بھی اس صورت میں کہ قلعہ گاگرون فتح کر چکا ہوگا۔ ادہم خاں اسے سارنگ پور لے کر آیا جہاں وہ مقیم تھا اور اپنی آبرو بچانے کے لیے سارا مال و اسباب خدمت میں لا کر پیش کر دیا اور عفو و معذرت کے لیے گڑگڑانے لگا۔

''میری نیت میں کھوٹ آ گئی تھی۔ میں اپنے قصوروں کی معافی چاہتا ہوں۔ اگر آئندہ یہ حرکت مجھ سے سرزد ہو تو بے شک آپ کی تلوار ہوگی اور میری گردن۔ یہ گردن اب بھی حاضر ہے۔'' اس نے اپنا سر اکبر کے قدموں پر رکھ دیا۔

اکبر نے اس کے قصور معاف کر دیے اور خلعت و انعام عطا کیا لیکن اتنا ضرور کیا کہ اسے آگرہ پہنچنے کا حکم دیا اور مالوہ کی حکومت ملا پیر محمد کے سپرد کر کے خود بھی آگرہ واپس چلا گیا۔

اسی اثنا میں خبر ملی کہ عدلی شاہ کا بیٹا شیر خاں جو پچھلے

کچھ عرصے سے برابر مفقود الخبر تھا اچانک تیس ہزار سوار فراہم کر کے شرقی علاقے میں داخل ہو گیا ہے اور وہاں اس نے بڑا ہنگامہ مچا رکھا ہے۔ خان خاناں کے چلے جانے کے بعد خان زماں ہی اکبر کا سہارا رہ گیا تھا۔ اس نے خان زماں کو طلب کیا اور اس کے سامنے تمام معاملہ رکھا۔ خان زماں نے اسے اپنی خوش قسمتی سمجھا کہ خان خانان کا کانٹا نکل جانے کے بعد بادشاہ اس پر اعتبار کرنے لگا ہے۔ اس نے اپنے بھائی بہادر خاں کو ساتھ لیا اور اس فتنے کی سرکوبی کے لیے روانہ ہو گیا۔

شیر خاں نے چالیس ہزار سواروں کے ساتھ جونپور کو مغلوں کے قبضے سے نکالنے کے لیے دریائے گنگا کو پار کیا۔ خان زماں بھی بارہ ہزار سپاہیوں کے ساتھ اس کے مقابلے پر آیا۔ شاہی لشکر تعداد میں کم تھا لیکن خان زماں کا مستقبل داؤ پر لگا ہوا تھا۔ اس نے نہایت بہادری کا مظاہرہ کیا۔ ایک زبردست معرکے کے بعد شیر خاں کے قدم اکھڑ گئے۔ بھاگتے ہوئے پٹھان ہزاروں کی تعداد میں قتل ہو گئے۔

اس فتح کے بعد خان زماں اور بہادر خاں کی شجاعت و دلیری کی بڑی شہرت ہوئی۔

دوسروں نے تو ان کی بہادری کو سراہا ہی تھا لیکن یہ خود بھی اپنی بہادری اور خود مختاری کے نشے میں ایسے بدمست ہوئے اور وہی حرکت کر بیٹھے جو ادہم خاں سے مالوہ میں سرزد ہوئی تھی۔ گرفتار شدہ ہاتھیوں میں سے ایک بھی بادشاہ کی خدمت میں پیش نہ کیا۔

اس نے جو فتح نامہ دربار میں بھیجا، اس میں ان ہاتھیوں کا ذکر ہی نہیں تھا۔ اس بے قاعدگی کی اطلاع جب جاسوسوں کے ذریعے اکبر کو ہوئی تو اس نے یہ مشہور کر دیا کہ وہ [illegible] کے لیے آ رہا ہے۔ کچھ دور جا کر راستہ بدلا اور یلغار کرتا ہوا لشکر کے قریب پہنچ گیا۔ خان زماں کو جب معلوم ہوا کہ بادشاہ سلامت بنفس نفیس تشریف لائے ہیں تو استقبال کے لیے آیا۔ [illegible] کچھ ایسا ہوا تھا کہ دل میں چور تھا۔

''تم نے جو فتح نامہ ارسال کیا تھا اس میں ہاتھیوں کا کوئی ذکر نہیں جبکہ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ بڑی تعداد میں ہاتھی تمہارے ہاتھ لگے ہیں۔''

''ظلِ الٰہی! یہ میری نیت کی خرابی نہیں۔ میں نے تو ان ہاتھیوں کو اپنے مقتول ہمراہیوں کا خون بہا سمجھ کر اپنے پاس رکھ لیے۔''

''یہی عذر فتح نامے میں درج کر دیتے۔''

''مجھ سے بھول ہو گئی۔''

''آج ہمیں خان خاناں کی یاد آ گئی۔ ایسی بھول اس سے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ پھر بھی یہ تمہاری پہلی بھول ہے اس لیے ہم تمہیں معاف کرتے ہیں۔ ہم نے سوچا تھا تمہیں اس علاقے کا حاکم مقرر کر دیں گے مگر اب تم اپنی جاگیر پر چلے جاؤ۔''

اکبر نے شمس الدین خان اعظم کو وکیل بنا کر ٹوڈرمل کو وزارت کی پیش کاری پر مقرر کر دیا۔

خان زماں کے دل میں ان تقرریوں سے میل آ گیا۔ اس نے بڑی مشکل سے خان خاناں کا کانٹا صاف کیا تھا۔ اس نے سوچا اب وہ خود اکبر کی نظروں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہے۔ امراء تو بادشاہ کی نظروں کو دیکھتے ہیں۔ اس حق تلفی کو دیکھ کر دوسرے امراء کو بھی ہمت ہوگی اور وہ ہر جگہ میری مخالفت کریں گے لیکن میں خان خاناں نہیں ہوں کہ میدان چھوڑ کر چلا جاؤں۔ آئندہ دیکھو میں کیا کرتا ہوں۔

وہ اپنی جاگیر کی طرف لوٹ گیا لیکن اس کا دل صاف نہیں تھا۔

☆☆☆

اکبر کی فتوحات اور ملک رانی کا شہرہ بتدریج بلند ہوتا جا رہا تھا۔ اب اکبر نے ان قلعوں کی طرف توجہ کی جو ہمیشہ سے آزاد چلے آ رہے تھے اور کبھی مغلوں کی اطاعت میں نہیں آئے تھے۔ ان ہی میں ایک قلعہ میرٹھ (اس سے مراد شہر میرٹھ نہیں بلکہ یہ ناگور اور اجمیر کے درمیان ایک قلعے کا نام تھا) بھی تھا۔ یہ قلعہ راجا مالدیو کے قبضے میں تھا۔ اکبر نے مال دیو پر فوج کشی کی، کمان شرف الدین حسین کو دی۔ یہ قلعہ ایک پہاڑ پر واقع تھا اور نہایت مستحکم سمجھا جاتا تھا۔

راجا مالدیو کے دونوں ہندو سردار جگ مل اور دیوند اس جو اس وقت قلعے میں موجود تھے، قلعہ بند ہو گئے۔ شرف الدین نے قلعے کا محاصرہ کر لیا اور نقب لگانے کا حکم دے دیا۔ کھدائی شروع ہو گئی۔ ایک روز ایک نقب میں جو برج کے بالکل نیچے تھی بارود کو آگ لگائی گئی۔ زوردار دھماکا ہوا اور برج تباہ ہو گیا اور حصار میں ایک راستہ پیدا ہو گیا۔ مغل سپاہیوں نے قلعے کے اندر داخل ہونے کے لیے اس نئے راستے کا رخ کیا۔ راجپوتوں نے مزاحمت کی۔ فریقین میں زبردست لڑائی ہوئی۔ جب مغلوں کو کامیابی کی توقع نہیں رہی تو انہیں واپس ہونا پڑا۔

مغلوں کی اس پسپائی سے راجپوتوں نے پورا فائدہ اٹھایا اور رات ہی رات میں راستہ بند کر دیا۔ محاصرہ بدستور جاری رہا۔

چند روزہ محاصرے کے بعد ہی راجپوت عاجز

آ گئے۔ اس مصیبت سے نجات پانے کے لیے صلح کی درخواست کی گئی۔ شرائط یہ طے ہوئیں کہ مالدیو کا چھوٹا بھائی قلعے میں ایک ہفتے تک رہے گا تا کہ عورتوں اور بچوں کو نکالنے کے بعد وہ ہاتھی، ذخیرے، سامان اور قلعہ بادشاہی ملازموں کے حوالے کر دے۔ جودھ پور کے خالی ہونے تک راجا مالدیو ''قلعہ سامان'' میں جو ایک دشوار گزار پہاڑ کے دامن میں تھا، جا کر رہے گا۔

شرف الدین نے یہ شرط قبول کر لی مگر راجا کے نکل جانے کے بعد راجا کا بھائی اور شرف الدین بعض باتوں پر اتفاق نہ کر سکے یہاں تک کہ دوبارہ لڑائی چھڑ گئی اور مالدیو کے بھائی نے راجپوتوں کے پرانے دستور کے مطابق عورتوں اور بچوں کو قتل کر دیا اور پانچ سو سواروں کو لے کر بادشاہی فوج کے مقابل نکل آیا اور بڑی بہادری سے لڑتے ہوئے جان دے دی۔

شرف الدین نے جودھ پور پر قبضہ کر لیا۔

☆☆☆

باز بہادر حاکم مالوہ نے فرار ہونے کے بعد بیجا گیر یا بیجا گڑھ کے کوہستان میں جا کر پناہ لے لی تھی۔ وہاں اس نے ایک دشوار گزار مقام پر اپنے اہل و عیال کو ٹھہرا دیا اور خود وہاں سے برہان پور کے حاکم کے پاس کمک حاصل کرنے چلا گیا۔

ملا پیر محمد جسے اکبر نے مالوہ کا حاکم مقرر کر دیا تھا، باز بہادر کی طرف سے فکر مند رہتا تھا۔ یہ کھٹکا ہمیشہ رہتا تھا کہ کہیں وہ مالوہ پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لیے طاقت جمع نہ کر رہا ہو۔ اسے معلوم ہوا کہ باز بہادر بیجا گیر کے کوہستان میں دیکھا گیا ہے تو اس نے مالوہ کے لشکر کو جمع کر کے ولایت اسیر و برہان پور کو فتح کرنے کا ارادہ کر لیا۔

وہ مالوہ سے نکلا اور بیجا گیر کے کوہستان میں قلعے پر قبضہ کر لیا لیکن باز بہادر اس کے ہاتھ نہ لگا۔ غالباً وہ اس سے پہلے ہی وہاں سے نکل گیا تھا۔ اس نے یہاں سے پیش قدمی کی اور برہان پور کی طرف روانہ ہو گیا۔

پیر محمد کے مقابلے میں باز بہادر کے ساتھ برہان پور کا بادشاہ بھی فوج لے کر نکلا۔ ان کے پاس حاکم برار کی کمک بھی پہنچ گئی۔ برہان پور سے سات آٹھ کوس کے فاصلے پر دونوں فوجوں میں زبردست جنگ ہوئی لیکن پیر محمد سے اس کی فوج خوش نہیں تھی۔ وہ لڑ ضرور رہی تھی لیکن بے دلی کے ساتھ۔ اس کے مقابلے میں باز بہادر واقعی باز بنا ہوا تھا اور جھپٹ جھپٹ کر حملے کر رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پیر محمد کو بری طرح شکست ہوئی اور بادشاہی لشکر کا سارا ساز و سامان لٹ گیا۔ بادشاہی فوج ایک بڑی تعداد میں ماری گئی اور زخمی ہوئی۔

فوج کی اس تباہی کو دیکھ کر وہ اس بری طرح بھاگا کہ دریائے نربدا تک کہیں مڑ کر نہیں دیکھا۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ اطراف و اکناف سے بھیل اور اس علاقے کے مفسد باز بہادر کی مدد کو پہنچ گئے اور مفرور فوج پر ایسا حملہ کیا کہ سواروں کو پیادہ کر دیا۔

یہ گھبرا دینے والے حملے ایسے تھے کہ بہاؤ دیکھے بغیر اس کی فوج نے دریا میں گھوڑے ڈال دیے۔ مجبوراً پیر محمد نے بھی ان کی تقلید کی۔ اب یہ اتفاق ہی تھا کہ اونٹوں کی ایک قطار پیر محمد کے گھوڑے کے قریب پہنچ گئی اور حملہ کر دیا۔ وہ گھوڑے سے جدا ہو کر دریا میں گرا اور پھر کبھی نہ ابھرا۔

اس کے بہت ہی کم ساتھی تھے جو بچ کر نکل سکے۔

جو امراء اس مصیبت سے بچ گئے تھے، وہ کسی نہ کسی طرح مالوہ پہنچے ضرور لیکن اس ولایت کی حفاظت اپنی طاقت سے باہر دیکھی تو آگرہ کی راہ لی اور بادشاہ کے حضور پہنچ گئے۔

باز بہادر نے دوبارہ مالوہ پر قبضہ کر لیا اور اپنے دارالحکومت میں پہنچ کر از سر نو اپنے ملک کے بندوبست میں مشغول ہو گیا۔

اکبر نے اس شکست کی خبر سنی تو نہایت غضب ناک ہوا اور اس نے باز بہادر کی سرکوبی کے لیے عبداللہ خاں ازبک کو دوسرے بہادر سرداروں کے ساتھ متعین کیا۔

اس مرتبہ مالوہ پر حملہ کرنے کے لیے جو فوج بھیجی گئی، وہ ہر طرح سے آراستہ تھی اور اس کے انتظامات اعلیٰ پیمانے پر کیے گئے تھے۔ باز بہادر نے بھی تیاری تو خوب کی تھی۔ دلیرانہ مقابلہ کیا لیکن قسمت میں شکست لکھی تھی۔ فرار ہونے پر مجبور ہو گیا اور اسی بیجانگر کے کوہستان میں جا کر پناہ لی۔

عبداللہ خاں نے کچھ دور تک اس کا تعاقب کیا اور پھر اسے اس کے حال پر چھوڑ کر لوٹ آیا۔

☆☆☆

خان خاناں کو بے وجہ ستانے میں جتنے سازشی کردار تھے، سب اپنے اپنے انجام کو پہنچنے کے قریب تھے اور پہنچ رہے تھے۔ ان کرداروں میں شمس الدین اتکہ اور ادہم خاں پیش پیش تھے۔ شمس الدین کو خان اعظم کا خطاب مل گیا تھا۔ ادہم خاں اس کا اثر رسوخ دیکھ کر حسد کی آگ میں جل رہا تھا اور اس فکر میں تھا کہ خان خاناں کی طرح اسے بھی راہ سے ہٹا دے۔ یہ شمس الدین ماہم اتکہ اور ادہم خاں ہی تھے جو اکبر

کے کان بھرتے رہے تھے اور بالآخر خان خاناں کے خلاف کرنے میں کامیاب رہے تھے۔ اب مکافاتِ عمل کا شکار تھے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں مشغول تھے۔ ادہم خاں بادشاہ کی قربت کی وجہ سے غرور و نخوت کا پیکر بنا ہوا تھا۔ اس نے بہت ریشہ دوانیاں کیں لیکن جب کامیابی کی کوئی صورت نہ ہوئی تو اس نے ایک اور راہ اختیار کی۔ ایک روز خلوت میں داخل ہوا۔ شمس الدین خاں قرآن کی تلاوت کر رہا تھا۔ ادہم خاں نے یہ خیال بھی نہیں کیا کہ وہ تلاوت کر رہا ہے۔ اس نے تلوار نکالی اور شمس الدین ماہم اتکہ کا سر قلم کر دیا۔ پورے محل میں قاتل قاتل کا شور مچ گیا۔ ادہم خاں اس بھگدڑ کا فائدہ اٹھا کر بھاگ سکتا تھا۔ کوئی اسے روکنے والا نہیں تھا لیکن اسے بادشاہ کی قربت کا ایسا نشہ تھا کہ بے خوف ہو کر وہیں کھڑا رہا۔

جہاں یہ قتل ہوا، وہ ایوان بادشاہ کی خواب گاہ کے قریب تھا اور یہ اکبر کے آرام کا وقت تھا۔ اس شور و غل نے اس کے آرام میں خلل ڈال دیا۔ وہ نہایت غضب کی حالت میں تلوار ہاتھ میں لیے باہر نکل آیا۔ باہر آ کر دیکھا تو منظر ہی دوسرا تھا۔ مقتول زمین پر پڑا تھا۔ ایک طرف ادہم خاں تلوار ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔ بادشاہ اس سے مخاطب ہوا۔

"یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟ میرے محل کے نزدیک ایسی بے ہودگی، کیا تم نے اسے قتل کیا ہے؟"

ادہم خاں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اکبر وہاں آ جائے گا۔ اس لیے کوئی بہانہ بھی نہیں تراش سکا تھا۔ کچھ گھبرایا ہوا بھی تھا۔ اس نے بادشاہ کے تقرب پر بھروسا کر کے آگے بڑھ کر اکبر کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ یہ سخت بے ادبی تھی۔ اکبر غصے میں تو تھا کہ ایک جھٹکے سے اپنے ہاتھ چھڑائے اور اس کے منہ پر دو بھرپور تھپڑ ایسے مارے کہ وہ چکرا کر زمین پر گر گیا۔

"اسے کوٹھے پر سے نیچے گرا دیا جائے۔"

حکم کی تعمیل ہوئی چنانچہ اسے دو مرتبہ کوٹھے سے نیچے گرایا گیا اور وہ مکافاتِ عمل پر پہنچ گیا۔

اسی افتاد کا سامنا خان خاناں کے ایک اور دشمن ابوالمعالی کو کرنا پڑا۔ خان خاناں نے اس کے کرتوت سے تنگ آ کر اسے قید کر دیا تھا لیکن وہ قید سے نکل کر فرار ہو گیا اور فتنے برپا کرتا رہا۔ پھر بارگاہِ شاہی میں حاضر ہو گیا اور بعض امراء کو درمیان میں ڈال کر معافی حاصل کر لی اور امراء کے حلقے میں شامل ہو گیا لیکن اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا۔ یہاں تک کہ دو تین نامی گرامی امیروں کو قتل کرا دیا۔

وہ خان خاناں کے زوال کے بعد دربار میں آیا تھا اس لیے بے خوف تھا۔ اکبر بھی چشم پوشی کرتا رہا تھا پھر وہ پنجاب بھاگ گیا۔ وہاں بھی غدر مچائے رکھا۔ اب معاملہ اکبر کی برداشت سے باہر تھا۔ اکبر نے اس کی گرفتاری کے احکام جاری کر دیے۔ اس گرفتاری سے بچنے کے لیے وہ کابل میں اکبر کے بھائی مرزا محمد حکیم کے پاس چلا گیا۔ وہاں جا کر اس نے ایسی خوش اسلوبی سے فرائض انجام دیے کہ مرزا حکیم کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ وہ اتنا خوش ہوا کہ اکبر کے مشورے کے بغیر اپنی بہن کو اس کے عقد میں دے دیا۔

اکبر اس رشتے پر ناراض تو ہوا لیکن کیا کر سکتا تھا۔ مرزا حکیم کی خوشنودی اسے عزیز تھی۔ بس اس نے مرزا حکیم کو یہ پیغام بھیج دیا کہ تم نے جو کچھ کیا ہے، اس کا انجام خود دیکھ لو گے۔

اس کا کہنا ٹھیک ثابت ہوا۔ ابوالمعالی نے مرزا حکیم کے پیٹ میں گھس کر تمام کام اپنے ہاتھ میں لے لیے اور من مانی کرنے لگا۔ مرزا حکیم کی والدہ نے جب اس کے یہ رنگ ڈھنگ دیکھے تو اسے سرزنش کرنا شروع کر دیا۔ ابوالمعالی نے جب دیکھا کہ وہ سلطنت کے معاملات میں بہت زیادہ دخل اندازی کر رہی ہے تو اس کے خلاف سازشوں کا جال بچھا دیا اور اس بے چاری کو قتل کرا دیا اور تمام نظم و نسق اپنے قبضے میں کر لیا۔ اب اس کے عزائم نے مزید پاؤں پھیلائے اور وہ مرزا حکیم کو راستے سے ہٹانے کے لیے کوشاں ہوا۔

ان واقعات کی جب مرزا سلیمان کو اطلاع ملی تو وہ بدخشاں سے کابل پہنچا اور ایک لڑائی کے بعد ابوالمعالی کو قتل کرا دیا۔

اکبر نے اس خبر پر اللہ کا شکر ادا کیا کہ ایک مصیبت سے نجات ملی۔

خان زماں کے دشمنوں میں سے ایک اور کا خاتمہ ہو گیا۔ اب خان زماں رہ گیا تھا۔ وقت جس کی بربادی کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ موقع بھی بہت جلد آ گیا۔

مالوہ کے حاکم عبداللہ خاں ازبک نے باز بہادر سے جنگ کے دوران بہت سے ہاتھی حاصل کیے تھے لیکن اس کے دل میں بے ایمانی آ گئی تھی اور اس نے ایک بھی ہاتھی بادشاہ کی خدمت میں پیش نہیں کیا تھا۔ اکبر کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو وہ مالوہ کی طرف روانہ ہوا۔ ابھی وہ راستے میں تھا کہ عبداللہ خاں خوف زدہ ہو کر اپنے بال بچوں اور مال و اسباب کو لے کر گجرات کی طرف بھاگ گیا۔ اکبر نے اپنے ہراول کو اس کے تعاقب میں روانہ کیا جس نے راستے ہی

میں عبداللہ خاں کو جا لیا۔ عبداللہ خاں نے جب راہِ فرار نہ دیکھی تو مقابلے پر آمادہ ہو گیا۔ فریقین میں لڑائی ہوئی جس کے نتیجے میں عبداللہ خاں کو فتح ہوئی۔ اکبر کا اصل لشکر اجین میں تھا جس سے لڑنے کی تاب عبداللہ خاں کو نہیں تھی لہٰذا اس نے سفر جاری رکھا اور گجرات پہنچ گیا۔

عبداللہ خاں نے گجرات پہنچ کر یہ مشہور کر دیا کہ اکبر ازبکوں کے خلاف ہے۔ میں ازبک ہوں اس لیے اس نے مجھے یہ سزا دی کہ مالوہ سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ اس کی وجہ بھی اس نے تراش لی اور اکبر کی زبانی کبھی کے کہے ہوئے الفاظ اپنی صفائی میں پیش کیے۔

"ان لوگوں کو اس بات پر فخر ہے کہ وہ شیبانی خاں ازبک کی اولاد ہیں۔ اس شیبانی خاں نے فردوس مکانی (بابر) کو جس جس طرح تنگ کیا تھا، اس کی سزا تو یہ ہے کہ ہم اپنی قلمرو سے اس قوم کو نکال دیں۔"

عبداللہ خاں نے اس بات کو پھیلانے کے لیے سکندر خاں اور ابراہیم خاں وغیرہ نامی گرامی ازبک امراء سے ملاقاتیں کیں جو بہار اور جونپور کے علاقوں میں منصب دار اور جاگیردار تھے اور انہیں اپنا ہم نوا بنا لیا۔

"کوئی ہمارے اجداد کو برا کہے اور ہماری تباہی کے درپے ہو تو ہماری بہادری پر لعنت ہے جو ہم اس کے خلاف نہ جائیں۔ ہم ہر وہ قدم اٹھائیں گے جو اکبر کو تباہی کی طرف لے جائے۔"

خان زماں کے دل میں پہلے ہی اکبر کی طرف سے گرہ پڑ گئی تھی۔ جب اس نے شرقی علاقوں کی فتح کے بعد خان زماں کی بددیانتی کی وجہ سے اسے اس علاقے کا حاکم بنانے کے بجائے اسے اپنی جاگیر پر چلے جانے کا حکم جاری کیا تھا۔ خان زماں اپنی جاگیر کی طرف لوٹ تو گیا تھا لیکن اپنے دل میں یہ عہد کر کے گیا تھا کہ دیکھو اب میں کیا کرتا ہوں۔

عبداللہ خاں ازبک کی بغاوت کی وجہ سے یہ موقع اسے جلد ہی مل گیا۔ اس نے اپنے بھائی بہادر خاں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا اور بغاوت کا اعلان کر دیا۔

اس بغاوت کا جب چرچا ہوا تو دوسرے شورش پسند بھی جو ایسے مواقع کے منتظر تھے، پر پرزے نکالنے لگے۔ خان زماں ان باغیوں کا سردار بن گیا۔ آصف خاں ہروی کی جاگیر، خان زماں کے ہمسائے ہی میں تھی، لہٰذا وہ بھی خان زماں کے ساتھ مل گیا۔

جب یہ شورش پسند مل بیٹھے تو ان کے لشکر کی تعداد تقریباً تیس ہزار ہو گئی۔ انہوں نے ایک ساتھ علمِ سرکشی بلند کیا اور جس قدر ہو سکا مختلف علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ تمام بلاد شرقی میں شورش مچی ہوئی تھی۔ اکبر کو یہ اطلاعات برابر مل رہی تھیں لیکن وہ اپنی عادت کے مطابق سنی ان سنی کرتا رہا لیکن جب وحشت ناک خبریں تواتر سے آنے لگیں تو شکار کا بہانہ کر کے نکلا۔ اس نے اپنے ہمراہ کوئی بڑی فوج نہیں لی تھی بس خاص جاں نثاروں کی جمعیت ساتھ تھی۔

اکبر خود تو سیر و شکار میں مصروف رہا اور اپنے دو امیروں کو الگ الگ سکندر خاں ازبک اور آصف خاں

قارئین متوجہ ہوں



کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چا دستیاب نہ ہو۔

☆ شہر اور علاقے کا نام۔

☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

ثمر عباس 0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

ہروی کے پاس بھیجا۔ اشرف خاں منشی کو سکندر خاں کے پاس بھیجا کہ وہ اسے تسلی تشفی دے کر شاہی بارگاہ میں لے آئے اور لشکر خاں بخشی نامی امیر کو آصف خاں کے پاس بھیجا تاکہ وہ خزانوں اور مالِ غنیمت میں سے بادشاہ کی پیشکش کے قابل اشیا آصف سے لے کر آئے۔

''حضور! آپ کا حکم مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے لیکن مجھے معلوم تو ہو، میں کن خزانوں کا مطالبہ اس سے کروں؟''

''کیا تم نہیں جانتے کہ میں کن خزانوں کا مطالبہ کر رہا ہوں؟''

''غلام اس سے بے خبر ہے۔''

''تمہارا اس سے واقف ہونا ضروری نہیں کیونکہ تم نہ جانو لیکن آصف خاں جانتا ہے۔ پھر بھی ہم تمہیں بتا دیں کہ کہیں تم یہ نہ سمجھ لو کہ ہم اس سے تاوان طلب کر رہے ہیں۔ جیسا کہ تم جانتے ہو کہ ہم نے آصف خاں ہروی کو کڑہ مانک پور کا جاگیردار اور پنج ہزاری امیر مقرر کیا تھا۔ اس کے پڑوس میں گڑھ کی سلطنت تھی جو اس وقت تک کسی مسلمان سے فتح نہیں ہوئی تھی۔ آصف خاں نے اس سلطنت کو فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ یہ فتح اسے نصیب بھی ہوئی۔ بہت سا مال واسباب اس کے ہاتھ لگا جو اس نے حضورِ شاہ میں روانہ نہیں کیا۔ میں اس خزانے کا مطالبہ کر رہا ہوں۔''

اس نے امیروں کو روانہ کیا اور خود سیر وشکار میں مصروف ہوگیا۔ اکبر شکار کھیلتا ہوا گڑھ کے قریب پہنچا۔ ہوا کی تپش اور موسم کی خرابی کی وجہ سے وہ بیمار ہوگیا اور واپس آگرہ کی طرف روانہ ہوا۔

جب اشرف خاں منشی اکبر سے جدا ہو کر اودھ کے نواح میں پہنچا جو سکندر خاں کی جاگیر تھی تو سکندر خاں اس کے استقبال کے لیے آیا اور اسے نہایت احترام سے اپنے مکان پر لے گیا۔ اشرف خاں نے اسے بادشاہ کا پیغام دیا۔ اسے تسلی دی اور اکبر کے حضور پیش ہونے کا مشورہ دیا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بادشاہ کے حضور میں پیش ہوگا لیکن چند روز کے بعد وہ حیلے بہانوں پر اتر آیا۔

''ابراہیم خاں چونکہ عمر میں مجھ سے بڑا ہے اور میرا پڑوسی بھی ہے لہٰذا بہتر یہ ہے کہ اسے بھی ہموار کرلوں۔ اگر اس کی مرضی کے بغیر میں چلا گیا تو بادشاہ کا تو کچھ نہیں جائے گا، ہمارے تعلقات میں بگاڑ آجائے گا۔'' سکندر خاں یہ بہانہ کر کے قصبہ سراور میں جو ابراہیم خاں کی جاگیر میں تھا، چلا گیا۔ یہاں دونوں نے مشاورت کی۔ سکندر خاں کا جھکاؤ اکبر کی طرف دیکھتے ہوئے ابراہیم خاں نے اسے طعنہ دیا۔

''بس تمہاری بہادری یہیں تک تھی۔ اکبر نے حیلے بہانے سے بلایا اور تم تیار ہوگئے۔''

''بات بہادری کی نہیں ہے۔ کمزور تو بادشاہ ہوا ہے جو ہمارے خلاف لشکر کشی کرنے کے بجائے مصالحت کے لیے بلا رہا ہے۔''

''تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ اس میں کوئی چال نہیں۔ وہ تمہیں بلا کر قید بھی کرسکتا ہے۔''

''اسی مشورے کے لیے تو میں تمہارے پاس آیا ہوں۔''

''بادشاہ کے خلاف جو محاذ ہم نے بنایا تھا، اس میں صرف میں اور تم ہی نہیں ہیں بلکہ ہم سب تو علی قلی خاں (خان زماں) کی سربراہی میں جمع ہوئے ہیں لہٰذا اسے بھی بتایا جائے کہ بادشاہ کی طرف سے تمہیں کیا پیشکش ہوئی ہے۔ دیکھو وہ کیا کہتا ہے۔''

ان دونوں نے اکبر کے فرستادہ اشرف خاں کو ساتھ لیا اور خان زماں سے ملنے اس کے علاقے جونپور چلے گئے۔ خان زماں نے اشرف خاں کو ان کے ساتھ دیکھا تو اس کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اسے اشرف خاں کی آمد قطعی ناگوار گزری ہے۔ اس نے مہمان سمجھ کر بھی اشرف خاں کی طرف نگاہ نہ کی بلکہ اپنے ملازموں سے کہا کہ اس شخص کو الگ جگہ ٹھہرا دو تاکہ ہم آپس میں آزادانہ بات کرسکیں۔ اشرف خاں کے جاتے ہی وہ سکندر خاں اور ابراہیم خاں پر برس پڑا۔

''تمہیں جرأت کیسے ہوئی اس شخص کو میری اجازت کے بغیر یہاں لانے کی؟''

''ہم تو اس لیے ساتھ لے آئے کہ جو بھی بات ہو اس کے سامنے ہو تاکہ یہ اکبر تک پہنچا سکے۔''

''کیسی بات چیت؟''

''اکبر نے اسے میرے پاس اس پیغام کے ساتھ بھیجا تھا کہ میں اکبر کے حضور پیش ہوجاؤں۔ میں نے مناسب سمجھا کہ ابراہیم خاں سے بات کروں اور اب آپ کے پاس آئے ہیں۔''

''میرے پاس اس شخص (اکبر) کا پیغام لے کر آئے ہو جو ازبکوں کا دشمن ہے۔ جس نے عبداللہ خاں ازبک کو گجرات میں پناہ لینے پر مجبور کردیا۔ جس نے میری بے عزتی کی۔''

''ہمارے انکار کے بعد وہ لشکر ضرور بھیجے گا۔''

''ہم نے بھی چوڑیاں نہیں پہنی ہوئی۔ ہم کمزور نہیں ہیں۔ آس پاس کے جتنے ازبک امراء اور جاگیردار ہیں سب ہمارے ساتھ ہیں۔ ہم ہر لشکر کا مقابلہ کریں گے۔ ازبک جہاں جہاں بھی ہیں، خود مختار حکومتیں قائم کریں گے۔ اگر ہم نے اس وقت مغلوں کو ڈھیل دے دی تو وہ ازبکوں کا

نام ونشان تک مٹا دیں گے۔''

''ٹھیک ہے، تو میں اشرف خاں سے معذرت کر کے واپس بھیج دیتا ہوں۔'' سکندر خاں نے کہا۔

''اب وہ واپس نہیں جائے گا۔ وہ ہمارا مجرم ہے۔ میں اسے حراست میں لینے کا حکم دیتا ہوں۔''

کم وبیش یہی حال آصف خاں کے پاس بھیجی جانے والی سفارت کا ہوا۔ اس نے بھی 1500 ہاتھیوں میں سے صرف تین سو ہاتھی بادشاہ کی خدمت میں ارسال کیے، باقی اشیا پر خود قبضہ کرلیا۔ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بھی باغیوں کے ساتھ مل گیا ہے۔

خان زماں اپنے بھائی کے ساتھ کڑہ مانک پور کی طرف آیا اور بغاوت وسرکشی کرنے لگا۔

اشرف خاں کی حراست کی خبر جب اس علاقے کے جاگیرداروں کو ملی تو ان سب نے مل کر دشمنوں سے مقابلے کی تیاری کی۔ دونوں طرف سے مڈبھیڑ ہوئی۔ مخالفین کا لشکر ان کے مقابلے میں کئی گنا بڑا تھا لہٰذا جنگ کو پشت دے کر وہ ایک قلعے میں آکر قلعہ بند ہوگئے اور حقیقتِ حال لکھ کر اکبر بادشاہ کے حضور میں بھیجی۔

جب یہ عرضی آگرہ میں اکبر تک پہنچی تو اس نے انتقام لینے کا ارادہ کرلیا اور اپنے ایک امیر منعم خاں کو طلب کر کے اسے بطور ہراول فوجیں دے کر روانہ کیا اور چند روز بعد خود بھی روانہ ہوگیا۔

اکبر نے سفر طے کیا اور قنوج کے باہر پہنچ کر قیام کیا۔ منعم خاں اس کے استقبال کو آیا اور اب تک جو حالات ہوئے تھے، ان سے باخبر کیا۔

اسی جگہ اسے یہ معلوم ہوا کہ سکندر خاں ابھی تک لکھنؤ میں مقیم ہے۔ اسے اتنا غصہ آیا کہ اس نے امیروں پر بھی بھروسا نہیں کیا۔ اپنے امیروں کو لشکر میں چھوڑا اور خود جانباز نوجوانوں کے ساتھ یلغار کے طور پر آدھی رات کو چل پڑا۔ ایک رات اور دو دن مزید چلتا رہا۔ راستے میں کہیں بھی آرام نہیں کیا اور سکندر کے سر پر لکھنؤ جا پہنچا۔

سکندر نے اس کی آمد کا غلغلہ سنا تو فرار ہوگیا اور سیدھا خان زماں اور بہادر خاں کے پاس پہنچ گیا۔ اکبر اس کے تعاقب میں روانہ ہوا اور جونپور کے نواح میں پہنچ گیا۔ یہاں عجیب اتفاق ہوا۔ آصف خاں جو اس سے باغی ہوگیا تھا، اپنی غلطیوں کا احساس کر کے اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے نفیس تحفوں کے ساتھ ساتھ پانچ ہزار سواروں پر مشتمل وہ لشکر بھی جو گڑھ منڈ کے خزانوں کی بدولت تیار ہوا تھا، اس کی خدمت میں پیش کردیا۔

اکبر خود تو جونپور کے قلعے میں قیام پذیر ہوا اور آصف خاں کو حکم دیا کہ وہ بڑے امراء کی جماعت کے ہمراہ دریائے گنگا کے گھاٹ پر پہنچ جائے جہاں سے خان زماں اپنی فوج کو لے کر گزر رہا تھا۔ وہاں پہنچ کر جنگ میں پہل نہ کرے بلکہ دشمن کے روبرو ٹھہر کر شاہی فرمان کا منتظر رہے۔

آصف خاں نے حکمِ شاہی پر عمل کیا اور دریائے گنگا کے کنارے جا کر پڑاؤ ڈال دیا۔

علی قلی خاں (خان زماں) اور سلیمان کرانی حاکم بنگالہ کے درمیان نہایت ربط واتحاد تھا لہٰذا اکبر کی یہ رائے ہوئی کہ سلیمان کرانی کے پاس ایک ایلچی بھیج کر اس کو خان زماں کی اعانت سے منع کردیا جائے۔ اس کام کے لیے حاجی محمد خاں کا انتخاب عمل میں آیا جو اصابت رائے میں مشہور تھا۔

جب حاجی محمد قلعہ رہتاس پہنچا تو افغان سرداروں نے جو خان زماں سے رابطہ رکھتے تھے اسے گرفتار کر کے خان زماں کے پاس بھیج دیا۔ چونکہ اس کے اور علی قلی خان زماں کے درمیان دوستانہ تعلقات تھے۔ خان زماں نے اسے کسی ایسے وقت کے لیے اپنے پاس روک لیا جب صلح کے لیے اس کی سفارش کی ضرورت پیش آئے۔

☆☆☆

آصف اس گھاٹ پر پہنچ چکا تھا اور شاہی حکم کا منتظر تھا کہ ایک امیر محفوظ خاں کو اس سے عداوت ہوگئی۔ آصف خاں کی طبیعت ایسی مکدر ہوئی کہ وہ آدھی رات کو اپنے بھائی وزیر خاں اور اپنی فوج کو ساتھ لے کر فرار ہوگیا اور گڑھ کا رخ کیا۔

صبح ہوئی تو وہ بھی غائب تھا اور پانچ ہزار کا وہ لشکر بھی

گدھا الیکشن جیت گیا

یہ 1938ء کی بات ہے کہ امریکا کے شہر واشنگٹن سے ڈیموکریٹک پارٹی کے ایک ممبر نے ری پبلکن پارٹی کی طرف سے امیدوار کے طور پر ایک گدھا کھڑا کیا۔ اس سے صرف وہ یہ بات ثابت کرنا چاہتا تھا کہ ووٹر ووٹ دینے کے لیے امیدوار کی قابلیت کو نہیں دیکھتا بلکہ وہ پارٹی سے وابستگی کو دیکھتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ گدھا 51 ووٹوں سے جیت گیا۔

مرسلہ۔ غلام حسین اختر، سرگودھا

جواس کے ساتھ تھا۔ ہر طرف کھلبلی مچ گئی۔ فوراً عرضداشت لکھ کر بادشاہ کے پاس بھیجی گئی۔ اکبر نے عرضداشت پڑھتے ہی ایک اور امیر منعم خاں کو لشکر کا سردار بنا کر بھیجا اور شجاعت خاں کو حکم ہوا کہ وہ آصف خاں کا تعاقب کرے۔ وہ اس کا تعاقب کرتا ہوا مانک پور پہنچا تو معلوم ہوا وہ گڑھ چلا گیا ہے۔

خان زماں ابھی تک شاہی افواج کے مقابل ٹھہرا ہوا تھا۔ اس نے نہایت خاموشی سے سکندر خاں کو "سرور" کی ولایت پر بھیج دیا تاکہ وہاں جا کر فتنہ فساد برپا کرے۔

اس اطلاع کے ملتے ہی اکبر نے اپنے تمام بڑے امراء کو حکم دیا کہ وہ سکندر اور بہادر خاں کے سروں پر پہنچیں اور ان سے مقابلہ کریں۔

خان زماں اسی گھاٹ پر پڑا ہوا تھا لیکن مقابلہ چھوڑ کر صلح کا متمنی تھا۔ یہ صلح وہ دل سے نہیں کر رہا تھا بلکہ وقتی طور سے اس مقابلے کو ٹالنا چاہتا تھا اور اس میں وہ کامیاب بھی رہا کیونکہ منعم خاں اور اس کے درمیان دوستی کا رشتہ تھا۔ منعم خاں اس کی باتوں میں آکر مقابلے کو ٹالتا رہا۔

اکبر کی تجربہ کار آنکھوں نے بھانپ لیا کہ تاخیر ہو نہیں رہی، کی جا رہی ہے۔ اس نے حقیقتِ حال جاننے کے لیے خواجہ جہاں اور دریا خاں کو لشکر میں بھیجا۔ خان زماں نے ان کے آنے کو غنیمت سمجھا اور نامہ و پیام کے ذریعے صلح کی تجویز سامنے رکھی۔

خان زماں نے ابراہیم خاں کو بھی اپنے ساتھ لیا۔ سب ایک کشتی میں سوار ہوئے اور مذاکرات کا آغاز ہوا۔ گفتگو کے بعد یہ طے ہوا کہ منعم خاں اور خواجہ جہاں خان زماں کی والدہ کو بطور سفارش بادشاہ کی خدمت میں لے کر جائیں اور اس کی (خان زماں) خطاؤں کی معافی طلب کریں۔ جب خطائیں معاف ہو جائیں تو خان زماں، اس کا بھائی اور سکندر خاں بادشاہ کے حضور میں جائیں۔

دونوں فریقین کی جانب سے اس قرارداد پر دستخط ہوئے اور خان زماں اپنے لشکر میں چلا گیا۔

منعم خاں، خان زماں کی والدہ اور ابراہیم خاں کو لے کر بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوا۔ ابراہیم خاں اس حال میں آیا کہ ننگے سر تھا۔ تلوار اور کفن گردن میں ڈالی ہوئی تھی۔ اس نے روتے ہوئے بادشاہ سے سفارش کی۔

"شاہی خاندان سے متعلق خان زماں اور اس کے بھائی کی خدمات ہر شخص پر ظاہر ہیں اور بہت سی پسندیدہ خدمات ان سے ظہور میں آئی ہیں۔ اب حسبِ تقدیر اگر ان سے کوئی قصور واقع ہو گیا ہے تو بادشاہی الطاف و عنایات اس سے وسیع تر ہیں کہ ان کی خطاؤں پر نظر کر کے ایسے کارآمد آدمیوں کو ضائع کیا جائے۔ خاص طور پر اس بوڑھے غلام کو اپنی خطاؤں کی معافی کا ذریعہ بنایا ہے اور میں اس امید پر حضور میں حاضر ہوا ہوں۔"

اکبر نے منعم خاں کو مخاطب کیا۔

"میں تمہاری خاطر ان کی خطاؤں کو معاف کرتا ہوں لیکن یہ نہیں معلوم کہ یہ لوگ مطیع و فرمانبردار رہیں گے بھی۔"

"حضور! ان کی جاگیروں کے متعلق کیا حکم ہے؟"

"جب ہم نے ان کی خطائیں معاف کر دیں تو ان کی جاگیروں کے متعلق کیا مضائقہ ہے لیکن جب تک ہم یہاں (جونپور) مقیم ہیں، وہ لوگ دریا کے اس پار نہ جائیں۔ جب آگرہ پہنچ جائیں تو ان کے وکیل وہاں آکر جاگیروں کے فرامین حاصل کریں اور اپنی جاگیروں پر قبضہ کر لیں۔"

یہ واضح حکم تھا لیکن اکبر جیسے ہی چنار کی طرف گیا، خان زماں نے دریا عبور کر لیا اور ایک جماعت کو غازی پور اور جونپور کے انتظام کے لیے بھیج دیا۔

یہ خبر سنتے ہی اکبر آگ بگولا ہو گیا اور از روئے عتاب منعم خاں سے مخاطب ہوا کیونکہ خان زماں کی سفارش لے کر وہی آیا تھا۔

"ہم نے ابھی تک ان حدود سے باہر قدم نہیں رکھا ہے اور علی قلی خاں نے خلافِ شرط عمل کیا۔" منعم خاں کے پاس کیا جواب ہو سکتا تھا۔ شرمندگی سے گردن جھکائے کھڑا رہا۔

اکبر نے اشرف خاں کو حکم دیا۔

"تم فوراً جونپور روانہ ہو جاؤ اور والدہ علی قلی خاں کو گرفتار کر کے قلعہ جونپور میں قید رکھو اور باغیوں میں سے جو کوئی بھی وہاں ہو، اسے بھی حراست میں لے لو۔ خواجہ جہاں اور مظفر خاں لشکر کے ساتھ تمہاری مدد کو پہنچ جائیں گے۔"

اکبر نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ وہ خود بھی ایک کثیر فوج کے ساتھ یلغار کرتا ہوا علی قلی خاں کے ارادے سے روانہ ہوا۔

علی قلی جنگل کے راستے سے کوہ سوالک کی طرف بھاگ گیا۔

تمام شاہی قوت خان زماں کی تلاش میں جنگلوں کی خاک چھان رہی تھی۔ کسی کا دھیان خان زماں کے بھائی بہادر خاں کی طرف گیا ہی نہیں اور اسے خوب موقع مل گیا۔ وہ اپنے لشکر کے ساتھ جونپور میں داخل ہوا اور معمولی سی جھڑپ کے بعد اپنی والدہ کو آزاد کرا لیا۔

یہ خبر سنتے ہی اکبر نے خان زماں کا تعاقب ترک کر دیا اور جونپور کی طرف واپس چلا آیا۔ جب یہ خبر عام ہوئی کہ شاہی لشکر بس آیا ہی جاتا ہے تو سکندر خاں اور بہادر خاں دریائے گنگا کو عبور کر کے فرار ہو گئے۔

بادشاہ نے وہاں مستقل قیام کا فیصلہ کر لیا۔ ایک عارضی عمارت میں دربار منعقد کیا۔ اس دربار کی اہم بات یہ تھی کہ یہاں خان زماں یا دوسرے باغیوں کا کوئی ذکر نہ آیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے خان زماں کو بالکل بھلا دیا ہے یا اسے اس قابل ہی نہیں سمجھتا کہ اس کا ذکر کیا جائے۔ اشرف خاں حاکم جونپور نے کہنا چاہا بھی تو اکبر نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ حکم صادر ہوا۔

"ہمارے قیام کے لیے مناسب جگہ منتخب کی جائے اور وہاں عالی شان عمارتیں تعمیر کی جائیں اور امراء بھی اپنے اپنے حوصلے کے مطابق مکانات اور عمارات بنوائیں۔"

اس انوکھے حکم پر سب حیران تھے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ عمارتیں بنانے کا حکم کیوں دیا جا رہا ہے۔ اکبر نے اس مشکل کو خود ہی حل کر دیا۔

"جب تک علی قلی خاں (خان زماں) اور اس کا بھائی دنیا میں موجود ہیں جونپور سلطنت پایۂ تخت رہے گا۔"

خان زماں جو کوہ سوالک کے دامن میں بھاگ گیا تھا اس خبر کو سن کر دریائے گنگا کے کنارے آیا اور معتمد میرک رضوی کو منعم خاں کے پاس بھیجا کہ وہ ایک مرتبہ پھر اس کا ضامن بن کر بادشاہ سے اس کی معافی کا خواستگار ہو۔

میرک خاں، خان خاناں کی والدہ کے ساتھ منعم خاں کے پاس گیا اور خان زماں کا پیغام پہنچایا۔ منعم خاں کو خان زماں سے ہمدردی تو تھی۔ دل سے چاہتا تھا کہ اسے معافی مل جائے لیکن اب اس کی ہمت نہیں تھی کہ اکیلے بادشاہ کے سامنے جائے۔ اس نے چند علمائے دین کو ساتھ لیا جن میں مخدوم الملک بھی شامل تھے اور بادشاہ کے حضور پہنچ کر خان زماں کی خطاؤں کی معافی مانگی۔

اکبر نے اپنی فطری شفقت کی بدولت معاف تو کر دیا لیکن دیگر علماء کو یہ حکم بھی ملا کہ وہ خان زماں کے پاس جا کر اس سے توبہ کرائیں اور اسے عفو کا مژدہ سنائیں۔

جب یہ لوگ خان زماں کے لشکر کے قریب پہنچے تو خان زماں استقبال کے لیے آیا اور نہایت احترام کے ساتھ ان لوگوں کو اپنی جائے قیام پر لے گیا۔ نہایت تعظیم و تکریم کے ساتھ پیش آیا اور جس طرح حکم صادر ہوا تھا، توبہ کی اور قسم کھائی۔

جب دشمنوں نے اپنی ناشائستہ حرکتوں سے توبہ کر لی اور مطیع ہو گئے تو وہ جونپور سے آگرہ چلا آیا۔

اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد مہدی قاسم خاں کو جو خاندان مغلیہ کا قدیم امیر تھا، تین چار ہزار آدمیوں کا سردار بنا کر گڑھ کی ولایت پر مقرر کیا کہ اس ولایت کی مہمات میں مشغول ہو اور آصف خاں کو گرفتار کرے۔

اس سے پہلے کہ مہدی قاسم وہاں پہنچتا، آصف خاں قلعہ چوراگڑھ کو چھوڑ کر جنگلوں میں نکل گیا اور ایک عرضی جو اس کی عاجزی اور ندامت پر مشتمل تھی، اکبر کے حضور ارسال کی اور حج کی اجازت طلب کی۔

مہدی قاسم خاں ولایت گڑھ میں داخل ہوا اور تمام علاقے پر قبضہ کر کے آصف خاں کے تعاقب میں روانہ ہوا۔

ایک طرف تو آصف خاں نے اکبر کو عرضی بھیجی، دوسری طرف خان زماں کو خط لکھ کر اس کے پاس آنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ خان زماں کو بھی کوئی سہارا چاہیے تھا۔ اس نے آصف خاں کو اپنے پاس بلا لیا۔ وہ اپنے بھائی وزیر خاں کے ہمراہ خان زماں کے پاس جونپور پہنچ گیا۔

مہدی قاسم اس کے تعاقب سے مایوس ہو کر ولایت گڑھ کو واپس ہو گیا۔

آصف خاں یہاں آتو گیا تھا لیکن پہلی ہی ملاقات میں خان زماں کا غرور دیکھ کر سخت مایوس ہوا تھا اور یہاں سے فرار ہونے کا سوچ رہا تھا لیکن خان زماں نے حکم دیا کہ وہ بہادر خاں کے ہمراہ ان علاقوں کی تسخیر کے لیے چلا جائے جو افغانوں کے قبضے میں ہیں۔ غالباً خان زماں کو بھی احساس ہو گیا تھا کہ آصف خاں فرار ہو سکتا ہے۔ اس نے اس کے بھائی وزیر خاں کو اپنے پاس روک لیا اور کچھ لوگ وزیر خاں کی نگرانی کے لیے مقرر کر دیے۔

وزیر خاں نے آصف خاں کی روانگی کے بعد اپنے فرار کی کوششیں شروع کر دیں۔ اس پر جو نگراں مقرر تھے، ان سے ساز باز کر کے اور کچھ انعام و اکرام دے کر فرار ہونے کا دن اور وقت طے کر لیا اور ایک آدمی بھیج کر آصف خاں کو اس کی خبر کر دی۔

یہ پیغام جب آصف خاں کو ملا تو اس نے بھی بہادر خاں سے علیحدہ ہونے کی تیاری شروع کر دی۔ ادھر ادھر گھوم کر فرار کا راستہ تلاش کر لیا اور ایک رات اپنا مال و اسباب چھوڑ کر بہادر خاں سے الگ ہوا اور اندھیرے میں اندھیرا بن کر کڑہ مانک پور کا راستہ لیا۔ رات بھر میں تیس کوس کا راستہ طے کر گیا۔ بہادر خاں کو جیسے ہی معلوم ہوا وہ

اس کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ جونپور اور کڑہ مانک پور کے درمیان کسی جگہ اس تک پہنچ گیا۔

جنگ کے سوا کیا ہوسکتا تھا۔ سخت جنگ ہوئی لیکن کیا جنگ ہوسکتی تھی۔ آصف خاں گرفتار ہوگیا۔ بہادر خاں نے اسے ہاتھی کے ہودے میں ڈالا اور روانہ ہوگیا۔

وزیر خاں اپنے منصوبے کے مطابق فرار ہوا۔ ابھی وہ راستے میں تھا کہ اس نے آصف خاں کی گرفتاری کی خبر سنی۔ وہ بھی بھائی کی تلاش میں آگے بڑھا۔ بہادر خاں کے آدمی غارت گری کے لیے ادھر ادھر منتشر ہوگئے تھے۔ اسی اثنا میں وزیر خاں، بہادر خاں کے سر پر پہنچ گیا۔ بہادر خاں میں اب اتنی سکت نہیں تھی کہ وزیر خاں سے جنگ کرتا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ آصف خاں کو قتل کردو۔ اس پر ہر طرف سے تلواریں پڑنے لگیں۔ وزیر خاں نے آگے بڑھ کر اپنے بھائی کو قتل ہونے سے بچالیا۔ وہ معمولی سا زخمی ہوا تھا کہ وزیر خاں نے اپنے بھائی کو بچالیا۔ بہادر خاں کو بھاگتے ہی بنی۔

اکبر اس وقت لاہور کے نواح میں اپنے بھائی مرزا محمد حکیم کی جانب سے اٹھائے گئے فتنوں سے نبرد آزما تھا۔ مرزا حکیم کابل سے پنجاب پر قبضہ کرنے کی کوششوں میں مصروف تھا۔

وزیر خاں، مظفر خاں کے وسیلے سے اکبر کے حضور میں حاضر ہوا۔ اپنی خطاؤں کی معافی طلب کی۔ اکبر نے اپنی وسعتِ قلبی سے اس کی اور اس کے بھائی کی خطائیں معاف کردیں۔ یہ وقت بھی ایسا تھا کہ وہ ان معاملات کو زیادہ طول نہیں دے سکتا تھا۔

جب آصف خاں کے زخم کچھ بھر گئے تو آصف خاں کو حکم ہوا کہ وہ ایک لشکر لے کر جائے اور کڑہ مانک پور اور اس کے اطراف کی حفاظت کرے۔

اکبر آگرہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ آگرہ پہنچ کر اسے اطلاع ملی کہ خان زماں نے قنوج سے چار کوس کے فاصلے پر شیر گڑھ کا محاصرہ کرلیا ہے۔ اکبر نے منعم خاں کو آگرہ کے انتظام کے لیے چھوڑا اور خود جونپور کی طرف متوجہ ہوا۔

خان زماں اس کے ساتھ چوہے بلی کا کھیل کھیل رہا تھا۔ اس نے اکبر کی روانگی کی خبر سنتے ہی محاصرہ اٹھایا اور مانک پور کی طرف روانہ ہوا جہاں اس کا بھائی بہادر خاں تھا۔

اکبر نے ایک لشکر نامور امراء کی سربراہی میں سکندر خاں کی طرف بھیجا جو اودھ میں تھا اور خود کڑہ مانک پور کی طرف متوجہ ہوا اور پرگنہ رائے بریلی پہنچا۔ وہاں یہ اطلاع ملی کہ علی قلی خاں اور بہادر خاں دریائے گنگا کو عبور کرکے کالپی جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس نئی صورتِ حال میں اس نے حکم صادر کیا کہ شاہی لشکر خواجہ جہاں کی ہمراہی میں قلعہ گڑھ جائے اور خود نہایت عجلت میں مانک پور کے گھاٹ پر پہنچا۔ اس وقت رات ہورہی تھی اور وہاں کوئی کشتی موجود نہ تھی۔ اس کے ساتھی اسے روکتے رہ گئے اور صبح ہونے کا انتظار کرنے کا مشورہ دیتے رہے لیکن اس کی خوش اقبالی اس سے کچھ اور ہی کہہ رہی تھی۔ اس نے اپنا پسندیدہ ''سندر'' نامی ہاتھی منگوایا۔ سوار ہوا اور ہاتھی کو دریا میں ڈال دیا۔ اتفاق یہ تھا کہ دریا اس وقت پایاب تھا اس لیے ہاتھی کو تیرنے کی ضرورت نہ ہوئی۔

اکبر دیوہیکل ہاتھیوں اور سو سواروں کے ساتھ دریا کی دوسری طرف جا پہنچا۔ اب اسے کسی کا انتظار تھا۔ اس انتظار میں اسے یہیں رکنا تھا۔ اس احتیاط کے ساتھ کہ کسی گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز بھی اندھیرے کو نہ چیر سکے۔

☆☆☆

جودھ پور سے آئی ہوئی رقاصہ نے اپنا رقص ختم کیا اور ایک ادائے خاص سے چکر کھاتی ہوئی خان زماں کی گود میں سما گئی۔ یہ بے ادبی تھی لیکن یہاں ہوش کس کو تھا۔ خان زماں نے بھی ہاتھوں کا حصار بنالیا۔ قریب کھڑی ایک حسینہ نے صراحی اٹھائی اور جام بھر کے خان زماں کی طرف بڑھادیا۔

''بھئی ہم کس خوشی میں پیاسے ہیں؟''

''قربان جاؤں آپ کے اصرار پر۔'' حسینہ نے کہا اور ایک جام اس کی خدمت میں بھی پیش کردیا۔

رقاصہ سمٹ کر ایک طرف بیٹھ گئی۔

''بہادر خاں''. خان زماں نے نشے میں ڈوبی آواز میں اپنے بھائی کو مخاطب کیا۔

''جی برادر عزیز......!'' اس کی آواز بھی نشے سے بوجھل ہورہی تھی۔

''سنا ہے آصف خاں نمک حرام تم سے جان چھڑا کر بادشاہ کے پاس پہنچ گیا ہے۔''

''سنا تو میں نے بھی ہے۔''

''اکبر کے کیا ارادے ہیں...... جاسوسوں نے کیا خبر دی ہے؟''

''بس اتنا معلوم ہوسکا ہے کہ بادشاہ نے اسے معاف کردیا ہے۔''

''وہ اتنا سورما نہیں کہ ہمارے سامنے آئے۔ ویسے

بھی رات گزرے پھر ہم کہاں اور اکبر کہاں۔ صبح ہوتے ہی ہم گنگا پار کرلیں گے۔ سلطان مرزا کی اولادوں نے ہمارا کام آسان کردیا ہے۔ انہوں نے مالوہ پر حملہ کردیا ہے۔ ہم اس بغاوت میں ان کا ساتھ دیں گے اور مالوہ پر قبضہ ہوتے ہی انہیں دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال پھینکیں گے۔ بس وہاں پہنچنے دو۔''

''وہاں پہنچنے میں اب کتنی دیر رہ گئی ہے۔ صبح ہوتے ہی گھاٹ پر کشتیاں لگ جائیں گی اور ہم دوسرے کنارے پر ہوں گے۔''

☆☆☆

سلطان مرزا، سلطان حسین کا نواسہ تھا۔ حسین مرزا نے ہمایوں کے عہد حکومت میں کئی مرتبہ غداری کی تھی لیکن بادشاہ نے ہر بار اس کا جرم معاف کیا تھا۔

ہمایوں کے دوسرے دورِ حکومت میں سلطان مرزا دوبارہ ہندوستان آیا اور سنبھل کے علاقے میں آدم پور کا پرگنہ اس کی معاش کے لیے مقرر ہوا۔ سلطان مرزا کے چار بیٹے تھے۔ جونپور کے ہنگامے کے بعد یہ چاروں بھائی بادشاہ سے اجازت لے کر سنبھل میں اپنی جاگیر کو روانہ ہوگئے۔

ان چاروں بھائیوں نے اپنے چچازاد بھائیوں کے ساتھ مل کر علمِ سرکشی بلند کیا۔ دوسرے بہت سے فسادی بھی ان کے گرد جمع ہوگئے۔ اس علاقے کے جاگیرداروں نے ان سے لڑائی کی اور انہیں مالوہ کی طرف بھگا دیا۔ یہی وہ وقت تھا جب خان زماں نے ان کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور ان کے ساتھ مل کر اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے پر تولنے لگا۔

☆☆☆

اکبر دریا پار کرچکا تھا لیکن اسے کسی کا انتظار تھا۔ آنے والا آگیا۔ یہ آصف خاں تھا جو اپنے لشکر کے ساتھ آگیا۔ اکبر کے لشکر نے بھی بخیر و خوبی دریا پار کرلیا تھا۔

دونوں بھائی خان زماں اور بہادر خاں ہر خطرے کے خوف سے آزاد بادہ نوشی میں مشغول تھے۔

شاہی فوج خان زماں کے خیمے کے پاس پہنچی اور بہ آوازِ بلند پکارا۔

''اے بے خبرو! اکبر اعظم دریا پار کرکے تمہیں تباہ و برباد کرنے کے لیے یہاں پہنچ گیا ہے۔'' یہ آواز بہادر خاں کے کان میں پڑی تو اس نے خان زماں کو چونکایا۔

''برادر عزیز! یہ آواز سنی؟''

''ہاں سنی۔''

''شاید آصف خاں کی آواز تھی۔''

''ہاں وہی ہوگا۔''

''مگر وہ یہ بھی کہہ رہا تھا کہ اکبر اعظم دریا پار کرکے یہاں پہنچ گیا ہے۔''

''رات کے وقت بزدل اکبر کیسے دریا پار کرسکتا ہے۔''

''اب صبح ہونے کو ہے۔''

''ہونے دو۔''

کچھ دیر کے لیے باہر خاموشی ہوگئی اور پھر نقارۂ شاہی کی آواز آنے لگی۔ اب تو کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ اکبر پہنچ گیا ہے۔

اکبر اسی ہاتھی پر سوار تھا جس پر بیٹھ کر اس نے دریا عبور

تعلیم کی اہمیت

(1) تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ ایک خالی دماغ کو با مقصد بنادیا جائے (میلکم فوربس)

(2) تعلیم زندگی کی تیاری نہیں بلکہ خود ایک زندگی ہے (امریکی فلسفی جان ڈیوی)

(3) تعلیم کی جڑیں کڑوی ہوسکتی ہیں مگر اس کا پھل بہت میٹھا ہوتا ہے (ارسطو)

(4) تعلیم کا مقصد حقائق کو نہیں بلکہ اقدار کو جاننا ہے (امریکی مصنف ولیم بورو)

(5) بامقصد تعلیم کسی فوج سے زیادہ بہتر انداز میں آزادی کا تحفظ کرسکتی ہے (ایڈورڈ ایورٹ امریکی سیاستداں)

(6) اچھی تعلیم کا سب سے بہترین نتیجہ برداشت ہے (ہیلن کیلر)

(7) تعلیم کے بغیر انسان ایسے ہی ہے جیسے بے بنیاد گھر۔

(8) تعلیم ہر انسان کے لیے اس کے مستقبل کا پاسپورٹ ہے۔

(9) تعلیم اندھیرے سے روشنی کا سفر ہے۔

(10) آپ اپنی تعلیم پر پورا دھیان دیں اور خود کو عمل کے لیے تیار کریں۔ یہ آپ کا پہلا فریضہ اور آپ کی تعلیم کا حصہ ہے۔ ہماری قوم کے لیے تعلیم زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ (بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناحؒ)

مرسلہ۔ جاوید اختر رانا۔ پاکپتن شریف

کیا تھا۔ فوج کی سیدھی جانب آصف خاں اور تمام بہادر اور بائیں جانب مجنوں خاں اور دوسرے امراء تعینات ہوئے۔
خان زماں اور اس کے ساتھی نقارۂ شاہی کی آواز سنتے ہی پریشان ہو کر اٹھے۔ خان زماں کو اب معافی کی کوئی توقع نہیں رہی تھی۔ اس لیے بجز اس کے کہ وہ مقابلہ کرتا، کوئی اور راہ نہیں تھی۔ دونوں بھائی باہر نکلے۔ دونوں بھائیوں کا لشکر مقابلے پر آچکا تھا۔ بادشاہی ہراول نے دشمن کی ایک جماعت کو جو مقابلے کے لیے اس کے سامنے آئی، تھوڑی ہی دیر میں پسپا کر دیا۔ بہادر خاں آگے بڑھا اور شاہی ہراول پر دھاوا بول کر مجنوں خاں کی صف تک دھکیل دیا۔ اس بہادر نے مجنوں خاں کے لشکر کو تتر بتر کر دیا۔ اس کے بعد اس نے لشکر خاصہ پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ اس دوران میں کچھ امراء نے بہادر خاں کے حملے کو روکنے کی کوشش کی۔ اکبر ہاتھی پر سوار تھا۔ یہ حملہ دیکھ کر ازراہِ احتیاط گھوڑے پر آ گیا۔
بہادر خاں نہایت بہادری سے لڑ رہا تھا کہ اچانک ایک تیر اس کے گھوڑے کے لگا اور وہ چراغ پا ہو گیا۔ بہادر خاں گھوڑے سے زمین پر گرا اور گرفتار ہو گیا۔
اس گرفتاری کی اطلاع اکبر کو نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے اس نے بذاتِ خود جنگ میں حصہ لینے کے ارادے سے اپنے ہاتھیوں کو دشمن کی فوج کی طرف ہنکا دیا۔ سب سے پہلے ''ہیرانند'' نامی ایک ہاتھی علی قلی خاں کے لشکر کی طرف گیا۔ خان زماں نے بھی اپنا ایک ہاتھی 'رودیانہ' مقابلے کے لیے بھیجا۔ ''ہیرانند'' نے ''رودیانہ'' پر اس زور کا حملہ کیا کہ وہ زمین پر گر گیا۔
اس ہاتھی کے گرتے ہی طرفین آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔ اس ہنگامے میں ایک تیر خان زماں کے بازو میں آ کر لگا۔ ابھی وہ اس تیر کو اپنے جسم سے نکال ہی رہا تھا کہ دوسرا تیر اس کے گھوڑے کو آ کر لگ گیا۔ گھوڑا اس صدمے کی تاب نہ لا کر چلنے سے معذور ہو گیا لہٰذا وہ گھوڑے سے اتر گیا۔ ایک بہی خواہ نے دوسرا گھوڑا اسے پیش کیا۔ ابھی وہ گھوڑے پر سوار بھی نہیں ہو سکا تھا کہ اکبر کی فوج کا ایک ہاتھی وہاں پہنچ گیا۔ یہ ہاتھی حملے کا ارادہ کر رہا تھا کہ خان زماں نے چلا کر فیل بان سے کہا۔
''میں مرد بزرگ ہوں۔ اگر تو زندہ مجھے بادشاہ کے پاس لے جائے گا تو انعام پائے گا۔''
فیل بان نے اس کی بات پر توجہ نہ دی اور اس پر ہاتھی دوڑا دیا۔ ہاتھی نے اپنی سونڈ میں لپیٹ کر اسے زمین پر پٹخا اور اپنا پاؤں اس پر رکھ کر اسے کچل دیا۔
بس اتنا ہونا تھا کہ میدان دشمن کے لشکر سے خالی ہو گیا۔ جس کا جدھر منہ اٹھا بھاگ کھڑا ہوا۔ جو ہاتھ لگ گیا، وہ قتل ہو گیا۔ سیکڑوں گرفتار بھی ہوئے۔
میدان صاف ہوا تو اکبر کا ایک امیر نظر بہادر، قیدی بہادر خاں کو گھوڑے پر اپنے پیچھے بٹھا کر اکبر کے حضور لے کر آیا۔
اکبر نے بہادر خاں کو دیکھتے ہی اس سے سوال کیا۔
''میں نے تمہارے ساتھ کیا برا سلوک کیا تھا جو تم نے میرے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور میرے مقابلے پر تلوار سنبھالی۔'' بہادر خاں ندامت کی وجہ سے خاموش رہا۔ اس نے صرف اس قدر کہا۔
''خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آخری وقت میں حضور کا دیدار حاصل ہو گیا جو تمام گناہوں کے مٹانے کا باعث ہے۔''
اکبر نے اس کے قتل کا ارادہ فی الحال ترک کر دیا اور فی الحال نظر بند کرنے کا حکم دیا لیکن لشکریوں نے بہادر خاں کا زندہ رہنا مناسب نہ سمجھا اور شاہی حکم کے بغیر ہی اسے قتل کر دیا۔
اس مقام پر خان زماں کا سر بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ اکبر نے خان زماں کے کٹے ہوئے سر کو حقارت سے دیکھا اور اس غیبی فتح پر سجدۂ شکر بجا لایا۔
حکم شاہی ہوا کہ ان مقتولوں کے سروں کو سلطان مرزا کی ان اولادوں کے پاس بھیج دیا جائے جنہوں نے حال ہی میں علمِ بغاوت بلند کیا تھا تاکہ انہیں عبرت حاصل ہو اور وہ بغاوت سے باز آجائیں۔
ان واقعات کا ایک کردار سکندر زماں ابھی باقی تھا۔
جب اکبر کو اطمینان کلی حاصل ہو گیا تو اس نے ''جوسی'' اور ''بیاگ'' کا ارادہ کیا۔ دو روز وہاں قیام کیا۔ وہ لوگ جو بادشاہ کے حضور سے فرار ہو کر خان زماں سے جا ملے تھے، وہاں گرفتار ہو کر لائے گئے اور انہیں موکلوں کے سپرد کر دیا گیا۔
اکبر نے وہاں سے بنارس کا رخ کیا۔ اس منزل پر خان زماں (مقتول) کے آدمیوں میں سے جس نے عاجزی اختیار کی اور حاضر ہو گیا اس کی خطا معاف کر دی گئی۔ بادشاہ بنارس سے جونپور پہنچا۔ تین روز تک اس شہر کے باہر قیام کیا۔ خان زماں کے بہت سے آدمی میدانِ جنگ سے بھاگ آئے تھے اور وہاں جمع تھے، ان سب کو امن کی نوید دی۔
''تم لوگوں نے چونکہ علی قلی خاں کا ساتھ چھوڑ دیا اور ہمارے مقابلے پر نہیں آئے اس لیے تم سب کو سلامتی کی

نوید دی جاتی ہے۔''
ان انتظامات سے نمٹنے کے بعد وہ جونپور سے نکلا اور دریائے گنگا کے کنارے کڑہ مانک پور کے گھاٹ پر جہاں بادشاہی لشکر مقیم تھا، پہنچا۔ کشتیاں تیار کھڑی تھیں۔ وہ اپنے چار پانچ ساتھیوں کے ساتھ کشتی میں سوار ہوا اور قلعہ کڑہ میں رونق افروز ہوا۔ فرمان صادر ہوا، منعم خاں دارالخلافہ آگرہ سے یہاں حاضر ہو۔
خان زماں کے لشکر کے قیدیوں کی ایک جماعت جو بادشاہ کے حضور سے بھاگ گئی تھی، انہیں قتل کرا دیا گیا۔
خان زماں کا وکیل مرزا میرک رضوی مشہدی جو بادشاہ کے پاس سے فرار ہو کر خان زماں کے پاس چلا گیا تھا جنگ کے دن ہی گرفتار ہوا تھا، اسے اکبر کے سامنے پیش کیا گیا۔ اسے ہاتھی کے نیچے پھینکا گیا۔ ہاتھی نے اسے چند مرتبہ سونڈ میں لے کر پٹخا۔ اس کی موت نہیں تھی کہ مرا نہیں۔ آخرکار سیادت کی وجہ سے معاف کر دیا گیا۔
یہ سزائیں دی جا رہی تھیں کہ بہ حکم شاہی منعم خاں آگرہ سے یہاں پہنچ گیا۔ بادشاہ نے بہادر خاں اور خان زماں کی جاگیروں کا تمام علاقہ اس کی حفاظت اور انتظام میں دینے کا حکم جاری کیا۔
''لشکر کے لیے کیا حکم ہے؟''
''یہ ابھی آگرہ واپس نہیں جائے گا۔ باغیوں کا ایک مہرہ سکندر خاں ابھی باقی ہے۔ مظفر خاں کی سربراہی میں فتح مند لشکر سکندر کے تعاقب میں اودھ کی طرف جائے گا۔''
ان احکامات کے بعد اکبر آگرہ پہنچ گیا۔
سکندر خاں نے لشکر کی روانگی کی خبر سنی تو وہ قلعہ بند ہو گیا۔ اسے یہ خبر نہیں تھی کہ خان زماں اور بہادر خاں کو شکست ہو چکی ہے اسی لیے وہ قلعہ بند ہو گیا تھا کہ خان زماں اس کی مدد کو ضرور پہنچے گا لیکن جب کئی دن گزر گئے تو اسے تشویش ہوئی۔ اس نے ایک آدمی کسی نہ کسی طرح نیچے اتارا کہ وہ خان زماں کے پاس جائے اور اسے حالات سے آگاہ کرے۔ یہ سوار کوئی ایک ہفتے بعد واپس آیا اور یہ بری خبر لایا کہ نہ صرف شکست ہوئی ہے بلکہ بہادر خاں اور خان زماں اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ اس خبر کو سنتے ہی ازبک جو اس کے ساتھ لگے چلے آئے تھے، بددل ہو گئے۔
سکندر خاں نے یہ موسم دیکھ کر کچھ لوگوں کو مظفر خاں کے پاس بھیجا اور امان طلب کی۔ دراصل یہ بھی اس کی چال تھی۔ اس نے نہایت چالاکی سے شاہی افواج کو صلح کی گفتگو میں مشغول رکھا اور اس دروازے سے جو دریا کی طرف نکلتا تھا، اپنے لوگوں کے ساتھ نکلا اور کشتی میں سوار ہو کر چلا گیا۔
چونکہ دریا کے اس طرف کی کشتیاں سکندر خاں کے قبضے میں تھیں، اس وجہ سے امراء نہ جا سکے۔
دوسری طرف پہنچ کر سکندر خاں نے امراء کو پیغام بھیجا کہ میں اسی قول و قرار پر قائم ہوں جو ہو چکا ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ جو لوگ میرے ہمراہ ہیں، وہ بھی دیکھ لیں۔ اگر تم کشتی میں بیٹھ کر دریا میں آجاؤ اور اس طرف سے میں بھی دو تین آدمیوں کو ہمراہ لے کر آجاؤں تو عہد و قرار ازسرِنو کر لیا جائے تاکہ ان لوگوں کو تسکین ہو جائے اور ہم سب مل کر بادشاہ کے حضور چلے جائیں۔
مظفر خاں اپنے تین آدمیوں کے ساتھ دریا میں آیا اور دریا ہی میں ملاقات ہوئی۔ مظفر خاں نے قسم کھائی اور سکندر خاں کی گناہ کی معافی کا ذمہ لیا اور وعدہ کیا کہ اس کے جان و مال اور اس کے آدمیوں کو نقصان نہیں پہنچائیں گے۔
یہ ملاقات بھی اس کی چال تھی۔ جب مجلس برخاست ہو گئی اور ہر شخص اپنی اپنی جگہ چلا گیا تو سکندر خاں جس جگہ تھا، وہاں سے کوچ کر کے دو منزل آگے چلا گیا اور شاہی امراء کو لکھا کہ دریا میں طغیانی ہونے کی وجہ سے میں دریا کے کنارے نہ ٹھہر سکا۔ مظفر خاں نے محمد قلی برلاس اور راجا ٹوڈرمل کو طلب کیا اور ان سے مشورہ چاہا۔ سب نے اس طغیانی کی تردید کی۔
''دریا میں طغیانی آتی ہے تو صرف ایک کنارے پر نہیں آتی۔ دریا پُرسکون ہے۔ سکندر خاں نے ہمیں فریب دیا ہے۔ وہ فرار ہونے کی نیت رکھتا ہے۔''
''اس سے پہلے کہ وہ ہماری دسترس سے باہر نکل جائے ہمیں اس کا تعاقب کرنا ہوگا۔''
''پورے لشکر کو لے جانا محال ہوگا۔ صرف چند افراد ہی جا سکتے ہیں۔''
''اگر مقابلے کی نوبت آگئی؟''
''سکندر خاں کے ساتھ زیادہ افراد نہیں ہیں۔ سب اس کا ساتھ چھوڑ گئے ہیں۔ ہم چند افراد ہی اس کا قلع قمع کرنے کے لیے کافی ہوں گے۔''
سکندر خاں نے گھاٹ سے کشتیاں ہٹوا دی تھیں صرف ایک کشتی تھی جس سے یہ امراء سکندر سے ملاقات کر کے واپس آئے تھے۔ اسی کشتی پر سوار ہوئے اور دریا پار کر لیا۔
تعاقب کرنے والے گورکھپور پہنچے تو معلوم ہوا، سکندر خاں ایک سکندر نامی ازبک کی مدد سے جو افغان حاکم کی

طرف سے اس گھاٹ پر تھا، دریا عبور کر کے چلا گیا۔ چونکہ اس جانب زیادہ تر افغانوں کی حکومت تھی لہٰذا امراء بادشاہ کے حکم کے بغیر اس ولایت میں نہ جاسکے اور حقیقتِ حال لکھ کر بادشاہ کے حضور میں بھیج دی۔

شاہی حکم صادر ہوا کہ چونکہ سکندر ممالکِ محروسہ سے باہر نکل گیا ہے اس لیے اب اس کے تعاقب کی ضرورت نہیں۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دو اور ہم فرمان جاری کرتے ہیں اس کی جاگیر محمد قلی برلاس کے سپرد کی جائے۔

جب امرائے کبار اس حضور سے آگاہ ہوئے تو انہوں نے محمد قلی خاں برلاس کو وہاں چھوڑا اور شاہی بارگاہ کی طرف متوجہ ہوئے اور دارالخلافہ آگرہ پہنچ کر شرفِ باریابی سے سرفراز ہوئے۔

بیرم خاں خان خاناں کے ڈرامے کے جتنے کردار تھے سب اپنے اپنے انجام کو پہنچے۔ جن لوگوں نے اس کے خلاف سازشیں کی تھیں، وہ خود اپنی ہی پھیلائی ہوئی سازشوں کا شکار ہوئے۔

اس کے خلاف سازش کرنے والوں نے جن میں خان زماں پیش پیش تھا، اس پر بغاوت کا الزام لگا کر اکبر کو اس سے متنفر کر دیا تھا۔ اب وہ خود بغاوت پر آمادہ ہوئے اور مارے گئے۔ اب نہ ادہم خاں رہا، نہ بہادر خاں نہ خان زماں۔ سکندر خاں بچ ضرور گیا لیکن جاگیریں گنوا کر کوڑی کوڑی کو محتاج ہوا۔ بیرم خاں کے ساتھ بھی اچھا نہیں ہوا لیکن بادشاہ کی نظروں میں سرخرو بھی ہوا اور شہید بھی کہلایا۔

اکبر نے اس کے تمام قصور معاف کر کے اس کو حج بیت اللہ کو جانے کی اجازت دے دی تھی۔ پچاس ہزار روپے سفر خرچ کے لیے بھی عنایت کیے تھے۔ سازشیوں کے ہاتھوں اپنی تذلیل پر دکھ تو بہت ہوا تھا لیکن راضی بہ رضا تھا۔ اس نے اسی میں عافیت سمجھی تھی کہ حج کے لیے چلا جائے پھر اگر منظور ہوا تو سازشوں کا طوفان تھمنے کے بعد دوبارہ ملازمت میں آجائے گا لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ حج کا ارادہ بھی پورا نہ ہوا اور ملازمت کا ارمان بھی راستے ہی میں رہ گیا۔

وہ اکبر کی طرف سے اجازت ملتے ہی اپنے اہل وعیال اور چند رفیقوں کے ساتھ کعبہ کا ارادہ کر کے طرح طرح کی مصیبتیں اٹھا کر کھنبایت کی بندرگاہ پر پہنچ گیا تھا۔ وہاں اس کو کچھ عرصے تک ٹھہرنا پڑا۔ وہ کسی بھی خطرے سے بے خبر یہاں رکا رہا جبکہ خطرہ اس کے اردگرد منڈلا رہا تھا۔ اس کے دشمن یہاں بھی اس سے غافل نہیں ہوئے تھے۔

ایک پٹھان مبارک خاں دشمنوں کے اکسانے پر اس.... قافلے کے ساتھ ہو گیا تھا اور موقع کا منتظر تھا۔ جب خان خاناں کو کھنبایت کی بندرگاہ پر رکنا پڑا تو اسے موقع مل گیا۔ اس نے چھرا مار کر اس کا کام تمام کر دیا۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے دیگر ساتھی اطراف میں گھات لگائے بیٹھے تھے۔ جب خان خاناں کے قتل کا شور مچا اور بھگدڑ سی مچ گئی تو مبارک خاں کے ساتھی خان خاناں کے خیمۂ خرگاہ پر ٹوٹ پڑے اور جو کچھ مال واسباب ہاتھ لگا لوٹ کر لے گئے۔

بھگدڑ کا خاتمہ ہوا تو خان خاناں کے ساتھیوں نے اس کی لاش کی خبر لی۔ خان خاناں کا دمِ واپسیں تھا۔ اس کی زبان پر یہ کلمات جاری تھے۔

''صد شکر کہ میں اپنے ولی نعمت کی راہ میں بیت اللہ کا سفر کرتے ہوئے شہید ہو رہا ہوں۔''

خان خاناں کی بیوہ سلیمہ سلطان بیگم اور دوسرے متعلقین احمد آباد لوٹ آئے۔ وہاں کے حاکم نے بدرقہ کی حفاظت میں ان سب کو بادشاہ کے حضور پہنچا دیا۔

اکبر نے خان خاناں کی بیوہ سے عقد کر لیا۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ خان خاناں کی طرف سے اس کا دل صاف تھا۔ اس کا مزید ثبوت اس وقت مل گیا جب خان خاناں کے چار سالہ بیٹے کو جوان ہونے کے بعد خان خاناں کا لقب دیا جو تاریخ میں مرزا عبدالرحیم خان خاناں کے نام سے درج ہو گیا۔

بیرم خاں سلطنت وفرماں روائی میں مختارِ کل کے درجے پر پہنچ گیا تھا۔ اسی لیے وہ حاسدوں کی آنکھ میں کانٹا بن کر کھٹکتا رہتا تھا۔ یہی خلش باہمی نزاع کا سبب بنی اور تنازعات کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس سے غلطیاں بھی ہوئی ہوں گی، ناانصافیاں بھی ہوئی ہوں گی لیکن وہ باغی ہرگز نہیں تھا۔ وہ اپنا دفاع ضرور کرتا رہا لیکن بغاوت نہیں کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ دشمن اس کے خلاف اپنا کام کر گئے اور وہ مفت میں بدنام ہوا۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ مکافاتِ عمل کا سلسلہ چلا کہ اس کے دشمنوں میں سے کوئی بھی اپنا بویا ہوا کاٹے بغیر اس دنیا سے نہیں گیا۔

اسے کانٹا کہہ کر نکالنے والے خود بھی کانٹا بن کر نکلے۔

طبقات اکبری (اردو ترجمہ، جلد دوم۔ مغلیہ دورِ حکومت (حصہ اول)، خافی خاں نظام الملک۔ تاریخ فرشتہ، محمد قاسم فرشتہ (حصہ اول)

آخری گھر

منظر امام

جس کا کام اُسی کو ساجھے... دوجا کرے تو... جی ہاں بالکل ایسا ہی ہوا تھا اس کے ساتھ بھی... صحیح اور غلط کا فیصلہ کرنا اور جزا و سزا کا مستحق ٹھہرانا انسان کا کام ہرگز نہیں ہے۔ یہ تو اوپر والے کے فیصلے ہیں مگر اس نے انجانے میں ایسی ہی غلطی کر ڈالی اور جب اس کی سزا ملی تو حیرت زدہ رہ گیا۔

ایک تعمیراتی انجینئر کے

گھمنڈ کا عبرت اثر انجام

میں تھک چکا تھا۔

میرا دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن میرے باس نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اسی لیے مجھے یہ کام ہر حال میں کر کے دینا تھا۔

کیا سفر تھا میرا۔

میں نے کامیابی کا سفر کیا تھا۔ میں ایک آرکیٹیکٹ ہوں۔ یہ میرا بچپن کا شوق رہا ہے۔ جب میں چھوٹا سا تھا تو اس وقت بھی گھروندے بنایا کرتا تھا۔ مٹی کے، لکڑی کے



ٹکڑوں کے اور گھاس پھوس کے۔ گھر والوں کو ابتدا ہی میں اندازہ ہو گیا تھا کہ میرا رجحان کیا ہے۔ میری دلچسپی کیا ہے۔ مجھے کس طرف جانا ہے۔

جب کچھ بڑا ہوا تو اکثر مجھ سے پوچھا جاتا کہ بیٹا بڑے ہو کر کیا بنو گے۔ تو میں جواب میں کہہ دیتا۔ ''میں انجینئر بنوں گا۔''

گھر والوں نے میری حوصلہ افزائی کی اور مجھے وہی تعلیم دلوائی جو میرے خواب تھے۔ جس طرف میں جانا چاہتا تھا۔ میں انجینئر بنا۔ میں نے آرکیٹیکٹ کے شعبے کا انتخاب کیا تھا اور ہوا یہ کہ میں ایک کامیاب آرکیٹیکٹ بن گیا۔

ایک بڑی فرم نے مجھے ہائر کر لیا اور میں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز کر دیا اور پھر نہ جانے کیسی کیسی کامیاب اور منفرد ڈیزائننگ کی۔ میری بنائی ہوئی عمارتیں حسن اور تہذیب کی علامت ہوا کرتی تھیں۔ میں نے اس شعبے میں استاد نزاکت علی سے بہت راہنمائی حاصل کی۔ وہ اب ریٹائر ہو چکے تھے۔ انہوں نے کسی ادارے سے اس شعبے میں تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ اس کے باوجود ان کی ڈیزائن کی ہوئی عمارتیں اپنی مثال آپ ہوا کرتی تھیں۔

انہوں نے کہا تھا کہ عمارت سازی صرف ایک کاریگری نہیں ہے بلکہ ایک نازک احساس بھی ہے۔ معمار ہی سے عمارت بنتی ہے۔

عمارت ڈیزائن کرنے والے کی شخصیت کا عکس اس عمارت میں نظر آنے لگتا ہے۔ ہر عمارت میں شاعری بھی ہونی چاہیے۔ ایسا لگے جیسے رہنے والا کسی عمارت میں نہیں بلکہ کسی بڑے شاعر کے دیوان میں رہ رہا ہو۔

انہوں نے مجھے مغلیہ طرزِ تعمیر سے روشناس کروایا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ویسے تو مغلیہ طرزِ تعمیر، ایرانی، ترکی اور بازنطینی طرزِ تعمیر کا ملغوبا ہے لیکن مغلوں نے اس میں اپنی شناخت بھی برقرار رکھی ہے۔ ان کی بنائی ہوئی عمارتوں کی مثالیں ہندوستان، پاکستان، بنگلا دیش اور افغانستان میں جگہ جگہ ملتی ہیں۔ جیسے بادشاہی مسجد لاہور، جامع مسجد دہلی، بلند دروازہ آگرہ، لال قلعہ، ہمایوں کا مقبرہ اور سب سے بڑھ کر تاج محل۔ تاج محل ایک عمارت ہی نہیں بلکہ ایک شاعری ہے۔ خوب صورت غزل ہے۔

میں نے استاد کی باتوں کو ہمیشہ یاد رکھا۔ اسی لیے میں نے جتنی عمارتیں ڈیزائن کیں، وہ اپنی مثال آپ تھیں۔ دیکھنے والے انہیں سراہے بغیر نہیں رہتے تھے۔ میں جس فرم میں کام کرتا تھا، اس فرم کے مالکان بھی میرے کاموں سے بہت خوش تھے۔ وہ مجھے کسی قیمت پر بھی اپنی فرم سے جانے نہیں دیتے تھے۔ اگرچہ ایک دو بار بہت اچھی آفر بھی آئی لیکن یا تو میں نے خود انکار کر دیا یا انہوں نے مجھے جانے نہیں دیا۔

اسی طرح زندگی گزر گئی۔ ایک عرصہ ہو گیا۔ تیس سال کم نہیں ہوتے۔ اس دوران یاد نہیں ہے کہ میں نے کتنی عمارتیں ڈیزائن کی ہوں گی اور کیسے کیسے لوگ ان عمارتوں میں رہ رہے ہوں گے۔

پھر یہ ہوا کہ باس نے مجھے اپنے کمرے میں بلا کر ایک صاحب سے ملاقات کروائی۔ میں نے باس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کو پہچان لیا تھا۔ وہ ایک معروف آدمی تھا لیکن اس کی شہرت ٹھیک نہیں تھی۔ کہا جاتا تھا کہ وہ لڑکیوں کی اسمگلنگ میں بھی ملوث ہے لیکن مجھے کیا۔ میرا اس سے کیا واسطہ تھا۔

''ظہیر صاحب۔'' باس نے اس کا تعارف کروایا۔ ''ان سے ملیں یہ اسفند یار صاحب ہیں۔''

میں نے رسمی طور پر اس سے ہاتھ ملایا۔

''ظہیر صاحب۔ اسفند یار صاحب اپنی کوٹھی آپ سے ڈیزائن کروانا چاہتے ہیں۔'' باس نے کہا۔

''اسفند صاحب مجھ ہی سے کیوں؟''

'' ظہیر صاحب۔ چار کوٹھیاں اسی شہر میں ہیں۔'' وہ فخریہ لہجے میں بولا۔ ''لیکن ایک کوٹھی کی ڈیزائننگ آپ سے کروانا چاہتا ہوں۔ کیا زبردست ڈیزائننگ ہوتی ہے آپ کی۔ ارے بھائی میں تو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتا رہتا ہوں۔ پچھلے مہینے میں نے کبیر برادرز والوں کی کوٹھی دیکھی تو میں بہت متاثر ہوا۔ میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے اس فرم کا نام لیا اور یہ بتایا کہ اس فرم میں ظہیر صاحب ہوتے ہیں۔ وہی ایسی ڈیزائننگ کر سکتے ہیں۔ اس لیے آپ کے پاس آیا ہوں۔''

''بہت بہت شکریہ اس تعریف کا۔'' میں دل ہی دل میں خوش بھی ہو گیا تھا۔ اپنی تعریف کسے بری لگتی ہے۔ ''ویسے بھی یہ میرا کام ہے۔''

''کام تو ہے لیکن میرا کام ذرا دل لگا کر کریں گے۔'' اس نے کہا۔

''کیوں نہیں لیکن میری ایک شرط بھی ہوگی۔''

''ضرور۔ ضرور فرمائیں کیا شرط ہے؟''

''اسفند صاحب! میں کوٹھی ڈیزائن تو کرتا ہوں لیکن اس میں آرٹ کا پہلو بھی رکھتا ہوں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ

میری بنائی ہوئی کوٹھی جس طرح باہر سے آرٹسٹک دکھائی دیتی ہے، اسی طرح اندر سے بھی دکھائی دے تاکہ دیکھنے والے ہر طرح سے متاثر ہو جائیں۔''

''ارے صاحب۔ میں تو خود بھی یہی چاہتا ہوں۔ بتائیں مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' اس نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ میری شرط یہ ہے کہ اس کے اندر کی ڈیکوریشن بھی میری مرضی کے مطابق ہوگی۔ میں ہی انٹیریئر ڈیزائنر کا انتخاب کروں گا۔''

''واہ واہ۔ یہ تو اور بھی اچھی بات ہوگی۔'' وہ پھڑک اٹھا تھا۔ ''مجھے اور کیا چاہیے۔ آپ جو کہیں گے وہی ہوگا۔ اخراجات کی فکر نہ کریں۔ وہ ڈیزائنر جتنا مانگے گا میں دینے کو تیار ہوں۔''

میں نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس شخص کی کوٹھی دو سال میں بن کر تیار ہوئی تھی لیکن کیا شاہکار بن گئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ پورے شہر میں اس کوٹھی کی دھوم مچی ہوئی تھی، لوگ اس کو دیکھنے آیا کرتے تھے۔

اس آدمی نے کام مکمل ہونے پر مجھے ایک گاڑی تحفے میں دی تھی۔ میرے دفتر والے بھی بہت خوش تھے۔ اس فرم کی شہرت اور بھی دو چند ہو گئی تھی۔

زندگی آرام سے گزر رہی تھی کہ ایک دن مجھے اپنی کمر میں تکلیف محسوس ہوئی۔ میری بیوی جاگ رہی تھی۔ میں نے اسے بتایا اس نے جو کچھ ہو سکتا تھا وہ کیا۔ مالش کی، پین کلر دیا لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس تکلیف نے ساری رات مجھے جگائے رکھا تھا۔

البتہ دوسرے دن تکلیف کم ہو گئی تھی بلکہ شام تک ختم ہو چکی تھی۔ اس دن میں آفس نہیں گیا تھا۔

دراصل میری شادی خاندان ہی کی ایک لڑکی سے ہوئی تھی۔ وہ فیشن ڈیزائنر تھی۔ ایک ہی جیسا کام تھا۔ وہ لباس تیار کرتی تھی اور میں عمارتیں تیار کرتا تھا۔ دو بیٹے تھے۔ وہ دونوں ایم بی اے کر رہے تھے۔ تعمیرات کی طرف ان کا رجحان نہیں تھا۔ اسی لیے میں نے بھی ان کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کی تھی اور مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ وہ دونوں اپنی فیلڈ میں بہت اچھے جا رہے تھے۔

میں نے خدا سے جو بھی مانگا، وہ مجھے ملتا چلا گیا۔ ایک دن میری ملاقات نور صاحب سے ہو گئی۔ وہ ایک مفکر، ایک دانشور ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مذہبی شخص بھی تھے۔ میں ان سے بہت متاثر ہوا تھا۔

وہ اپنی نشست گاہ میں شام کے وقت دوستوں کی محفل لگایا کرتے۔ اس محفل میں دنیا بھر کی باتیں ہوا کرتیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ زندگی اس کا نام نہیں ہے کہ آپ کے پاس دنیا بھر کا سامان ہو بلکہ اس کا نام ہے کہ آپ کے پاس سکون ہو۔ سکون جو سب سے بڑی چیز ہے۔

''نور صاحب! ایسا سکون حاصل کرنے کی ترکیب کیا ہے؟'' ایک دن میں نے پوچھا۔

''بہت آسان ہے۔'' نور صاحب نے کہا۔ ''دل اور دامن کو صاف رکھیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جو کچھ یہاں ملتا ہے اس کو سلیقے سے برتیں تاکہ وہاں کا حساب کتاب آسان ہو جائے۔ دیکھیں مجرم ہونا تو خود ہی ایک بری چیز ہے لیکن کسی گناہ گار یا کسی مجرم کو آسانیاں مہیا کرنا یا اس کی ہاں میں ہاں ملانا بھی گناہ ہے۔ آج کی زبان میں اسے facilitate کرنا بھی کہتے ہیں۔ خاموشی بھی ایک جرم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر کوئی ظلم یا گناہ کر رہا ہے تو اسے ہاتھ سے روکنے کی کوشش کریں۔ اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو زبان سے تو برا کہیں۔ اگر یہ بھی ممکن نہیں ہے تو کم از کم دل سے تو برا سمجھیں۔ اگرچہ یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے پھر بھی اس کا اجر ملے گا۔''

نور صاحب کی باتوں نے میرے اندر ایک شمع روشن کر دی تھی۔

کئی مہینے گزر گئے۔ میں کام کرتے کرتے تھک چکا تھا۔ آرام کرنا چاہتا تھا۔ بہت کام کر لیا۔ اب خدا کی طرف دھیان لگاتا تھا۔

میں نے ایک دن اپنے باس سے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔ ''باس! میں اب آرام کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیا مطلب؟''

''بس کام کرتے کرتے تھک چکا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''ایسا تو نہیں کہ آپ نے کسی اور فرم کا انتخاب کر لیا ہو؟'' باس نے پوچھا۔

ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ تیس سال آپ کے ساتھ رہا ہوں۔ اب کہیں اور جا کر کیا کرنا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''بات صرف اتنی ہے کہ میں نے تھکن کو غالب کر لیا ہے۔ اب آرام کرنا چاہتا ہوں۔''

''چلیں اگر ایسا ہے تو میں نہیں روکوں گا۔ خدا کرے کہ آپ کو سکون ملتا رہے لیکن میری ایک آخری درخواست ہے۔''

''ارے سر! درخواست کہہ کر شرمندہ کیوں کر رہے

ہیں۔ حکم فرمائیں۔"

"بس ایک مکان آپ کو اور تعمیر کرنا ہے۔" باس نے کہا۔ "یہ آخری گھر ہوگا جو آپ بنائیں گے۔ اس کے بعد میں آپ سے نہیں کہوں گا۔"

دل تو نہیں چاہ رہا تھا کہ کوئی اور کام کروں لیکن باس نے اس انداز سے کہا تھا کہ میں انکار نہیں کرسکا۔ ویسے میں سمجھ گیا تھا کہ دو ہزار گز پر بننے والا شاندار مکان کس کا ہوسکتا ہے۔ کسی موٹے پیٹ والے سیٹھ کا یا کسی راشی آفیسر کا، کسی گناہ گار کا، کسی سودخور کا، یا کسی اسمگلر کا۔ عام آدمی بے چارہ اتنی گز کا گھر بھی نہیں بنوا سکتا۔

نور صاحب کی بات یاد آگئی۔ انہوں نے کہا تھا کہ کسی گناہ گار کو facilitate کرنے والا بھی گناہ گار ہی ہوتا ہے۔

میں نے باس سے کہہ دیا "ٹھیک ہے سر! میں مکان بنانے کو تیار ہوں۔"

لیکن میں نے سوچ لیا تھا کہ کیسا مکان بنا کر دوں گا۔ ایسا مکان جس میں سو طرح کی خامیاں ہوں جس میں رہنے والا زندگی بھر بے سکون رہے۔ یہ سب میرے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ ایسی پیچیدگی پیدا کردیتا کہ دو چار سال بعد اس میں رہنے والے کو نانی یاد آجاتی۔

پیسوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ دوسرے ہی ہفتے سے کام شروع ہوگیا۔ میں جو کچھ بھی کر رہا تھا، اس کی خبر میرے ساتھ کام کرنے والے کو ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ سب میرا حکم ماننے والے لوگ تھے۔

ان میں اتنی صلاحیت ہی نہیں تھی کہ وہ کنسٹرکشن کی خامیوں کا اندازہ لگاسکتے۔ میں اپنے پروفیشن سے بددیانتی تو کر رہا تھا لیکن دوسری طرف میں مطمئن بھی تھا۔ اس قسم کے لوگوں کے مکان ایسے ہی ہونے چاہئیں۔

میں نے صرف تین مہینوں کی محنت کے بعد مکان کھڑا کر دیا۔ اس کا ایلیویشن شاندار تھا۔ اس کی پلاننگ زوردار تھی۔ اس میں سب کچھ ایسا ہی تھا جس کی مجھ سے توقع کی جاسکتی تھی۔

مکان کی تکمیل کے بعد باس اور دوسرے لوگ اس کو دیکھنے آئے ہوئے تھے۔ سب نے اس مکان کی تعریف کی تھی۔

میں نے باس سے کہا۔ "سر! میں نے آپ کے کہنے پر آخری مکان تعمیر کردیا ہے۔ اب مزید کوئی کام نہیں کرسکوں گا۔"

"ٹھیک ہے، اب میں بھی آپ سے کوئی اور کام نہیں کہوں گا۔ جائیں اور ایک پُرسکون زندگی گزاریں۔ ہماری فرم آپ کے اعزاز میں اگلے ہفتے ایک الوداعیہ دے رہی ہے۔ کانٹی نینٹل ہوٹل میں۔ جس میں ہم آپ کو باقاعدہ رخصت کریں گے۔"

"ارے سر! اس کی کیا ضرورت ہے؟" میں نے کہا۔

"ضرورت ہے کیونکہ یہ آپ کا حق ہے۔"

میں نے اپنے گھر والوں کو جب یہ خبر سنائی تو وہ بھی خوش ہوئے تھے۔ "ہاں یہ ہونا ہی چاہیے تھا۔ آپ ہی کی وجہ سے اس فرم کو شہرت ملی ہے۔ ان کو تو اور کچھ بھی دینا چاہیے تھا۔ بہرحال اتنا ہی بہت ہے کہ اس دور میں کسی کے کام کو سراہا تو گیا۔"

تقریب بہت شاندار تھی۔

شہر کے بہت سے معزز لوگ آئے ہوئے تھے۔ دفتر کے کچھ لوگوں نے میرے لیے تقریریں کیں۔ کچھ ہم پیشہ تھے جو میرے کام کو سراہتے رہے۔ آخر میں دفتر کا باس اسٹیج پر آیا۔ اس نے مجھے کچھ بولنے کو کہا۔ میں نے سب کا شکریہ ادا کیا۔

عام طور پر اسی قسم کی باتیں ہوا کرتی ہیں پھر باس نے ایک اعلان کیا۔ "مجھے یہ کہنا ہے کہ ہم ظہیر صاحب کی خدمات کا کوئی صلہ تو نہیں دے سکتے لیکن دفتر کی طرف سے ایک چھوٹا سا تحفہ ضرور دیا جارہا ہے۔ امید ہے کہ ظہیر صاحب اس تحفے کو ضرور قبول کرلیں گے۔" اتنا کہہ کر باس نے میری طرف ایک چابی بڑھا دی۔

"یہ کیا ہے سر؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ اسی مکان کی چابی ہے جو مکان آپ نے ابھی بنایا ہے۔" باس نے کہا۔ "ہم نے آپ کو اس لیے نہیں بتایا کہ ہم سرپرائز دینا چاہتے تھے۔ وہ مکان ہم نے آپ ہی کے لیے بنوایا ہے یہ رہی اس کی چابی۔"

میں نے کانپتے ہاتھوں سے وہ چابی پکڑلی۔

وہ میرا بنایا ہوا آخری گھر تھا۔ وہ گھر جس میں، میں نے بےشمار خرابیاں رکھ دی تھیں۔

اور اس دن مجھے احساس ہوا کہ آپ جس قسم کا گھر یہاں بناتے ہیں، اسی قسم کا گھر آپ کو وہاں دیا جاتا ہے۔ اگر اس کی بنیاد دنیا میں مضبوط رکھیں گے تو آخرت میں بھی مضبوط بنیاد کا ہی گھر ملے گا، ورنہ؟ کیونکہ جو آپ یہاں کرتے ہیں، وہاں آپ کو ویسا ہی ملنے والا ہے۔

انسان بغیر کسی خطا کے بھی اکثر سزاوار ٹھہرادیا جاتا ہے جیسے کہ اس کے ساتھ ہوا مگر... وہ سب تو محض نظر کا دھوکا تھا جسے سچ ثابت کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا سوائے مقدر کی کرشمہ سازی کے۔

اندھیرے غار کے خوف میں مبتلا ایک بےبس انسان کی روداد

خوف کا حصار

تنویر ریاض



ڈینا اور کلیٹن نے اپنی شادی کی تیسویں سالگرہ منانے کے لیے مارچ کے پہلے ہفتے میں دریائے ڈینوب کی سیر کا پروگرام بنایا اور اس مقصد کے لیے تفریحی جہاز میں بکنگ بھی کروالی۔ ڈینا کو امید تھی کہ اس سفر کے دوران اس کی توجہ اپنے خالی گھر سے ہٹ جائے گی جہاں سے اڑنے والا آخری پنچھی اس کا سب سے چھوٹا اور تنگ کرنے والا بیٹا [illegible] تھا۔ ساری تیاریاں مکمل تھیں لیکن صرف ایک ہفتہ قبل انہیں معلوم ہوا کہ دریا میں سیلاب آنے والا ہے اور بکنگ ایجنٹ نے صاف کہہ دیا کہ وہ کسی صورت میں بھی دریا کی سیر سے لطف اندوز نہیں ہوسکیں گے۔

"کوئی بات نہیں۔ ہمیں کم از کم اپنے پیسے تو واپس مل جائیں گے۔" کلیٹن نے صبح کا اخبار پڑھتے ہوئے کہا۔

ڈینا نے کوئی تبصرہ کیے بغیر میز پر سے ناشتے کی خالی پلیٹیں اٹھائیں۔ وہ چاہ رہی تھی کہ کوئی ایسی بات ہوجائے

جس سے وہ خوش ہوسکے لیکن وہ کیا بات ہوسکتی ہے۔ یہ گھر ہی اس کے لیے سب کچھ تھا۔ اس نے ساری زندگی بچوں کی پرورش اور ان کی تعلیم وتربیت میں گزار دی لیکن ان کے جانے کے بعد وقت جیسے ٹھہر گیا تھا۔ اب اس کے پاس صرف یادیں رہ گئی تھیں کہ وہ کس طرح انہیں صبح سویرے بیدار کرکے تیار کرتی، انہیں ناشتا کرواتی، ان کا لنچ تیار کرتی اور انہیں اسکول بھیجتی تھی۔

"کچھ نہ کچھ تو ہونا چاہیے۔" اس نے کلیٹن کا گنجا سر چومتے ہوئے کہا جب وہ ناشتے کی میز سے اٹھ رہا تھا۔ "جب سے ہمارا پروگرام کینسل ہوا ہے، میں پاگل ہونے کے قریب ہوگئی ہوں۔ تم تو اپنے کام پر چلے جاتے ہو۔ ہمیں بندرگاہ کی طرف چلنا چاہیے۔ وہاں بیٹھ کر سی فوڈ کھائیں گے۔ ساحل پر چہل قدمی کریں گے اور سمندر کی ہوا میں سانس لیں گے۔ یہ ہمارے لیے ٹانک کا کام کرے گی۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "آف سیزن میں ایسی جگہ کا ملنا مشکل نہ ہوگا۔"

ڈینا کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے خوشی کے عالم میں لیپ ٹاپ کھولا اور ان جگہوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے لگی۔ کلیٹن اپنے کام پر روانہ ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اٹھی اور اس نے کچن کی دراز سے وہ پوسٹ کارڈ دوبارہ نکالا جو جوئے نے حال ہی میں بھیجا تھا جبکہ آج کل ہر کوئی ای میل یا فیس بک کے ذریعے پیغام رسانی کرتا ہے۔ بچپن سے ہی وہ ڈینا کے لیے معما بنا ہوا تھا اور اب اس نے نیومیکسیکو کے قصبے تاؤس میں ایک ایسی لڑکی سے تعلق قائم کرلیا جسے وہ ٹھیک طرح سے جانتا بھی نہیں تھا۔ اسے گریجویشن کیے ہوئے تھوڑا عرصہ ہی ہوا تھا۔ اس کی کوئی ملازمت نہیں تھی اور نہ ہی اس نے مستقبل کے بارے میں کوئی منصوبہ بنایا تھا۔ صحافت میں ڈگری لینے کے باوجود وہ چھوٹے موٹے کام کرکے اپنا گزارہ کر رہا تھا جن میں تازہ ترین گرین پیروٹ، نامی ایک ریستوران میں شیف کی نوکری تھی۔ اسے ہمیشہ سے ہی کھانا بنانے سے دلچسپی تھی لیکن گریجویشن کرنے کے بعد اس نوعیت کا کام کرنا کچھ عجیب سا لگتا تھا۔

"تم سمجھتی ہو کہ وہ کوئی قابلِ بھروسا شخص ہے۔" کلیٹن نے یہ بات کئی مرتبہ کہی تھی۔ کیا وہ اس میں بہت زیادہ ملوث ہوگئی تھی؟ اور اس کے خیال میں ہی کھوئی رہتی تھی۔

"تم چاہتی ہو کہ سارے بچے تمہارے پاس رہیں۔" اس کی ماں نے ایک دفعہ کہا تھا۔ "لیکن انہیں ایک جگہ رکھنا بہت مشکل ہے۔"

کلیٹن کا پیشہ کھیتی باڑی تھا اور وہ موسم کی سختی کی پروا کیے بغیر اپنی فصلوں کی دیکھ بھال میں لگا رہتا تا کہ اس کے بچے ایک بہتر زندگی گزار سکیں۔ اس کی کوشش رنگ لائی اور اس کے تینوں بچے کالج سے ڈگری حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ بیٹی بیکی کو رہوڈ آئی لینڈ اسکول آف ڈیزائن سے وظیفہ مل گیا تھا جبکہ بیٹا کلے، ہوسٹن کے ٹیکساس میڈیکل سینٹر میں ریسرچ کر رہا تھا البتہ جوئے ابھی تک فارغ تھا اور ادھر ادھر گھوم کر اپنا وقت ضائع کر رہا تھا اور اس کی وجہ سے دونوں میاں بیوی پریشان رہا کرتے تھے۔

☆☆☆

"مجھے یقین ہے کہ ولنگٹن اب پہلے سے زیادہ پھیل گیا ہوگا۔" ڈینا نے جیپ کی پسنجر سیٹ پر بیٹھے ہوئے تبصرہ کیا۔ وہ صنوبر کے درختوں کے پاس سے گزر رہے تھے جو کالج کیمپس کے گرد دائرے کی شکل میں لگے ہوئے تھے۔ وہ طالب علموں کی گاڑیوں کی طویل قطار کے پیچھے چلتے ہوئے ایک جگہ لنچ کے لیے رکے۔

"جوئے یہاں بھی اچھی زندگی گزار سکتا تھا۔" ڈینا نے مینیو پر نظر ڈالتے ہوئے کہا پھر ویٹر کو بلا کر اپنے لیے مشروب کا آرڈر دے دیا۔ "اسے ہمیشہ سے سمندر اور اس کی لہروں پر بننے والے جھاگ پسند ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ جگہ اس کے لیے جنت ہے۔"

"آج کل بچوں کے بارے میں اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔" کلیٹن نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا اور اپنے لیے بیئر کا آرڈر دیتے ہوئے مینیو بند کردیا۔ "جوئے کو ایسے دور دراز علاقوں میں رہنا پسند ہے جو تھیم پارک سے ملتے جلتے ہوں۔"

"تمہیں وہ وقت یاد ہے جب وہ اپنے کچھ دوستوں سے ملنے میکسیکو چلا گیا تھا اور جب اس نے سرحد سے فون کرکے بتایا تو مجھے ہارٹ اٹیک ہوتے ہوتے رہ گیا۔"

"ہاں اور وہاں پہاڑی علاقے میں اسے حادثہ بھی پیش آگیا تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ اسے وہاں جانا ہی نہیں چاہیے تھا اور وہ بھی شرابی دوستوں کے ساتھ۔ قسمت اچھی تھی کہ زندہ بچ گیا۔"

"ممکن ہے کہ ہم اپنے بچوں کے بارے میں تھوڑے سے جذباتی ہو رہے ہوں، ہم اسے پسند کریں یا نہیں لیکن اب وہ اپنے بارے میں سوچنے کے لیے آزاد ہیں۔" ڈینا نے لمحہ بھر توقف کیا اور بولی۔ "صرف جوئے کو

اپنے بارے میں سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہیے۔"

"وہ پہلے ہی بہت وقت لے چکا ہے۔ اس کی ڈگری یونہی پڑے پڑے ضائع ہوجائے گی اور وہ کبھی اسے استعمال میں نہیں لا سکے گا۔"

"یوں لگتا ہے جیسے ہم کل ہی بچوں کے ساتھ چھٹیاں منانے یہاں آئے تھے۔" ڈینا نے اپنے اندرونی کرب پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"وہ دن گزر گئے ڈینا۔ اب ہم صرف یہی امید کرسکتے ہیں کہ کسی دن ان کے بچوں کے ساتھ یہاں ریت پر گھروندا بنائیں گے۔"

انہوں نے خاموشی سے کھانا ختم کیا اور شمال کی جانب روانہ ہوگئے۔ ڈینا اپنے اندر اتنی ہمت نہیں پا رہی تھی کہ وہ کلیٹن کو جوئے اور ٹینا کا تعلق ختم ہونے کے بارے میں بتا سکے اور یہ کہ اب اس کے پاس رہنے کے لیے کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ وہ تاؤس کے باہر نیشنل فاریسٹ میں کیمپنگ کر رہا ہے۔

وہ سہ پہر کے قریب بیچ ہاؤس پہنچے۔ اسکاچ بونیٹ، نامی اس مکان پر سفید اور پیلا رنگ کیا گیا تھا اور اس کے ڈرائیو وے پر برائے فروخت کا بورڈ آویزاں تھا۔

"کتنی پُرسکون جگہ ہے۔" ڈینا نے کار سے باہر آتے ہوئے کہا۔ "یہ مکان بالکل پہلے جیسا ہی ہے۔ تم نے دیکھا کلیٹن...... اس پر برائے فروخت کا بورڈ لگا ہوا ہے۔ پتا نہیں کیا قیمت مانگ رہے ہیں۔"

"میرا اندازہ ہے کہ بہت بھاری رقم ہوگی۔" اس نے مسکراتے ہوئے ڈِکی کھولی اور سامان باہر نکالنے لگا۔

"مجھے ہمیشہ سے یہ مکان پسند ہے کیونکہ دوسرے مکانوں سے الگ تھلگ ہے۔ اس لیے بالکل ذاتی محسوس ہوتا ہے۔" ڈینا مسکراتے ہوئے بولی۔

کلیٹن نے مکان کے احاطے کے ساتھ چلتے ہوئے اس کی ہر چیز کا معائنہ کیا اور بولا۔ "دیکھنے میں تو نہیں لگتا کہ اس کا کوئی حصہ کمزور ہوگیا ہے۔"

ڈینا نے ہر کمرے میں جا کر اس کی سجاوٹ دیکھی اور متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ بستروں پر دیدہ زیب چادریں اور خوب صورت لحاف، تمام دیواروں پر پیچ کلر، شیشے کی بوتلوں میں سیپیاں اور گھونگے اور دیواروں پر آویزاں خوب صورت تصاویر۔ وہ کچن میں چلی گئی اور سامان کھولنے میں کلیٹن کی مدد کرنے لگی پھر اس نے کافی بنائی اور فارمیکا کے ٹیبل پر رکھ دی۔

"کافی اور اس وقت؟" کلیٹن نے بیئر کا ڈبا کھولتے ہوئے کہا۔

"مجھے اس کی طلب محسوس ہو رہی ہے لیکن میں کریم کا ڈبا بھول آئی۔" اس نے فریج کھول کر دیکھا۔

"میں منی مارٹ سے لے کر آتا ہوں۔" کلیٹن بولا۔ "مجھے بھی شکار کے لیے چارا لانا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور چیز جس کی ہمیں ضرورت ہو؟"

"تم مچھلی مارکیٹ سے رات کے کھانے کے لیے کچھ لیتے آنا۔"

کلیٹن کے جانے کے فوراً بعد اس نے مقامی ریئلٹی آفس کو اسکاچ بونیٹ، کی قیمت معلوم کرنے کے لیے فون کیا۔ کتنا اچھا ہوگا اگر وہ اس مکان کے مالک بن جائیں اور ہر سال اپنے بچوں کے ساتھ یہاں چھٹیاں گزاریں۔ شاید اس طرح جوئے بھی گھر واپس آجائے۔ ان کے پاس سرمایہ کاری کرنے کے لیے کافی رقم موجود تھی کیونکہ کلیٹن حصص کے معاملے میں ہمیشہ شک میں مبتلا رہتا تھا اور اس کے لیے وہ اسے الزام نہیں دیتی تھی۔ انہوں نے میوچل فنڈ میں جو سرمایہ کاری کی تھی، وہ ہمیشہ گھٹتی بڑھتی اور وہ یقین سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ ریٹائرمنٹ کی عمر کو پہنچنے تک اس کی قدر وقیمت کیا ہوگی۔

اس کا خیالی منصوبہ زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا جب کلیٹن نے واپس آکر یہ بری خبر سنائی۔

"مجھے امید ہے کہ تم نے سارا سامان نہیں کھولا ہوگا۔" اس نے کہا۔ "منی مارٹ والے نے بتایا ہے کہ سمندر میں طوفان آیا ہوا ہے اور اسی جانب بڑھ رہا ہے۔ اگلے چوبیس گھنٹوں میں وہ ساحل سے ٹکرا سکتا ہے۔"

"پلیز...... کہہ دو کہ تم مذاق کر رہے ہو؟"

"ہم یہاں رات گزار سکتے ہیں لیکن صبح ہوتے ہی یہاں سے جانا ہوگا۔ تم جانتی ہو کہ سمندری طوفان کتنی تباہی لاتا ہے۔"

ڈینا نے ایک سرد آہ بھری اور صوفے میں دھنس کر کافی پینے لگی۔

"یہ طوفان کہاں سے آگیا؟ ہم نے روانہ ہونے سے پہلے ٹی وی پر موسم کی تمام خبریں دیکھی تھیں۔ انہوں نے ایک مرتبہ بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ اچانک ہی سمندر بپھر گیا۔ طوفان اسی طرح آتے ہیں۔"

"پھر ہم کب یہاں سے جائیں گے؟"

"شاید کل صبح۔ ویسے مجھے اتنی جلدی نکلنا پسند نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ ایسا کرنا ضروری ہے۔"

اس رات کھانے کے بعد وہ دونوں ٹیرس پر بیٹھے سمندر کا نظارہ کر رہے تھے کہ ڈینا نے ہمت کر کے کلیٹن کو جوئے کے پوسٹ کارڈ کے بارے میں بتادیا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ اس کے جبڑے بھینچ گئے تھے۔ اس نے مضبوطی سے کرسی کو پکڑلیا کہ وہ ہوا کے جھکڑ سے کہیں دور نہ چلی جائے۔ ایک طوفان اس کی آنکھوں میں مچل رہا تھا پھر وہ پھٹ پڑا۔ "وہ اس پیاری سی لڑکی کے ساتھ شادی کیوں نہیں کرلیتا۔ کیا نام ہے اس کا؟"

"مسی......!" ڈینا نے غائب دماغی کے عالم میں کہا۔

"مسی اچھی لڑکی ہے اور اس کا تعلق اچھے گھرانے سے ہے۔ آخری سال تک وہ دونوں ساتھ تھے پھر جوئے نے اسے سڑے ہوئے آلوؤں کے بیگ کی طرح پھینک دیا۔"

"حالانکہ وہ ایک دوسرے کے لیے بہت موزوں لگتے تھے۔" ڈینا بولی۔

"میں کبھی نہیں سمجھ سکا کہ علیحدگی کی وجہ کیا تھی۔"

"ان کے درمیان اختلافات ہوگئے تھے۔" ڈینا بڑبڑائی۔

"کیسے اختلافات؟"

"تمہیں معلوم ہے کہ میں بچوں کے ذاتی معاملات میں دخل نہیں دیتی۔ بس اتنا معلوم ہے کہ ان کے درمیان اختلافات ہوگئے تھے۔"

"پھر وہ اس سنہرے بالوں والی لڑکی کیسی، سے ملنے لگا۔ وہ مالدار لڑکی تھی اور اس کی عادتیں بھی اچھی تھیں۔ اس کے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟"

"میں نے سنا ہے کہ وہ شادی کر کے ویسٹ کوسٹ چلی گئی لیکن مجھے حقیقت معلوم نہیں۔"

"اس کے بعد وہ ایسی لڑکی کے پیچھے لگ گیا جسے وہ ٹھیک طرح سے جانتا بھی نہیں تھا اور ہمیں بھی اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔"

ڈینا یہ سب پہلے بھی سن چکی تھی۔ اس نے مشروب کا آخری گھونٹ لیا اور کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

"میری تو بس یہی خواہش ہے کہ ہم ایسی جگہ جائیں جو اس جیسی طوفانی نہ ہو۔"

"ایسی جگہ تو ہمارا گھر ہی ہوسکتا ہے۔" کلیٹن نے جوئے کے ذکر کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

ان دونوں کے درمیان ایک عجیب سی خاموشی طاری ہوگئی۔ ان کی گفتگو نے ڈینا کی توقع کے مطابق رخ اختیار کیا تھا۔ اگلے روز اسے معلوم ہوا کہ اسکاچ یونیٹ کی قیمت اس کی توقع سے کہیں زیادہ تھی۔ لہٰذا اسے اپنی حکمت عملی وضع کرنے کے لیے مزید وقت درکار تھا۔

☆☆☆

جوئے اپنے لمبے سنہرے بالوں پر اونی ٹوپی جمائے آگ کے پاس اس امید پر کھڑا ہوا تھا کہ اسے کافی کے لیے گرم پانی مل جائے گا۔ کچھ دیر بعد وہ اس کوشش میں کامیاب ہوگیا۔ وہ ایک ویران کچی سڑک پر سفر کر کے یہاں تک آیا تھا۔ گو کہ اسے پہاڑ پر چڑھنے، سائیکل چلانے، برف رانی کے لیے تختوں پر پھسلنے اور دوستوں کے ساتھ گھومنے میں مزہ آتا تھا لیکن یہ صورتِ حال اس کے لیے بالکل نئی تھی۔ دور تک پھیلا ہوا جنگل، ہر طرف چھائی تاریکی، عجیب سی آوازیں جو رات بھر اس کا پیچھا کرتیں۔ اس کے اثرات ایک ہفتے بعد ہی ظاہر ہونا شروع ہوگئے۔ وہ کام کرنے قصبے جاتا تھا لیکن ایک دن پہلے اس نے کیمپ واپس آتے ہوئے سہ پہر میں ایک پہاڑی شیر کو درختوں سے نکلتے دیکھا تو فوراً بریک لگا دیے تاکہ وہ سڑک پار کرسکے۔

جوئے نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے آگ کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے والدین سے ملنا چاہ رہا تھا لیکن جلد ہی اس کے خیالات کا سلسلہ منقطع ہوگیا جب اس نے بجری پر ٹائروں کے چلنے کی آواز سنی جو قریب آتی جارہی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی جب جنگل کے گشتی محافظوں کی گاڑی اس کے ٹرک کے برابر میں آکر رک گئی اور وہ نیچے اتر آئے۔

"صبح بخیر جناب۔" ایک درمیانی عمر کے شخص نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"صبح بخیر آفیسر۔"

"تم نے یہاں کب سے کیمپ لگایا ہوا ہے؟"

"تقریباً ایک ہفتہ ہوگیا۔" جوئے کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس کے علاوہ کیا کہے۔

"میں یہاں گھومنے آیا ہوں۔"

"یہ خطرناک علاقہ ہے۔" آفیسر نے کیمپ کی پیمائش جانچتے ہوئے کہا۔ "سال کے اس حصے میں یہاں پہاڑی شیر پھرتے رہتے ہیں۔ اس لیے تمہیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔"

جوئے کے ذہن میں دو دن پہلے والا واقعہ گھوم گیا جب اس نے شیر کو قریب سے دیکھا تھا۔

"حال ہی میں ایک واقعہ پیش آیا جب ایک عورت موت کے گھاٹ اتار دی گئی۔ شیر اس کے انتظار میں ہی لیٹا ہوا تھا۔ اس بے چاری عورت کو معلوم ہی نہ ہوسکا کہ اس پر کس نے حملہ کیا۔ وہ اسے گھسیٹتا ہوا جنگل میں لے گیا اور اس

کی لاش کو ٹہنیوں اور ملبے سے ڈھانپ دیا۔ ہمیں کئی مہینوں تک اس کی لاش نہ مل سکی۔"

"بڑی ہولناک خبر ہے۔" جوئے نے کہا۔

"یہ کیمپ لگانے سے پہلے تم کہاں رہتے تھے؟" آفیسر نے پوچھا تو جوئے نے اپنا پرانا پتا بتادیا۔

"تم جوئے ہوورڈ تو نہیں ہو؟"

"ہاں، میں وہی ہوں۔" جوئے نے جواب دیا۔

"کیا تم ٹینا سے فو کرنامی ایک جوان لڑکی کے ساتھ رہتے تھے؟"

"ہاں۔ ہم کچھ عرصہ ساتھ رہے لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"وہ لاپتا ہوگئی ہے۔" آفیسر نے کہا۔ "اور ہم اسی سلسلے میں پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔ تم نے آخری بار ٹینا کو کب دیکھا تھا؟"

"کئی ہفتے ہوگئے۔" جوئے نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے اگر وہ جلد ہی نہ ملی تو ہم تمہیں شاملِ تفتیش کرلیں گے۔"

جوئے بجھتی ہوئی آگ کے پاس کھڑا ہوا تھا اور اب اس کے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ جب آفیسر نے اس سے ڈرائیونگ لائسنس مانگا تو اس نے بے دھیانی میں اپنی جینز کی جیبوں پر ہاتھ مارا پھر وہ اپنے ٹرک تک گیا اور... گلوو باکس سے لائسنس نکال کر اس کے حوالے کردیا۔ آفیسر نے اپنے ٹرک کے ڈیش بورڈ میں نصب کمپیوٹر میں اس کے کوائف ٹائپ کیے اور لائسنس اسے واپس کردیا پھر اس نے اسے جلدی سے خدا حافظ کہا اور ٹرک میں بیٹھ کر چلا گیا۔

☆☆☆

انہیں گھر آئے ہوئے ایک ہفتہ ہوا تھا کہ ایک شام ڈینا نے کلیٹن کو خوشگوار موڈ میں دیکھتے ہوئے کھانے کی میز پر اپنی تجویز رکھی کہ وہ ادھر ادھر پیسے لگانے کے بجائے اسکاچ یونیٹ خرید کر اسے کرائے پر اٹھادیں اور اس کے انتظام اور دیکھ بھال کی ذمے داری جوئے کے سپرد کردی جائے۔ اگر یہ منصوبہ کامیاب ہوگیا جس کا اسے یقین تھا تو وہ مزید مکانوں میں سرمایہ کاری کرسکتے ہیں ورنہ اسکاچ یونیٹ کے کرائے سے بھی دوسرے مکان کی قسطیں ادا ہوسکتی ہیں۔

"لگتا ہے کہ ان دنوں تم بہت زیادہ ایسے ٹی وی شوز دیکھ رہی ہو۔" کلیٹن نے کہا۔ "ایسی باتیں ٹی وی پر تو اچھی لگتی ہیں لیکن وہ اس کا منفی پہلو نہیں دکھاتے۔ تم نے کبھی اخراجات اور پراپرٹی ٹیکس کے بارے میں بھی سوچا؟ قیمت کے حساب سے وہ بھی آسمان سے باتیں کریں گے۔ اس کے علاوہ بندرگاہ پر واقع مکانات کی دیکھ بھال پر بھی بہت زیادہ خرچہ آتا ہے۔ تمہیں یہ پہلو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے۔ سب سے بڑھ کر میں نہیں سمجھتا کہ جوئے یہ ذمے داری سنبھالنے کے قابل ہے۔"

"تم بھول گئے کہ جب ٹریکٹر کے حادثے میں تمہاری ٹانگ ٹوٹ گئی تھی تو اس نے کتنی بھاگ دوڑ کی تھی؟"

"مجھے وہ وقت مت یاد دلاؤ۔" وہ اپنی آنکھیں گھماتے ہوئے بولا۔

"اوہ کلیٹن پلیز!" ڈینا نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے اس کا بازو پکڑ کر کہا۔ "ہمارا بیٹا نیشنل فاریسٹ میں رہ رہا ہے۔"

"یہ اس کا اپنا انتخاب ہے۔" کلیٹن نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔ "ہم نے اس کی تربیت اس طرح نہیں کی تھی کہ زندگی میں ہر چیز اسے چاندی کی پلیٹ میں رکھ کر پیش کی جائے۔ میں وہ بات نہیں بھولا کہ اسے گزشتہ سال کرسمس پر جو رقم بھیجی تھی، وہ سب اس نے برف رانی میں اڑادی۔"

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تو ہم نے ہی اسے اس کی اجازت دی تھی۔" ڈینا بولی۔ "کیا تمہیں نظر نہیں آرہا کہ وہ چوراہے پر کھڑا ہے۔ یہ ہمارا کام ہے کہ اسے وہاں سے نکالیں۔"

"میں پھر کہوں گا کہ وہ اس ذمے داری کا اہل نہیں ہے۔ اسے حساب کتاب بالکل نہیں آتا۔"

"سنو کلیٹن! میں اس گھر میں تیس سال سے رہ رہی ہوں۔ میں نے تمہارے بچوں کی پرورش کی۔ تمہاری ہر ضرورت کا خیال رکھا۔ کھانا پکایا، کپڑے دھوئے، گھر سنوارا اور یہ سب کچھ ایک محدود بجٹ میں رہتے ہوئے کیا۔ کیا میرا اتنا حق بھی نہیں کہ میں تم سے کچھ کہہ سکوں؟"

"جوئے اس وقت کیا کرے گا جب وہ مکان پورے ہفتے کے لیے کرائے پر چلا جائے گا؟"

"وہ گیراج سے متصل کمرے میں رہ سکتا ہے۔"

"اور جن دنوں مکان خالی ہوا تو......؟"

"وہاں بہت کام ہے۔ جز وقتی ملازمت مل جاتی ہے۔"

"لگتا ہے کہ تم نے پہلے سے سب سوچ لیا ہے۔"

ڈینا نے خاموشی سے میز صاف کی اور جانے کے لیے اٹھنے لگی۔ وہ اس سے بحث میں کبھی نہیں جیت سکتی تھی۔ وہ شاید اس کی تجویز مان لیتا لیکن اس نے محسوس کیا کہ جوئے کا ذکر آتے ہی وہ اپنا صبر کھو بیٹھتا ہے۔

''کیا ہم اس تجویز پر غور کرنے کے لیے تھوڑا وقت لے سکتے ہیں؟'' وہ اس کے پیچھے کچن میں آتے ہوئے نرم لہجے میں بولا۔ ''تمہیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ جوئے واپس آنے کے لیے تیار بھی ہے یا نہیں؟''

''کلیٹن ہوورڈ! میں اس بارے میں پُرعزم ہوں۔'' اس نے پلیٹیں دھو کر ڈش واشر میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں میرا ساتھ دینا چاہیے۔''

''مجھے سنجیدہ شبہات ہیں۔''

''جوئے ایک ایسا پرندہ ہے جو ابھی اڑنا سیکھ رہا ہے۔ وہ ایک معصوم بچے کے مانند ہے اور ہمارے مقابلے میں دنیا کو مختلف نظر سے دیکھتا ہے۔ تمہیں یاد ہے کہ ایک دفعہ ہم ساحل پر گئے۔ اس وقت یہ بچے بہت چھوٹے تھے۔ آسمان پر پہلی کا چاند روشن تھا۔ اسے دیکھ کر جوئے نے کہا...... دیکھو مما! چاند ٹوٹ گیا۔ اس پر میں نے کہا۔ پریشان مت ہو، تمہارے ڈیڈی اسے جوڑ دیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' کلیٹن نے کہا۔ ''اگر تم مجھے مکمل تفصیلات فراہم کرو تو میں اس ہفتے اپنے حسابات چیک کر کے دیکھتا ہوں کہ ہم کہاں کھڑے ہیں۔ اس دوران تم جوئے کو فون کر کے اس کا عندیہ معلوم کرو۔''

اس رات بستر پر لیٹتے وقت ڈینا نے جوئے کو فون کیا اور جواب میں اس کی وائس میل موصول ہوگئی۔ اس نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔ ''اب مجھے یہ مت بتانا کہ اس کا سیل فون دوبارہ گم ہوگیا ہے۔''

''ممکن ہے کہ وہ فون چارج کر رہا ہو۔ مجھے شبہ ہے کہ نیشنل فاریسٹ میں بجلی کا کوئی معقول بندوبست ہو......

...... میں بہت بے چین رہی ہوں۔'' ڈینا نے اس کے تبصرے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''اگر جوئے کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آگیا تو کون ہمیں اطلاع دے گا؟'' اس نے وائس میل پر ایک مختصر پیغام بھیجا کہ کوئی ایمرجنسی نہیں تھی لیکن موقع ملتے ہی وہ جلد از جلد گھر فون کرے۔ اس کے بعد وہ تکیے پر سر رکھ کر ٹی وی دیکھنے لگی۔

جیسے ہی جوئے نے ڈینا کی شادی کی سالگرہ کی مبارکباد دینے کے لیے فون کیا، اس نے اسے اسکاچ بونیٹ کے بارے میں بتادیا کہ اس کے مالکان اسے ساز و سامان سمیت بیچ کر میامی جا رہے ہیں اور انہوں نے اسے خریدنے کا معاہدہ کرلیا ہے۔

''وہ تین دن میں یہاں پہنچ جائے گا۔ اس کا انحصار موسم پر ہے۔ وہ پیسے بچانے کی خاطر خود گاڑی چلا رہا ہے۔'' اس نے کلیٹن کو بتایا۔

''جب تم نے اسے اسکاچ بونیٹ کے بارے میں بتایا تو اس نے کیا جواب دیا؟''

''وہ کافی پرجوش لگ رہا تھا لیکن اس کا انداز خاصا دھیما تھا جسے میں کوئی نام نہیں دے سکتی۔''

''شاید وہ جنگل میں رہتے رہتے تھک گیا ہو۔ ہوسکتا ہے کہ وہ یہاں آکر اپنے حواسوں میں آجائے۔''

ڈینا اس سے متفق ہونا چاہ رہی تھی لیکن اس کے اندر سے آواز آرہی تھی کہ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ اس نے بیڈ سائڈ کا سوئچ آف کرنے سے پہلے سرگوشی میں دعا کی۔ ''یا خدا...... اسے اپنی حفاظت میں رکھنا۔''

جوئے پانچ دن سے سفر میں تھا۔ اس دوران راستے میں کئی بار گرج چمک کے طوفان آئے اور اسے گہرے بادل میں ٹینا کا چہرہ نظر آرہا تھا۔ وہ شہد کی مکھی کی طرح اس کے گرد منڈلاتا تھا لیکن بہت جلد یہ کہانی ختم ہوگئی۔ ٹینا کے بدلتے موڈ اور نامعقول مطالبات کی کوئی حد نہیں تھی۔ اس لیے اسے علیحدگی پر مجبور ہونا پڑا۔ فاریسٹ چھوڑنے سے پہلے اسے پوچھ گچھ کے لیے بلایا گیا۔ گوکہ ان کے پاس اسے روکنے کا کوئی جواز نہیں تھا لیکن قانون نافذ کرنے والوں کا خوف اسے پریشان کر رہا تھا۔

اس نے منزلِ مقصود پر پہنچ کر گاڑی کے آئینے میں اپنا جائزہ لیا اور عمدہ بیئر کا ایک کیس باپ کو پکڑاتے ہوئے شادی کی سالگرہ کی مبارکباد دی۔ پھر ماں کو جنگلی پھولوں کا گلدستہ دیا جو اس نے سڑک کے کنارے سے توڑے تھے اور اپنے تھیلے سے مشروب کی بوتل نکالی۔

''تمہاری آنکھ کو کیا ہوا؟'' ڈینا نے مشروب کو نظر انداز کر کے اس کی ٹھوڑی پکڑتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہیں، ایک دن پہاڑی پر سائیکل چلاتے ہوئے ایک چھوٹا سا حادثہ پیش آگیا تھا۔''

''تم نے کسی ڈاکٹر کو دکھایا؟'' ڈینا نے پوچھا۔

''نہیں، میں ٹھیک ہوں۔ بس معمولی سی سوجن ہے۔''

کھانے کے دوران ڈینا اور کلیٹن ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ جیسے حال ہی میں ہونے والی شادیوں، اموات، مقامی سیاست اور چرچ کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کی مہم وغیرہ وغیرہ لیکن جوئے کو ان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا دماغ میلوں دور بھٹک رہا تھا۔ اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''ایسا لگتا ہے کہ یہاں سب کچھ ٹھیک چل رہا ہے۔''

''شاید میں نے تمہیں بتایا نہیں کہ بیکی اور کلے بھی آئندہ چند ہفتوں میں آنے والے ہیں۔ اس طرح ہمیں ایک بار پھر ساحل پر اکٹھا ہونے کا موقع ملے گا۔''

جوئے مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ان لوگوں سے دوبارہ مل کر اچھا لگے گا۔''

''میرا خیال ہے کہ ہمیں چند دنوں میں وہاں چلے جانا چاہیے تاکہ تیاری کرسکیں۔ ویسے بھی ہمیں اس مکان کو کرائے پر دینے کے لیے ٹھیک کرنا ہوگا۔''

جوئے نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اس سے پہلے میں اپنے کچھ پرانے دوستوں سے ملنا چاہوں گا۔''

''ضرور، یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔'' ڈینا بولی۔

''گزشتہ طوفان میں سڑک پر بہت زیادہ ریت جمع ہوگئی تھی۔ ڈیپارٹمنٹ والوں نے اسے ہٹا دیا لیکن ڈرائیو وے اور صحن میں اب بھی ریت کا ڈھیر موجود ہے۔ سب سے پہلے اسے صاف کرنا ہوگا۔ اس کے علاوہ تمہاری ماں کچن میں گرینائٹ کا کاؤنٹر بنوانا چاہتی ہے۔ ماسٹر بیڈ روم کو بھی ٹھیک کرنا ہے لیکن تمہیں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' کلیٹن نے کہا۔

''ہاں۔ ہم نے سب انتظام کرلیا ہے۔'' ڈینا بولی۔

''میں نے ہارڈ ویئر کی دکان پر کھاتا کھول لیا ہے۔'' کلیٹن نے کہا۔ ''تمہیں وہاں سے ضرورت کی ہر چیز مل جائے گی۔ اس کے علاوہ میری ورکشاپ سے اپنی مرضی کے اوزار لے سکتے ہو۔''

''تمہارے اور ٹینا کے درمیان کیا مسئلہ ہوگیا؟'' کلیٹن نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔ ''اگر تمہیں میرا پوچھنا برا نہ لگے۔''

''اوہ کلیٹن! جوئے اس بارے میں بات کرنا نہیں چاہتا۔ وہ صرف ہم سے ملنے آیا ہے۔'' پھر وہ اپنا اسمارٹ فون جوئے کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''اس میں بیچ ہاؤس کی کچھ تصویریں ہیں۔''

''کوئی بات نہیں۔'' جوئے تصویریں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ہمارے درمیان تعلق کامیاب نہ ہوسکا۔ شاید میں اس کی توقعات پر پورا نہیں اتر سکا۔''

''فکر مت کرو۔ تمہیں بہت جلد کوئی اچھی لڑکی مل جائے گی۔'' ڈینا اس کا بازو تھپتھپاتے ہوئے بولی۔

☆☆☆

جوئے نے ٹرالی میں بیلچے کے ذریعے ریت بھر کر ساحل پر پھینکنا شروع کی۔ اس کے لیے اسے دس بارہ چکر لگانا پڑے۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے کلیٹن کی دی ہوئی فہرست دیکھی اور بقیہ کاموں کے بارے میں سوچنے لگا۔ ماسٹر باتھ روم کے ٹائلوں میں سیمنٹ لگانا تھا۔ بڑے کمرے کی دیواروں پر نیا رنگ کرنا تھا اور مکان کے کونے پر ایک سرچ لائٹ تبدیل کرنا تھی۔ ڈینا بیڈ رومز کے لیے نئی لائٹیں خریدنے گئی ہوئی تھی۔ جوئے نے بیئر کا گھونٹ لیتے ہوئے سوچا کہ اسے ایک ماہ تک مصروف رکھنے کے لیے یہ کام کافی ہیں۔ بشرطیکہ وہ اتنے دن رہ سکا۔

وہ بڑی باقاعدگی سے ٹیلی ویژن پر نشر ہونے والی خبریں دیکھنے کے علاوہ مقامی اخبارات کا بھی مطالعہ کر رہا تھا لیکن اسے ٹینا کے بارے میں کوئی خبر نظر نہیں آئی۔

''ہیلو۔'' ڈینا نے آواز لگائی۔ ''میں آگئی۔''

جوئے اس کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ کچن میں بجلی کے سامان کے ڈبے اوپر تلے رکھ رہی تھی۔

''میری کار میں ایک باکس اور بھی ہے۔ اس میں بڑے کمرے کے لیے چھت کا پنکھا ہے لیکن وہ کافی بھاری ہے۔''

جوئے وہ باکس لے کر آیا اور اسے بڑے کمرے کے فرش پر رکھ دیا۔ ''کیا ہمارے پاس سیڑھی ہے؟ ورنہ مجھے کرائے پر لانا پڑے گی کیونکہ یہ چھت کم از کم پندرہ فٹ اونچی ہے۔''

''میں بتاتی ہوں کہ کیا کرنا ہے۔'' ڈینا بولی۔ ''پہلے ہم لنچ کے لیے جائیں گے پھر مچھلی مارکیٹ سے شام کے کھانے کے لیے کچھ خریدیں گے۔''

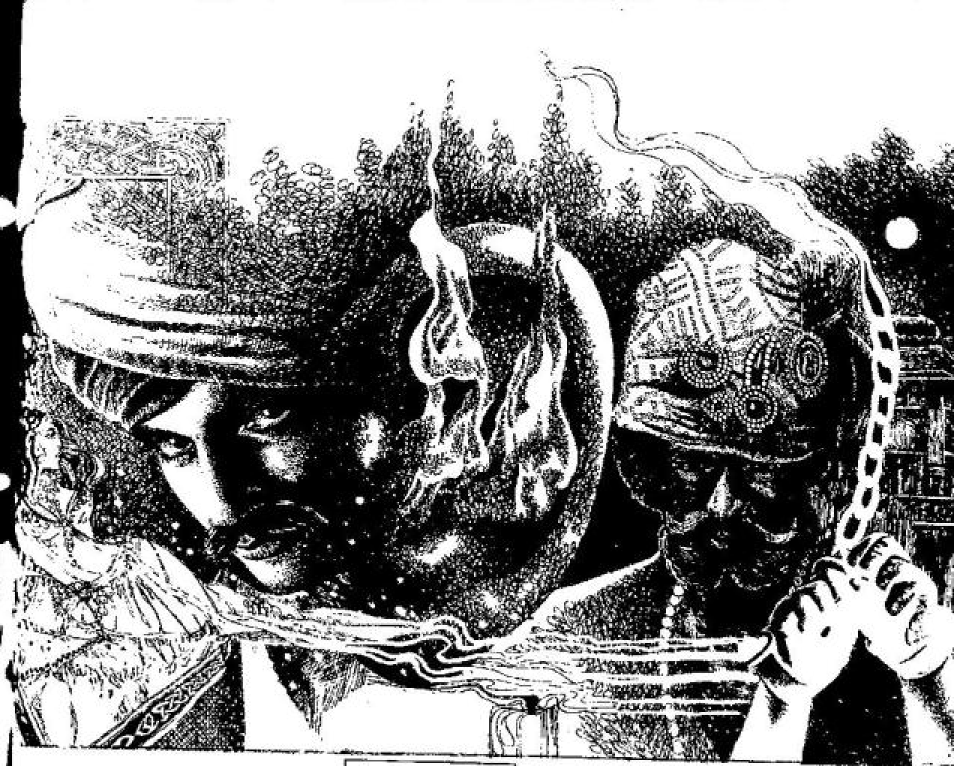
جوئے کھسیانا ہوتے ہوئے بولا۔ ''تم نے تو پہلے سے سارا پلان بنا رکھا ہے۔''

ڈینا اسے پہلے سینڈوچ شاپ پر لے گئی۔ وہاں سے وہ فش مارکیٹ گئے۔ ڈینا نے اس سے کہا کہ وہ اپنی مرضی کی کوئی چیز لے لے۔ اس نے بڑے جھینگوں کا انتخاب کیا۔ گھر واپس آتے ہوئے ڈینا اس سے بیچ ہاؤس میں ہونے والے کام کے بارے میں باتیں کرتی رہی۔

ابھی انہوں نے آدھا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ ایک سرکاری گاڑی بغلی سڑک سے برآمد ہوئی اور اس نے کچھ فاصلہ رکھ کر ان کا تعاقب شروع کردیا۔ جوئے وقفے وقفے سے بیک ویو مرر میں دیکھ رہا تھا۔ اسے پریشانی ہونے لگی۔ اسے اپنے ٹرک میں نہیں آنا چاہیے تھا۔ اس نے ایک میل کا سفر اسی حالت میں طے کیا پھر ایک کار اس کے اور تعاقب کرنے والوں کے درمیان میں آگئی اور اس نے موقع غنیمت جان کر اپنا ٹرک ایک بغلی سڑک پر موڑ لیا۔

"تم کہاں جا رہے ہو؟" ڈینا نے پوچھا۔
"مجھے نہیں معلوم۔" اس نے جواب دیا۔ "شاید ہمارا تعاقب ہو رہا ہے۔"
"کیوں؟ تم سے کیا غلطی ہوئی؟" وہ بڑبڑائی۔ "تم کچھ بے چین لگ رہے ہو؟"
"میرا نیو میکسیکو میں چالان ہو گیا تھا۔ وہ جمع نہیں کرا سکا۔" اس وقت اسے یہی بہانہ سوجھا۔
"اوہ جوئے۔" وہ غصے سے بولی۔ "تم نے بہت غیر ذمے داری کا ثبوت دیا ہے۔"
"میں مصروفیت کی وجہ سے بھول گیا۔"
جب سرکاری گاڑی دیر تک نظر نہیں آئی تو جوئے نے ایک گہرا سانس لیا اور گاڑی دوبارہ گھر جانے والے راستے پر ڈال دی۔
جوئے کو اسٹور میں سیڑھی مل گئی اور اس نے ڈینا کی نگرانی میں چھت کے پنکھے اور لائٹیں تبدیل کرنا شروع کر دیں۔ دوسرے دن اس نے باتھ روم کے ٹائلوں میں سیمنٹ سے بھرائی کی اور ڈینا سے کہا کہ وہ بڑے کمرے کے لیے رنگ کا انتخاب کرے۔ وہ جلد از جلد اپنا کام مکمل کرنا چاہ رہا تھا۔
اس دوران اس نے کئی بار سوچا کہ ڈینا کو ٹینا کی گمشدگی کے بارے میں بتا دے اور یہ کہ رینجرز کو اس معاملے میں اس کے ملوث ہونے کا شبہ ہے حالانکہ اس نے کئی بار اس بات کو ذہن سے نکالنے کی کوشش کی لیکن وہ ہمیشہ ایک گھومنے والے دروازے کی طرح واپس آ جاتی۔ اس نے ایک بیئر ختم کی اور دوسری اٹھا لی۔ اس کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ ڈینا نے رات کے کھانے کے بعد اسے اسکریبل کھیلنے کی دعوت دی۔ وہ بے دلی کے ساتھ اس میں شامل ہو گیا۔ انہوں نے تین گیم کھیلے اور ڈینا وہ تینوں جیت گئی جس پر اسے خود بھی حیرانی تھی۔
"کیا بات ہے جوئے...... آج تمہارا کھیل میں دل نہیں لگ رہا؟"
"مما! میں کچھ بتانا چاہ رہا ہوں۔" اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔
ڈینا نے اسے غور سے دیکھا اور بولی۔ "ایسی کیا بات ہے؟"
"ٹینا لاپتا ہے اور اس کی گمشدگی کا شبہ مجھ پر کیا جا رہا ہے۔"
ڈینا اپنی کرسی پر منجمد ہو کر رہ گئی۔ "ٹینا غائب ہے اور تم پر شبہ ظاہر کیا جا رہا ہے۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو بیٹا؟"
"ہاں، جب تک وہ مل نہیں جاتی، میں مشکوک رہوں گا۔ انہوں نے مجھے پوچھ گچھ کے لیے بلایا تھا لیکن روک نہیں سکے کیونکہ اس کے گھر میں زبردستی داخل ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی غلط کام نہیں ہوا۔"
"اوہ میرے خدا۔" ڈینا پتھرائے ہوئے چہرے کے ساتھ اٹھی اور اپنے لیے مشروب کا گلاس بھرنے لگی۔
"شاید مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔"
"اسی لیے تم اس روز مارکیٹ سے آتے ہوئے پریشان ہو گئے تھے۔" ڈینا نے کہا۔
"یہ ایک سنجیدہ معاملہ ہے۔ ممکن ہے کہ تمہارے باپ کو معلوم ہو کہ کیا کرنا چاہیے۔ ہم اس کے وکیل سے بھی مشورہ کر سکتے ہیں۔"
"نہیں...... ہم ڈیڈی کو نہیں بتا سکتے۔"
"کیوں نہیں؟ آخر تم نے مجھے بھی تو بتایا ہے۔"
"ممکن ہے کہ یہ معاملہ ختم ہو جائے۔ بہرحال میں انہیں اس میں شامل کرنا نہیں چاہتا۔"
"جوئے! میں پوری کوشش کروں گی لیکن وعدہ نہیں کر سکتی۔ ہماری شادی کو تیس برس ہو چکے ہیں اور وہ میرا چہرہ پڑھ لیتا ہے۔ ہم نے کبھی ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں چھپائی۔"
اگلی صبح جوئے نے جلدی اٹھ کر رنگ کا کام شروع کر دیا۔ صرف ایک کمرا باقی رہ گیا تھا۔ سہ پہر تک اس نے کافی کام کر لیا۔ اب صرف چھت باقی رہ گئی تھی۔ وہ سیڑھی پر چڑھ کر اس کا جائزہ لینے لگا، تبھی ڈینا سیاہ نہانے کے لباس میں آئی جس کے اوپر اس نے سفید لبادہ پہن رکھا تھا اور اس کے ایک کندھے پر تولیا لٹکا ہوا تھا۔
"میں سمندر میں نہانے جا رہی ہوں۔ تمہارے باپ کا فون آیا تھا۔ وہ شام تک یہاں پہنچ جائے گا۔"
جوئے نے کہا۔ "میرا خیال تھا کہ وہ ہفتہ ختم ہونے سے پہلے یہاں نہیں آئے گا۔"
"وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ اب تک کتنا کام ہو گیا ہے۔"
وہ باہر ڈیک پر آ گیا اور جنگلے پر جھک کر اسے تیرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ سمندر کی لہریں جھاگ کی شکل میں اوپر اٹھ رہی تھیں اور پانی اس کی کمر تک آ گیا تھا۔ وہ کمر کے بل ایک مشاق پیراک کی طرح تیر رہی تھی اور صرف اس کا سر اور پاؤں نظر آ رہے تھے۔ وہ بہتے بہتے ساحل سے دور ہوتی جا رہی تھی اور وقفے وقفے سے اسے ہاتھ ہلاتی رہتی۔ وہ بھی اسے جواب دیتا رہا پھر وہ گھر میں آیا اور اس نے بیئر کی ایک اور بوتل نکالی۔ تیسری بار جب وہ باہر آیا تو اس کی ماں نظروں

[illegible]ل ہو چکی تھی۔ وہ ساحل کی طرف بھاگا اور دونوں [illegible] پانی میں تلاش کرتا رہا۔ اس نے کئی لوگوں سے پوچھا [illegible] نے اس کی ماں کو دیکھا ہے لیکن کچھ معلوم نہ ہو سکا۔
وہ مایوسی کے عالم میں گھر آ گیا۔ اس کے اعصاب [illegible] دے چکے تھے لیکن جب کلیٹن کی گاڑی ڈرائیو وے [illegible] رکی تو اس کا دل بند ہونے لگا۔ وہ اسے کیسے بتائے [illegible]س کی ماں لاپتا ہو گئی ہے۔
"ڈیڈی! مما سمندر میں تیرنے گئی تھی اور میں کام [illegible] مصروف تھا لیکن اب وہ غائب ہو گئی ہے۔ میری سمجھ میں [illegible] آ رہا کہ کیا کروں۔" یہ کہہ کر وہ رونے لگا۔
کلیٹن نے جیب سے اسمارٹ فون نکالا اور [illegible] [illegible] کو اس واقعے کی اطلاع دی۔ تھوڑی دیر بعد ہی ایک [illegible] جیپ وہاں آ کر رکی۔ اس کی پسنجر سیٹ پر ڈینا ایک [illegible] کی گڑیا کی طرح بیٹھی ہوئی تھی۔ کلیٹن اور جوئے [illegible] ہوئے جیپ تک گئے اور انہوں نے ڈینا کے دونوں [illegible] پکڑ لیے۔ اسے گھر کی طرف لانے لگے تو وہ بولی۔ "مجھے اس نوجوان کا شکریہ ادا کرنا ہے جس نے میری زندگی [illegible]"
کلیٹن نے اپنے پرس میں سے کچھ نوٹ نکال کر اس [illegible]ان کی طرف بڑھائے لیکن اس نے انکار کر دیا جبکہ جوئے [illegible] ماں کو سہارا دے کر گھر کے اندر چلا گیا۔ کلیٹن دروازہ بند [illegible] ڈینا کے پاس آیا جو صوفے پر چت لیٹی ہوئی تھی۔
"کیا تم نے مجھے اشارہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا [illegible] مجھے ایک مخالف لہر بہا کر لے گئی تھی؟" وہ روتے ہوئے بولی۔ "یہ تو میری قسمت اچھی تھی کہ ان لڑکوں نے دیکھ لیا اور بچانے آ گئے۔ ورنہ میں بہتے ہوئے نہ جانے کہاں چلی جاتی۔"
"جوئے، تمہیں اپنی ماں پر نظر رکھنی چاہیے تھی۔" [illegible] نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "تمہیں معلوم ہے کہ ایسی [illegible] کتنی خطرناک ہوتی ہیں۔ تیرنے والے کو پتا بھی نہیں [illegible] اور یہ اسے پکڑ لیتی ہیں۔ تمہاری ماں ڈوب بھی سکتی تھی۔"
"ڈیڈی! یہ ایک حادثہ تھا۔" جوئے غصے میں کہتے ہوئے اٹھا اور گھر سے باہر چلا گیا۔
اگلے دن انہوں نے روانگی کی تیاری کر لی۔ کلیٹن [illegible] طور پر جوئے کے کام سے مطمئن تھا لیکن کچھ کمی رہ گئی [illegible]۔ جوئے اسے مکمل کرنے کی خاطر رکنے پر تیار ہو گیا [illegible] وقت پر کلیٹن کے ٹرک میں خرابی ہو گئی۔ جوئے [illegible] کی کہ وہ اسے اپنے ٹرک میں مقامی گیراج تک لے جا سکتا ہے تاکہ وہاں سے مطلوبہ پرزہ لے سکے۔ کلیٹن نے اس سے گزشتہ روز والے رویّے پر معذرت کی۔ انہیں اس پرزے کی تلاش میں جگہ جگہ رکنا پڑا۔ گفتگو کے دوران کلیٹن نے اسے بتا دیا کہ گھر میں کیا کام باقی رہ گیا ہے۔
وہ ایک کباڑی کی دکان پر جانے کے لیے دوسرے قصبے کے موڑ تک پہنچے ہی تھے کہ ایک سرکاری گاڑی کی بتیاں جلنے بجھنے لگیں۔ وہ انہیں رکنے کا اشارہ کر رہے تھے۔
"یہ کیا چاہتے ہیں؟" کلیٹن بڑبڑاتے ہوئے بولا۔
جوئے نے اپنی طرف کی کھڑکی کا شیشہ نیچے کیا۔ ایک سپاہی اس کی طرف آ رہا تھا۔
"کیا تم جوئے ہوورڈ ہو؟" اس نے کھڑکی میں جھکتے ہوئے کہا۔
"ہاں۔"
"کیا میں تمہارا لائسنس دیکھ سکتا ہوں؟"
جوئے نے اپنی جینز کی پچھلی جیب سے بٹوا نکالا اور لائسنس اس کے حوالے کر دیا۔
"مجھے افسوس ہے کہ تمہیں ایک بری خبر سنا رہا ہوں مسٹر ہوورڈ۔" سپاہی نے توقف کیا پھر بولا۔ "وہ بری خبر یہ ہے کہ ٹینا کوکر کی لاش مل گئی ہے۔"
جوئے کو یوں لگا جیسے اس کے چہرے کا سارا خون نچڑ گیا ہو۔
"لگتا ہے کہ اس پر پہاڑی شیر نے حملہ کیا۔ اس کی لاش ایک کچھار سے ملی ہے جو دور دراز پگڈنڈی پر واقع ہے۔"
جوئے نے اپنا اوپری ہونٹ کاٹا اور مضبوطی سے اسٹیئرنگ پکڑ لیا۔
"کورونر کی رپورٹ حتمی ہے۔ اس لیے مذہبی وجوہات کی بنیاد پر پوسٹ مارٹم کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ اس کی آخری رسومات آبائی قصبے میں ادا کی جائیں گی۔ اب تم ہر قسم کے شک و شبے سے آزاد ہو۔" یہ کہہ کر سپاہی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔
"اس دنیا میں کیا کچھ ہوتا ہے جوئے؟" کلیٹن نے کہا اور سرکاری گاڑی کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔
جوئے خالی خالی نظروں سے ونڈ شیلڈ کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس خبر کو کیا رنگ دے۔ اسے ٹینا کی موت کا سن کر بہت دکھ ہوا تھا لیکن اس کی لاش ملنے پر اطمینان بھی ہوا۔ ورنہ اس کے سر پر ہمیشہ شک کی تلوار لٹکتی رہتی اور اس کی گمشدگی کا ذمے دار اسی کو ٹھہرایا جاتا۔ کم از کم وہ خوف کے اس حصار سے تو باہر نکل آیا تھا۔



آٹھواں حصہ

رنگ آسماں

اے۔آر۔راجپوت

ماضی کی دھنگ و تاریک مگر خوابناک راہداریوں سے جنم لینے والے ایسے کردار... جذبات، واقعات و شواہد نے خود ترتیب دے کران کی زندگی کی بے قراریوں کو ایک ایسے مقصد میں ڈھال دیا جس کا ادھورا پن بے شمار ہلاکتوں کا سبب بن جاتا... لہٰذا اس کی تکمیل کے لیے وہ باغی فطرت انسان میدانِ جنگ میں یوں اترا کہ دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کردینے والے گداز احساسات کو بھی بھول گیا لیکن... عشق تو پھر عشق ہوتا ہے... کوئی کتنا ہی بھولنا چاہے، عشق اپنا مسکن کبھی نہیں بھولتا۔ جس دل میں بس جائے اسے اپنے ساتھ ہی لے کر جاتا ہے... اور پھر ایک دن اچانک اس کے من کا موسم بھی بدل گیا کیونکہ... وہ فرنگی حسینہ دلّی کے اس نوجوان کو دل دے بیٹھی تھی، جس کا ہر قدم آزمائش اور ہر نظر کسی امتحان سے کم نہ تھی، اس کے باوجود... خاک و خون کے اس کھیل میں نہ تو اس نے خوابوں کو بکھرنے دیا اور نہ ہی جذبوں کو بے لگام ہونے دیا۔ کیونکہ وہ آسمان پر بکھرے رنگوں کا مطلب جان گیا تھا۔

مشرق و مغرب کے عجب امتزاج اور تاریخی جنوں خیزیوں کے عبرت اثر اشاروں میں لہراتی دلچسپ داستان

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ 1857ء کی جنگِ آزادی کے بعد کے دور کی داستان ہے۔ کوہِ شالیہ کے گھنے جنگلوں اور سنگلاخ پہاڑیوں کی دلکش وادیوں میں ایک مختصر قافلہ محوِ سفر ہے۔ اس قافلے کا سالار ایک انگریز پروفیسر ہنری برنارڈ ہے، جو ایک مختلف سوچ، وضع دار اور مثبت خیالات کا حامل شخص ہے۔ ہندوستان ا... قدیم اسراریت اور جستجو اسے لندن سے یہاں تک کھینچ لائی ہے۔ اس قافلے میں اس کی نیلی آنکھوں والی جوان اور حسین بیٹی ریتا بھی شامل ہے۔ اپنے باپ کی طرح وہ بھی فطرتاً تجسس پسند اور مہم جو ہے۔ پروفیسر ہنری کا ایک اوباش بھتیجا رابرٹ اور اس کی آزاد خیال جوان بہن گارشیا بھی ساتھ ہیں۔ ملازمین میں ڈرائیور امجد خان، ادھیڑ عمر خانساماں میاں بیوی نندو اور شانتا کے علاوہ ایک بانکا سجیلا کڑیل نوجوان شوکت حسین بھی اس قافلے میں شامل ہے۔ یہ جنرل مائیکل شا کے سائیس کریم بخش کا اکلوتا بیٹا ہے۔ شوکت عرف شوکی، ریتا کو دل بیٹھا ہے مگر مزاجاً گھمنڈی اور مغرور فطرت رابرٹ کو شوکی سے سخت قسم کی رقابت اور ذاتی عناد ہے۔ پروفیسر ہنری کے برعکس رابرٹ، شوکی سمیت دیگر ملازموں کے ساتھ آقا و غلام جیسا رویہ روا رکھے ہوئے ہے۔ پروفیسر ہنری برنارڈ اپنی اس مہم جوئی کے دوران ایک پراسرار بستی کا کھوج لگاتا ہے۔ کوہِ شالیہ کی تین خودمختار ریاستوں پر فرنگی سامراج اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے مختلف سازشوں میں مصروف ہیں اور انہی سازشوں کو سبوتاژ کرنے کے لیے پانچ مسلم اور جری جانباز گوریلوں کا گروپ اپنی جانیں جوکھم میں ڈالے ہوئے ہے۔ اس گروپ میں علی ریحان ہے جو فوجِ آزادی کے سپہ سالار جنرل شمیر خان کے ایک خاص کمانڈر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے بارودی ماہر کہا جاتا ہے۔ دوسرا احسان جامو، جو کرنل نہال خان کا قریبی ساتھی ہے۔ شاہ زمان ان کا تیسرا ساتھی بذاتِ خود ایک لیڈر کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ گروہ ''کاروانِ مجاہد'' کہلاتا ہے۔ باقی دو ساتھی شرجیل اور قیصر شاہ تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی یہ سوداگروں کی جماعت اب حکومتوں کا کاروبار کرنے لگی تھی۔ غاصب فرنگیوں کو شبہ تھا کہ منتشر مسلم باغی گروہ کوہِ شالیہ میں اپنی خفیہ کمین گاہیں بنا سکتے ہیں تاکہ نئے سرے سے اپنی طاقت کو یکجا کر سکیں۔ یوں بھی ان فرنگیوں کا ایک مقصد اپنا ''سلسلۂ تسلط'' کوہِ شالیہ کی ان تینوں قابلِ ذکر ریاستوں تک دراز کرنا بھی تھا۔ لہٰذا مکاری اور دھوکے بازی کا کھیل کھیلتے ہوئے فرنگی حکومت پہلے ریاست ناگرہ کے مہاراجا چندر گپتا کی طرف بہ ظاہر دوستی کا ہاتھ بڑھاتی ہے اور پھر مشترکہ طور پر باقی دو ریاستوں تریپال اور پالن پور کے خلاف عسکری سازش کو عملی جامہ پہناتی ہے تاکہ عسکری کارروائیوں کا آغاز کیا جا سکے۔ تریپال میں مسلم نواب شہباز خان اور پالن پور میں مہاراجا مہندر سنگھ گدی نشین ہوتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے حلیف ہیں۔ راج محل داخلی سازشوں کی زد میں ہے۔ مہارانی مجو بائی اپنے بیٹے ایش کمار کو ولی عہد کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہے مگر پرتاب کمار اس کی راہ کا سب سے بڑا پتھر ہے، جو مہاراجا چندر گپتا کی پہلی اور مرحومہ بیوی کے بطن سے تھا۔ مہارانی مجو بائی کی ایک جواں سال خوبصورت بیٹی سوجنا بھی ہے۔ مہارانی اپنے سوتیلے بیٹے ولی عہد پرتاب کمار کو راستے سے ہٹانے اور اپنے بیٹے ایش کمار کا راستہ صاف کرنے کے لیے کالی کے مندر کے مہا پجاری بدری ناتھ کے ساتھ خفیہ گٹھ جوڑ کیے ہوئے ہے۔ بدری ناتھ جس کا اپنا ایک پراسرار اور شیطانی مفاد کالی کے مندر سے وابستہ ہے جو سوائے اس کے اور اس کے سیوک کاروں کے اور کوئی نہیں جانتا۔ بدری ناتھ اپنے پجاریوں کے ذریعے ہنری برنارڈ کو قتل کرا دیتا ہے۔ مہارانی مجو بائی پرتاب کمار کو مارنے کے لیے ایک منصوبے کے تحت اس کے دودھ میں زہر ملوا دیتی ہے۔ تاہم گلاس کی تبدیلی کے بعد زہر ملا دودھ مہاراجا چندر گپتا پی لیتا ہے اور پرتاب کمار کے بجائے وہ موت کا شکار ہو جاتا ہے۔ پرتاب کمار راجا بن جاتا ہے اور قتل کی تحقیقات کرواتا ہے۔ شک مجو بائی پر ہوتا ہے تاہم پرتاب مجو بائی کو سزا نہیں دیتا مگر اس کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ ادھر علی تریپال پہنچتا ہے تو اسے پولیس پکڑ لیتی ہے تاہم اپنے بارے میں بتانے پر اور نواب شہباز کا نام لینے پر اسے رعایت دی جاتی ہے۔ علی کے پاس نواب شہباز کے لیے ایک پیغام ہوتا ہے مگر انسپکٹر اسے نواب کے بھائی سراج کے پاس لے جاتا ہے۔ تاہم وہ نواب شہباز سے ملاقات کرنے کا کہہ کر سراج سے اپنی جان چھڑاتا ہے مگر راستے میں کچھ لٹیرے پولیس کی گاڑی کو گھیر لیتے ہیں۔ وہ بڑی مشکل سے ان کے گھیرے سے نکلتا ہے اور نواب شہباز کے پاس پہنچ کر انہیں فرنگیوں کی سازش سے آگاہ کرتا ہے۔ ادھر ماریہ کے ہاتھوں فرنگی افسر بروجر کا قتل ہو جاتا ہے اور اسے قید خانے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ ادھر شوکی اینڈ کمپنی کے خیموں میں آگ لگ جاتی ہے اور امجد خان، نندو بابا اور شانتا جل کر ہلاک ہو جاتے ہیں۔ یہ آگ پراسرار بستی کے عجیب و غریب لوگ لگاتے ہیں تاہم ریتا انہیں رام کر لیتی ہے اور یقین دلاتی ہے کہ وہ لوگ ان کی مدد کے لیے یہاں آئے ہیں۔ بدری ناتھ ایک انگریز لڑکی کی بلی چڑھا دیتا ہے۔ ماریا کا خنجر ایک لڑکی بالی کے پاس ہوتا ہے جو بدری ناتھ کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ وہ اسے نایاب سمجھ کر اپنے پاس رکھ لیتا ہے تاہم وہ نہیں جانتا کہ یہ خنجر اس کے لیے کتنی بڑی مصیبت لا سکتا تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

رات...... گہری تاریک رات...... اپنے آخری پہر میں تھی۔ کالی کے مندر پر ہُو کا عالم طاری تھا۔ ہر سُو خاموشی تھی۔ مہا پجاری بدری ناتھ کے کمرے میں ایک اور گناہ آلود رات تمام ہوئی۔ یہ منحوس اور سیاہ کار رات اس شیطان پجاری نے معصوم بالی کے ساتھ بڑے عیش و طرب میں گزاری تھی۔

بدنصیب بالی پر سانپ کے زہر کا نشہ اترا تو اس پر یہ کرب انگیز انکشاف ہوا کہ اس کے ساتھ شیطان بدری ناتھ نے کیا ظلم کر ڈالا تھا۔

صبح سے پہلے بالی کو بدری ناتھ کے دو خدمت گزار چیلے اس کے کمرے سے اٹھا کر لے گئے اور دوبارہ اسی تہ خانے میں لے جا کر پھینک دیا۔ بالی نڈھال سی ایک کونے میں سرک گئی اور اپنے گھٹنے سینے سے لگائے، ان میں اپنا روتا ہوا چہرہ دیے گھٹے گھٹے انداز میں سسکنے لگی۔

اپنے نصیب پر آنسو بہاتے ابھی اسے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک آواز آئی۔

''روتی کیوں ہے بالی؟ جو ہوا اچھا ہی ہوا۔ اب تجھے بھی آنے والی پورن ماشی کی اس منحوس رات کا خوف نہیں ہوگا۔''

اس آواز پر بالی نے قدرے چونک کر اپنا آنسوؤں سے لبریز چہرہ اٹھایا۔ وہ چھبی تھی اور اس کے بالکل قریب تنگی اینٹوں والے فرش پر بیٹھی تھی۔

''میرے پاس اب رہ ہی کیا گیا ہے خوف کھانے کو بھی؟'' بالی کرب ناک سے لہجے میں بولی۔ ''اب تو مجھے اپنی جان جانے کا بھی ڈر نہیں رہا ہے۔''

''ایسی مایوسی والی باتیں کیوں کرتی ہے پگلی!'' چھبی بولی۔ ''مجھے دیکھ...... عیش میں ہوں۔ پجاریوں کا دل بہلاتی ہوں، ان کی مار سے بچی رہتی ہوں بلکہ پجاری پرس رام کو تو میں نے اپنا اس قدر دیوانہ بنا لیا ہے کہ وہ اب مجھے اپنے لیے ہی بلاتا ہے، کسی اور کے حوالے نہیں کرتا۔ اچھے اچھے بھوجن کھلاتا ہے۔ شراب پلاتا ہے۔ کم بخت بڑا سرور انگیز نشہ ہے اس شراب کا بھی۔''

''چھبی، دیکھ! میں بہت دکھی ہو رہی ہوں اس سے......'' بالی نے اس کی طرف دیکھ کر ملتجی لہجے میں کہا۔ ''تو ایسی باتیں کر کے مجھے اور مت دکھی کر۔ مجھے اکیلا چھوڑ دے، جا اپنی جگہ پر بیٹھ جا کر...... جا......''

اس کی بات پر چھبی نے برا نہیں منایا تھا، بلکہ ہولے سے مسکرائی بھی تھی۔ ساری قیدی لڑکیوں میں اسے یہ معصوم صورت بالی اچھی لگتی تھی اور اس سے ہی زیادہ باتیں کرنا چھبی کو اچھا لگتا تھا۔ اس نے بڑی محبت سے بالی کے بکھرے بالوں کو اپنے ہاتھ سے یونہی سنوارتے ہوئے بڑی محبت سے کہا۔

''میں تو تیرے فائدے کی بات کر رہی تھی......''

''مجھے ایسی باتیں پسند نہیں۔'' بالی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے وعدہ، اب میں تم سے ایسی کوئی بات نہیں کروں گی، پر مجھے اپنے پاس سے جانے کا مت کہو۔'' چھبی نے کہا۔ وہ بھی اب کچھ سنجیدہ سی نظر آنے لگی تھی۔ اچانک اس نے بالی کے سراپا پر ایک نگاہ ڈالی اور قدرے چونک کر پوچھا۔

''ارے...... بالی! وہ تیرا سنہری خنجر کدھر گیا جس پر ہیرے موتی جڑے ہوئے تھے؟''

''وہ اس راکشش بدری ناتھ نے مجھ سے چھین لیا۔'' بالی نے ہولے سے جواب دیا۔

''ہائے رام...... ! تو نے اتنا قیمتی اور خوبصورت خنجر اپنی بے وقوفی سے گنوا دیا۔'' چھبی بھویں اچکا کر اور اپنے نیم برہنہ سینے پر ایک ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ اس کے چہرے پر تاسف پھیل گیا۔

''میرے بھلا کس کام کا تھا وہ خنجر......؟'' بالی نے مُردہ سے لہجے میں کہا اور ایک بار پھر اپنا سر گھٹنوں میں دے کر خاموش ہوگئی۔ چھبی نے اس سے کچھ کہا بھی تھا مگر بالی نے اس بار اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ چھبی تھوڑی دیر تک اس کے پاس بیٹھی رہی، اس کے بعد دوسری لڑکیوں کی طرف چلی گئی۔

کافی دیر بیت گئی۔ تہ خانے کے واحد روشندان سے صبح کی کرنیں اندر پڑنے لگی تھیں۔ ان کے لیے ناشتا بھیجا گیا تھا۔ بالی نے ہاتھ بھی نہیں لگایا، باقی قیدی لڑکیوں نے اسے فوراً چٹ کر لیا۔

☆☆☆

''ارے واہ...... پربھو! یہ اتنا قیمتی خنجر کہاں سے آیا تمہارے پاس......؟''

پرس رام نے مہا پجاری بدری ناتھ کے ہاتھ میں وہ خوبصورت سنہری خنجر دیکھ کر پوچھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ اس وقت بدری ناتھ اسی خنجر کو اپنے ہاتھ میں لیے اسے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کے بدہیت ہونٹوں پر ایک شیطانی مسکراہٹ ابھری۔ بولا۔

''یہ اسی ناری کے پاس تھا جو رات بھر میرے ساتھ تھی۔''

''اچھا! یہ بالی کے پاس تھا؟'' پرس رام کی بھویں... پُرسوچ انداز میں سکڑ گئیں۔ ''پرنتو اس سسری کے پاس کدھر سے آ گیا؟''

''ہمیں کیا پرس رام!'' بدری ناتھ جھلا کر کہا۔ ''جہاں سے بھی آیا، لیکن اب یہ ہماری ملکیت ہے۔ دیکھو تو

ذرا ہاتھ میں لے کر، کتنا خوبصورت ہے یہ۔'' کہتے ہوئے بدری ناتھ نے وہ خنجر پرس رام کی طرف بڑھا دیا۔ پرس رام نے وہ خنجر تھاما اور ذرا سی دیر دیکھنے اور اس کا مختصراً جائزہ لینے کے بعد اسے واپس بدری ناتھ کو لوٹا دیا۔

''واقعی خوبصورت ہے۔'' وہ زیر لب بولا۔ اس کے بعد وہ وہاں سے اٹھ کر سیدھا تہ خانے میں پہنچا۔ اس کے چہرے پر اب الجھن کے علاوہ گہری اور پُرسوچ سنجیدگی کے بھی آثار نمایاں تھے۔

اسے دیکھ کر قیدی لڑکیاں خوف سے سمٹ گئیں۔ پرس رام نے متلاشی نظریں دوڑائیں اور ایک کونے میں اسے بالی سکڑی سمٹی فرش پر لیٹی ہوئی نظر آگئی۔ وہ فوراً اس کی طرف بڑھا اور اس کے قریب پہنچ کر اس نے بے دردی سے اپنے پاؤں کا ٹھوکا مار کے بالی کو جگایا۔ اس بے چاری نے ہڑبڑا کر اپنی آنکھیں کھول دیں۔ پرس رام پر نگاہ پڑتے ہی اس کے چہرے پر سراسیمگی سی پھیل گئی۔

''وہ خنجر تیرے پاس کدھر سے آیا تھا؟'' پرس رام نے گھور کر اس سے پوچھا۔

بالی فوراً سمجھ گئی کہ وہ کس خنجر کی بات کر رہا تھا۔ اس نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری اور لرزتے لہجے میں جواب دیا۔

''وہ......وہ ماریا نے مجھے دیا تھا۔''

''ماریا نے دیا تھا......!'' پرس رام نے گومگو کے سے انداز میں بڑبڑاتے ہوئے کہا اور پھر اچانک اس کی آنکھوں اور چہرے سے تشویش کے سائے نمودار ہونے لگے۔ اس نے دوبارہ تحکمانہ درشتی سے کہا۔

''تو سچ بول رہی ہے نا......؟ یاد رکھنا، جھوٹ بولا تو تیرا بہت برا حشر ہوگا۔''

''نہیں......میں سچ کہہ رہی ہوں، وہ اسی کا تھا۔'' بالی نے سہمے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''اسے اپنی موت کا یقین ہو گیا تھا، اس لیے اس نے وہ خنجر میرے حوالے کر دیا تھا۔''

پرس رام اپنی دھوتی سنبھالتا ہوا الٹے پیروں فوراً مہا پجاری بدری ناتھ کے پاس پہنچا۔

''پربھو......پربھو......! اس خنجر سے ترنت پیچھا چھڑا لو، ورنہ وہ ہم سب کے سینوں میں پیوست ہو جائے گا۔'' پرس رام نے ہانپتے ہوئے بتایا۔

''ہاہا......ہاہا...... پرس رام! تمہارا شاید دماغ چل گیا ہے۔'' بدری ناتھ نے ایک استہزائیہ قہقہہ اگلتے ہوئے کہا۔ ''یہ چھوٹا سا خنجر کسی کو کیا نقصان پہنچائے گا، اس سے تو کھال بھی نہیں اترے گی۔''

''پربھو! میری بات کا مطلب آپ نہیں سمجھے۔'' پرس رام نے تشویش سے پھیلی ہوئی آنکھوں اور اچکی ہوئی بھوؤں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس فرنگن ماریا نے مرتے مرتے بھی ہمیں پھنسوانے کے لیے آخری چال چلی ہے مہاراج!'' اور پھر اسے ساری بات بتا دی۔

پرس رام کا خیال تھا کہ اس خنجر کا پس منظر سنتے ہی بدری ناتھ اچھل پڑے گا، مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ بدری ناتھ اسی طرح بڑے بے پروا انداز میں پرس رام کو گھورتے ہوئے غرور سے بولا۔

''ہم مہابلی ہیں۔ ہمارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ تم جاؤ اپنا کام کرو۔''

پرس رام فکرمند سا اپنا منہ لٹکائے، جیسے آیا تھا ویسے ہی واپس لوٹ گیا۔

☆☆☆

راج محل کے اس قدیم مگر مضبوط سنگی اور رنگی اینٹوں والے سیلن زدہ سے اندھیرے بندی خانے میں اریبہ اداس سی ایک کونے میں بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں نمناک تھیں اور حلق میں رقت اتری ہوئی تھی۔

اس کے ایک نازک سے پیر میں آہنی کڑا ڈلا ہوا تھا، ایک فولادی زنجیر اس سے منسلک تھی جس کا دوسرا سرا دیوار میں نصب ایک لوہے کے کنڈے سے جڑا ہوا تھا۔ زنجیر دو تین فٹ ہی دراز تھی۔ اسی قدر کہ جب اس کے سپاٹ اور آہنی دروازے کی نچلی درز کھول کر کھانے پینے کا مقدور بھر سامان سرکایا جاتا تو وہ...... وہاں تک بہ مشکل جا کر اٹھا سکتی تھی۔

اس وقت اریبہ دیوار سے پشت لگائے سوگوار سی بیٹھی تھی۔

......اس بندی خانے میں قتل کے مجرموں کو رکھا جاتا تھا۔ یہ عرصے سے خالی پڑا تھا۔ اب یہاں صرف اریبہ ہی مقید تھی۔

اس تنگ و تاریک بندی خانے کا ماحول بے حد خوفناک دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی چھت نیچی تھی۔ دیواریں سپاٹ اور سیاہ پڑی ہوئی تھیں۔

اریبہ کو گھٹن تو اس قدر محسوس ہو رہی تھی کہ اسے آکسیجن لینے کے لیے پھیپھڑوں پر زور دے کر کھینچ کھینچ کر سانس لینا پڑ رہی تھی۔ اسی وجہ سے وہ ہولے ہولے ہانپ بھی رہی تھی۔ اس بندی خانے میں کوئی روشندان نظر نہیں آ رہا تھا۔ فقط دروازے کی چوکھٹ کی بنی ہوئی قدرے

بالائی درزوں سے مقدور بھر ہوا اور روشنی کا گزر ہوتا تھا۔

ایک روز ہی گزارنے کے بعد اسے اندازہ ہو چلا تھا کہ اگر وہ مزید کچھ روز یہاں رہی تو ایک دن اسی خوفناک بندی خانے میں دم توڑ دے گی۔ شاید یہاں قتل کے قیدیوں کو بھی رکھا جاتا تھا اور پھر مرنے کے بعد اس کی لاش کو ادھر ہی گلنے سڑنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اس تصور سے ہی وہ لرز اٹھی۔ ایسی دردناک اور لاچارگی کی موت کا اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

اسے شاہ زمان کی فکر ستانے لگی۔ وہ اس کے لیے کس قدر پریشان ہو رہا ہوگا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ ایسا کوئی انتہائی قدم نہ اٹھا بیٹھے کہ اس کے نیک مقاصد داؤ پر لگ جائیں۔ کیونکہ اریبہ بھی یہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے محبوب کے نیک کاز کو اس کی وجہ سے کوئی نقصان پہنچے۔

یہ بھی ممکن تھا کہ شاہ زمان اس کی رہائی کے لیے کسی اور طریقے پر عمل کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا محبوب نچلا بیٹھنے والا نہیں تھا۔

☆☆☆

شاہ زمان کے لیے گرباش سنگھ اور سیناپتی موج سنگھ امید کی آخری کرن ثابت ہوئے۔ ان کی باتوں نے اسے کافی حوصلہ دیا تھا۔

موج سنگھ نے تو اسی رات اپنے وعدے کو پورا کر دیا تھا۔ اسی سبب شاہ زمان کا بلاوا آ گیا۔ ریاست کے نئے راجا پرتاب کمار نے اسے طلب کر لیا تھا۔ اب وہ اس کے سامنے دست بستہ کھڑا تھا۔

اس نے راجا کو ساری باتیں تفصیل سے بتا دی تھیں اور گرباش سنگھ ایسے گواہوں کا بندوبست بھی کر چکا تھا جنہوں نے اس بات کی تصدیق کر دی تھی کہ...... مینا کوری (اریبہ) پر مقتول لیف بروجر پہلے ہی سے گندی نظر رکھے ہوئے تھا اور وقوعے والے روز بھی جب مینا کوری کو دیکھا گیا تو اس کے کپڑے مسلے ہوئے تھے، جسم اور چہرے پر بھی ایسے نشانات تھے جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ مینا کے ساتھ بروجر نے دست درازی کی کوشش کی تھی۔

یہ ساری باتیں سننے کے بعد راجا پرتاب کمار نے ابھی اپنا فیصلہ محفوظ رکھتے ہوئے بڑے سنجیدہ اور بردبارانہ لہجے میں کہا۔

''ہم ابھی اپنا فیصلہ محفوظ رکھتے ہیں لیکن چنتا کرنے کی ضرورت نہیں۔ فریادی کے ساتھ پورا پورا انصاف ہوگا۔ یہ ہمارا وعدہ ہے۔ لیکن چونکہ ہم یک طرفہ فیصلہ صادر کرنے سے قاصر ہیں اور ہم چاہتے ہیں انصاف کے تقاضوں کو پورا کیا جائے، لہٰذا...... مقتول بروجر کے حق میں بولنے والے (استغاثہ) کو بھی اگلی بار پیش ہونے کا موقع دیا جانا چاہیے۔ اس کے بغیر مقدمے کی حتمی کارروائی کو عمل میں لانا ہمارے لیے ناممکن ہوگا۔''

راجا پرتاب کمار یہ کہہ کر اپنے دو خادموں کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ تاہم اس نے اتنا ضرور کیا تھا کہ......راج محل سے زمان کی بے دخلی کا اپنا حکم نامہ واپس تو نہیں لیا تھا البتہ اسے عارضی طور پر معطل ضرور کر دیا تھا، جب تک کہ مقدمے کی یہ کارروائی کسی منطقی انجام تک نہیں پہنچ جاتی۔

''بھوپت! اب چنتا کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' راجا کے اٹھ کر جاتے ہی راج محل کے مصاحب خاص گرباش سنگھ نے شاہ زمان کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے ازراہِ تشفی کہا۔ ''پورا وشواس ہے ہمیں کہ فیصلہ تمہارے حق میں ہی ہوگا۔''

شاہ زمان کو بھی اگرچہ کچھ تسلی تو ہوئی تھی تاہم ایک خدشے کے پیشِ نظر وہ گرباش سے ملتجی لہجے میں بولا۔

''میں آپ کا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھلا سکتا سردار جی! لیکن مجھے ڈر ہے کہ فرنگی کبھی بھی یہ نہیں چاہیں گے کہ فیصلہ میرے حق میں ہو۔ آپ تو جانتے ہی ہیں ان لوگوں کو......؟''

''اچھی طرح جانتے ہیں۔'' گرباش سنگھ بولا۔ ''لیکن ......تم شاید ہمارے راجا پرتاب کو نہیں جانتے۔ وہ انصاف پسند ہی نہیں بلکہ ایک بہادر اور نڈر انسان بھی ہیں۔ میں نے کہا نا کہ تم چنتا نہ کرو اور مجھے اپنا کام کرنے دو۔''

گرباش سنگھ وہاں سے سیدھا مقتول لیف بروجر کے کمرے میں پہنچا جہاں پہلے ہی چار عدد فرنگی سر جوڑے بیٹھے تھے۔ راج محل کے مصاحب خاص کی آمد پر وہ خاموشی سے کھڑے ہو گئے۔ گرباش سنگھ نے انہیں ساری بات بتا دی اور کہا۔

''تم چاروں میں سے استغاثہ کی پیروی کون کرنا چاہتا ہے؟ تاکہ راجا صاحب کو اگلی پیشی میں حتمی فیصلہ دینے میں آسانی ہو۔''

ان چاروں فرنگیوں میں سے ایک نے جواب دیا۔ یہ لیف بروجر کا نائب جان پارکر تھا۔

''ہم کوئی وکیل نہیں ہیں لیکن...... ہم پابند ہیں کہ ہمارے مقتول افسر کے قتل کی ترنت رپورٹ جنرل صاحب

تک پہنچا ئیں۔ وہ جو فیصلہ کریں، ہم وہی کریں گے۔"

"ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔" مصاحبِ خاص گرباش سنگھ نے کہا اور پھر پوچھا۔

"تو پھر اس سلسلے میں تم نے کیا، کیا اب تک؟"

"ہمارا ایک ساتھی دلی روانہ کیا جا چکا ہے۔ کل تک لوٹ آئے گا۔ اس کے بعد ہی ہم آپ کو کوئی حتمی جواب دے سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے، ہم منتظر ہیں۔" گرباش سنگھ نے ہولے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

شاہ زمان کو کچھ تسلی تو ہوئی تھی مگر وہ پوری طرح سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگلی پیشی میں جو بھی مقدمہ ہوگا وہ بڑا دھواں دھار ہوگا، کیونکہ اس میں دونوں فریقین موجود ہوں گے اور غاصب فرنگی اپنی جابرانہ روایت برقرار رکھتے ہوئے راجا پرتاب کو اپنے حق میں فیصلہ دینے پر مجبور کر ڈالیں گے لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ریاست کا نیا گدی نشین راجا بھی نڈر اور انصاف پسند ہے۔

اگلے دن ہی شام تک دلی سے چھ فرنگی افسران ریاست ناگرہ آن دھمکے۔ ان میں ایک تو وہی فرنگی سپاہی تھا جو راج محل میں برٹش گورنمنٹ کی طرف سے تعینات دستے میں شامل تھا جس کی کمانڈ مقتول لیفٹیننٹ بروجر کے ہاتھ میں تھی اور جسے بروجر کے نائب جان پارکر نے دلی جنرل مائیکل شا کے ہاں روانہ کیا تھا۔

باقی پانچ میں سے دو برٹش گورنمنٹ کے خصوصی نمائندے تھے، جن میں ایک تو بارایٹ لاء تھا، اس کا نام والٹر برائٹ تھا۔ وہ ایک ساٹھ سالہ فرنگی افسر تھا۔ وہ درمیانی قامت اور قابلِ رشک صحت کا مالک تھا۔ اس کے سر کے سارے بال سفید تھے۔ اس نے سیاہ موٹے فریم کا چشمہ آنکھوں پر چڑھا رکھا تھا۔

دوسرا نمائندہ نسبتاً طویل قامت اور تنومند جثے کا مالک ہیگن کلارک تھا۔ اس کی عمر بہ مشکل پچاس برس رہی ہوگی۔ وہ گورنر رڈنی کاسٹوفر کا مشیر اور برٹش آرمی کا ایک سابقہ آنریری افسر تھا۔ اس کا چہرہ لمبوترا اور آنکھیں مچی مچی سی تھیں، جس سے بلا کی مکاری اور ذہانت ٹپکتی محسوس ہوتی تھی۔ چوتھا کرنل بلسٹر وڈ پانچواں میجر ڈی فارسٹ تھا، جبکہ چھٹا عام رینک فوجی تھا۔ اس کا نام روڈی تھا۔

ان کے چہروں پر بلا کی سنجیدگی اور آنکھوں سے برہمی مترشح ہوتی تھی۔ ان کے انداز و اطوار میں بھی ناراضگی اور غصہ جھلکتا محسوس ہوتا تھا۔

انہوں نے وہاں پہنچتے ہی بلا دیر راجا پرتاب کمار سے باریابی چاہی لیکن راجا پرتاب کمار نے پہلے ہی حکم صادر کر رکھا تھا کہ راج محل کی روایت کے مطابق ایسے مہمانوں کو جن کی آمد اچانک اور بغیر پیشگی اطلاع کے ہوا، انہیں پہلے مہمان خانے میں کچھ دیر ٹھہرایا جائے۔ مجبوراً انہیں یہ حکم ماننا پڑا تھا یوں بھی ان کا یہ دورہ غیر معینہ مدت کا تھا۔

انگریز بہت مکار اور شاطر قوم ہے، کب دماغ اور کب ہتھیار سے کام لینا ہے یہ وہ خوب جانتے تھے۔ آنجہانی مہاراجا چندر گپتا کے مرتے ہی جب اس کا بیٹا ولی عہد پرتاب کمار رجواڑے کی گدی پر براجمان ہوا تو راج محل میں متعین لیفٹیننٹ بروجر کی سرکردگی میں ان کے جاسوس راج محل سے متعلق ایک ایک بات کی رپورٹ بھیجا کرتے تھے۔

مہاراجا چندر گپتا کے مرنے کی خبر کے ساتھ ہی غاصب فرنگیوں پر کچھ دبی دبی سی یہ حقیقت پہلے ہی واضح ہونا شروع ہوگئی تھی کہ آنجہانی مہاراجا چندر گپتا کے دور میں مذکورہ مشن کو جو تعاون اور تحفظات حاصل تھے، وہ اب نئے گدی نشین راجا کے مقابلے میں ویسے نہیں رہے۔

پہلے تو جنرل مائیکل شا نے اپنے طور پر اس کی یہی وجہ سمجھی تھی کہ چونکہ اس روز ہونے والی مذکورہ نشست میں ولی عہد پرتاب موجود نہ تھا (پرتاب کمار اس وقت پروفیسر ہنری کے قتل کے سلسلے میں رینا اور کالی کے مندر کے پجاریوں کے درمیان ہونے والے ایک مقدمے میں مصروف تھا) اسی لیے شاید نئے راجا کو اس مشن کا پوری طرح ادراک نہیں ہے لیکن پھر جلد ہی جب مشترکہ عسکری پلاننگ کی رپورٹ قلعہ بند جنرل مائیکل شا کے ہاں نہیں پہنچی تو یاددہانی کے سلسلے میں خط روانہ کیا گیا، اس کا جواب بھی نہیں موصول ہوا تو بعد میں لیف بروجر کی ماہانہ رپورٹ سے واضح ہوا کہ نئے گدی نشین راجا پرتاب نے یاددہانی والے اس خط کو کھولنا تو درکنار پڑھنے کی بھی زحمت گوارا نہ کی تھی۔

جنرل مائیکل شا نے گورنر رڈنی کاسٹوفر سے اس سلسلے میں میٹنگ کی۔ ابھی یہ سب جاری تھا کہ ریاست ناگرہ سے انہیں چونکا دینے والی اطلاع ملی کہ مہاراجا چندر گپتا کا انتقال ہوگیا ہے۔ بالآخر یوں ان پر واضح ہوگیا کہ پرتاب کمار ان کے بارے میں کوئی دلچسپی لینے کے موڈ میں نہیں نظر آرہا۔

اس کے بعد فوری طور پر ایک وفد تیار کیا جانے لگا، تو دوسری خبر یہ آن پہنچی کہ لیف بروجر کا راج محل میں قتل

ہوگیا ہے اور قاتلہ وہی عورت ہے جس پر پہلے ہی اس کے دو ساتھیوں سمیت مسلم باغیوں کے جاسوس ہونے کا شبہ کیا جا رہا تھا۔

اب یہ وفد ان دو اہم ایجنڈوں کے مطابق راج محل پہنچا۔

چنانچہ اب راج محل کے در و دیوار کان ہو گئے۔ نظریں اس نشست پر ٹک گئیں۔ محل کی فضا جیسے پل کے پل دم بہ خود سی رہ گئی۔ اس دبکی ہوئی خاموشی میں گہری سماعت رکھنے والوں کو جنگ کے بگل کی آوازیں آنا شروع ہوگئی تھیں۔

راجا پرتاب کمار بڑے کروفر کے ساتھ اپنی اونچی پشت گاہ والی تخت نما مسند پر براجمان تھا۔ ایک نیام بھی باندھے رکھی تھی، جس میں رکھی تلوار کے جڑاؤ دستے کی جھلک صاف نظر آتی تھی۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ راجا پرتاب کمار جلال میں تھا۔

ایسا اس نے اس فرنگی وفد کی آمد پر ان کے عزائم کی جھلک سے متعلق اپنے مصاحبِ خاص گرباش سنگھ سے سن کر کیا تھا۔

یہی نہیں اس نے اپنے دائیں جانب جہاں اصولاً آنجہانی مہاراجا کی بیوہ (نجو بائی) کو بھی براجمان ہونا چاہیے تھا، اس کی جگہ پر فوج کے سپہ سالار موج سنگھ کو بٹھا رکھا تھا۔ بائیں ہاتھ کی نشست پر خصوصی مشیر سترام داس ... براجمان تھا۔ وہ...... آنجہانی مہاراجا چندر گپتا کا مشیر بھی رہ چکا تھا مگر محلاتی سازشوں کی وجہ سے نجو بائی نے اسے بے دخل کروا دیا تھا۔ بہرکیف...... اب پرتاب کمار نے اسے اپنا مشیر ہی نہیں بلکہ ایک نئے عہدے "وزیرِ مملکت" پر بھی مقرر کر دیا تھا۔ وہ ایک پچاس پچپن سالہ دبنگ انسان نظر آتا تھا۔ پرتاب کو اس کی وفاداری پر مکمل بھروسا تھا۔

اس وقت سترام داس کی پرغور نظریں سامنے داہنی قطار میں بچھی کرسیوں پر براجمان فرنگی وفد کے چہروں اور ان کے چڑھے ہوئے تیوروں پر جمی ہوئی تھیں۔ اسی نے راجا پرتاب کمار کو ان فرنگیوں کے آگے اس دبدبے کے ساتھ بیٹھنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس بات کا اثر فرنگیوں پر خاطر خواہ پڑا تھا اور جو غبار اور ابال ان کے اندر اٹھا ہوا تھا، وہ اس دبدبے کے سامنے کچھ کم ہوا تھا۔

فرنگی وفد کی صدارت کرنل بلسٹر وڈ کر رہا تھا۔ رسمی گفتگو کے بعد کرنل بلسٹر وڈ نے موقع محل دیکھتے ہوئے اپنے دیرینہ مشن کے بجائے لیف بروجر کے قتل کی بات سے ابتدا کر ڈالی، حالانکہ پہلے وہ اپنے مشن سے متعلق گفتگو کرنا چاہتا تھا۔

"ہم نے ریاست ناگرہ کے وسیع تر مفادات اور اس کی بھلائی و بہتری کی خاطر لیفٹیننٹ بروجر کی سرکردگی میں یہاں جو دستہ مقرر کیا تھا، ہمیں افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ اس کے ساتھ کوئی تعاون نہیں کیا گیا، جس کا نتیجہ بالآخر یہ نکلا کہ اسے بے دردی سے قتل کر دیا گیا اور قتل کرنے والا کون...... وہ جس پر پہلے ہی باغیوں کا شبہ کیا جا رہا تھا۔ ہمارے علم میں یہ بھی رہا ہے کہ لیف بروجر نے اس سلسلے میں آپ کے سینا پتی موج سنگھ کو بھی کئی بار خبردار کیا تھا مگر تب بھی کوئی لائحہ عمل تیار نہیں کیا گیا۔"

کرنل بلسٹر وڈ بڑے دبنگ لہجے میں راجا پرتاب کمار سے یہ کہہ کر خاموش ہوا تو پرتاب کمار بھی جواباً بڑے دبدبے سے بولا۔

"کرنل بلسٹر وڈ...... ! ہر اسٹیٹ کے اپنے کچھ داخلی مسائل ہوتے ہیں۔ ان میں اگر بلاوجہ مداخلت کی جائے تو پھر ذہنی طور پر ہر قسم کی صورتِ حال کے لیے پیشگی تیار رہنا پڑتا ہے اور پھر اس کی ذمے داری ایک فریق پر نہیں بلکہ دونوں پر آتی ہے۔"

راجا پرتاب کمار یہ جچا تلا جواب دینے کے بعد خاموش ہوگیا۔ اس کا جواب کرنل بلسٹر وڈ کے سوال سے جتنا مختصر تھا اتنا ہی حاضر اور برمحل بھی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کرنل بلسٹر وڈ سے بھی فوری طور پر کوئی جواب نہ بن پڑا۔ لاجواب ہونے کا تاثر دیتی خاموشی طوالت اختیار کرنے لگی تو اس کے ساتھ بیٹھے میجر ڈی فارسٹ نے فوراً سوال اٹھایا۔

"آنریبل میجسٹی سے ایسے جواب کی ہمیں توقع نہ تھی۔ کیا وہ اپنے نفع و نقصان سے اس قدر غافل ہیں کہ...... بجائے دشمنوں پر نظر رکھنے کے دوستوں کو کڑی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔ کیا ہم یہ سمجھیں کہ راج محل میں ہمارے ایک فوجی افسر کا قتل اس غفلت کی دلیل ہے؟"

"کچھ بھی سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔" اچانک راجا پرتاب کے مشیرِ خاص سترام داس نے کہا۔ "ہم اپنے معاملات سنبھالنا اور چلانا زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے شاید راجا صاحب کے پہلے جواب کو توجہ سے نہیں سنا، جس میں "مداخلت" کا ذکر کیا گیا ہے۔"

"یہ مداخلت کسی طور پر بھی نہیں کہلائی جا سکتی۔" کرنل بلسٹر وڈ نے کہا۔ "ایسا ہم نے اپنے اور اس آزاد ریاست کی بھلائی کی خاطر کیا ہے۔ ہمارے پاس آنجہانی مہاراجا چندر گپتا کی شاہی مہر والا معاہدہ نامہ رکھا ہوا ہے۔"

"اچھی بات ہے۔ اب اگر ہم اسی بحث میں پڑے

رہے تو راجا صاحب کوئی کارآمد فیصلہ کرنے سے قاصر رہیں گے۔'' مشیر نے بات ختم کرنا چاہی۔

''ہم بروجر کے قاتل کو لینے آئے ہیں تا کہ اسے دلی لے جا کر وہاں اس پر باقاعدہ مقدمہ قائم کر کے قرار واقعی سزا دی جا سکے۔'' میجر ڈی فارسٹ نے بھی فوراً مقصد بیان کر دیا۔

''اس طرح تو انصاف کے تقاضوں کا مجروح ہونا یقینی ہوگا۔ واقعہ جہاں پیش آتا ہے تفتیش و تحقیق ادھر ہی زیادہ بہتر طریقے سے کی جا سکتی ہے۔'' اس بار پرتاب کمار نے جواب دیا۔

''کیا مجرم کو پیش کیے بغیر کارروائی کی جا سکتی ہے؟'' اس بار والٹر برائٹ نے سوال اٹھایا۔

''بالکل کی جا سکتی ہے۔'' راجا پرتاب کمار کا جواب اثبات میں تھا۔

''تو پھر میرا خیال ہے کہ آپ اب تک اپنے طور پر کسی نتیجے پر پہنچ ہی چکے ہوں گے۔ آپ کی اس مقدمے کے بارے میں کیا رائے ہے؟'' والٹر برائٹ انگلستان کا بار ایٹ لاء تھا۔ اس نے بڑی چالاکی سے راجا پرتاب کمار کی کورٹ میں گیند پھینک دی تھی۔

راجا پرتاب نے جواب میں کہا۔ ''ہم ابھی اپنی رائے ہی نہیں، فیصلہ بھی محفوظ رکھتے ہیں۔ بھلا طرفین و فریقین کی موجودگی کے بغیر ہم کیسے کوئی فیصلہ صادر کر سکتے تھے؟'' راجا پرتاب کمار کے اس محتاط انداز کے جواب پر بار ایٹ لاء یافتہ والٹر بھی اپنی بغلیں جھانکنے پر مجبور ہو گیا۔

تب ہی کرنل بلسٹر وڈ نے ایک بات اٹھا دی۔ یہ فرنگیوں کا گھاگ ٹولا پہلے سے ہی ایک ایجنڈا تیار کیے ہوئے تھا۔ اسی لیے ایک دوسرے کو سپورٹ دینے میں یہ لوگ ذرا بھی تامل اور تساہل سے کام نہیں لے رہے تھے۔

''معاملہ صرف بروجر کے قتل کا ہی نہیں ہے۔ اگرچہ اس قتل پر پوری برٹش گورنمنٹ اور آرمی میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی ہے، یہ ایسے معاملات ہوتے ہیں کہ جنگ کا بگل تک بجا دیا جاتا ہے لیکن ہمارے مہاراجا چندر گپتا کے ساتھ دوستانہ ہی نہیں بلکہ اس سے آگے کے بھی تعلقات مضبوط رہے ہیں۔ وہ ہمارے مفادات کا نہایت احترام کیا کرتے تھے۔'' کرنل کے لہجے سے آتی دھمکی کی بو کو محسوس کرتے ہی راجا پرتاب کا موڈ بگڑنے پر آ گیا، لیکن پھر فوراً ہی اسے مشیر ستر ام داس کی مصلحت آمیز نصیحت یاد آ گئی اور وہ ضبط سے کام لیتے ہوئے بولا۔

''ہم سے بھی آپ کو ہمارے سرگ باش پتا جی جیسی ہی امیدیں رکھنی چاہئیں بشرطیکہ دوطرفہ مفادات کے تحفظات کسی قسم کی زد میں نہ آتے ہوں۔''

پرتاب کمار نے یہ جملے اس طرح بے پروا انداز میں ادا کیے تھے جیسے جنگ کی ڈھکی چھپی دھمکی نے اس پر کوئی اثر ہی نہیں کیا ہو۔

''میجسٹی! ہمیں پتا چلتا رہا ہے کہ راج محل میں گویوں کے بہروپ میں تین افراد گھسے بیٹھے ہیں۔ بروجر نے ان کے بارے میں خبردار بھی کیا مگر اس کے خبردار کرنے کے باوجود ان تینوں کے خلاف کوئی کارروائی عمل میں نہیں لائی گئی۔ اگر ایسا کیا جاتا تو بروجر آج زندہ ہوتا۔'' اس بار دوسرے خصوصی نمائندے جان پار کر نے لب کشائی کی۔

''مگر ہماری اس سلسلے میں رائے اور ہے......'' راجا پرتاب کمار نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ تینوں گویے، سوشیل، بھوپت اور اس کی بیوی مینا کوری ...... کافی روز سے یہاں موجود ہیں۔ وہ ہمارے سورگ باش پتا جی کا دل بہلایا کرتے تھے۔ ان سے اب تک ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ البتہ تمہارے لیف بروجر کی وجہ سے ضرور حالات خراب ہوئے۔ عینی شاہدین اور اس عورت کی گواہی اور واقعے کے روز اس کی حالتِ زار سب نے دیکھی تھی۔

''بروجر نے اسے پوچھ گچھ کے بہانے اپنے کمرے میں طلب کیا تھا۔ وہ شراب کے نشے میں تھا......اور پھر اس نے لڑکی کی عزت پر حملہ کر دیا۔ نتیجے میں مینا نے خود کو بچانے کی کوشش بھی کی تھی، اپنی عزت بچانے کے لیے ہی اس نے موقع تاک کر اسی کا خنجر اسے گھونپ دیا۔ عین واقعے کے روز مینا کی حالت ایسی ہی تھی، اس کے کپڑے تار تار تھے۔ تمہارے اپنے سپاہیوں نے بھی یہ منظر دیکھا تھا۔''

''منظر کا کیا ہے جناب!'' والٹر برائٹ نے طنزیہ مسکراہٹ سے کہا۔ ''وہ تو اپنی مرضی کے مطابق بھی بنایا جاتا ہے۔''

راجا پرتاب کمار کو اس کی بات انتہائی ناگوار گزری مگر اس نے بردباری اور ضبط کا دامن نہیں چھوڑا، تاہم تلخ لہجے میں بولا۔

''دوستی کا دعویٰ کرنے کے باوجود ہمیں شبے کی نگاہ سے دیکھا جائے گا تو پھر اصولی طور پر سب سے پہلے ہم بدگمانی کا حق رکھتے ہیں۔ ایسی فضا میں باقی اہم اور مشترکہ معاملات کو آگے بڑھانا ہمارے لیے مشکل ہو جائے گا۔''

''آپ کیا چاہتے ہیں؟'' نمائندہ خصوصی جان پار کر نے پوچھا۔

''انصاف۔'' راجا نے گمبھیر آواز میں کہا۔

''قاتلہ مینا کو کہاں رکھا ہوا ہے اس وقت......؟'' والٹر برائٹ نے کوئی سوال اٹھانے کی غرض سے پوچھا۔

''ہم نے دونوں طرف سے انصاف سے ہی کام لیا ہے۔ لڑکی کو ریشم و کمخواب والے آرام دہ بستر پر نہیں لٹایا ہوا، اسے راج محل کے بندی گھر میں قید کیا ہوا ہے، چاہو تو دیکھ سکتے ہو کہ وہ وہاں کس حال میں ہے؟''

''ہم ضرور دیکھنا چاہیں گے۔'' جان پار کر نے کہا۔

پھر اس کے تھوڑی دیر بعد ہی جان پار کر اور والٹر برائٹ کو بندی گھر کا ''نظارہ'' کرا دیا گیا۔

واپس آ کے وہ دونوں ہی لاجواب ہو کر کرنل بلسٹر وڈ اور میجر ڈی فارسٹ کی طرف تکنے لگے، جیسے کہہ رہے ہوں۔ ''اب کیا کیا جائے؟''

''آدمی ہمارا قتل ہوا ہے اور ہم فریادی ہیں۔ ہماری اس اعلیٰ ظرفی کی قدر کی جائے کہ حاکم وقت ہونے کے باوجود ہم آپ سے یہ درخواست کریں گے کہ ملزمہ مینا کوری کو ہمارے حوالے کر دیا جائے تا کہ ہم اپنی عدالت میں اس پر مقدمہ چلا سکیں۔''

''ہرگز نہیں۔'' راجا پرتاب کمار جلال میں آ گیا۔ ''آپ نے شاید کیس کی نوعیت پر غور ہی نہیں کیا کرنل! ایک طرح سے ملزمہ بھی فریادی ہی ہے۔ رہی بات حاکم وقت کی، تو اس وقت آپ سب لوگ حاکم وقت کے سامنے ہی بیٹھے ہوئے ہیں۔''

مشیر ستر ام داس نے دانستہ طور پر اب تک خاموشی اختیار کر رکھی تھی کیونکہ وہ راجا پرتاب کے جوابات سے مطمئن تھا۔

ادھر بلسٹر وڈ اور ڈی فارسٹ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے اور اس کے بعد انہوں نے اپنے ساتھ بیٹھے مشیر خصوصی ہیگن کلارک کی طرف دیکھا، جواب تک خاموش بیٹھا تھا مگر کون جانتا تھا کہ اس نے کسی ''ہدایت'' کے طور پر ایسا خول چڑھا رکھا تھا۔ لہٰذا جب کرنل اور میجر نے اس کی طرف دیکھا تو......اس نے راجا پرتاب کمار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''مسٹر پرتاب کمار! آپ کا لب و لہجہ برٹش گورنمنٹ کو للکار رہا ہے۔ جبکہ ہمیں سختی سے ہدایت کی گئی ہے کہ ملزمہ کو ہی نہیں بلکہ اس کے دونوں ساتھیوں کو بھی ہمارے حوالے کیا جائے اور ہم انہیں دلی لے جانے کے حتمی ارادے سے آئے ہیں۔''

اس کی بات نے گویا جلتی پر تیل کا اثر کیا۔ گفتگو اور مقدمے کی......کارروائی شاید اس کے بولنے پر ہی اختتامی......نتیجے پر منتج ثابت ہوئی مگر باوصف اس کے راجا پرتاب کمار نے انتہائی تلخ قسم کی سنجیدہ روئی کے ساتھ انہیں مسکت جواب سے نواز ہی دیا۔

''ہم نے جو کہنا تھا کہہ دیا۔ اس سے پہلے کہ اس نشست کا اختتام کسی بدمزگی کی طرف مائل ہو، ہم معزز مہمانوں کو مہمان خانے تشریف لے جانے کا کہتے ہیں۔''

فرنگی ٹولے نے ایک دوسرے پر جھک کر تھوڑا صلاح مشورہ کیا اور پھر وہ سب اپنی نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

اگلی نشست راجا پرتاب کمار کرنل بلسٹر وڈ اور میجر ڈی فارسٹ کے مابین ایک بند کمرے میں ہوئی۔ اس کا ایجنڈا وہی تھا جو یہ مہاراجا چندر گپتا کے ساتھ طے کر گئے تھے مگر راجا پرتاب کمار نے اس دوسری اور مختصر نشست میں ان پر صاف اور کڑے لفظوں میں واضح کر دیا کہ وہ اپنی پڑوسی ریاست پر بلاجواز جنگی جارحیت کو ایک ظالمانہ کارروائی سمجھتا ہے، لیکن اگر کسی بیرونی طاقت نے کبھی ایسا کرنے کی غاصبانہ کوشش کی تو وہ کوہ شمالیہ کی چھوٹی بڑی ریاستوں کو متحد کر کے اس جارحیت کا منہ توڑ جواب دے گا۔ (''بیرونی طاقت'' سے اس کی مراد فرنگی ہی تھے۔)

فرنگی وفد اسی دن واپس دلی لوٹ گیا۔ آثار بتاتے تھے کہ وہ نئے گدی نشین راجا سے بالکل بھی مطمئن نہ تھے مگر پرتاب کمار کو اس کی کوئی پروا نہ تھی۔ نیز ان سے مل کر پڑوس کی دیگر دو ریاستوں پائن پور اور تریپال پر مشترکہ عسکری چڑھائی کے بھی وہ بالکل حق میں نہیں تھا۔

اگلے روز ہی اس نے مقدمے کی آخری کارروائی نمٹاتے ہوئے اریبہ کی رہائی کا حکم دے دیا اور اس مقدمے کی کارروائی کی رپورٹ جنرل مائیکل شا کو ڈاک خانے کے ذریعے بھجوا دی گئی۔

مصلحت اندیشی کے طور پر راجا پرتاب کمار نے جنرل مائیکل شا کو یہ ضرور لکھوا دیا تھا کہ اگر وہ چاہیں تو لیف بروجر کی جگہ پر اپنے کسی اور آفیسر کو متعین کر سکتے ہیں، انہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا مگر یہ سب صرف خیرسگالی کے طور پر سفارتی تعلقات کی بنیاد پر ہوگا۔ نیز ان کا راج محل میں، داخلی اور خارجی سیاست و معاملات میں کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے۔ راج محل سے باہر کسی دوسرے مقام پر ان

مرحبا

عرق گلاب



دیسی گلاب کا خالص عرق
قدرتی خوبیوں کا بے مثال تحفہ

100%
PURE & NATURAL





f /marhabalaboratoriespk UAN: 111-152-152 www.marhaba.com.pk

فوجیوں کے ٹھکانے کا بندوبست کر دیا جائے گا۔

☆☆☆

ان لوگوں کی وجہ سے پوری بستی میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ لوگ انہیں پوجنے کی حد تک چاہنے لگے تھے۔ بستی کا ادھیڑ عمر سردار جس کا نام نارنگ تھا، اس نے ان چاروں کی رہائش کا بندوبست بھی کر دیا تھا۔

بوڑھا غافر جوان کا روحانی پیشوا تھا اور جسے ان کی زبان آتی تھی، رینا نے اسے بعد میں مزید کچھ اہم قسم کی باتوں سے بھی آگاہ کرڈالا۔ جس میں کالی کے مندر کے پجاری بدری ناتھ کے کالے کرتوتوں سمیت پروفیسر ہنری برنارڈ کے ایک سازش میں قتل ہو جانے سے لے کر اب تک سب شامل تھا۔

بوڑھا غافر اب ساری بات سمجھ گیا تھا۔ راکاشی بستی والے تو خود بھی عرصے سے بھیمن داس کے دشمن تھے لیکن انہیں نہیں معلوم تھا کہ آج بھی بھیمن داس کی ''باقیات'' بدری ناتھ اور پرس رام کے گروہ کی صورت میں موجود تھیں۔

چنانچہ اس حقیقت کا پتا چلتے ہی ان کے سینوں کے اندر دبی برسوں کی چھپی ہوئی آتش انتقام...... ایک بار پھر پوری شدت کے ساتھ بھڑک اٹھی لیکن وہ خود معذور تھے کیا کر سکتے تھے؟ لیکن رینا نے تسلی دی تھی وہ یہ کام خود کرے گی اور بدری ناتھ اور اس کے ٹولے کو ایک دن عبرت ناک انجام تک پہنچا کر رہے گی۔

چنانچہ اب رینا کو راکاشی بستی والوں کا پورا تعاون حاصل تھا۔ رینا کو ان لوگوں سے فقط یہی درکار تھا کہ وہ انہیں رہنے کے لیے اس بستی میں جگہ اور ٹھکانا دے دیں۔ باقی کام وہ خود سنبھال لے گی۔ راکاشی بستی والے تو پہلے ہی ان کے آگے بچھے جا رہے تھے۔ انہیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

کھپریل اور سرکنڈوں کا ایک بڑا سا جھونپڑا ان کے لیے بنوا دیا گیا جس میں دو گوشے رکھے گئے تھے۔

راکاشی کے لوگ اپنی استعداد کے مطابق چھوٹا موٹا شکار بھی کیا کرتے تھے۔ جنگل میں خوش ذائقہ میٹھے پھلوں کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ لہٰذا کھانے پینے کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ بنا بنایا تیار کھانا ان کے جھونپڑے میں پہنچا دیا جاتا تھا۔

رینا کے سامنے اب دو اہم مقاصد کی تکمیل تھی۔ پہلا تو یہ کہ اس نے اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لینا تھا اور دوسرے راکاشی کے لوگوں کو اس موذی بیماری سے نجات دلانے کا عزم تھا۔ بلکہ آخر الذکر مشن کا تعلق تو اس کے باپ کی اس پُرخطر مہم سے بھی تھا۔

رینا نے بہت غیر معمولی ذہن پایا تھا۔ اس نے اپنے باپ کی اس مذکورہ ڈائری کا ایک ایک باب بڑے غور سے پڑھا تھا اور اب اس کا ایک ایک لفظ اسے ازبر ہو چکا تھا۔ اسی کی روشنی میں وہ راکاشی والوں کی مدد کرنا چاہتی تھی۔

رینا نے ان کے موذی مرض کا پتا تو لگا لیا تھا، مگر اب اسے ان کا علاج بھی ڈھونڈنا تھا۔ وہ کوئی ڈاکٹر تو نہ تھی اور نہ ہی کسی میڈیکل اسکول یا کالج کی طالبہ رہی تھی، مگر وہ مایوس نہ تھی۔ اس کا حل اس نے سوچ رکھا تھا مگر پہلے وہ یہاں کے حالات کا کچھ روز جائزہ لینا چاہتی تھی۔

بوڑھے غافر نے اسے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ اپنی اس کمزوری کی وجہ سے عام صحت مند لوگوں کی نظروں سے بچنے کے لیے چھپ چھپ کر زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ اسی لیے راتوں کے اندھیروں میں کام کاج پر نکلتے، جس سے انہیں کئی خطرات اور دقتوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا تھا۔ اس کے بعد سورج کے طلوع ہونے سے پہلے بستی لوٹ آتے اور سو جاتے تھے۔

رینا نے آتے ہی سب سے پہلے ان کی یہ کمزوری دور کی تھی۔ بوڑھے غافر کے ذریعے اس نے ان کی زبان بھی سیکھنا شروع کر دی تھی اور اس نے یہی تنبیہ اپنے ساتھیوں کو بھی کی تھی۔ راکاشی کی زبان ہندی، اردو اور سنسکرت کا ملغوبا تھی۔ بوڑھا غافر ان کا بہترین ترجمان ثابت ہو رہا تھا۔

رینا نے ایک دن بوڑھے غافر کے ساتھ ''کلاس'' کا بندوبست کیا۔ ایک چھوٹے سے میدان میں سب کو جمع کیا۔ بوڑھا غافر ترجمانی کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اس ''کلاس'' میں بستی کا سردار نارنگ بھی موجود تھا۔

''سب سے پہلے تمہیں اپنی اس کمزوری پر قابو پانا ہو گا جو تم لوگوں کے اپنے بس میں ہے۔'' رینا نے اپنے لیکچر کی ابتدا کرتے ہوئے ان سے کہا۔

وہ سب ایک میدان میں جمع تھے۔ دن نکلا ہوا تھا اور اتفاق سے آج موسم بھی خوشگوار تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی اور سردی کا احساس بھی کم تھا۔ آسمان بھی صاف تھا۔

''وہ پہلی کمزوری تمہاری اپنی احساسِ کمتری ہے جو تم نے خود اپنے آپ پر سوار کر رکھی ہے۔ جب تک تمہارے اندر سر اٹھا کر ایک عزم و حوصلے سے جینے کا جذبہ نہیں ابھرے گا، علاج بھی بے کار ثابت ہو گا۔ کل سے تم سب لوگ چھپ چھپ کر رہنے کے بجائے دوسرے عام

انسانوں کی طرح سینہ تان کر زندگی گزارو گے۔ راتوں کے اندھیروں میں نکلنا اور دن میں چھپ کر لیٹے رہنا قدیم دور کے وحشی انسانوں کا وتیرہ تھا۔ تم آج کے دور کے انسان ہو...... تہذیب یافتہ انسان۔ کچھ بھی سہی تم لوگ اب رات میں آرام کرو گے اور صبح ہوتے ہی کام پر نکلو گے۔ کھیتی باڑی، شکار، اپنے مال مویشیوں کی رکھوالی اور دیگر اندرونی و بیرونی کام دن میں کرو گے، جیسا کہ اور لوگ کرتے ہیں۔ وعدہ کرتے ہو......؟ تاکہ پھر میں آگے بڑھوں۔"

رینا اتنا کہہ کر ان کا جواب سننے کے لیے ذرا خاموش ہوگئی۔ ترجمان غافر بوڑھا ہونے کے باوجود بڑی سبک روی کے ساتھ اپنا فرض انجام دے رہا تھا۔

رینا کی اب تک کی بات اس نے ان کی زبان میں پہنچادی۔ جسے سن کر تھوڑی دیر تک تو مجمعے میں بھنبھناہٹ ہوتی رہی اس کے بعد سب سے پہلے سردار نارنگ نے اپنا ہاتھ بلند کرلیا اور بہ آوازِ بلند کچھ کہا بھی۔ اس کے ساتھ ہی بستی کے دیگر لوگوں نے بھی بہ آوازِ بلند اس کے کہے ہوئے کو دہرایا۔ ان میں جوش و خروش کی کیفیات نظر آتی تھیں۔

تب بوڑھے غافر نے رینا کو خوشی سے بتایا کہ انہوں نے اس کی بات پر عمل کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ اس کے بعد رینا نے پھر انہیں مخاطب کرکے کہنا شروع کیا۔

"میں، میرے ساتھی اور میرا باپ پروفیسر ہنری، انگلستان سے یہاں ریسرچ کے لیے آئے تھے۔ سب سے پہلے میرے باپ نے ہی تمہاری بستی کا کھوج لگایا تھا جسے تم لوگوں نے اپنی طرح چھپا رکھا تھا۔ وہ تمہاری مدد کرنا چاہتے تھے اور یہ بھی بتانا چاہتے تھے کہ تمہارے جس مٹھی بھر دشمنوں نے تمہیں برسوں سے اس حال تک پہنچایا ہوا ہے، وہ آج بھی زندہ ہیں۔ دن بہ دن اپنی تعداد بھی بڑھا رہے ہیں، ایسا تم لوگوں کی بزدلی کی وجہ سے ہوا۔ میرے باپ اور میرے چند ساتھیوں کو اسی شیطانی ٹولے نے اس بات کی سزا دی اور وہ سب جان سے ہار گئے مگر میں نے اور میرے باقی ساتھیوں نے ہمت نہ ہاری کیونکہ ہم نے تمہاری مدد اور اس شیطانی گروہ کو نیست و نابود کرنے کا عزم کر رکھا ہے لیکن یہ سب تمہاری مدد کے بغیر ممکن نہیں۔

"برسوں پہلے شیطان صفت بھیمن داس نے سانپ کے خاص زہر سے تمہیں نسل در نسل معذور بنایا تھا۔ اب اس کا شیطان بیٹا بدری ناتھ تم سب کا اس بستی سے ہی صفایا کرنے پر تلا بیٹھا ہے۔ کیا تم اس سے انتقام نہیں لوگے؟ کیا تم اس بستی کو پھر سے پہلے کی طرح ہنسی خوشی آباد نہیں کرو گے؟ کیا تم آئندہ بھی اسی طرح معذور نسلوں کو جنم دیتے رہو گے؟ تاکہ وہ بھی تمہاری طرح سسک سسک کر اور مہذب دنیا سے چھپ کر اپنی زندگی گزارنے پر مجبور رہیں؟ آؤ...... میرا ساتھ دو...... میرا وعدہ ہے، میں تمہیں اور تمہاری آنے والی نسلوں کو اس مصیبت سے نجات دلا دوں گی کیونکہ میں نے اور میرے مرحوم باپ نے اس کا حل ڈھونڈ لیا ہے۔ ضرورت صرف ہمت اور صبر و استقامت کی ہے، حوصلے اور ثابت قدمی کی ہے۔ بس! مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔"

رینا اتنا کہہ کر خاموش ہوگئی۔ فرطِ جوش سے اس کا چہرہ مرتعش ہو رہا تھا۔ دیکھا دیکھی بوڑھا غافر بھی جوش میں آگیا تھا اور اسی جوش و جذبے سے رینا کے الفاظ کی ترجمانی کرنے لگا۔

شوکی، رابرٹ اور گارشیا بھی خاموش کھڑے تھے۔ ان کے چہرے اس قسم کے جذبات سے بالکل عاری تھے، بلکہ ان سے بیزاری جھلک رہی تھی، جیسے وہ چار و ناچار اور اپنی کسی مجبوری (غرض) کی وجہ سے رینا کے شانہ بشانہ کھڑے ہوں، جبکہ حقیقت بھی یہی تھی۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا، یہ دونوں شاطر اور مطلب پرست بہن بھائی تھے۔ جب ان کا رینا سے مطلب نکلنا تھا انہوں نے اسے تنہا چھوڑ دینا تھا لیکن شوکت حسین عرف شوکی اس کا (رینا کا) واحد ساتھی اور غم خوار تھا جس نے رینا کا آخری وقت تک ساتھ دینے کا فیصلہ ہی نہیں بلکہ پختہ عزم بھی کر رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس وقت بھی شوکی کی نظریں رینا کے مرتعش چہرے پر ٹھہری گئی تھیں۔

وہ اس سے محبت کرتا تھا، بے حد محبت...... اور پھر جب رینا نے بھی اس کی محبت کا جواب اسی محبت اور اس اقرار سے کرکے دیا تھا کہ وہ بھی اسے پسند کرتی ہے، اسے چاہتی ہے تو شوکی کو یوں لگا تھا جیسے ساری دنیا، ساری کائنات میں ہزاروں رنگ بکھر گئے ہوں لیکن پھر اچانک وہ خوش ہوتے ہوتے ایک دم اداس سا ہو جاتا تھا۔ یہ سوچ کر کہ کیا ایک فرنگن لڑکی اور ایک مسلمان لڑکے کا ملاپ ممکن تھا؟ مگر اسے اپنے "انتخاب" پر فخر محسوس ہوا، اسے یقین تھا کہ اس کی منزلِ الفت کے حصول میں اللہ بھی اس کی مدد ضرور کرے گا۔

وہ سوچتا اتنے اجلے خیالات اور اتنی بلند سوچ کی مالک لڑکی بھلا کیسے محبت جیسے پاکیزہ جذبے کو جھٹلا سکتی ہے؟ کیسے اسے دھوکا دے سکتی ہے؟

شوکی کو چند دنوں پہلے جو غلط فہمی اور بدگمانی ہونے لگی

تھی، وہ اب دور ہونے لگی تھی۔ اس نے خود کو سمجھایا۔ محبت میں بدگمانی اچھی بات نہیں، اس میں وسیع النظری ہونی چاہیے۔

رینا کے بارے میں یہ سب سوچتے ہوئے اس کے چند دنوں سے بے قرار دل کو کافی سکون پہنچا تھا۔ اسے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آگئی تھی کہ رینا ایک اہم کاز میں مصروف ہے، وہ خود کو اپنے عظیم مقصد کے بالکل قریب سمجھ رہی ہے۔

بوڑھے غافر نے جب رینا کے خیالات اور اس کی باتوں کی ترجمانی اپنی زبان میں مجمعے کے سامنے کی تو وہ سب خوشی سے آوازیں بلند کرنے لگے۔ رینا نے بوڑھے غافر سے پوچھا۔

"یہ لوگ اب کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا میری بات انہیں سمجھ نہیں آئی ہے یا پھر یہ میرا یقین نہیں کرتے؟"

"نہیں بیٹی! ایسی بات نہیں، یہ تمہاری بات کا مفہوم اچھی طرح سمجھ چکے ہیں۔" بوڑھے غافر نے شفیق لہجے میں کہا۔ "یہ لوگ اچھی طرح جان اور سمجھ بھی چکے ہیں کہ تم ان کی مدد کرنے آئی ہو، یہ لوگ اپنے دشمنوں کا سن کر جوش میں آگئے ہیں اور ان کا خاتمہ چاہتے ہیں۔"

رینا نے دیکھا کہ سردار نارنگ بھی اپنی زبان میں اپنے قبیلے کے لوگوں سے پُرجوش خطاب کر رہا تھا اور اس دوران وہ بار بار رینا کی طرف اشارہ بھی کر رہا تھا۔ پوچھنے پر بوڑھے غافر نے رینا کو بتایا کہ...... "وہ اپنے لوگوں سے یہی کہہ رہا ہے کہ وہ سب وہی کریں جو رینا کہہ رہی ہے۔ یہ ہماری محسن ہے۔ وہ دیکھو بیٹی!" کہتے ہوئے اچانک غافر نے مجمع کی طرف اشارہ کیا۔

رینا نے دیکھا۔ سب لوگوں نے اپنا بایاں ہاتھ سینے پر اور دایاں ہاتھ فضا میں بلند کر رکھا تھا اور اسے دھیرے دھیرے ہلا رہے تھے۔ ساتھ تھوڑا جھک بھی رہے تھے۔ غافر نے رینا کو بتایا کہ وہ اپنے قبیلے کے مخصوص انداز میں اسے سلام پیش کر رہے ہیں۔

رینا نے بھی مسکرا کر انہی کی طرح انہیں سلام پیش کیا۔ فرطِ جذبات تلے رینا کی نیلی آنکھیں اشکبار ہوگئی تھیں۔ شوکی کو بھی رینا کا اشکبار چہرہ بھلا محسوس ہوا۔ اس کے آنسو اس کے اندر کی سچائی کی دلیل تھے۔

تھوڑی دیر بعد سب لوگ چلے گئے، یہ چاروں بھی اپنے جھونپڑے میں آگئے۔

"رابرٹ، گارشیا، میری بہن! میں آج بہت خوش ہوں۔" اندر آکر رینا نے مسرت بھرے لہجے میں ان سے کہا۔ پھر وہ شوکی کی جانب مڑی۔

"شش...... شوکی! دیکھو...... ہم کامیابی کے کس قدر نزدیک پہنچ چکے ہیں اور...... اور......" جذبات کی شدت تلے اس کا لہجہ مرتعش سا ہوا جا رہا تھا۔

"ی ی...... یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ تم نے ہر کڑے وقت اور کڑی آزمائش میں میرا ساتھ دیا۔"

"اچھا! ہم نے تو جیسے کچھ کیا ہی نہیں۔" رابرٹ، رینا کے منہ سے شوکی کی تعریف سن کر جل گیا تھا۔ "میں اور میری بہن گارشیا بھی تو ابتدا سے ہی تمہارے ساتھ ہیں۔ اس روز خیموں میں لگنے والی آگ میں ہم دونوں نے بھی تو اپنی زندگیاں داؤ پر لگا رکھی تھیں۔"

"بے شک، تم دونوں نے بھی میرا بہت ساتھ دیا ہے۔" رینا نے رابرٹ کی طرف دیکھ کر ہلکی مسکراہٹ سے کہا۔ "لیکن اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا کہ ہمیں مشکل گھڑی اور موت کے منہ سے ہمیشہ شوکی نے ہی نکالا ہے۔"

رینا کی صاف گوئی پر رابرٹ خار کھائی نظروں سے شوکی کو گھورنے لگا اور پھر اس سے پہلے کہ وہ منہ سے کوئی سخت جملہ نکالتا، اس کے ساتھ کھڑی گارشیا نے ہولے سے رابرٹ کو خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا۔

یہ لوگ باتیں کرنے لگے۔ رابرٹ کو اپنی غرض کی فکر تھی اور گارشیا کو اپنے مفاد کی...... دونوں جانتے تھے کہ راج محل سے بالکل کٹ کر ان کے مفادات پورے نہیں ہوسکتے تھے۔ لہٰذا گارشیا نے رینا سے کہا۔

"رینا! ہم نے اب راکاشی بستی والوں پر تو اپنا اعتماد بٹھا لیا ہے۔ لیکن راج محل سے دور ہوگئے ہیں۔ یہ بات کچھ اچھی نہیں ہے، جبکہ ولی عہد پرتاب کمار نے بھی تمہاری مدد کا وعدہ کر رکھا ہے۔"

شوکی بڑی دزدیدہ نظروں سے ان دونوں مکار بہن بھائیوں کی طرف دیکھ رہا تھا مگر وہ مفاد پرست تھے اور...... وہ مفاد کیا تھا؟ ابھی اسے کچھ ٹھیک طرح اندازہ نہیں ہوسکا تھا۔ لہٰذا جب گارشیا نے راج محل اور ولی عہد پرتاب کمار (راجا پرتاب کمار) کا ذکر چھیڑا تو شوکی خاموش نہ رہ سکا، بولا۔

"راج محل سے ہمیں سوائے ناکامیوں اور رسوائیوں کے کیا ملا ہے اب تک؟ پرتاب کمار بھی ہمارے سلسلے میں بے بس ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ وہ اس وقت کچھ نہ کرسکے تو اب بھلا کیا کرلیں گے۔ جبکہ مس رینا نے اپنی مدد آپ کے تحت

خود ہی یہاں تک کامیابی حاصل کی ہے اور انشاء اللہ آئندہ بھی کامیابی ان کے قدم چومتی ہوئی نظر آرہی ہے۔ہمیں اب کسی کی مدد کی ضرورت نہیں رہی۔"

رینا کوشوکی کا جواب اچھا لگا تھا۔وہ اس کی طرف دیکھ کر بڑے پیار بھرے انداز میں مسکرائی تھی۔رابرٹ اور گارشیا، رینا کوشوکی کی بات پر یوں طمانیت بھرے انداز میں مسکراتا دیکھ کر اندر ہی اندر بری طرح جل گئے۔

"خیر! اب ایسی بات بھی نہیں ہے۔" گارشیا نے منہ بنا کر کہا۔"ولی عہد رینا سے بہت مخلص ہیں۔اسی لیے تو راج محل سے رخصت ہوتے وقت وہ خود ہم سے ملنے چلے آئے تھے۔وہ اپنی جگہ شرمندہ ضرور تھے،مگر رینا کی مدد کرنے کا وعدہ بھی تو کیا تھا انہوں نے۔"

"ہاں! گارشیا بہن بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔" رابرٹ نے فوراً اپنی بہن کی تائید میں کہا۔"وہ یہ وعدہ ضرور پورا کریں گے اور میں سمجھتا ہوں کہ ان بدمعاش پجاریوں کو وہی کیفر کردار تک پہنچا سکتے ہیں جبکہ ہم اس بدمعاش اور شیطان ٹولے کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

"رینا! تمہیں راج محل جانا چاہیے اور پرتاب کمار سے ملنا چاہیے۔میرا خیال ہے کہ وہ تمہیں دل سے پسند کرنے لگے ہیں، تمہیں دیکھ کر وہ یقیناً خوشی سے کھل اٹھیں گے اور پھر......"

"غلط...... بالکل غلط۔" شوکی نے اچانک گارشیا کی بات کاٹ دی جبکہ گارشیا کی بات پر رینا کے چہرے پر شرم کی سرخی سی جھلک آئی تھی۔شوکی کو گارشیا کی آخرالذکر بات بڑی بری لگی تھی۔آگے بولا۔

"ایسی رسوائی کے بعد مس رینا کا یا ہمارا راج محل جانا بالکل بھی مناسب نہ ہوگا۔یہاں ہم آزادی سے اپنا کام نمٹا سکتے ہیں اور یہ پسند کی بھلا کیا بات ہے۔راجوں مہاراجوں کے بیٹے صرف اپنی عیاشیوں سے لگاؤ رکھتے ہیں۔"

شوکی نے بھی بالآخر اپنے دل کی بھڑاس نکال لی۔وہ اب کچھ کچھ گارشیا کے "مقصد" سے بھی آگاہ ہونے لگا تھا۔اس سے پہلے وہ یوں کبھی نہیں بولا تھا لیکن اب اس نے پکا ارادہ کر رکھا تھا کہ چپ نہیں بیٹھے گا۔ورنہ یہ دونوں شاطر بہن بھائی کوئی نہ کوئی گل کھلانے سے باز نہیں آئیں گے۔آخر کو اتنی مخاصمت کے باوجود وہی ان کے کام آتا رہا ہے تو کیا اسے بولنے کا حق بھی نہیں۔

"تم خاموش رہو اور اپنی حد میں رہ کر بات کرو، تم ایک نوکر ہو اور بس......" رابرٹ نے غصے سے شوکی کی طرف گھورتے ہوئے انتہائی حقارت بھرے لہجے میں کہا تو شوکی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

وہ اب تک اسے بہت برداشت کر رہا تھا جس کی ایک حد ہوتی ہے مگر اب جیسے اس نے بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا عہد کر لیا تھا۔وہ بھی غضب ناک نظروں سے سامنے بیٹھے رابرٹ کو گھورتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا اور آگے بڑھ کر اس کا گریبان دبوچ لیا۔

تنومند دونوں ہی تھے، مگر قد کاٹھ میں رابرٹ، شوکی سے دبتا تھا۔

"اب تم اپنی زبان کو لگام دیے رکھنا مسٹر رابرٹ شا......! ہر انسان کی عزت نفس ہوتی ہے۔میں نے اپنی ڈیوٹی سے کبھی انکار نہیں کیا ہے۔خود تمہیں میں اس مہم کے دوران کئی بار اپنی جان خطرے میں ڈال کر مرنے سے بچا چکا ہوں مگر تمہاری مسلسل کینہ پروری اور بغض نے میرے صبر کا بھی پیمانہ لبریز کر دیا ہے۔سمجھے تم......"

یہ کہتے ہوئے شوکی نے رابرٹ کا گریبان اس جھٹکے سے چھوڑا کہ وہ دھکا لگنے سے پیچھے الٹ گیا۔

شوکی کی اس جرأت پر رابرٹ کا چہرہ مارے ذلت اور نفرت سے مسخ ہو کر رہ گیا۔گارشیا بھی پریشان نظر آنے لگی۔رینا بھی شوکی کو اس روپ میں دیکھ کر حیران تو ہوئی تھی مگر یہ دوسری بار ایسا ہوا تھا کہ شوکی کوئی پروا کیے بغیر رابرٹ پر پل پڑا تھا۔لہٰذا اب وہ بھی سمجھ گئی تھی کہ شوکی اب چپکا بیٹھے رہنے والا نہیں۔اب اس کا بھی رابرٹ سے عمومی نہیں بلکہ واقعی دل خراب ہو چکا ہے اور ایسا شاید تب سے ہوا ہے جب سے رابرٹ نے ذاتی عناد کی خاطر جھوٹی گواہی دی تھی۔یوں وہ جیتا ہوا مقدمہ ہار بیٹھے تھے، ورنہ تو کالی کے مندر کے پجاری پھنسنے ہی والے تھے۔

"رابرٹ، پلیز......!"

اچانک رینا نے یہ کہتے ہوئے چند قدم بڑھائے۔وہ شوکی کے آگے آگئی تھی لیکن اس کی طرف اس کی پشت تھی جبکہ رخ اس کا رابرٹ کی طرف تھا، جو غصے میں بپھرا ہوا جارحانہ نظروں سے شوکی کو گھور رہا تھا۔

"میں اسے نہیں چھوڑوں گا، اس نے دوسری بار مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے، ایک ذلیل نوکر......"

"اسٹاپ ناؤ......رابرٹ!" رینا کو بھی رابرٹ کی ہٹ دھرمی پر غصہ آگیا اور وہ اس پر برہم ہوگئی۔"ہوش کرو تم۔آخر چاہتے کیا ہو؟ ہر وقت تم اس بے چارے کی تذلیل کرتے رہتے ہو...... تمہیں پاپا (پروفیسر ہنری) بھی کئی بار

سخت لفظوں میں ٹوک چکے تھے۔بند کرو اب یہ کھیل...... پہلے ہی ہم تمہاری غلطی کی سزا بھگت رہے ہیں۔"

"یہ میری تذلیل کیا کرے گا مس رینا......!" شوکی نے بھنائے ہوئے لہجے میں رابرٹ کے لال بھبوکا چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے حقارت سے کہا۔

"دوسروں کی عزت وہی لوگ کرتے ہیں جن کی اپنی بھی کوئی عزت ہوتی ہے۔میں اب رابرٹ کو ہمیشہ اسی طرح اینٹ کا جواب پتھر سے دیتا رہوں گا۔اب میں بالکل بھی اس کا ایسا رویہ برداشت نہیں کر سکتا۔"

"میں تمہاری شکایت تو ضرور کروں گا انکل جان مائیکل سے، دیکھنا، وہ تمہیں ہی نہیں تمہارے اس بڈھے باپ کو بھی نوکری سے بے دخل کر دیں گے، بلکہ سزا بھی دیں گے۔" رابرٹ نے بھی اسے دھمکانے کی ناکام کوشش کی۔

"زبان سنبھال کر بات کرو مسٹر!" شوکی نے اپنا ایک ہاتھ اٹھا کر انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔"میرے باپ کا تمیز سے ذکر کرو، میں اچھی طرح جانتا ہوں اس کی عزت تم سے وہاں کہیں زیادہ ہے، سمجھے تم......؟"

اس کی بات پر رابرٹ کو مزید آگ لگ گئی۔مگر اسی وقت اس کی بہن گارشیا نے اسے سمجھا بجھا کر خاموش کرا دیا۔

"پلیز، شوکی! اب تم بھی جانے دو۔" رینا نے اس سے ملتجی انداز میں کہا۔شوکی نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے ایک نظر رینا کے صبیح چہرے پر ڈالی۔جتنا رابرٹ کی قلیل القلبی پر غصہ آرہا تھا اتنا ہی رینا پر ترس بھی......کہ وہ پہلے ہی اپنے کاز کے لیے کس قدر جان توڑ محنت کر رہی تھی، جبکہ رابرٹ اس کی کوئی مدد کرنے کے بجائے دھونس دھمکیوں میں لگا ہوا تھا۔

لہٰذا شوکی نے خاموشی اختیار کرنے سے پہلے...... بہت دھیرے سے رینا کو جتا بھی ڈالا تھا کہ وہ رابرٹ کی اب کوئی بات برداشت نہیں کرے گا۔

تھوڑی دیر بعد رابرٹ اور گارشیا جھونپڑے سے باہر نکل گئے۔ اندر رینا اور شوکی رہ گئے۔رینا نے ایک آزردہ سی تھکی تھکی سانس خارج کی اور دوسرے گوشے کی طرف بڑھ گئی۔شوکی چند لمحے وہیں کھڑا کچھ سوچتا رہا اس کے بعد غیر اختیاری طور پر اس کے قدم بھی اسی طرف کو اٹھتے چلے گئے۔

یہاں آکر وہ چونکا۔رینا ایک طرف کونے میں فرشی نشست پر پاؤں سکیڑے سر جھکائے بیٹھی تھی۔اس کا چہرہ جھکا ہوا تھا اور سنہری بال اس کے شانوں اور چہرے پر جھول رہے تھے۔شوکی کا دل بے قرار سا ہو گیا۔وہ متفکر چہرے کے ساتھ اس کی جانب بڑھا اور اس کے سامنے، قریب بیٹھ گیا۔پھر اس نے اپنے ایک ہاتھ سے بہت آہستگی کے ساتھ رینا کے جھکے ہوئے سر پر جھولتے سنہری بالوں کو الٹا۔دیکھا، رینا کا حسین چہرہ آبدیدہ ہو رہا تھا۔اس نے اس کی سبک ٹھوڑی کو ایک ہاتھ سے ذرا اوپر کیا اور مرتعش سے لہجے میں ہولے سے بولا۔

"تم رو رہی ہو رینا؟"

"اور کیا کروں پھر......؟" وہ بے اختیار سسک کر بولی۔اس نے چہرہ اٹھا کر اشکبار سی نیلی آنکھوں کے ساتھ شوکی کی طرف بھی دیکھا۔اس کے روتے چہرے اور دکھی لہجے نے شوکی کا دل چیر کر رکھ دیا۔

"پہلے مجھے صرف رابرٹ سے ڈر تھا مگر......مگر اب تم سے بھی خوف آنے لگا ہے مجھے شوکی!"

"کیا......؟ مجھ سے......؟ مگر......" شوکی پریشان ہو گیا۔

"ہاں، شوکی!" رینا رقت بھرے لہجے میں بولی۔"رابرٹ کی عادت کا تو تمہیں پتا ہی ہے، وہ تو ہے ہی ایسا، مگر تم بھی...... مجھے ڈر لگتا ہے کہیں تم دونوں کی لڑائی کسی دن ہم سب کے لیے نقصان کا سبب نہ بن جائے۔"

اس کی بات سن کر شوکی نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے پھر بڑی ملائمت آمیزی رسانیت سے بولا۔

"رینا! میں یہ سب سمجھتا ہوں، اسی لیے میں چپ رہتا تھا مگر شاید میری خاموشی کو رابرٹ کمزوری سمجھے ہوئے ہے۔اسی لیے وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا۔"

"تمہاری بات بھی غلط نہیں ہے لیکن شوکی! رابرٹ کی ان حرکتوں کی وجہ سے مجھے بھی تشویش ہوتی ہے مگر میں اس کا بہترین حل یہی سمجھتی ہوں کہ اس کے منہ ہی نہ لگا جائے۔" رینا نے سنبھالا لیتے ہوئے کہا، ساتھ ہی وہ اپنے ایک ہاتھ کی انگلیوں سے آنسو پونچھنے لگی۔

ایسے میں شوکی کو بے اختیار اس پر پیار آگیا۔اس نے رینا کا نازک ہاتھ تھام لیا اور اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔رینا بھی محبت سے اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دی۔

باہر گارشیا اپنے بھائی رابرٹ کو سمجھا رہی تھی۔

"خود پر کنٹرول کرو اب! ایسا نہ ہو کہ رینا تنگ آکر ہمیں جانے پر مجبور کر دے پھر ہم کیا کریں گے؟ ہمارے مفادات دھرے رہ جائیں گے۔"

"کوشش تو میں بہت کرتا ہوں سسٹر! لیکن یہ شوکی

میرے اعصاب پر سوار رہتا ہے۔ تو کر ہو کر دیکھو کس قدر اکڑ کر رہتا ہے۔ رینا نے ہی اسے سر چڑھا رکھا ہے۔“ رابرٹ نے زچ ہو کر کہا تو گارشیا مکاری سے بولی۔

”اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ تھوڑا برداشت سے کام لو۔ بہت جلد میں ان دونوں کو ایک دوسرے سے دور کردوں گی، لیکن تمہاری حرکتوں کے باعث وہ ایک دوسرے کے دم دلاسے پر پھر نزدیک ہونے لگے ہیں۔“

”کیسے دور ہوں گے یہ دونوں؟ راج محل سے تو ہمارا کوئی تعلق نہیں رہا۔ راج کمار، رینا کی تلاش میں یہاں کی خاک چھاننے کے لیے تو نہیں آسکتا۔“

”آسکتا ہے، میں نے اس کی آنکھوں میں رینا کے لیے محبت کے جلتے چراغ بھانپ لیے ہیں۔“ گارشیا نے گہرے لہجے میں کہا۔ ”وہ رینا کو چاہنے لگا ہے۔ تم دیکھتے جاؤ، ابھی تو ہمیں یہاں ٹھہرنے کا مستقل ٹھکانا مل چکا ہے۔ رینا کو اپنا کام کرنے دو، میں اب اپنا کام کروں گی۔“

”تم کیا کرو گی؟“

”میں کچھ روز میں راج محل جاؤں گی اور راج کمار سے ملوں گی۔“

”میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔ مجھے سونجا کو پھانسنا ہے۔“

دونوں باتیں کرتے ہوئے بستی کی حدود سے باہر آگئے تھے۔ موسم اچھا تھا۔ اچانک انہیں کسی گھوڑے کی ہنہنانے کی آواز سنائی دی۔ وہ چونک پڑے۔ انہیں سامنے ایک گھڑسوار آتا دکھائی دیا۔

یہ پرتاب کمار تھا۔ دونوں نہیں جانتے تھے کہ پرتاب کمار اب ریاست نا گرہ کا راجا بن چکا تھا۔

راجا پرتاب کمار حسبِ سابق رینا کی تلاش میں عام آدمی کا بھیس بھر کر نکلا تھا۔ وہ بھی ان دونوں کو پہچان گیا تھا۔ ان کے قریب پہنچ کر وہ گھوڑے سے نیچے اتر آیا۔

رابرٹ اور گارشیا...... چونک پڑے۔ وہ اسے پہچان تو نہیں پائے تھے تاہم اتنا اندازہ ضرور لگا سکتے تھے کہ اس گھڑسوار کا تعلق راج محل سے ہی ہوگا۔

گارشیا کسی حد تک ٹھیک سمجھی تھی کہ یہ پرتاب کمار کا ہی آدمی ہوگا جو رینا کی تلاش میں آیا تھا۔

راجا پرتاب کمار گھوڑے سے نیچے اتر آیا اور اس نے اپنے چہرے سے چادر کا ڈھاٹا اتار دیا۔ گارشیا اور رابرٹ، پرتاب کو دیکھ کر بری طرح چونک گئے اور پھر دوسرے ہی لمحے مکار گارشیا مسرت تلے انداز میں چہکتی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔

”پرتاب صاحب! آپ...... بہت خوشی ہو رہی ہے مجھے آپ کو دوبارہ دیکھ کر۔“

”شکر ہے بھگوان کا کہ آپ لوگوں کا ہم سے دل صاف ہے ورنہ آپ ہمیں دیکھ کر اس قدر خوش نہ ہوتیں۔“ راجا پرتاب کمار نے مسکرا کر کہا اور قریب کھڑے رابرٹ کی طرف دیکھا۔

”کیا تم ناراض ہو ہم سے......؟“ اسی وقت گارشیا نے بھائی کی طرف دیکھا اور تیز اور ”متنبہ“ نظروں سے اسے گھورا تو وہ جلدی سے اپنے چہرے پر خیر مقدمی مسکراہٹ سجائے آگے بڑھ کر پرتاب سے ملا۔

”ہمارا دل بھلا کیوں خراب ہوگا آپ سے جناب؟ لیکن سمجھ نہیں آیا کہ آپ یہ روپ دھار کر یہاں کیسے؟“

”رینا کہاں ہے؟ تمہیں معلوم ہے نا کہ ہم نے تمہاری مدد کرنے کا وعدہ کر رکھا تھا۔“ پرتاب کمار نے اپنے اندر کی بے قراری پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

”وہ بھی ادھر ہی ہے۔“ گارشیا نے جلدی سے جواب دیا۔ ”آپ آیئے ہمارے ساتھ، وہ بھی یقیناً آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوگی۔ بہت یاد کرتی تھی آپ کو، تعریف بھی کیا کرتی تھی کہ راج محل میں ایک آپ ہی تھے جنہوں نے ہماری مدد کی تھی۔“

وہ خوب مرچ مسالا لگا کر بڑی مکاری سے جھوٹ بولے جا رہی تھی۔ پرتاب کو حیرت بھی ہوئی تھی اور خوشی بھی، تاہم وہ خجل سی مسکراہٹ سے بولا۔

”یہ ان کا بڑا پن ہے، میں تو ان کی کوئی مدد ہی نہیں کرسکا تھا جس کا مجھے آج تک افسوس ہے۔“

یہ سب اسی طرح باتیں کرتے ہوئے پیدل چلتے ہوئے جھونپڑے کے قریب جا پہنچے۔

”رینا......! باہر آؤ...... دیکھو تو کون آیا ہے۔“ گارشیا نے جھونپڑے کے دروازے سے ہی ہانک لگائی۔ اندر رینا اور شوکی موجود تھے۔ اس کی آواز سن کر باہر آگئے۔ رینا اپنے جھونپڑے کے دروازے پر پرتاب کمار کو دیکھ کر پہلے تو ششدر رہ گئی۔ چند ثانیوں تک تو اس سے بولا نہیں گیا۔ شوکی بھی پرتاب کمار کو یہاں دیکھ کر حیران سا ہوا تھا۔ گارشیا اور رابرٹ کی تیز نظریں بیک وقت رینا اور پرتاب کمار پر جم گئی تھیں۔

رینا کو دیکھ کر پرتاب کمار کا دل بے طرح دھڑکنے لگا تھا۔

”آآ...... آپ...... یہاں......!“ رینا کے نرم و

گداز لبوں سے کپکپاتے ہوئے الفاظ برآمد ہوئے۔

”آپ شاید ہمیں بھول گئی تھیں مگر ہم آپ کو نہیں بھولے۔ آپ کی تلاش میں جنگلوں کی خاک چھانتے ہوئے یہاں تک چلے آئے۔“ پرتاب کمار نے محبت پاش نظروں سے رینا کے چہرے کو تکتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں آپوں آپ لہک سی عود کر آئی تھی۔ یہ شاید رینا کی کامیاب تلاش کا ثمر تھا۔ اس کے لب و لہجے اور آنکھوں کی چمک سے ایک تڑپ سی چھپی ہوئی صاف محسوس ہوتی تھی۔

رینا کے رخساروں پر شفق رنگ پھوٹے تھے، تھرتھراتے لبوں کی مسکان بھری سرخی کچھ اور گہری ہوئی تھی۔ کشادہ نیلی آنکھوں میں کچھ عجیب سے نامعلوم جذبوں کی امنگ مچلی تھی۔

گارشیا بڑی مکارانہ نگاہوں سے کبھی رینا اور کبھی پرتاب کمار کو دیکھے جا رہی تھی۔ آخر میں اس کی نگاہوں نے رینا کے ساتھ کھڑے شوکی کے چہرے کا بھی خصوصی جائزہ لیا تھا اور اس کی گھاگ اور بھانپتی ہوئی نگاہوں نے شوکی کے چہرے کے چڑھتے اترتے تاثرات کو فوراً ہی تاڑ لیا تھا کہ اسے پرتاب کمار کا اس بے باکانہ انداز سے مخاطب ہونا بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

یوں شوکی کو بھی آج پرتاب کمار ایک ریاست کا ولی عہد نہیں بلکہ کوئی بنجارہ قسم کا عاشق ہی محسوس ہو رہا تھا۔

ادھر رینا کی یہ حالت تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

شوکی اب پرتاب کمار کو چھوڑ کر خاموش نظروں سے رینا کی کیفیات کا جائزہ لینے لگا۔ ممکن تھا کہ وہ پرتاب کمار کے مرتبے اور اسے اچانک یہاں دیکھ کر بوکھلا سی گئی تھی۔

”مم...... میں اب آپ کو کہاں بیٹھنے کے لیے کہوں؟ یہ جگہ تو آپ کے شایانِ شان بالکل بھی نہیں۔“ رینا کے نرم لب متحرک ہوئے۔

”آپ بھی تو یہاں ہیں، تو پھر ہمیں یہاں کیوں عار ہوگا؟“ پرتاب کمار اسی طرح مسکراتی اور گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ وہ اپنی اس اچانک بدلتی ہوئی دلی کیفیات پر خود بھی حیران تھا۔ یقیناً یہ اس کے اندر چھپی ہوئی تڑپ کا ہی تو شاخسانہ تھا، جس کے سبب وہ یوں رینا کے سامنے بے اختیار ہو گیا تھا۔

”تت...... تو پھر آپ اندر تشریف لے آئیں......“ کہتے ہوئے رینا نے اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔

”ضرور......“ راجا پرتاب کمار نے کہا اور سر جھکائے اندر داخل ہو گیا۔

”ہمیں افسوس ہوا کہ یہ جگہ آپ کے شایانِ شان نہیں مگر اب آپ یہاں نہیں رہیں گی۔“

ایک جگہ کھڑے رہ کر پرتاب کمار نے اس جھونپڑے کے در و دیوار کا بغور جائزہ لیتے ہوئے رینا سے کہا۔

گھاس کی ایک دیوار کی جانب لکڑی کی بنچیں سی رکھی ہوئی تھیں۔ یوں تو جھونپڑا کشادہ تھا۔ کھال اور پھوس کی فرشی نشست کا بھی انتظام تھا۔

”آپ کا مطلب ہے، آپ ہمیں واپس راج محل لے جانا چاہتے ہیں؟“ اچانک رابرٹ نے مسرت بھری سی حیرت سے پوچھا۔

”اگر ایسا ہے تو ہم آپ کے بے حد شکر گزار ہوں گے راج کمار صاحب!“ گارشیا نے بھی خوش ہوتے ہوئے کہا۔

”ہم اب راج کمار نہیں، ریاست کے راجا ہیں۔“ پرتاب کمار نے بھاری لہجے میں جیسے ان کے سامنے ایک چونکا دینے والا انکشاف کیا۔ ”بدقسمتی سے ہمارے پتا جی کا دیہانت ہو چکا۔ انہیں کسی مورکھ نے زہر دے کر مار ڈالا ہے۔“ اپنے مرے ہوئے باپ کا ذکر کرتے ہوئے پرتاب کمار کا لہجہ غم سے بوجھل ہو گیا تھا۔

وہاں کھڑے سب اس خبر پر چونک پڑے اور پرتاب ...... سے اس اندوہناک حادثے اور مہاراجا چندر گپتا کے مرنے کا افسوس کیا۔

”جو بھگوان کو منظور...... اب آپ کیا کہتے ہیں؟“ راجا پرتاب نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے پوچھا۔ مخاطب رینا ہی تھی۔

رینا خاموش سی ہو گئی۔ شوکی کی نظریں رینا کے...... پرسوچ چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور دل بے چین سا ہو رہا تھا۔ کیونکہ اس کی بالکل بھی یہ مرضی نہ تھی کہ وہ دوبارہ راج محل کا رخ کرتے، کم از کم اس صورت...... حال میں تو بالکل بھی نہیں۔

”ہمیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے یور ہائنس!“ رابرٹ چالاکی سے بولا۔

”ہاں...... ہاں! ہمیں کوئی اعتراض نہیں اور بھلا رینا کو بھی کیونکر ہوگا؟“ گارشیا نے کہتے ہوئے رینا کی طرف دیکھ کر مرضی چاہی۔ ”تمہارا کیا خیال ہے رینا؟“

”میرے لیے اب شاید یہ مشکل ہی ہوگا۔“ رینا نے سر جھکا کر ہولے سے جواب دیا۔ ”کیونکہ وہاں ہماری موجودگی کو کوئی بھی برداشت نہیں کرے گا۔ پھر ہماری وجہ سے آپ کو بھی پریشانی......“

''ہرگز نہیں۔'' راجا پرتاب کمار نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''اب ہم وہاں کے راجا ہیں۔ کس میں جرأت ہوگی کہ وہاں کوئی تم پر انگلی بھی اٹھائے۔''

شوکی نے پہلی بار لب کشائی کی اور جرأت کر کے راجا پرتاب کمار سے بولا۔

''یور ہائنس! ہم آپ کے جذبے کی قدر کرتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ ایک بار جس تذلیل کے ساتھ ہمیں راج محل سے بے دخل کیا گیا، اب دوبارہ وہاں قدم رکھنے کا ہمارا کیسے دل چاہے گا۔''

اس کی بات سن کر گارشیا نے تو ناگواری سے اپنا سر جھٹکا البتہ کینہ پرور رابرٹ چپ نہ رہ سکا، وہ حسب سابق انتہائی حقارت سے شوکی کی طرف دیکھ کر بولا۔

''تم ایک نوکر ہو اور نوکروں کو مالکوں کے درمیان بولنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ راجا پرتاب کمار صاحب جو فرما رہے ہیں وہ غلط نہیں ہے، کیونکہ ہماری راج محل سے بے دخلی میں ان کا کوئی قصور نہ تھا۔''

شوکی کو رابرٹ پر پھر طیش آنے لگا۔ اس نے کچھ سخت کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا مگر پھر رینا کی نصیحت یاد کر کے خون کے گھونٹ بھر کے رہ گیا۔

رینا نے فوراً بات بدلی اور راجا پرتاب کمار سے مخاطب ہو کر کہا۔

''درحقیقت اب بات اور ہو چکی ہے۔ میں اپنے پاپا کے مشن کے بالکل نزدیک پہنچ چکی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے رینا نے راجا پرتاب کمار کو راکاشی بستی سے متعلق ساری باتوں سے بالتفصیل آگاہ کر دیا۔

''اب یہ لوگ مجھے اپنا نجات دہندہ سمجھے ہوئے ہیں۔'' رینا نے آخر میں کہا۔ ''اور میں نے بھی ان کی مدد کرنے کا حتمی فیصلہ کر لیا ہے۔ ہاں! اس سلسلے میں اگر ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت پڑی تو آپ کو زحمت ضرور دیں گے۔''

رینا کے جواب پر پرتاب کمار کا چہرہ بجھ سا گیا۔ وہ رینا کے چہرے سے اس کے مقصد کی برآری کا جذبہ اور عزم کی پختگی کی جھلک نمایاں طور پر دیکھ رہا تھا۔ کچھ ثانیے سوچتے رہنے کے بعد بولا۔

''ٹھیک ہے، ہم آپ کے ساتھ زبردستی تو نہیں کر سکتے، یہ مدد والی بات ہمارے لیے اعزاز کا درجہ ضرور رکھتی ہے اور ہم بھی اپنے وعدے پر قائم رہیں گے۔ لیکن ایک بات آپ کو ہماری بھی ماننا ہوگی۔''

''جی ضرور...... فرمایئے؟'' رینا نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا تو راجا پرتاب ایک نظر جھونپڑے کے تنگ و تاریک سے در و دیوار کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''ہم اس جھونپڑے کی جگہ...... آپ کے لیے پختہ اینٹوں کا ایک خوبصورت مکان بنوا کر دیں گے۔ جہاں زندگی کی ہر سہولت نوکر چاکر سب مہیا کریں گے۔''

''یہ مناسب نہ ہوگا یور ہائنس!'' رینا نے فوراً کہا۔ اب اس کے چہرے پر سنجیدگی کھنڈ آئی تھی۔ ''میں یہاں ان معذور اور بیمار لوگوں کے بیچ ایسی واضح تفریق کو برداشت نہیں کر سکوں گی۔ آپ اب ریاست کے ان داتا ہیں، ولی ہیں۔ اگر آپ میرے لیے کچھ کرنا ہی چاہتے ہیں تو میرے مقتول پاپا پروفیسر ہنری برنارڈ...... کے قاتلوں کو قرار واقعی سزا دلوا کر انصاف کریں۔ اس سلسلے میں، میں آپ کی تہ دل سے شکر گزار رہوں گی۔''

رینا کی بات سن کر راجا پرتاب کمار کے چہرے پر ایک کے بعد دوسرا رنگ آتا جاتا رہا۔ رینا نے اسے کالی کے مندر کی اصلیت اور اپنے باپ کی ڈائری کے حوالے سے سب باتیں بتا ڈالی تھیں کہ کالی کے مندر کا مہا پجاری بدری ناتھ در پردہ کس قسم کی سیاہ کاریوں اور جادو ٹونے میں مشغول ہے۔

پرتاب کمار چند ثانیے کچھ سوچتا رہا۔ اس کے بعد وہ خاموشی سے واپس لوٹ گیا۔

☆☆☆

تریپال پور میں علی ریحان کو آج دوسرا روز تھا۔ پری محل میں اس کی خوب آؤ بھگت کی جا رہی تھی۔ وہ نواب صاحب کا انتہائی قابل احترام اور معزز مہمان گردانا جا رہا تھا۔

اس نے نواب شہباز خان سے سب کچھ اور بلا کم و کاست گوش گزار کر ڈالا تھا۔ فرنگی سامراج کی غاصبانہ سازش سے لے کر ان کا ریاست ناگرہ کے مہاراجا چندر گپتا سے گٹھ جوڑ اور سب سے آخر میں خاور حیات نامی اس بدنصیب آدمی کا وہ پراسرار پیغام جو نامانوس سی زبان میں لکھا تھا، وہ پیغام بھی اس نے نواب صاحب کے حوالے کر دیا تھا۔

اس کے بعد اس نے انسپکٹر منظور اور سراج خان سے متعلق بتایا کہ کس طرح یہ پولیس افسر اسے زبردستی گھیر کر سراج خان کے پاس لے گیا تھا اور اس کے بارے میں کیا بتایا تھا۔ اس کے علاوہ راستے میں راہزنوں کے جس ٹولے نے ان پر حملہ کیا تھا، اسے پکا یقین تھا کہ وہ بھی سراج خان کے آدمی تھے اور جو ان کا سرغنہ زخمی ہوا تھا، وہ بھی۔

تاہم علی ریحان کے لیے بھی یہاں ایک چونکا دینے والی اطلاع پہلے سے موجود تھی، یعنی ریاست ناگرہ کے مہاراجا چندر گپتا کا اچانک انتقال۔

کیونکہ...... وہ کوئی عام نہ تھا۔ اس لیے اس کے انتقال کی خبر جنگل کی آگ کی طرح چار دانگ پھیل گئی تھی۔

بہرکیف...... ان بتائی ہوئی ساری باتوں سے قطع نظر نواب شہباز خان نے سب سے پہلے کھڑے ہو کر علی ریحان کو اپنے گلے سے لگایا تھا اور نہایت متاثر کن لہجے میں اس سے بولے تھے۔

''نوجوان! تم ایک بہادر اور سچے مسلمان ہو۔ تم نے اللہ کے حکم اور اس کے نام سے جو نیک عہد اپنے دل میں باندھا تھا بلاشبہ اسے تم نے پہاڑ جیسی صعوبتیں برداشت کرنے اور اپنی جان کو بھی خطرے میں ڈال کر نہایت ذمے داری سے پورا کر کے فرض شناسی اور وطن پرستی کی شاندار مثال قائم کی ہے۔ تمہارا یہ سارا کام ایک ایسا خزانہ ہے جس کا نعم البدل تو میرے پاس بھی نہیں۔''

''میرا سب سے بڑا انعام یہی ہے کہ میں نے جس کام کو پورا کرنے کا عزم کیا تھا، وہ اللہ کے فضل و کرم سے یہاں آ کر پورا ہوا۔'' علی نے مستحکم لہجے میں کہا۔ ''لیکن...... میں سراج خان کے متعلق ضرور جاننا چاہوں گا کہ کیا وہ واقعی آپ کے سگے بھائی ہیں؟ اور کیا خاور حیات نامی آدمی نے وہ پیغام مجھے آپ کو دینے کے لیے میرے حوالے کیا تھا، وہ سب کیا تھا؟''

نواب شہباز خان نے ایک گہرا ہنکارا بھرتے ہوئے علی ریحان کا کاندھا ہولے سے تھپتھپایا۔ اس کے بعد اپنی اونچی پشت گاہ والی کرسی پر براجمان ہو گئے۔

''برخوردار......! ہم اسے اپنی بدقسمتی ہی کہیں گے کہ سراج خان ہمارے ہی خاندان کا خون ہے۔ وہ ہمارا ہوتا سگا بھائی ہی ہے...... مگر بہت ہی کم ظرف، لالچی اور بے ضمیر انسان ہے۔ ہم نے تو اسی دن سے اس ناہنجار سے ہر قسم کا رابطہ توڑ ڈالا تھا، جب سے ہمیں یہ خبر ملی تھی کہ اس کے فرنگیوں کے ساتھ خفیہ روابط ہیں اور یہی نہیں وہ ان کی گیری بھی کرتا ہے۔

''ہم تو اسے ریاست سے ہی بے دخل کرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھے، مگر مجبوراً ایسا نہیں کر سکے۔ اس لیے کہ وہ...... قانونی طور پر ریاست کے ایک بڑے حصے کے مالک ہیں۔ وہ تھانہ انہی کے علاقے میں ہے۔ انسپکٹر منظور شاہ کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ تاہم ہم نے سراج خان کو سختی سے اپنے علاقے تک ہی محدود رہنے کا حکم دے رکھا ہے۔''

نواب شہباز خان اتنا کہہ کر خاموش ہوئے۔ علی ریحان اس پراسرار پیغام کی بھی حقیقت جاننے کے لیے بے چین تھا، لہٰذا ذرا جھجکتے ہوئے پوچھ ہی لیا۔

''کیا خاور حیات نامی وہ بدنصیب آدمی آپ ہی کا کوئی آدمی تھا نواب صاحب؟ میرا شاید اس پیغام سے کوئی تعلق تو نہیں بنتا، مگر یوں ہی تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر... اس کی حقیقت جاننے کی جسارت چاہتا ہوں۔''

''ضرور...... ضرور برخوردار! تم اس کا پورا حق رکھتے ہو۔'' نواب شہباز خان نے کھلے دل سے کہا۔ ''خاور حیات میرا ہی آدمی تھا اور وہ بدنصیب نہیں بلکہ خوش نصیب انسان تھا جس نے نیک مقصد کے لیے ملک و قوم کی خاطر اپنی جان دے کر شہادت کا درجہ حاصل کیا اور فرنگیوں کی ایک قبیح اور غلیظ سازش کو بے نقاب کر ڈالا۔ یوں تم نے بھی تو اس پیغام کی جان سے بڑھ کر حفاظت کی اور اسے اس رذیل پولیس افسر منظور اور سراج کے حوالے نہیں کیا۔ اس نیک مقصد میں تمہارا بھی پورا پورا حصہ ہے۔''

''وہ کیا پیغام تھا اور کس سلسلے میں تھا؟'' علی ریحان بے چین ہوا جا رہا تھا۔ ''کیا خاور حیات نے بھی میری ہی طرح فرنگیوں کی کوئی جنگی سازش کو بے نقاب کیا ہے؟''

''نہیں......'' نواب شہباز خان گمبھیر سے لہجے میں بولے تو علی ریحان کا تجسس مزید سوا ہو گیا۔

''تو پھر اس نے ایسی کون سی فرنگیوں کی سازش سے پردہ اٹھایا ہے؟''

''بہت جلد باز ہو...... برخوردار!'' نواب شہباز خان جانے کیوں اسرار بھرے انداز میں اس کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر بولے۔ علی ریحان کی بے چینی اب آسمان کو چھونے لگی تھی۔ تاہم وہ خاموش رہا اور نواب صاحب کے بولنے کا منتظر رہا۔

''یہ بہت اہم پیغام تھا برخوردار علی ریحان!'' بالآخر وہ بتانے لگے۔ ان کے باریش سے چہرے پر اب گہری سنجیدگی طاری ہو گئی تھی۔ علی کی یک ٹک نظریں ان کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

''فرنگی سامراج ہمیشہ سے ہی غاصب ذہنیت کا دغا باز اور چور فطرت رہا ہے۔ پہلے ہماری زمین پر چالاکی، مکاری اور دغابازی سے قابض ہوا، مگر اس پر بس نہ کیا تو اس نے ہماری دھرتی کے قیمتی اور تاریخی نوادرات، خزانے اور

بیش قیمت زروجواہر پر ہاتھ صاف کرنا شروع کردیا۔

"یہ کام اس قدر رازداری اور خاموشی سے کیا گیا کہ کسی کو بھی معلوم نہ ہوسکا، پتا تو تب چلا جب بمبئی اور مدراس کی بندرگاہوں سے چند مہینوں کے وقفوں سے دو بڑے بار بردار بحری جہازوں میں یہ لوٹا ہوا مال انگلستان لے جایا جا چکا تھا اور اب بھی یہ سلسلہ اسی شدومد کے ساتھ جاری ہے۔ ان میں مغل بادشاہوں کے تخت وتاج بھی تھے اور شاہان اودھ اور دکن کی سلطنت کا لوٹا ہوا بیش قیمت خزانہ بھی۔ یہ جہاز مہینوں سفر کے بعد اپنی منزل پر پہنچتے تھے۔ جو بحیرۂ عرب سے نکل کر مغربی افریقا کے ساحل کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے اور انگلستان جا پہنچتے۔

"ہمارے حریت پسند باغیوں نے اس سازش کو بے نقاب کیا اور ایسے چوری اور لوٹ کا مال لے جانے والے مال بردار جہازوں پر حملے کیے گئے تو یہ سلسلہ عارضی طور پر رک گیا۔ خاور حیات کا ایک پورا گروپ ہمارے جری ساتھیوں کا بھی تھا جو فرنگیوں کی ایسی کارروائیوں پر خفیہ نظر رکھتے تھے۔ خاور حیات نے ایک بار ان کی یہ کوشش ناکام بنائی تھی مگر افسوس اس بار وہ اور اس کے ساتھی ناکام ہوئے اور سب مارے گئے۔ خاور حیات نے "سی ہاک" نامی ایک بڑے مال بردار جہاز کا سراغ لگایا تھا جسے مدھرنا کی بندرگاہ سے ذرا دور خلیج کھمبات کی ساحلی پٹی کے قریب ایک ویران اور بے آباد جزیرے سے انگلستان روانہ کیا جانے والا ہے۔ اس گمنام جزیرے کی نشاندہی کے لیے اس کا کوڈ نیم "ٹریژر آئی لینڈ" رکھا گیا ہے۔ سی ہاک اس ویران جزیرے کے ساحل پر لنگر انداز ہے۔

"انگریز فوجیوں کی نگرانی میں اس جہاز پر ابھی تک چوری کیا گیا قیمتی ساز وسامان لادنے کا سلسلہ جاری ہے۔ یہ سو فٹ لمبا اور بہت مضبوط اور تیز رفتار جہاز ہے۔ سمندری ڈاکوؤں کا مقابلہ کرنے کے لیے اس میں بیس توپیں نصب کی گئی ہیں۔ یہ جہاز پہلے بھی انگلستان کا ایک چکر لگا چکا ہے۔ اب یہ اس کا دوسرا چکر ہے۔ اس جہاز میں کروڑوں روپے کا سونا، چاندی، ہیرے جواہرات، قیمتی تاج، لعل ویاقوت، کمخواب بڑے بڑے صندوقوں میں بھرے ہوئے ہیں۔

"اس جہاز میں انگریز اور پرتگالی ملازم بھرتی کیے گئے ہیں۔ یہ جہاز عنقریب روانہ ہونے والا ہے۔ اس جہاز کا سراغ لگانے اور اس پر ہلا بولنے پر خاور حیات اور اس کے گروپ کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ خاور حیات انگریز فوجیوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ ان ظالموں نے اس غریب پر بہت ظلم ڈھایا، مگر وہ کسی نہ کسی طرح زخمی حالت میں بچ بچا کر ان کے چنگل سے نکل بھاگنے میں کامیاب تو ہوگیا مگر اس بے چارے کی زندگی ہی اتنی تھی، خوش قسمتی سے تم اسے مل گئے اور یوں خاور حیات اور اس کے ساتھیوں کی قربانیوں کو تم نے ضائع ہونے سے بچالیا۔"

نواب شہباز خان اتنی صراحت بالتفصیل بتانے کے بعد خاموش ہوئے تو علی ریحان کی آنکھوں سے حیرت اور پرجوش سا مترشح ہونے لگا۔ اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ اس عظیم پیغام کو ٹھیک مقام پر اور ٹھیک آدمی تک پہنچانے میں کامیاب ہوا تھا۔

اس نے اپنے انہی جذبات کا اظہار نواب صاحب سے بھی بڑے جوش بھرے انداز میں کردیا اور اسی وقت اس کی نظریں غیر ارادی طور پر سامنے سے دائیں جانب والے ایک دریچے پر پڑی، جو دروازے کے بالکل قریب تھا۔ وہاں چلمن کے پیچھے سے اسے کسی کا سایہ سا متحرک ہوتا محسوس ہوا۔

میزبان کا گھر تھا اور وہ بھی نواب شہباز خان کا، اسی لیے وہ زیادہ دیر وہاں تاک جھانک نہ کرسکا۔ تاہم اسے شبہ سا ہوا تھا کہ کوئی پردے کے پیچھے کافی دیر سے کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا۔

"کون ہوسکتا ہے یہ......؟ کوئی نوکر......؟ یا پھر مکین مکاں......؟" اس کے ذہن میں سوال ابھرا۔

"برخوردار! پیغام پہنچنے کی اہمیت اپنی جگہ لیکن ہمیں اپنے جاں نثار ساتھیوں کی فرنگی فوجیوں کے ہاتھوں ہلاکت کا بھی بے حد دکھ ہے اور یہ تشویش وفکر بھی کہ اب خاور حیات جیسے وہ بہادر اور جری مجاہد دوبارہ کہاں سے لائے جائیں گے؟ میرا بس چلے تو میں اس فرنگی کرنل اینڈرسن کا خون پی جاؤں۔"

"کرنل اینڈرسن؟" علی سوالیہ انداز میں زیرلب بڑبڑایا۔

"ہاں! یہی وہ ذلیل فرنگی آفیسر ہے جس کے ذمے چوری کا مال پار لگانا ہے اور وہی اس کا نگران بھی ہے۔ اسی کم ذات نے خاور حیات کو اس حال تک پہنچایا تھا اور اس کے سارے ساتھیوں کو بے دردی سے ہلاک کرڈالا تھا۔" نواب شہباز نے پرجلال لہجے میں بتایا۔

"یہ ریاست مدھرنا کی ریزیڈینسی میں رہتا ہے۔ بے حد سفاک اور بے رحم انسان ہے۔"

علی کچھ سوچتا رہا اس کے بعد پوچھا۔ "کیا سی ہاک کو

سبوتاژ کرنے کے لیے آپ اب کوئی دوسرا ٹولا تیار کرنا چاہتے ہیں؟"

"یہی تو اصل پریشانی کی بات ہے۔" نواب صاحب بولے۔ "یہ ایک انتہائی خطرناک مہم ہے۔ تم اسی بات سے... اندازہ لگالو بیٹا کہ خاور حیات اور اس کا گروپ ایک نڈر اور انتہائی تربیت یافتہ لڑاکا اور گوریلا مجاہدوں پر مشتمل تھا، مگر کرنل اینڈرسن جیسے سفاک انسان اور اس کے خونی حواریوں کے نرغے میں آکر اپنا کیا حشر کر بیٹھا۔ اب ایسے بہادر مجاہدوں کو میں دوبارہ کدھر سے اکٹھا کروں؟ لگتا ہے ہم شاید اپنے اسلاف اور ان کے قیمتی نوادراتی خزانوں کو ان سفید فرنگی کتوں کے ہاتھوں کبھی بھی نہیں بچا پائیں گے۔"

نواب شہباز خان کے لہجے سے ہی نہیں چہرے سے بھی حد درجے مایوسی ہویدا تھی۔

"آپ اس مہم کی فکر نہ کریں نواب صاحب!" بالآخر علی ریحان نے مضبوط لہجے میں اور باعزم ہوکر کہا تو دونوں باپ بیٹا چونک کر اس کا چہرہ تکنے لگے۔ "آپ پہلے اس مسئلے کا حل تلاش کریں، جس کے لیے میں ناگرہ سے یہاں اپنی جان جوکھم میں ڈال کر آیا ہوں۔"

"تت......تو کیا تم اس مہم کا بیڑا اٹھاتے ہو؟ سی ہاک کو تباہ کردو گے؟ اور ......اور کرنل اینڈرسن کو بھی فنا کے گھاٹ......نن......نہیں......نہیں بیٹا! یہ بہت جان لیوا اور خطرناک مشن ہے۔" نواب شہباز نے نفی میں سر ہلادیا۔

"میں نے کہانا... جناب! آپ اس کی بالکل فکر مت کریں۔ میں اور میرے ساتھی انشاء اللہ اس مہم میں بھی کامیاب رہیں گے۔" علی نے مستحکم لہجے میں کہا۔ "کیونکہ میں اکیلا نہیں ہوں، فوج آزادی کے سپہ سالار جنرل شمیر خان کے ایک خاص کمانڈر کی حیثیت رکھتا ہوں۔ مجھے پہلے اپنے ریاست ناگرہ والے مشن کی رپورٹ دینی ہے جنرل صاحب کو......"

"کک......کیا......؟ تم جنرل شمیر خان کے مجاہد... ساتھی ہو؟ اوہ......میرے خدا......! مجھے اندازہ ہی نہیں ہے کہ میں کس بہادر شخص سے مخاطب ہوں۔" نواب شہباز خان فخر وانبساط تلے لرزتی ہوئی سی آواز میں بولے۔ اس کے بعد علی کے چہرے پر ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی کو دیکھتے ہی فوراً مقصد کی بات پر آگئے۔

"ہمیں فوراً پالن پور کے مہاراجا مہندر سنگھ سے رابطہ کرکے انہیں موجودہ خطرناک صورتِ حال اور فرنگیوں کے جنگی عزائم کے بارے میں مطلع کرنا ہوگا۔"

پولو

پولو چونکہ عوامی کھیل نہیں ہے اس لیے بہت کم لوگ اس کے بارے میں معلومات رکھتے ہیں۔ یہ دنیا کا قدیم ترین کھیل ہے جس کا میدان **600** میٹر لمبا اور **160** میٹر چوڑا ہوتا ہے۔ گول پوسٹ کی چوڑائی **24** فٹ اور بلندی تقریباً دس فٹ ہوتی ہے۔ گھوڑوں پر بیٹھ کر کھیلنے والے اس کھیل میں لمبی اسٹکس اور لکڑی کی بنی ہوئی گیند استعمال کرتے ہیں۔ پولو کا سب سے بڑا میدان پاکستان کے بارہ ہزار فٹ بلند شیندور پاس میں ہے۔ جہاں ہر سال پولو فیسٹیول 7 سے 9 جولائی تک علاقے کو رونق بخشتا ہے۔ اس میں نہ صرف پاکستان بلکہ یورپ سے بھی کافی سیاح شرکت کے لیے آتے ہیں۔ شیندور میلے میں عموماً گلگت اور چترال کی ٹیمیں فائنل میں پہنچتی ہیں اور مقابلہ دیکھنے کے لیے لوگوں کا جوش وخروش اسی طرح ہوتا ہے جس طرح پاکستان اور ہندوستان کی ٹیموں کے درمیان ہاکی یا کرکٹ میچ کے دوران ہوتا ہے۔ اس ہولناک اور منفرد کھیل میں بادشاہ قطب الدین ایبک بھی (جس کا مزار ایبک روڈ انارکلی لاہور میں ہے) پولو کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر کر موت کی آغوش میں چلا گیا تھا۔

ڈاکٹر منیر مرزا کے سفرنامے
پربتوں کا شیندور سے انتخاب

ٹارزن کے آخری الفاظ

ایک رائٹر دوسرے رائٹر سے۔
"ٹارزن کے آخری الفاظ کیا تھے......؟"

دوسرے رائٹر نے جواب دیا۔
"ٹارزن نے کہا تھا، درختوں کی جھولتی شاخوں پر گریس کس نے لگائی تھی۔"

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

''جی ابا حضور!'' اقبال بولا۔ ''نہ صرف یہ بلکہ جنگی تیاریوں کے لیے بھی اکسانا ہوگا اور فرنگیوں کے خلاف ایک مشترکہ جنگی حکمت عملی بھی تیار کرنا پڑے گی۔''

''لیکن سب سے پہلے ہمیں ایک اہم قدم بھی اٹھانا چاہیے۔'' علی ریحان نے خیال انگیز لہجے میں کہا۔

''وہ کیا......؟'' دونوں باپ بیٹے مستفسرانہ نظروں سے علی کا چہرہ تکنے لگے۔

''ہمیں مہاراجا مہندر سنگھ سے ملاقات سے پہلے ریاست ناگرہ کے نئے گدی نشین راجا پرتاب کمار کے نام ایک عدد خط روانہ کرنا ہوگا۔ پہلے اس فرنگی جنرل جان مائیکل اور ان کے جنگی عزائم کا چہرہ بے نقاب کرنا ہوگا۔ یہ بتانا ہوگا کہ ہم ان کی خفیہ جنگی سازشوں سے پوری طرح آگاہ ہو چکے ہیں لیکن اگر ہم پر جنگ مسلط کی گئی تو چوڑیاں ہم نے بھی نہیں پہنی ہوئی ہیں، اس جنگی جارحیت کا منہ توڑ جواب دیا جائے گا۔ فرنگی ہمیں آپس میں لڑوا کر صرف اپنے اقتدار کو کوہ شمالیہ تک طول دینا چاہتا ہے اور جو ان کا ساتھ دے گا وہ ان کی پیٹھ پیچھے بھی خنجر گھونپے گا۔ لہٰذا خیر سگالی کے طور پر تینوں ریاستوں کے مصاحب خاص کی جنرل میٹنگ کروائی جائے اور یہ بات حتمی طور پر واضح کی جائے کہ تینوں ریاستوں میں سے کوئی بھی فرنگیوں کا ساتھ نہیں دے گا۔''

''ہم آج ہی یہ پیغام اپنے قاصد کو دے کر ناگرہ روانہ کر دیتے ہیں۔''

علی ریحان کو اپنے دونوں ساتھیوں شاہ زمان اور اریبہ کی بھی فکر تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اب ان کا وہاں راج محل میں رہنا خطرے سے خالی نہ ہوگا۔ نواب شہباز خان سے اس سلسلے میں بات کی تو وہ بولے۔

''ان دونوں کا اب یوں بھی وہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔ انہوں نے جو کام وہاں راج محل میں رہ کر کرنا تھا وہ کر چکے، اب انہیں یہاں آجانا چاہیے۔''

''میں آپ کی بات سے متفق ہوں نواب صاحب!'' علی نے فوراً ان کی تائید میں کہا۔ ''میرا خیال ہے، مجھے خود ناگرہ پہنچ کر شاہ زمان اور اریبہ کو یہاں لانا ہوگا۔''

''تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں برخوردار! ہم اپنا ایک جاسوس وہاں روانہ کر دیتے ہیں، جو انہیں یہ پیغام پہنچا دے گا اور انہیں بحفاظت یہاں لے بھی آئے گا۔'' نواب شہباز نے کہا۔ علی کو یہ تجویز مناسب لگی۔ وہ خاموش ہوگیا۔

اسی دن نواب شہباز نے دو قاصد تیار کیے۔ ایک کو تو مذکورہ خط کے ساتھ ناگرہ روانہ کر دیا، جبکہ دوسرے قاصد کو مہاراجا مہندر سنگھ کے پاس پالن پور یہ پیغام دے کر بھیجا کہ فرنگی جنرل مائیکل شانا گرہ ریاست کے مہاراجا چندر گپتا کے ساتھ یہ گھناؤنی سازش بنائے ہوئے تھا، تاہم اب اس کا انتقال ہوگیا ہے اور اس کا بڑا بیٹا پرتاب کمار گدی نشین ہے، اب ان کے ساتھ فرنگی کیا معاملات طے کرنے والے ہیں اس کی خبر نہیں، تاہم ہمیں فرنگیوں کی اس سازش سے آگاہ ہو کر محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔

نواب شہباز نے اپنے پیغام میں یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ ایک خبرداری اور خیر سگالی کا پیغام ناگرہ بھی روانہ کر چکے ہیں اور نئے گدی نشین راجا پرتاب کمار کو مل بیٹھ کر گفتگو کرنے کی دعوت بھی دے چکے ہیں، وغیرہ۔

پالن پور کی ریاست زیادہ دور نہ تھی۔ مہاراجا مہندر سنگھ کا اسی روز جواب آگیا اور اس نے نواب شہباز خان سے دوستی کا ہاتھ پہلے سے بھی زیادہ مضبوطی کے ساتھ تھامتے ہوئے یہی کہا کہ وہ فرنگیوں کی سازشوں کو کچلنے کے لیے پہلے بھی اس کے ساتھ تھا اور اب بھی ہے۔ لہٰذا ہماری طرف سے ناگرہ کے راجا کو یہ چتاؤنی دے ڈالو کہ اگر ناگرہ کے راجا نے فرنگیوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے کوہ شمالیہ کا امن برباد کرنے کی کوشش کی تو انہیں منہ کی کھانی پڑے گی۔

جیسا کہ مذکور ہو چکا، پالن پور اور تریپال ایک دوسرے کے حلیف تھے۔ نواب شہباز مہاراجا مہندر سنگھ کا یہ جوابی پیغام پڑھ کر مطمئن ہوگیا۔ اب اسے ناگرہ کے راجا پرتاب کمار کے پیغام کا بے چینی سے انتظار تھا۔

☆☆☆

اریبہ اور شاہ زمان خوشی کے مارے گلے لگ گئے تھے۔ وہ یوں ایک دوسرے سے دیوانہ وار لپٹ گئے تھے جیسے برسوں کے بچھڑے ہوئے ہوں۔ حالانکہ اریبہ نے چند ہی ایام قید خانے میں بتائے تھے۔

''اریبہ...... جانِ جاناں! تمہیں دوبارہ پا کر جیسے میں نے ایک نئی زندگی پالی ہے۔ اب میں تمہیں خود سے بالکل بھی جدا نہیں ہونے دوں گا۔'' شاہ زمان بے اختیاری سے مغلوب ہو کر اریبہ کو خود میں پیوست کرتے ہوئے بولا۔ ''تم نہیں جانتیں کہ میں نے یہ صدیوں پر محیط گھڑیاں کس طرح تمہاری یاد میں گن گن کر گزاری ہیں۔ نہیں...... نہیں، اب میں تمہاری کوئی بات نہیں مانوں گا۔''

اریبہ کو اپنے محبوب کی اس بچوں جیسی بے قراری پر بے اختیار پیار آگیا۔ اس کے حنائی لبوں پر ہلکی سی محبت بھری

مسکراہٹ دمکی۔ چہرے کی گلناری پر ہزاروں چمن کے گلاب اور پھر وہ نہایت ہلکی آواز میں مدھر یاں ہوئی۔

''میرے محبوب! اس قدر مجھے چاہت مت دو کہ اگر کو پھر ہماری جدائی مقصود ہو تو ہم ایک دوسرے کے بغیر جی نہ سکیں۔'' کہتے ہوئے اریبہ نے ہولے سے خود کو شاہ زمان کی بانہوں کی بے قرار محبت بھری گرفت سے الگ کرنے کی ہلکی سی کوشش کی مگر شاہ زمان نے پھر اسے خود سے بھینچ لیا۔

''کیوں...... کیوں؟ ہم کیوں دوبارہ جدا ہوں گے؟ اللہ نہ کرے...... خوشی کے اس موقع پر ایسی باتیں تو مت کرو میری جان اریبہ!'' شاہ زمان پھر بے چین ہوگیا۔ گرفت اور مضبوط کرلی، جیسے کسی بچے کو ڈر ہو کہ اس کا من پسند کھلونا اس سے چھین نہ لیا جائے۔ تب پھر اریبہ نے بھی مزاحمت ترک کردی اور خود سپردگی میں رہتے ہوئے مدہوش لہجے میں بولی۔

''تمہاری اس وارفتہ محبت میں خود مجھے بھی کب اختیار رہا ہے میرے محبوب! مگر ہمیں اس نیک مقصد کو بھی مقدم جاننا ہوگا، ہاں! اپنی محبت سے بھی بڑھ کر...... جس کے لیے ہم نے صرف قبائے الفت ہی نہیں بلکہ کفن بھی سر سے باندھ رکھا ہے، اسی مقصد کے لیے ہمیں اپنی محبت کا ہی نہیں بلکہ جانوں کا بھی نذرانہ پیش کرنا پڑ جائے تو ہم پیچھے نہیں ہٹیں گے کرو وعدہ...... میرے ساتھ......''

اریبہ کی بات نے شاہ زمان کی بے خودی کو جھنجوڑ ڈالا اور اس نے ایک آہ سے مشابہ سرد سی سانس لے کر اریبہ کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔ اس کے چہرے پر ایک نامعلوم سی اداسی کی شام اتر آئی تھی۔ اس ہیت کذائی پر اریبہ نے شاہ زمان کا ہاتھ اپنے نرم و نازک ہاتھوں میں تھام لیا اور بولی۔

''شاہ زمان! محبت صرف جسموں کا نہیں بلکہ دو روحوں کے ملاپ کا نام ہے۔ ہم جسمانی طور پر جدا بھی ہو جائیں تو کیا ہماری روح ایک نہ ہوگی؟''

شاہ زمان کو محسوس ہوگیا کہ اریبہ کس قدر ''مضبوط'' عورت تھی اور وہ یہی مضبوطی اس کے اندر بھی دیکھنے کی خواہاں تھی۔

''اریبہ! یہ تو میرا مقصدِ حیات ہے کہ فرنگی غاصبوں کے خلاف میں ہر محاذ پر ڈٹا رہوں گا، کبھی پیچھے نہیں ہٹوں گا مگر تمہارے ساتھ رہتے ہوئے، تمہیں خود سے جدا کر کے کسی مہم کی نذر نہیں کروں گا۔'' شاہ زمان نے کہا۔

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسائل حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 900 روپے

امریکا کینیڈا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 10,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 9,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: ثمر عباس فون نمبر: 0301-2454188

سرکولیشن منیجر سید ندیم حسین 0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35804200-35804300

''ہرگز نہیں۔'' اریبہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''جب جب ایسی ضرورت پڑے گی، میں پیچھے نہیں ہٹوں گی شاہ زمان! اس لیے کہ نجانے کیا بات ہے میں خود کو بھی ایک مجاہدہ کے روپ میں سمجھنے لگی ہوں۔ اللہ نے چاہا تو غلامی کی اس رات کی وہ صبح سحر ضرور نمودار ہوگی جب ہم سب آزاد ہوں گے۔ آزادی کی فضا میں سانس لے رہے ہوں گے، تب...... ہاں! تب...... ہماری محبت بھی آزاد ہوگی، پھر تم ہوگے اور میں...... ہوں گی۔''

''بے شک...... بے شک......'' شاہ زمان کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

جب بے قراری اور جذبات کا طوفان تھما تو انہوں نے سنجیدگی سے آئندہ کے بارے میں غور کرنا شروع کر دیا۔ علی ریحان سے متعلق بھی باتیں ہوئیں اور اس کی کامیابی کے لیے بھی دونوں نے مل کر خدا کے حضور دعا مانگی۔

اریبہ کی رہائی کے بعد ان کی راج محل سے بے دخلی کا جو حکم نامہ عارضی طور پر ''معطل'' کیا گیا تھا، وہ دوبارہ جاری کر دیا گیا۔ ناچار دونوں کو راج محل چھوڑنا پڑا اور شام کے بعد رات کی اترتی سیاہی کا حصہ بن کر وہ اپنے مکان میں لوٹ آئے جو شمائل کی ملکیت تھا۔ وہاں اب یہ دونوں اپنے اصل روپ میں رہنے لگے۔ انہیں علی ریحان کی واپسی کا انتظار تھا۔ اس کے بعد ہی وہ اپنے آئندہ کا کوئی لائحہ عمل ترتیب دے سکتے تھے۔

شاہ زمان کا ایک خیال یہ بھی تھا کہ ان دونوں کو بھی فوراً ناگرہ سے نکل جانا چاہیے اور ترپال کی طرف کوچ کرنے میں ہی ان کی بھلائی ہے۔ کیونکہ راجا پرتاب نے تو اریبہ کو بے گناہ سمجھتے ہوئے رہا کر دیا تھا مگر فرنگی اریبہ کو نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ اگرچہ وہ دونوں اب اپنے اصل حلیے میں تھے، مگر ان کی ڈھنڈیا پڑ سکتی تھی۔

دونوں ابھی اس سلسلے میں غور کر رہے تھے اور دوسری جانب وہ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ راج محل میں متعین لیف بروجر کا نائب...... جان پارکر ان دونوں پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھا۔ جس وقت اریبہ کی رہائی اور بعد میں ان دونوں کو راج محل سے بے دخلی کا حکم نامہ ملا اور وہ دونوں یہاں سے کوچ کرنے لگے تو جان پارکر ان کے تعاقب میں لگ گیا تھا۔ جس وقت اریبہ اور شاہ زمان ...... فرنگیوں سے بے خبر شمائل کے مکان میں داخل ہو رہے تھے تو جان پارکر کی سوچتی ہوئی نظریں ان کا تب بھی تعاقب کر رہی تھیں۔

☆☆☆

اپنی بیٹی ماریا کے تذکرے پر کرنل اینڈرسن ... چونک پڑا تھا۔

شیو رائے بھولکر نے اسی وقت بچھورام کو ... سامنے پیش کر دیا۔ کرنل اینڈرسن ایک انتہائی گھا... شاطر آدمی تھا۔ جنگجوانہ فطرت کا مالک ایک سفاک ... رحم انسان تھا۔

ریاست مدھرنا میں اس نے بزورِ طاقت قبضہ ... کہ اس کا دھواں بھی نہیں اٹھ پایا تھا۔ یہی وہ سنگ دل ... تھا جس نے خاور حیات اور اس کے چند ساتھیوں ... دردی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

آج کل سرکارِ انگلشیہ نے اس کے ذمے بہت ... ذمے داری سونپ رکھی تھی جو خفیہ نوعیت کی تھی، اس کی ... قبیح حرکت نے اسے تاریخی راہزن بنا دیا تھا۔ جیسا کہ ... ہو اوہ پہلے بھی کامیابی کے ساتھ دو مرتبہ جہازوں ... ہندوستان کا نوادراتی خزانہ لوٹ کر انگلستان پہنچا چکا تھا اب تیسرے کی تیاری میں مصروف تھا اور جسے سبوتاژ کر... کے لیے مسلم باغیوں کا ایک چھاپا مار گروپ کرنل اینڈر... کے ہاتھوں بری طرح ناکامی سے دوچار ہو کر موت ... گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ لیکن اسی دوران میں اس کی ... ماریا جو شکار کی رسیا تھی، کوہ شمالیہ کی جانب ہردوار کے جنگلو... کی طرف روانہ ہوئی اور پھر لاپتا ہو گئی۔

''سی ہاک'' پر ان دنوں چوری کے مال کی آخری کھیپ لادی جانے والی تھی کہ یہ واقعہ پیش آ گیا۔

''تمہاری باتوں سے ہمیں صاف لگ رہا ہے کہ ... جس قدر حقیقت جانتے ہو، اس کے صرف نصف حصے ... ہمیں آگاہ کر رہے ہو۔ پوری حقیقت کیا ہے، وہ کیوں نہیں صاف صاف بتاتے ہمیں؟ چھپا کیوں رہے ہو؟''

بچھورام کے روبرو ہوتے ہی کرنل اینڈرسن نے اس کے چہرے کو برماتی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا تو بچھورام اس کی ذہنی چابک دستی پر لمحہ بھر کو حیران ہو گیا۔ بھولکر بھی وہاں موجود تھا۔ اس نے اگرچہ کرنل اینڈرسن کو بچھورام کی باتوں اور اس کے ''عزائم'' کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا۔

''سرکار......! میں کچھ بھی نہیں چھپا رہا ہوں۔'' بچھورام نے فوراً مکارانہ فروتنی سے کہا۔ ''اگر مجھے کچھ چھپانا ہوتا تو اس کا ذکر ہی کیوں کرتا۔ حقیقت یہی ہے کہ میں نے ابھی صرف اپنے ایک متوقع خدشے کا اظہار کیا ہے اور ساتھ ہی میں نے مہاشے بھولکر سے اس بات کا وعدہ بھی کیا ہے کہ میں یہاں سے ترنت جاتے ہی پہلے اپنے طور پر اس کا کھوج

...اں گا اور جیسے ہی مجھے یقین ہو گیا، میں آپ کو ترنت ... دے دوں گا۔''

بیٹی کا معاملہ تھا اسی لیے کرنل کچھ زیادہ مطمئن ہوتا نظر ... آ رہا تھا۔ مگر بھولکر نے فوراً اس سے کہا۔

''جناب، کرنل صاحب! میرا خیال ہے اس کی بات ... ہے، سراغ تو ہمیں مل ہی گیا ہے آپ کی بیٹی کا، لیکن ... اسے بھی پورا یقین نہیں ہے۔ قبل از وقت کوئی کارروائی ... اکاروں کو محتاط بھی کر سکتی ہے۔''

''مگر یہ ان کا نام بھی تو بتائے۔ کم از کم اس گروہ کو فوکس ... تو ضروری ہے۔'' کرنل نے بھولکر کی طرف دیکھ کر کہا۔

''آپ بالکل بھی اس کی چنتا نہ کریں سرکار! ان کا ... وہاں ٹھکانا پکا ہے، وہ وہاں سے کہیں نہیں جا سکتے۔'' بچھورام ... منہ سے غیر ارادی طور پر نکل گیا اور بعد میں اسے اپنی ... کا احساس بھی ہوا، مگر اب تیر نکل چکا تھا۔

''کون ہیں وہ؟ نام بتاؤ؟'' کرنل اینڈرسن نے گھور ... کر اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو بچھورام مسکین سی ... نظروں سے بھولکر کی طرف دیکھنے لگا تو اس نے دھیرے ... سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی، جیسے کہہ رہا ہو کہ اب چھپانے ... کوئی فائدہ نہیں۔

بچھورام سنبھل کر بتانے لگا۔

''سرکار! مجھے ابھی صرف شبہ ہے۔ ابھی کھوجنا ضروری ہے۔ راج محل کے عقب میں ایک جنگل ہے اور وہاں کالی کے مندر میں کچھ پجاری طویل عرصے سے ڈیرا ڈالے ہوئے ہیں۔ انہیں ریاست ناگرہ میں دھارمک پجاریوں کی حیثیت حاصل ہے، مگر کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہاں پوجا پاٹ کے نام پر کالے جادو کا عمل ہوتا ہے۔ اس کے لیے وہ کالی دیوی کے چرنوں میں خوبصورت لڑکیوں کی بھی قربانی کرتے ہیں۔ بس! اسی بنا پر مجھے شبہ ہوا تھا۔''

''یہ شبہ نہیں یقین ہے۔'' کرنل اینڈرسن ایک دم جوشِ غیظ تلے سرخ ہو کر بولا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ بھولکر اور بچھورام نے بھی ایک دم سے اپنی جگہیں چھوڑ دیں۔ بچھورام کو ڈر صرف یہ تھا کہ بات قبل از وقت نہ کھل جائے اور یہ انگریز کرنل بیٹی کی محبت کے جوش میں جلد بازی میں کوئی غلط قدم نہ اٹھا لے۔ وہ اس وقت کو کوسنے لگا جب اس نے بھولکر کو یہ بات بتائی تھی۔ اس نے ایسے ہی نہیں...... بظاہر اس غیر متعلق بات کو ہوا دی تھی، کیونکہ اب وہ ہی نہیں بلکہ نجو بائی بھی ریاست ناگرہ کی باگ عنان سنبھالنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ ان کا دل کالی کے مندر کے مہا پجاری بدری ناتھ سے خراب ہو چکا تھا۔

''جیسا آپ کا حکم سرکار......!'' بچھورام نے کرنل اینڈرسن کے سامنے فوراً ہاتھ جوڑ دیے۔ جبکہ اس کا بیان جاری تھا۔

''تمہیں بھی بچھورام یونہی کالی کے مندر کے پجاریوں پر شبہ نہیں ہوا ہوگا۔ تمہارا بھی ضرور ان سے کوئی خفیہ گٹھ جوڑ رہا ہوگا اور تم ان کے کالے رازوں سے اسی لیے واقف ہو۔''

کرنل اینڈرسن کی اس بات پر بچھورام کے چیچک سے چہرے پر خوف اور پریشانی کے آثار نمودار ہو گئے۔

''ی ی...... یہ آپ کیا فرما رہے ہیں سرکار......؟''

''نہیں، ہمارا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم ان سے ملے ہوئے ہو۔'' کرنل اینڈرسن نے اس کی طرف دیکھ کر ہلکی مسکراہٹ سے کہا اور چند قدم اس کی طرف بڑھا۔ بچھورام کی جان میں جان میں آئی۔ کرنل اینڈرسن نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''بے فکر رہو، ہم جوش میں آ کر کسی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتے۔ ہمارے کہنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ کہیں تم کسی دشمنی کی وجہ سے ایسا نہ کر رہے ہو۔''

''یہ سالا فرنگی آفیسر تو بڑا ہی زوردماغ ہے......'' بچھورام نے دل ہی دل میں کہا اور چہرے پر مکارانہ مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔

''سرکار! میں تو خود آپ کے پاس ایک مدد لینے اور فریاد کرنے آیا تھا۔''

''ہم سب جانتے ہیں۔'' کہتے ہوئے کرنل اینڈرسن دوبارہ اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔ یہ دونوں بھی اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے اور اس کے آگے بولنے کے بے چینی سے منتظر رہے۔

''مسٹر شیو رائے نے ہمیں سب بتا دیا ہے اور اس سلسلے میں ہم نے جنرل مائیکل شا سے ہی نہیں بلکہ گورنر ڈنی کا سٹوفر سے بھی بات کر لی ہے۔ تم نے بروقت ریاست ناگرہ کے اندرونی حالات سے ہمیں آگاہ کر کے اپنا کام اور بھی آسان کر لیا ہے۔'' ایک ذرا توقف کے بعد وہ آگے بولا۔

''کیونکہ ہم خود بھی نجو بائی کو ایک بار پھر ناگرہ کی مہارانی کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ بہت جلد ایک دستہ ناگرہ روانہ کیا جانے والا ہے۔''

کرنل اینڈرسن کی بات سن کر بچھورام کے مکروہ چہرے پر ایک دم مسرتوں کے ڈونگرے برسنے لگے۔

''بہت بہت شکریہ سرکار! ہم بھی آپ سے یہ وعدہ

کرتے ہیں کہ آپ کے وفادار رہیں گے، بس! ایک بار ناگرہ کی حکومت ہمیں مل جائے، ہم کٹھ پتلی بننے کو بھی تیار ہیں، بس ہماری گدی (کرسی) قائم رہے۔''

''ایسا ہی ہوگا۔'' کرنل اینڈرسن نے کہا اور پھر اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا۔ اسی وقت ایک سپاہی اندر داخل ہوا۔ اس نے کرنل اینڈرسن کو ایک ہنگامی میٹنگ کی اطلاع دی، جو دلی میں مائیکل شا کی رہائش گاہ پر ہونے والی تھی۔

کرنل اینڈرسن نے بچھورام کو روانہ کر دیا اور بھولکر کو اپنے ساتھ چلنے کا حکم دیا۔

☆☆☆

''اب کوہِ شالیہ کی جنگ ناگزیر ہوچکی ہے۔''

اس قلعہ بند رہائش کے ایک بلند چھت والے کمرے میں گول میز کے گرد وہ سب موجود تھے، جنہوں نے کچھ دن پہلے کوہ شالیہ پر چڑھائی کا عسکری منصوبہ بنایا تھا، آج اسے حتمی شکل دی جانے والی تھی۔ ان میں وہ وفد بھی شامل تھا جسے ناگرہ بھیجا گیا تھا۔ انہی کی زبانی رپورٹ اور ناگرہ کے نیا خانے سے موصول ہونے والے راجا پرتاب کمار کا خط ملنے کے بعد کوہ شالیہ پر بھی غاصبانہ قبضہ کرنے کے لیے برٹش آرمی کے اعلیٰ دماغ سر جوڑے بیٹھے تھے۔ ان میں کرنل اینڈرسن بھی شامل تھا۔

اس ہنگامی میٹنگ کا ایجنڈا ایک ہی تھا، یعنی جنگی جارحیت...... کیونکہ ان کے مطابق اب مذاکرات کا وقت گزر چکا تھا۔ راجا پرتاب کمار کے خط نے واضح کر دیا تھا کہ وہ...... ان کی (فرنگیوں کی) کسی ایسی جنگی جارحیت کا حصہ بننے کو بالکل بھی تیار نہیں ہوگا جس میں بلا جواز کسی ریاست پر چڑھائی کا ظالمانہ مقصد کارفرما ہو۔ بلکہ وہ عنقریب باقی دونوں ریاستوں، تریپال اور پالن پور سمیت گرد و پیش کی چھوٹی ریاستوں کو بھی متحد کریں گے تاکہ وہ کسی بھی بیرونی طاقتوں کی جارحیت کا منہ توڑ جواب دے سکیں۔

یہ گونجتی ہوئی آواز بریگیڈیئر ڈان کیورشم کی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ فطرتاً جنگی جنونی شخص تھا۔ بزور طاقت وہ دلوں میں نہیں بلکہ جسموں پر حکومت کرنے کا قائل تھا۔

''اس سے پہلے کہ راجا پرتاب دوسری ریاستوں کو ہمارے خلاف منظم کرے، ہمیں کوہ شالیہ پر چڑھائی کر دینی چاہیے۔''

''مسٹر ڈان بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں، میں ان کی تائید کرتا ہوں۔'' کرنل بلسٹر وڈ نے ہاتھ کھڑا کر کے کہا۔ میجر ڈی فارسٹ نے بھی تائید کی، مگر مائیکل شا، ہیگن کلارک اور روڈی اور کرنل اینڈرسن کا یہی مشورہ تھا کہ ابھی صرف کوہ شالیہ میں اپنے قدم جمانے کے لیے لیفٹیننٹ بروجر کے قتل، اس کے قاتل (اریبہ) کی غیر منصفانہ رہائی اور کرنل اینڈرسن کی بیٹی کا اغوا کا جواز بنا کے ناگرہ پر چڑھائی کی جائے، ایک تیسرا جواز جو تاج برطانیہ (ایسٹ انڈیا کمپنی، جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد اب پورا برصغیر تاج برطانیہ کے زیر تسلط آگیا تھا۔) کا معروف انصاف بھی کہلائے گا، یعنی راجا پرتاب کمار کا گدی پر غاصبانہ قبضہ، کیونکہ اس نے جلد سے جلد گدی نشین ہونے کے لیے خود اپنے باپ کا قتل کروا دیا اور اپنی سوتیلی ماں کو قید خانے میں پھنکوا دیا۔ یہ پروپیگنڈا مہم ہماری ناگرہ کے خلاف جارحیت کو ''اصولی'' ثابت کرنے کا پیش خیمہ بن سکتی ہے، وغیرہ۔

سب نے اس فیصلے پر صاد کیا تھا، کیونکہ تاج برطانیہ کی طرف سے اس کی ممانعت نہیں ہوسکتی تھی۔ اب فیصلہ یہی کیا گیا کہ تاج برطانیہ سے اجازت ملتے ہی ناگرہ پر حملہ کر کے ریاست کی باگ آنجہانی مہاراجا چندر گپتا کی بیوہ مہارانی نجو بائی کے حوالے کر دی جائے۔ یہ حکم تاج برطانیہ تلے غیر معینہ مدت تک ریاست ناگرہ پر لاگو رہے گا۔

اس نشست کے دو روز بعد ہی تاج برطانیہ کی طرف سے ریاست ناگرہ کے راجا پرتاب کمار کے خلاف جنگی بنیادوں پر کارروائی کرنے کا ''گرین سگنل'' مل گیا۔

اس کے اگلے روز ہی شیوارائے بھولکر، بچھورام کی کچھی سی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''جاؤ بچھورام ......! اب تم ناگرہ ریاست کا تخت سنبھالنے کی تیاری کرو۔ تمہارا خواب پورا ہونے والا ہے جب تم صرف ریاست ناگرہ کے ہی نہیں بلکہ پورے کوہ شالیہ کے مہاراجا کہلاؤ گے۔''

بچھورام خوشی خوشی یہ خبر سنانے کے لیے ناگرہ روانہ ہوگیا۔ وہ جانتا تھا کہ جب وہ یہ خوش خبری نجو بائی کو سنائے گا تو وہ کس قدر خوش ہوجائے گی اور اس کی ''تخلیہ گاہ'' کو بھی کس طرح نرم و گرم اور طرب انگیز بنا دے گی مگر...... وہ نہیں جانتا تھا کہ نجو بائی ایک کینہ پرور مادہ مکڑی...... کی طرح اسے ہڑپ کرنے کے لیے بے چین بیٹھی ہے۔ ایک خوفناک مکڑی صورت ...... جو اپنے قریب آنے والے نر مکڑے کو کبھی زندہ نہیں چھوڑتی ...... نشاط انگیز گھڑیاں بتانے کے بعد اسے اپنا لقمہ بنا دیتی ہے ...... لیکن کیوں......؟

یہ کربیہ انگیز حقیقت بچھورام بھی نہیں جانتا تھا......

(جاری ہے)

گمشدہ رشتوں کی تلاش اور محبتوں کا انوکھا انداز

تیسری قبر

شاہ زین رضوان

بعض اوقات ذرا سی غلطی عمر بھر کے پچھتاوے کا سبب بن جاتی ہے۔ اس نے بھی ذرا سی خطا کے بدلے جان گنوا دی مگر... اس کا سراغ لگانے والے نے بالآخر یہ معمّا حل کر ہی لیا کہ زندگی کے تعاقب میں چلنے والے کیسے موت کے غار میں قید ہوئے۔

اس عمارت پر نظر پڑتے ہی پولیس کانسٹیبل جارج کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ یہ کاٹیج اپنے نام جیسا خوب صورت نہیں ہے۔ اس کی کھڑکیاں بھی بوسیدہ ہوچکی تھیں۔ چھت کے ٹائل خستہ حالت میں تھے اور سامنے کے باغ کی گھاس بے ترتیب انداز میں بڑھ رہی تھی۔

یہ کاٹیج اس علاقے سے صرف چند گز کے فاصلے پر تھا جہاں سے لوگوں کا انخلا عمل میں لایا جارہا تھا اور وہ بھی ابھی



احکامات کی تعمیل کے لیے یہاں آیا تھا۔ اسے مکان میں رہائش پذیر خاتون کا نام معلوم تھا۔ دیگر معلومات پڑوسیوں نے بخوشی مہیا کر دی تھیں۔ اسے بتایا گیا کہ مس روز ایج ایک بوڑھی عورت ہے۔ تنہا ہے اور کسی سے نہیں ملتی جلتی۔ اس کا مکان ایک تنگ راستے پر واقع ہے جس کا اختتام اسی کاٹیج پر ہوتا ہے۔ پڑوسیوں کے کہنے کے مطابق وہ آدم بیزار ہے اور انسانوں کے علاوہ جانوروں سے بھی دور رہتی ہے۔ اسے کتے بلی یا پرندے پالنے کا بھی شوق نہیں۔

یہ بتانا مشکل تھا کہ پرم روز کاٹیج کتنا پرانا ہے لیکن یقیناً وہ اس ایٹمی بجلی گھر سے بہت پہلے وہاں موجود تھا جو سمندر کے کنارے سے دو میل کے فاصلے پر بنایا گیا تھا۔ جیکسن نے دور تک نگاہ دوڑائی۔ کھیت ویران پڑے ہوئے تھے اور سڑک کے دونوں طرف خودرو جھاڑیوں کی باڑ تھی۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ زمین برسوں سے ویران اور بنجر پڑی ہوئی ہے اور آئندہ بھی اس کے آباد ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

جیکسن لکڑی کے اس بوسیدہ گیٹ کے ساتھ کھڑا ہوا تھا جس نے مس کیج کے باغ کو باہر کی دنیا سے الگ کر رکھا تھا۔ اس نے کار کا دروازہ مقفل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کیونکہ اس ویران اور الگ تھلگ علاقے میں کسی چلتے پھرتے کار چور کی موجودگی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ چھ ہفتے پہلے تک وہ لندن کے بارونق علاقوں میں اس طرح کی وارداتوں سے نمٹتا رہا تھا لیکن اس دیہاتی علاقے کے حالات بالکل مختلف تھے۔

گیٹ کے قبضے زنگ آلود اور سالخوردہ تھے اور جیسے ہی اس نے گیٹ کھولنے کی کوشش کی، وہ زمین پر گر پڑا۔ یوں لگا جیسے کسی نے اسے گوند سے جوڑ رکھا تھا۔ وہ خلا سے گزر کر اندر آیا اور اس نے گیٹ کو واپس اپنی جگہ پر کھڑا کر دیا۔ لیکن اب وہ کسی شرابی کی طرح ٹیڑھے میڑھے زاویے سے کھڑا ہوا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ اسے بعد میں دیکھ لے گا۔ پہلے وہ کام کرے جس کے لیے وہ وہاں آیا تھا۔ مکان کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے اس کی نظر کھڑکیوں پر پڑے ہوئے سرمئی پردوں پر گئی اور وہ سوچنے لگا کہ کیا اس کی نگرانی کی جا رہی ہے؟

جہاں بھی گھنٹی کا بٹن ہوتا تھا، اس جگہ بجلی کے دو عدد تار ایک مستطیل پلاسٹک سے باہر لٹک رہے تھے۔ جس کا مطلب تھا کہ مکین کی توجہ حاصل کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ باہر لگے ہوئے زنگ آلود لیٹر بکس کو کھڑکھڑایا جائے۔

بیرونی دروازہ جس کا نیلا رنگ اتر چکا تھا، دیکھنے میں انتہائی بوسیدہ لگ رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر اسے ٹھوکر ماری گئی تو وہ نیچے گر پڑے گا۔ اس بوڑھی عورت کے حفاظتی انتظامات انتہائی ناقص تھے۔

اس نے لیٹر بکس کو گرنے سے پہلے ہی پکڑ لیا اور ... آواز میں بولا۔ ”مس کیج! کیا تم سن رہی ہو؟ میں پولیس کانسٹیبل ہوں۔ مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“

اس نے کچھ دیر انتظار کیا اور کان لگا کر سننے کی ... کی پھر اس نے دوبارہ دروازے پر دستک دی جس کا ... دھندلا چکا تھا۔ دو منٹ بعد اس نے کسی کو ڈیوڑھی میں ... کرتے دیکھا تو اسے قدرے اطمینان ہوا۔ اس نے ... تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

”ہیلو مس کیج! میرا نام جیکسن ہے۔ کیا تم دروازہ کھول سکتی ہو؟“

وہ سایہ نزدیک آ کر دروازے کے پیچھے رک گیا ... نے دھندلے شیشے سے دیکھا تو اسے ایک غیر واضح ... ہوئی شکل نظر آئی جیسے کوئی تجریدی تصویر ساکت ہو گئی ہو۔

”براہ مہربانی دروازہ کھولو۔ پریشانی کی کوئی ... نہیں ہے۔“ اس نے جھوٹ بولا۔ اگر بات بگڑ گئی تو ... حال بہت پریشان کن ہو جائے گی اور اس خبر کا چرچا ... تک رہے گا۔

اس سائے نے دروازہ کھولنے کے لیے کوئی ... نہیں بلکہ جیکسن نے اس کی مدھم اور کمزور آواز سنی ... زور سے بولنے کی عادی نہ ہو۔ ”مجھے معلوم تھا کہ تم ... گے۔“ اس نے کہا اور دروازہ تھوڑا سا کھول دیا۔

☆☆☆

روز ایج شیشے کے پیچھے اسے دیکھ سکتی تھی۔ وہ ... تھی کہ وہ اس سے ملنے آئے گا۔ کار کی آواز سن کر اس ... کھڑکی پر لگے ہوئے لیس کے پردے کو ہٹا کر باہر جھانکا ... وہ اس کے تصور سے زیادہ لمبا اور عمر رسیدہ تھا۔ اس ... ہمیشہ اسے بچہ یا نوجوان سمجھا۔ جو کسی جنگ میں حصہ لینے ... گیا تھا لیکن اس کی یادوں میں ہمیشہ زندہ رہا۔

یہ شخص چالیس کے پیٹے میں تھا اور اس کے کھچڑی ... بال اتنے چھوٹے تھے کہ وہ تقریباً گنجا نظر آتا تھا۔ وہ ... بھی تھا اور اس کی توند نکلی ہوئی تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ یہ ... ہے۔ اس کے چہرے میں کسی کی مشابہت نظر آ گئی۔ اس ... نقوش اسے جانے پہچانے لگے۔ وہ دبے قدموں چلتی ... ہال میں آئی۔ یہ اس کی زندگی کا بہترین لمحہ تھا۔ گو کہ وہ ...

... محسوس کر رہی تھی۔

☆☆☆

دروازہ ابھی تھوڑا سا ہی کھلا تھا کہ جیکسن کا ریڈیو ... اٹھا۔ اس نے جواب دینے سے پہلے اسے کوسا۔ ... اب یہاں ہوں۔ یہ آخری فرد ہے۔“ اس نے ... وٹ دیتے ہوئے کہا۔ ”میں اس بات کو یقینی بناؤں گا کہ ... وہاں پہنچا دوں۔“

اس نے اپنے لہجے کو پُرسکون اور خوشگوار رکھنے کی کوشش ... کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مس کیج اس کی گفتگو سن سکتی ہے۔ وہ ... تک پہنچنے کے بعد اسے خوفزدہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس نے ہوا کے دوش پر کیرن کی غصے میں بھری ہوئی ... آواز سنی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”میں نے تم سے کہا تھا کہ میں ... جاؤں گی۔ تم نے یہ کام مجھ پر کیوں نہیں چھوڑا؟“

”تم مصروف تھیں۔ اس میں مسئلہ کیا ہے؟“

وہ محسوس کر سکتا تھا کہ پولیس کانسٹیبل کیرن ڈاؤسن کسی ... سے مطمئن نہیں ہے۔ وہ ایک عجیب عورت تھی۔ سنجیدہ اور ... لیکن پولیس میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔

وہ دور سے آنے والی سائرن کی آواز سن رہا تھا۔ ... پیش آنے والا واقعہ علاقے کے لوگوں کے لیے بری ... تھی۔ تاہم اسے ایک حادثے کے بجائے واقعے کا نام دیا ... تھا۔ حادثے کا مطلب افراتفری اور نظم و ضبط کا فقدان تھا ... سے لوگوں میں خوف و ہراس پھیل سکتا تھا۔ واقعی لفظوں ... دھوکا دینا کتنا آسان ہے۔

اس نے دیکھا کہ ایک استخوانی ہاتھ نے دروازے کا ... کنارہ پکڑا۔ اس کے جوڑوں کی ہڈیاں صاف نظر آ رہی ... تھیں جیسے لکڑی پر سفید کھال کس کر لپیٹ دی گئی ہو۔

دروازہ تھوڑا سا مزید کھلا اور بالآخر اس کا چہرہ نظر آ گیا۔ لمبوترا چہرہ، چپٹی ناک، کھچڑی بال جو بے ڈھنگے پن ... سے تراشے گئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ اس عورت نے آئینے ... دیکھے بغیر کسی کند قینچی سے انہیں خود ہی کاٹا ہو۔ ایک ... ڈھالا سیاہ کارڈیگن اور لمبا سرمئی اسکرٹ اس کے ... بدن پر جھول رہا تھا۔ البتہ اس کی آنکھیں روشن اور ... بھری تھیں۔ ان میں ہلکی سی گھبراہٹ نمایاں تھی جیسے فرار کا ... ڈھونڈ رہی ہوں۔ جیکسن سمجھ گیا کہ اس کے ساتھ بہت ... سے بات کرنا ہوگی۔

”کیا تم نے پاور اسٹیشن سے آنے والی سائرن کی ... آواز سنی؟“

وہ خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

”وہاں ایک واقعہ رونما ہو چکا ہے اور ہمیں ہر ایک کو اس علاقے سے نکالنا ہے۔ یہ محض ایک احتیاط ہے اور اس میں پریشانی والی کوئی بات نہیں۔ ہم ہر ایک کو گولڈ برگ کے تفریحی مرکز میں عارضی طور پر منتقل کر رہے ہیں۔ اگر تم چاہو تو ایک بیگ میں ضروری استعمال کی چند چیزیں رکھ سکتی ہو۔ میں تمہیں اپنی کار میں وہاں تک پہنچا دوں گا۔ یہ میرے فرائض میں شامل ہے۔“

اس نے ایک ناگوار سی بو محسوس کی جو غالباً اس عورت کے کپڑوں یا اس کے جسم سے آ رہی تھی۔ شاید وہ کئی روز سے نہیں نہائی تھی۔ یا پھر ہو سکتا ہے کہ بو اس مکان سے آ رہی ہو جو سیلن زدہ اور بہت خستہ حالت میں تھا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ جگہ ہمیشہ سے ایسی نہیں تھی۔

روزا نے کوئی جواب دینے کے بجائے دھڑ سے دروازہ بند کر دیا۔ جیکسن کے پاس انتظار کرنے، قریبی درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندوں کی چہچہاہٹ اور دور سے آتی ہوئی سائرن کی آواز سننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ روزا کی ماں نے سختی سے تاکید کی تھی کہ کبھی کسی مرد کو گھر میں داخل نہ ہونے دینا۔ گو کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہی تھی لیکن روزا کے لیے اس کی خواہش کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں تھا۔

اسے اپنی ماں کی کرخت اور تیز آواز یاد تھی۔ ”روزا! ہم اپنے آپ کو دوسروں سے دور رکھتے ہیں اور کسی سے نہیں گھلتے ملتے۔“ جب سے وہ پیدا ہوئی، اس کی یہی زندگی تھی۔ وہ اور اس کی ماں نے دنیا کو چھوڑ دیا تھا لیکن جب سمندر کے کنارے پاور اسٹیشن بنانے کا فیصلہ کیا گیا اور ان کے پاس پیسوں کی کمی ہو گئی تو انہیں اجنبی لوگوں کے لیے اپنے دروازے کھولنا پڑ گئے۔

پولیس مین اس سے دروازے کے پیچھے سے باتیں کر رہا تھا اور اسے اپنے ساتھ لے جانے پر مصر تھا۔ وہ اپنی میٹھی باتوں سے اسے ورغلا رہا تھا اور اس کی آواز بالکل اس شخص جیسی دلکش تھی جس نے ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی بدل دی تھی۔ جو ہمیشہ اس سے نرم لہجے میں بات کرتا اور اس کی تعریف کرتا رہتا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اس کی دل خوش کن مسکراہٹ کا تصور کرنے لگی جب وہ اس کی ماں کے پکائے ہوئے کھانوں کی ضرورت سے زیادہ تعریف کیا کرتا۔ اس کی وجہ سے وہ ایک بار پھر زندگی کی طرف لوٹ آئی تھی لیکن بہت جلد سب کچھ بدل گیا۔

جب اس نے دروازے کی چٹخنی گرائی تو دیکھا کہ پولیس والے نے اپنے سیاہ چمک دار بوٹ دروازے کی

دہلیز پر رکھ دیے ہیں۔ ”تمہارے سبھی ہمسائے پہلے ہی یہاں سے جا چکے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ جلدی کرنا پڑ رہی ہے لیکن ہنگامی حالت میں ایسا ہی ہوتا ہے۔“

اب وہ اندر ہال میں آگیا تھا۔ اس طویل قامت شخص کے مقابلے میں وہ بہت چھوٹی لگ رہی تھی۔ وہ اسے بتا سکتی تھی کہ اس کا باتیں کرنے کا انداز اور لہجہ اس شخص جیسا نہیں جس کا وہ انتظار کر رہی تھی اور اسے یہ جان کر سکون ملا لیکن اس نے ایک طویل عرصے تک اس کی واپسی کا انتظار کیا تھا۔ اس لیے اسے مایوسی بھی ہوئی۔

یہ پولیس والا اس کے لیے اجنبی تھا اور وہ اس کے ساتھ کسی تفریحی مرکز یا کسی اور جگہ نہیں جا سکتی تھی۔ جب اس نے پیچھے ہٹنا شروع کیا تو وہ اپنے دل کی تیز ہوتی ہوئی دھڑکنیں سن سکتی تھی۔ یوں لگا جیسے اس کے جسم میں خون کی گردش تیز ہوگئی ہو۔ وہ اپنی ماں کے احکامات کی تعمیل کرتے ہوئے وہاں رکنے پر مجبور تھی۔ بہرحال اسے اس شخص سے کسی نہ کسی طرح چھٹکارا حاصل کرنا تھا۔

پہلے وہ یہ سمجھا کہ روزا تعاون کرنے پر آمادہ ہے لیکن اب وہ پیچھے ہٹ رہی تھی اور اس کی پشت ہال کی دیوار کی جانب تھی۔ جیکسن کو اسے ہر حال میں وہاں سے نکالنا تھا لیکن اس کے لیے طاقت استعمال کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر وہ آسان الفاظ میں خطرے کی وضاحت کر سکے تو شاید اس کی سمجھ میں آجائے۔

”دیکھو خاتون ...... پاور اسٹیشن میں ایک حادثہ ہو چکا ہے اور ہمیں سب لوگوں کو اس علاقے سے نکالنا پڑ رہا ہے۔“

وہ دیوار سے لگ کر کھڑی ہوگئی جیسے اسے ڈر ہو کہ وہ اس پر حملہ کرنے والا ہے۔ جیکسن نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ”بس تم اپنا سامان اٹھاؤ اور پولیس کار کی سواری سے لطف اندوز ہوتی رہو۔“

وہ جانتا تھا کہ اس سے بچوں کی طرح بات کر رہا ہے۔ اسے ہر حال میں روزا کو اپنے ساتھ لے کر جانا تھا پھر اسے اپنی جیب میں رکھے ہوئے خطوط کا خیال آیا اور وہ اچانک ہی بے چین ہوگیا۔

”دیکھو، تم اگر یہاں سے نہ گئیں تو زہر آلود تابکاری شعاعوں سے ہلاک ہو جاؤ گی۔ اس لیے میں تمہیں یہاں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ آؤ میرے ساتھ۔“

اس نے روزا کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن وہ الٹے قدموں ایک تاریک کمرے کے کھلے ہوئے دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ یہ دیکھ کر جیکسن کو وہ جنگلی جانور یاد آگئے جو گھیرے جانے پر خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔ وہ تصور میں ان کے نکیلے ناخنوں کی چبھن اپنے چہرے پر محسوس کر رہا تھا۔ ممکن تھا کہ اسے مدد کے لیے کیرن کو بلانا پڑے۔ وہ اس عورت کو قابو کر سکتی تھی۔

وہ اپنی اگلی کارروائی کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ عورت تیزی سے کمرے میں گئی اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ اب وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا لیکن اس طرح اسے یہاں چھوڑنا بھی ممکن نہیں تھا۔ ایک دفعہ وہ بحفاظت یہاں سے نکل جاتی تو پھر اسے مزید کچھ کام کرنا تھا۔

اس نے کسی کار کے آنے اور بریک لگنے کی آواز سنی۔ وہ چلتا ہوا بیرونی دروازے تک گیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک اور پیٹرول کار اس کی گاڑی کے برابر میں کھڑی ہوئی ہے۔ کیرن ڈاؤسن ڈرائیونگ سائڈ کا دروازہ کھول کر باہر آرہی تھی۔ وہ دبلی پتلی سیاہ بالوں والی عورت تھی اور تقریباً اسی کی ہم عمر تھی۔ اس کی طرح کیرن کی بھی گزشتہ سالوں سے ترقی نہیں ہوئی تھی لیکن اس کے برعکس کیرن کے مزاج میں ایک طرح کی تلخی پائی جاتی تھی جس کی وجہ برسوں پہلے کسی خواہش کی ناکامی بھی ہو سکتی تھی۔

کیرن اس کی طرف چلتی ہوئی آئی۔ اس کے ہونٹ سختی سے بھنچے ہوئے تھے۔ اس نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ”تم نے ابھی تک اس عورت کو باہر نہیں نکالا؟“

”وہ کچھ سننے کو تیار ہی نہیں۔ بہت ہی عجیب عورت ہے۔“

”وہ ہے کہاں؟“

”بائیں جانب والا پہلا دروازہ ...... میں نے ہر ممکن کوشش کر لی لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔“

کیرن اس کے پاس سے گزرتی ہوئی مکان میں داخل ہوگئی۔ جیکسن نے اس سے پوچھا۔

”کیا تم نے کچھ سنا؟“

وہ گھومتے ہوئے بولی۔ ”کس بارے میں؟“

”پاور اسٹیشن کے بارے میں ...... تازہ ترین خبر کیا ہے؟“

”مجھے کچھ علم نہیں۔“ وہ دروازے کی ناب پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ”روزا! میں پولیس کانسٹیبل کیرن ڈاؤسن ہوں۔ کیا میں اندر آ سکتی ہوں؟“

جیکسن نے ڈراؤنی فلموں کے انداز میں دروازہ آہستہ سے کھلتے ہوئے دیکھا اور کیرن فوراً ہی اندر چلی گئی۔ ایک منٹ بعد ہی وہ باہر آگئی۔ وہ بوڑھی عورت سر جھکائے دبے قدموں اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ کیرن نے اس کا بازو تھام رکھا تھا۔ اس نے جیکسن کو دیکھا جیسے کہہ رہی ہو

”میں نے تم سے کہا تھا نا ...... اب دیکھ لو۔“

”اس مکان کو مقفل کر دو۔“ وہ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے بولی۔ ”اور اطمینان کر لینا کہ چابی تمہارے پاس ہی ہے۔“

جیکسن نے بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پایا۔ وہ اسے بالکل ہی احمق سمجھ رہی تھی لیکن اس وقت چپ رہنا بہتر تھا۔ اسے کچھ کام کرنا تھے اور وہ فضول باتوں میں وقت ضائع کرنا نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ دروازے پر کھڑا کیرن کی کار کو نظروں سے اوجھل ہوتا دیکھتا رہا۔ اگر روزا اس گھر سے جانے پر تیار نہ ہوئی تو اس میں جیکسن کا کوئی قصور نہیں تھا۔ ایسی عورتیں صنفِ نازک کی بات مان لیتی ہیں۔

”انجینئرز ایٹمی پاور اسٹیشن سے خارج ہونے والی شعاعوں کو کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تاہم اسٹیشن کے ایک ترجمان کا کہنا ہے کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ البتہ احتیاط کے طور پر دو میل کے دائرے میں رہنے والے تمام رہائشیوں سے علاقہ خالی کروالیا گیا ہے جو عارضی طور پر تفریحی مرکز میں قیام کریں گے۔“

جیکسن نے ریڈیو بند کر دیا۔ یہ ایک پرانے فیشن کا ریڈیو تھا جس پر میل کی کئی تہیں چڑھی ہوئی تھیں۔ یہاں تک کہ سوئچ گھمانے پر بھی اس کی انگلیاں گرد آلود ہوگئیں۔ گھر میں ٹی وی نہیں تھا اور روزا سے اس کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ قالین پر برسوں کی گرد جمی ہوئی تھی اور اس کی اصل شکل اس گرد کے نیچے چھپ گئی تھی۔ فرنیچر انیس سو پچاس یا ساٹھ کے زمانے کا تھا۔ ان میں سے کچھ کا فیشن دوبارہ لوٹ آیا تھا لیکن ان لوگوں کے لیے اس میں کوئی اپیل نہیں تھی جو پہلے ہی اسے دیکھ چکے تھے۔ وہ خود 1965ء میں پیدا ہوا تھا اور اس کے گھر میں بھی ایسا ہی فرنیچر تھا۔ اس کی ماں کے پاس تھوڑی بہت فالتو رقم تھی جس کی بدولت وہ فرنیچر خریدنے کے قابل ہوگئی اور آخری دم تک اس کی دیکھ بھال کرتی رہی۔

وہ کافی دیر تک کان لگائے کھڑا رہا لیکن اب سائرن کی آواز نہیں آرہی تھی۔ شاید سائرن اس لیے بند کر دیا گیا کہ تمام مکین اس علاقے سے جا چکے تھے اور اب صرف وہ اس ویران مکان میں تنہا رہ گیا تھا۔

جیکسن نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر خطوط نکالے۔ وہ انہیں دوبارہ پڑھنا چاہ رہا تھا۔ اس نے گرد آلود صوفے پر ایک نظر ڈالی اور اس پر بیٹھنے کے بجائے کھڑے رہنے کو ترجیح دی۔ پھر اس نے لفافے سے پہلا خط نکال کر پڑھنا شروع کیا۔

”ڈارلنگ! میں یہاں خیریت سے پہنچ گیا ہوں اور مجھے پرم روز کاٹیج میں رہنے کی جگہ بھی مل گئی ہے۔ مکان کی مالکہ مسز کیج بہت دلچسپ عورت ہے۔ وہ زیادہ نہیں بولتی لیکن اسے بہت عمدہ ناشتا بنانا آتا ہے۔ اس نے مرغیاں پال رکھی ہیں۔ اس لیے انڈوں کا کوئی مسئلہ نہیں۔ میں دیہی زندگی کا عادی ہوتا جا رہا ہوں۔“

دوسرے صفحے پر گھر کے بارے میں باتیں پوچھی گئی تھیں لیکن جیکسن کی دلچسپی پرم روز کاٹیج اور مسز کیج کے تذکرے میں تھی۔ اسے صرف یہ بتایا گیا تھا کہ اس کی پیدائش سے ایک ماہ قبل اس کا باپ غائب ہوگیا تھا اور اسے تلاش کرنے کی تمام کوششیں ناکام رہیں۔

ماں کے سنگدل دوستوں نے اس کے باپ کے بارے میں فرض کر لیا کہ وہ اپنی حاملہ بیوی کو چھوڑ کر چلا گیا ہے کیونکہ وہ ہونے والے بچے کی ذمے داری سنبھالنے سے کترا رہا تھا لیکن اس کی ماں نے اس مفروضے پر یقین کرنے سے انکار کر دیا۔ ماں کے مرنے کے بعد جب اسے ایک بکس میں یہ خطوط ملے اور اس نے انہیں پڑھا تو اسے بھی اپنے باپ کی بے وفائی پر یقین نہیں آیا۔ اسی لیے اس نے کوشش کرکے اپنا تبادلہ اس علاقے میں کروایا۔ وہ جاننا چاہ رہا تھا کہ جب اس کا باپ دوسرے سیکڑوں مزدوروں کے ساتھ اس پاور ہاؤس کی تعمیر کے سلسلے میں یہاں آیا تو اس پر کیا گزری۔ وہ گھر واپس جانے کے بجائے لاپتا کیوں ہوگیا۔

اس نے پہلے جب بھی پرم روز کاٹیج سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تو اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ اس لیے آج سے پہلے اس نے روزا کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ اس کے باپ نے مکان کی مالکہ کا جو نام بتایا، اس عورت کا بھی وہی نام تھا جس کی وجہ سے جیکسن کے دل میں امید کی لہر جوش مارنے لگی۔ جس روزا کیج سے وہ تھوڑی دیر پہلے ملا، وہ 1965ء میں ایک نوعمر لڑکی ہی ہوگی لیکن جیکسن کو شبہ تھا کہ اس سے ماضی کی یادوں کے بارے میں بات کرنا شاید مشکل ہو۔

اس نے دوسرا خط پڑھنا شروع کیا جو پہلے خط کے ایک ہفتے بعد لکھا گیا تھا۔ ”امید ہے کہ تم خیریت سے ہوگی اور تمہارے سینے کی جلن دور ہوگئی ہوگی۔ میری خواہش تھی کہ اس موقع پر میں تمہارے پاس ہوتا لیکن یہاں بہت اچھے پیسے مل رہے ہیں اور میں سوچتا ہوں کہ تمہارے اور آنے والے ننھے مہمان کے لیے پیسے جمع کر لوں۔ فورمین

نے کہا ہے کہ میں بچے کی پیدائش پر چند دنوں کی چھٹی کرسکتا ہوں۔ پر م روز کاٹیج میں ایک اور شخص بھی آگیا ہے۔ اس کا نام جان ہے اور وہ آئرلینڈ کا رہنے والا ہے۔ اس کے ساتھ اچھا وقت گزر رہا ہے اور اس کی وجہ سے کافی رونق ہوگئی ہے۔ وہ بہت زندہ دل ہے لیکن اس کا زیادہ وقت مسز کیچ کے آگے پیچھے پھرنے میں گزرتا ہے۔''

یہ ایک ایسے شخص کا خط نہیں ہوسکتا جو اپنی بیوی اور بچے کو چھوڑنے کے بارے میں سوچ رہا ہو۔ ضرور اس کے ساتھ کچھ ایسا ہوا جس کی وجہ سے وہ گھر واپس نہیں آسکا اور جیکسن کو یہی معلوم کرنا تھا۔ برسوں پہلے اس مکان میں آکر رہنے والے جان کو تلاش کرنا ایک مشکل کام تھا لیکن اردگرد کے گھروں میں کئی عمر رسیدہ لوگ بھی تھے۔ لہٰذا قوی امکان تھا کہ جن دنوں پاور اسٹیشن تعمیر ہو رہا تھا تو وہ بھی یہاں رہتے ہوں اور شاید انہیں وہ شخص بھی یاد ہو جس نے پاور اسٹیشن کے بننے میں حصہ لیا تھا۔

☆☆☆

''تم ٹھیک تو ہو روزا؟''

روزا کیچ کی آنکھیں نم آلود تھیں اور وہ واضح طور پر نہیں دیکھ سکتی تھی لیکن اس آواز میں نرمی تھی اور وہ جانی پہچانی لگ رہی تھی جیسے اس کی ماں کی آواز ہو۔

''کیا تمہیں کچھ چاہیے؟ میں تمہارے لیے ایک کپ چائے لاسکتی ہوں۔''

اب اس کی آنکھوں سے دھند چھٹ رہی تھی اور...

وہ اپنے سامنے بیٹھی ہوئی عورت کو دیکھ سکتی تھی جس نے سفید قمیص پہن رکھی تھی۔ یہ وہی پولیس کانسٹیبل کیرن تھی جو اسے یہاں لے کر آئی تھی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور کیرن اس کے بازو کو چھوتے ہوئے کھڑی ہوگئی جیسے اس کا دل بڑھا رہی ہو۔

اس بڑے کمرے میں بہت سے لوگ تھے۔ روزا کو ان کے باتیں کرنے اور بچوں کے رونے کی آواز بہت بری لگ رہی تھی۔ خاص طور سے وہ بچوں کے رونے کی آواز تو بالکل برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ اسے وہ اذیت ناک درد اور ننھا سا وجود یاد آیا جو اس سے علیحدہ کردیا گیا تھا۔ اسے وہ نرس بھی یاد آئی جو پتھر کے مجسمے جیسا چہرہ بنائے اسے بتا رہی تھی کہ اسی میں اس کی بھلائی تھی۔

وہ بھی ان بہت سے لوگوں میں سے ایک تھا جو پاور اسٹیشن کی تعمیر کے سلسلے میں یہاں آئے تھے اور وہ اس کا پہلا محبوب بھی تھا۔ پہلا اور آخری۔ اس سے پہلے لوگ کہا کرتے تھے کہ پاور اسٹیشن اس علاقے کے ...
پھر روس میں کہیں دھماکا ہوا تو لوگوں نے ان ...
نظر انداز کرنا شروع کردیا۔ اس پاور اسٹیشن کی ...
ہوئی تو وہ یہاں چلا آیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کا ...
پیسے مل رہے ہیں۔ اسی لیے ماں نے ان کو ...
زیادہ کرایہ رکھا۔

روزا کو کبھی کسی نے نہیں بتایا کہ اس ...
پیدا ہوا تھا یا لڑکی...... لیکن جس شخص کو آج اس ...
کی شکل اس آدمی سے بہت ملتی تھی جو کئی روز ...
روز کاٹیج میں ٹھہرا تھا۔ اس غیر معمولی مشابہت ...
کہ اس کا بیٹا واپس آگیا ہے لیکن اس کی یادداشت ...
کمزور ہوچکی تھی اور وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی ...
اس شخص سے مشابہت رکھتا ہے جس کے ساتھ اس ...
حسین وقت بتایا تھا یا اس آدمی سے جس کا لب ...
والوں جیسا تھا۔ گزرے وقت اور اسپتال میں ...
کے بعد ماضی اس کے لیے ایک خواب کے مانند تھا ...
ان دونوں کے چہرے دھندلا گئے تھے لیکن وہ ...
کہہ سکتی تھی کہ جیکسن نامی یہ شخص ان دونوں میں ...
ایک سے ضرور مشابہت رکھتا تھا۔

کیرن اس کے لیے پلاسٹک کے کپ میں ...
لے کر آئی اور اس کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ ...
بولی۔ ''یہاں کافی شور ہے لیکن ہم تمہیں جتنی جلد ممکن ...
گھر واپس لے جائیں گے۔''

کیرن بہت مہربان عورت تھی۔ اس لیے روزا ...
بھروسا کرنے کے لیے تیار ہوگئی۔ وہ زیادہ دیر تک ...
کو نہیں چھپا سکتی تھی۔ وہ کسی کو بتانا چاہتی تھی کہ ...
واپس آگیا ہے۔

اس نے کیرن کا بازو پکڑا اور سرگوشی کر ...
بولی۔ ''میرا ایک راز ہے۔''

''کیسا راز؟'' کیرن پریشان ہوتے ہوئے بولی
''میرا خیال ہے کہ میرا بیٹا واپس آگیا ہے۔''

کیرن حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے بولی ...
مطلب ہے تمہارا؟''

''وہ میرے لیے آیا ہے۔ اس کی شکل اس ...
ملتی ہے لیکن......'' وہ کہتے کہتے رک گئی جیسے خود ...
بات کا یقین نہ ہو۔

کیرن اسے عجیب نظروں سے دیکھتے ہوئے ...
''تم کس مرد کی بات کررہی ہو روزا؟'' ...

... جو ہمارے گھر میں آکر ٹھہرا تھا جب وہ لوگ ... نے آئے تھے۔''

... نے آہستہ سے سر ہلایا جیسے وہ اس کی بات ... اور روزا بھی اس کی شکر گزار تھی کہ کوئی تو ہے جو ... سمجھتا ہے۔ کیرن اس کی طرف جھکتے ہوئے ... میں بولی۔ ''جب وہ شخص تمہارے گھر ٹھہرا تھا ... مطلب ہے کہ کیا تم نے اس کے ساتھ تنہائی میں وقت ...''

... ہی روزا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ... آہستہ سے اس کے ہاتھ سے چائے کی پیالی لے ... کرنے لگی۔ روزا سوچ رہی تھی کہ وہ اس مہربان ... سمجھائے کہ یہ سب کچھ ایک بھولے بسرے ... طرح ہے۔ اسپتال میں کافی عرصہ زیر علاج رہنے ... اسے دوائیں اور بجلی کے جھٹکے دیے جاتے رہے ... سے اس کے جذبات اور یادداشت بری طرح ...

... رن نے نرمی سے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ ... ہو روزا...... میں اس کا حل نکال لوں گی۔''

... کے قریب ترین پڑوسی ایک زندہ دل اور عمر ... مسٹر اینڈ مسز پارسن تھے جو کولڈ بوروف کے ... میں اپنی بیٹی کے پاس چلے گئے تھے۔ وہ جگہ ... کے مقام سے بارہ میل کے فاصلے پر تھی۔ جیکسن کو ... اس نے انہیں کسی دوسری جگہ منتقل ہونے کے ... اس عورت نے کتنا ہنگامہ کیا تھا۔ اس کی سمجھ میں ... تھا کہ وہ اپنے ساتھ کون سے کپڑے لے کر ... نے جانے سے پہلے کم از کم تین مرتبہ اپنا ذہن ... جیکسن نے اس کی اہمیت پر زور دینے کی کوشش ... لوگوں کو سمجھانا بہت مشکل ہوتا ہے۔

... کے برعکس مسٹر پارسن خاموش طبیعت کے مالک ... کی رفاقت میں کئی برس گزارنے کے بعد اس ... سے آشنا ہوچکے تھے۔ کئی مرتبہ جیکسن کے دل میں ... ابھری کہ وہ بھی شادی شدہ زندگی سے لطف ... اس پر ماں کی دیکھ بھال کی ذمے داری تھی۔ ... کے بعد وہ اس ذمے داری سے آزاد ہوگیا۔ ... باپ کے لکھے ہوئے وہ خطوط ملے جو ماں نے ... سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔ انہیں پڑھنے کے ... لے بچ جانے کا فیصلہ کرلیا۔

... نے اپنے طور پر دو مرتبہ چیک کرلیا کہ وہ علاقہ پوری طرح خالی ہوچکا ہے۔ جہاں تک پاور اسٹیشن سے خارج ہونے والی تابکار شعاعوں کا تعلق تھا تو اس کے پاس جاننے کا واحد ذریعہ ریڈیو تھا جس سے کچھ زیادہ تفصیل معلوم نہیں ہورہی تھی اور صرف یہی بتایا جارہا تھا کہ انجینئرز اب بھی صورتِ حال کو کنٹرول کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ ان مکینوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا جو نقل مکانی کی وجہ سے بری طرح متاثر ہوئے تھے اور نہ ہی کسی نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا کہ یہ سرسبز خطہ اور سمندر اب شاید دوبارہ صاف نہ ہوسکے لیکن فی الحال اس کا اصل مسئلہ یہ تھا کہ وہ روزا کے بارے میں سب کچھ جان جائے۔

پارسن کی بیٹی کا مکان ایک نئی آبادی میں دوسرے مکانوں سے بالکل الگ تھلگ تھا۔ اس علاقے میں پولیس کار کی آمد ایک غیر معمولی بات تھی۔ جب وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھا تو اسے محسوس ہوا کہ بہت سی آنکھیں کھڑکیوں کے پیچھے سے اسے دیکھ رہی ہوں۔

نصیحت

ماں نے بچے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا۔ ''یاد رکھو بیٹا، ہم اس دنیا میں دوسروں کی بھلائی کے لیے آئے ہیں۔''

بچے نے تھوڑی دیر سوچا اور پھر کہا۔ ''اور امی! دوسرے یہاں کس لیے آئے ہیں؟''

☆☆☆

ایک لکڑہارا اپنے کم عمر بیٹے کے ساتھ جنگل میں گیا۔ لکڑیاں کاٹتے کاٹتے شام ہوگئی۔ تھکن سے برا حال تھا۔ واپسی میں راستہ بھول گئے۔ بہت تلاش کے بعد جب راستہ نہ ملا تو اس نے بیٹے کو مارنا شروع کردیا اور بولا۔ ''نامعقول! میں تو راستہ بھول گیا ہوں...... تو، تو گھر جا، تیری ماں انتظار کررہی ہوگی۔''

مرسلہ۔ غلام حسین اختر، سرگودھا

☆☆☆

☆ جب بھی کسی کو دعا دو اچھی اور دل سے دو کیونکہ وہ دعا پہلے آپ کے اپنے حق میں قبول ہوتی ہے۔

☆ اپنا غصہ اتنا مہنگا کرو جو خریدنا کسی کی قوت نہ رہے اور اپنی خوشی اتنی سستی کرو جو ہر بندہ آسانی سے خرید سکے۔

☆ اللہ کو چاہنے والا نکھر جاتا ہے اور دنیا کو چاہنے والا بکھر جاتا ہے

مرسلہ۔ راحیلہ شفیق، سندھی ہوٹل، نیو کراچی

اس کی قسمت اچھی تھی کہ وہ دونوں گھر پر مل گئے۔
ان کی بیٹی نے بتایا کہ وہ اس ایڈونچر سے لطف اندوز ہو رہے ہیں البتہ وہ خود تھوڑی سی خوفزدہ تھی کہ کہیں تابکار شعاعیں ہوا کے دوش پر کولڈ بوروف تک نہ پہنچ جائیں جس کے نتیجے میں کئی ہلاکتوں کا اندیشہ ہے۔ وہ صرف اتنا ہی بتا رہے ہیں جو وہ ضروری سمجھتے ہیں ورنہ اس کے اثرات کافی عرصے تک رہتے ہیں۔

جب چائے کا دور ختم ہوا اور پاور اسٹیشن کے موضوع پر بھی کافی بات ہو چکی تو جیکسن نے چائے کی پیالی میز پر رکھی اور مسکراتے ہوئے عمر رسیدہ جوڑے سے مخاطب ہوا۔

''ہم نے مس کیج کو بحفاظت یہاں سے دوسری جگہ منتقل کر دیا ہے لیکن مجھے پریشانی یہ ہے کہ وہ تنہا اس صورتِ حال سے کیسے نمٹے گی۔''

مسز پارسن بولی۔ ''میں نے ایک دفعہ سوشل سروس والوں کو بلایا تھا لیکن اس نے انہیں واپس بھیج دیا حالانکہ اس عورت کے آنے پر میں خاصی مطمئن ہو گئی تھی۔ میں نہیں جانتی کہ وہ کسی فلاحی ادارے سے آئی تھی یا......''

''تم کس عورت کی بات کر رہی ہو؟''

''میں نہیں جانتی کہ وہ کون ہے۔ یہ تمہیں روزا ہی بتا سکتی ہے اگر تم اس کی باتوں کا مطلب سمجھ سکو۔''

''تم کافی عرصے سے وہاں رہ رہی ہو۔ یقیناً مس کیج کے بارے میں جانتی ہو گی۔''

اب مرد کے بولنے کی باری تھی۔ ''کچھ زیادہ نہیں۔ ان لوگوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھا۔''

مسز پارسن بولی۔ ''البتہ جب پاور اسٹیشن بن رہا تھا تو انہوں نے دو آدمیوں کو اپنے گھر میں رہنے کی جگہ دی۔ اس زمانے میں چند لوگ ہی تعمیراتی کارکنوں کو کمرا دیتے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ انہیں اچھا کرایہ ملتا تھا۔ اس کے باوجود مجھے حیرت ہوئی جب اس بوڑھی عورت نے اجنبیوں کو اپنے گھر میں داخل ہونے دیا۔''

''تمہیں وہ کرائے دار یاد ہیں؟''

''ہاں۔ ان سے کبھی کبھی بات ہو جاتی تھی۔''

جیکسن کو لگا کہ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا ہے۔ وہ بولا۔ ''مجھے ان کے بارے میں بتاؤ۔''

''ان میں سے ایک کا نام جان تھا۔ وہ آئرش تھا اور اس کی شخصیت بڑی سحر انگیز تھی جبکہ دوسرا لندن کا رہنے والا جیف تھا۔'' وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''اس کی شکل تھوڑی بہت تم سے ملتی تھی۔''

''ان دونوں کے ساتھ کیا ہوا؟''

میاں بیوی نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر مرد بولا ''ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ وہ دونوں اچانک ہی چلے گئے میرا خیال ہے کہ انہیں بہتر ملازمت مل گئی ہو گی یا پھر کوئی ا[illegible] وجہ ہو گی۔''

''جیف غالباً لندن چلا گیا۔ اس نے مجھے بتایا تھا [illegible] اس کی بیوی پہلی بار ماں بننے والی ہے۔''

پارسن بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم نے [illegible] بات مجھے کبھی نہیں بتائی۔''

''کیوں بتاتی؟ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جس میں تمہیں دلچسپی ہو۔ میں نہیں جانتی کہ جان کے ساتھ کیا ہوا اس کا یوں اچانک غائب ہو جانا ایک معما ہے۔''

جیکسن انتظار کرتا رہا کہ وہ مزید کچھ کہے۔ ضرور کوئی ایسی بات ہوئی تھی جس کی وجہ سے اس کا باپ گھر واپس [illegible] آسکا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس جوڑے کے پاس اس الجھن کا حل موجود ہے جس نے اسے گزشتہ پچاس برس سے پریشان کر رکھا ہے۔

''کیا اس وقت کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا تھا جب وہ دونوں اچانک غائب ہو گئے تھے؟''

عورت نے نفی میں سر ہلایا لیکن پارسن خاموش نہ رہ سکا۔ اس نے بیوی کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''ایک دن میں شام کے وقت باغ میں تھا جب میں نے کچھ آوازیں سنیں جیسے کوئی جھگڑا ہوا ہو۔ ایک عورت کے رونے کی آواز آئی پھر ایک مرد کو بولتے ہوئے سنا جو کسی کو خاموش رہنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ بہر حال میں ٹھیک طرح سے نہ سن سکا اور نہ ہی یہ میرا کام تھا۔''

اس کی بیوی نے غصے سے دیکھا تو پارسن خاموش ہو گیا۔ جیکسن اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

''چائے پلانے کا شکریہ۔ مجھے اب چلنا چاہیے۔'' یہ کہہ کر وہ دروازے سے باہر نکل گیا۔ اب اس کا رخ [illegible] روز کاٹیج کی جانب تھا۔

وہ بہت تیزی سے کار چلاتا ہوا کاٹیج تک پہنچا۔ وہاں ہر سو خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اب سائرن کی آواز بھی نہیں سنائی دے رہی تھی۔ اسی خاموش جگہ پر کئی سال پہلے اس کے باپ کا جھگڑا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ حقیقت جاننے کے بعد کیا وہ بہتر محسوس کرے گا یا بہت زیادہ تاخیر ہو [illegible] سے اس سچ کی کوئی اہمیت نہیں رہے گی؟

اس نے بیرونی دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا اور ہال [illegible]

داخل ہو گیا پھر وہ مکان کے عقبی حصے میں گیا۔ اس نے [illegible] کہ پورے مکان کی منظم طریقے سے تلاشی لینا بہتر ہو گا اس نے سونے کے کمروں سے اس کام کا آغاز کیا۔ ایک [illegible] کی تلاشی کے بعد اسے وہ سراغ مل گیا جس کی اسے [illegible] تھی۔ پھر پندرہ منٹ بعد دوبارہ بیرونی دروازہ کھلنے کی [illegible] آئی لیکن وہ بہت زیادہ مصروف ہونے کی وجہ سے [illegible] سن نہ سکا۔

☆☆☆

پاور اسٹیشن کے واقعے کو پورا ایک سال گزر گیا۔ [illegible]مت کا کہنا تھا کہ یہ کوئی سنجیدہ نوعیت کا واقعہ نہیں تھا اور لوگوں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر علاقہ خالی کیا تھا، انہیں [illegible] تین دن بعد ہی اپنے گھروں کو واپس جانے کی [illegible]مت دے دی گئی۔ حکومت کا موقف تھا کہ اس انخلا سے [illegible]اہر ہو گیا کہ حکام کتنے مستعد ہیں اور وہ اس طرح کی [illegible]رت حال سے نمٹنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں لیکن [illegible] سے لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے اس پر بالکل بھی [illegible] نہیں کیا۔

اس واقعے کے بعد روزا کیج کی زندگی کی نئی [illegible]وعات ہوئی۔ اس کی پرانی زندگی بہت دور رہ گئی تھی وہ سب کچھ کسی اور کے ساتھ ہوتا رہا ہو لیکن حیرت [illegible] طور پر اس کی کچھ یادیں پہلے کے مقابلے میں واضح [illegible] تھیں۔ اسے اسپتال سے فارغ ہو کر گھر آنا اور ماں [illegible] ساتھ اس اکیلے کاٹیج میں رہنا یاد آ گیا۔ ماں کے [illegible]نے تک اس نے جو وقت اس کے ساتھ گزارا، پھر [illegible]ائی کا عذاب جھیلتی رہی۔ یہ سب اس کے ذہن کے [illegible]ے پر روشن ہوتا چلا گیا۔

جب اسے تفریحی مرکز کے پر ہجوم ہال میں لے [illegible] گیا تو اس کی زندگی یکسر بدل گئی اور وہ جب چند روز بعد روز کاٹیج واپس آئی تو اسے وہ جگہ بالکل صاف ستھری لگی [illegible] اس کا بچہ جس کی اس نے پیدائش کے بعد صرف ایک ہی دیکھی تھی... وہ اس کی زندگی میں واپس آ گیا تھا۔

اس نے اسے وہ سب کچھ بتا دیا۔ اسے یہ ناقابلِ [illegible]ار بتاتے ہوئے بہت عجیب لگ رہا تھا لیکن جب رکا [illegible]ائی بند توڑ کر باہر نکلا تو یہ سب کچھ بہت آسان ہو گیا۔ [illegible] عرصہ پہلے جب ایک رات کو وہ شخص اس کے کمرے میں [illegible] وہ بھی اس کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات سے لطف [illegible] ہوتی رہی حالانکہ بعد میں اس کی ماں نے یہی کہا کہ وہ [illegible] معصومیت سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ ایک روز صبح میں اسے [illegible] ہوئی تو اس کی ماں کا اندیشہ حقیقت بن کر سامنے آ گیا۔ ماں بہت ناراض ہوئی اور ایک رات اس آدمی سے اس کا زبردست جھگڑا ہوا۔ پھر سب کچھ بہت تیزی سے ہوا۔ اس کا چاقو والا ہاتھ حرکت میں آیا اور دوسرے ہی لمحے اس کا پھل جان کے پیٹ میں چلا گیا۔ لمحہ بھر کے لیے جان کی آنکھوں میں حیرت کی لہر ابھری اور وہ زمین پر گر پڑا۔ روزا کے چیخنے اور رونے کی آواز سن کر دوسرا کرائے دار جیف کمرے میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ جان زمین پر خون میں لت پت پڑا ہوا ہے۔ وہ ایک بار پھر چلائی جب اس نے دیکھا کہ ماں نے جیف کے دل میں بھی چاقو گھونپ دیا ہے۔ دونوں آدمیوں کو زمین پر مردہ حالت میں دیکھ کر وہ اپنی چیخیں نہ روک سکی۔

پھر ماں نے اسے پُرسکون رکھنے کے لیے دوا دی۔ اس کے بعد اسے کچھ یاد نہ رہا۔ وہ گھنٹوں سوتی رہی اور بیدار ہونے کے بعد اس نے دیکھا کہ وہاں خون تھا اور نہ ہی لاشیں۔ ماں نے اسے بتایا کہ یہ سب اس کا وہم تھا۔ شاید اس نے سوتے میں کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔ وہ دونوں آدمی یہاں سے جا چکے ہیں کیونکہ ان کا کام ختم ہو گیا تھا۔ لیکن اب ایک خوفناک امکان اس کے دماغ میں جگہ بنا رہا تھا۔ اس کی ماں ایک مضبوط اور طاقت ور عورت تھی اور جنگ کے زمانے میں اس نے کھیتوں پر بڑی محنت کی تھی۔ اگلی صبح روزا بیدار ہوئی تو اس کا منہ خشک ہو رہا تھا اور پیٹ میں درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اس نے باغ میں نئی کھدائی دیکھی، وہاں زمین میں دو پیوند نظر آ رہے تھے جو پہلے وہاں نہیں تھے۔

☆☆☆

اب وہ کچن کی کھڑکی کے پاس کھڑی باغ کا نظارہ کر رہی تھی۔ وہاں سے گھاس پھوس صاف ہو چکی تھی اور اس کے بچے نے اس جگہ سبزیاں اگا دی تھیں۔ ریڈیو پر کچھ اس طرح کے تبصرے ہو رہے تھے کہ پاور اسٹیشن پر رونما ہونے والے واقعے کے بعد تابکار لہروں کے اخراج کی وجہ سے یہاں کی زمین آلودہ ہو گئی ہے۔ اس کی اولاد نے بتایا کہ یہ محض بکواس تھی۔ وہاں سبزیوں کی تین کیاریاں تھیں جن کے پودے آہستہ آہستہ بڑھ رہے تھے۔ اس کی اولاد نے بتایا کہ یہ تین خاص جگہیں باقی باغ کی نسبت زیادہ زرخیز تھیں۔

☆☆☆

حقیقی ماں کی تلاش میں کیرن جنون کی حد تک جا چکی تھی۔ وہ ان لوگوں سے کبھی مانوس نہ ہو سکی جنہوں نے اسے گود لیا تھا اور اسی وجہ سے اس نے اپنی حقیقی ماں کی تلاش

شروع کردی جس میں اس کے کئی سال لگ گئے۔ اس دوران وہ ہراس سراغ کا تعاقب کرتی رہی جس کی مدد سے وہ اپنی ماں تک پہنچ سکتی تھی اور اب وہ عورت اسے مل گئی تھی جس نے اسے جنم دیا تھا۔ یہ اس کی زندگی میں آنے والی پہلی خوشی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے وقت سے پہلے ہی ریٹائرمنٹ لے لی کیونکہ اب وہ پورا وقت ماں کو دینا چاہتی تھی جس نے ساری زندگی تنہائی کا عذاب سہا۔ اس کے علاوہ اسے اپنے نئے باغ کی بھی دیکھ بھال کرنا تھی جس سے اسے ملازمت کے مقابلے میں زیادہ اطمینان ملتا۔

وہ جب پہلی بار اس بنگلے پر آئی تو اس کی حالت بہت ہی خستہ تھی اور وہ کسی بھوت بنگلے کا منظر پیش کر رہا تھا۔ روزا کیج اپنی تنہائی اور منتشر ذہنی کیفیت کی وجہ سے مکان کی دیکھ بھال کرنے سے قاصر تھی تاہم اب اس بنگلے میں کافی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ اس نے نیا باتھ روم بنوایا اور کچن کی از سرِ نو تزئین و آرائش کی۔ ماضی کی تمام باقیات ضائع کردی گئیں جن میں وہ کاغذات بھی شامل تھے جن کا تعلق اس کی ماں کی دارالامان میں قید سے تھا۔ اس کے علاوہ وہ تمام خطوط بھی ضائع کردیے جو اس کے باپ کے رشتے داروں نے بھیجے تھے اور جن میں التجا کی گئی تھی کہ اس کی خیریت کے بارے میں اطلاع دی جائے۔ گو کہ وہ اسے باپ کے لقب سے سرفراز نہیں کرنا چاہتی تھی کیونکہ اس کی زندگی میں جان کا رول نہ ہونے کے برابر تھا۔

پاور اسٹیشن والے واقعے سے بہت پہلے ہی کیرن کو روزا کیج کی حقیقت کا علم ہو گیا تھا پھر جب وہ اسے تفریحی مرکز لے کر آئی اور اس سے گھل مل کر باتیں کیں تو ساری حقیقت اس پر واضح ہوگئی۔ اس سے پہلے وہ روزا کیج کے بارے میں بہت کچھ سن چکی تھی۔ اس نے اپنی منہ بولی ماں، اسپتال اور دارالامان کا ریکارڈ چیک کیا تو کڑی سے کڑی ملتی چلی گئی پھر اس نے اپنی ایک سہیلی سے رابطہ کیا جو سوشل سروس میں کام کرتی تھی اور اسے اعتماد میں لے کر روزا کیج کی دیکھ بھال کے لیے بھیجا۔ اس کی ہمدردی سے متاثر ہو کر روزا پگھل گئی اور اس نے 1965ء میں پیش آنے والے واقعات اس کے سامنے دہرا دیے لیکن یہ کہنا مشکل تھا کہ اسے یاد آنے والے یہ واقعات کتنے حقیقی یا تصوراتی تھے۔

اس نے اپنی ماں کے جرم کے بارے میں بتایا اور یہ کہ اس کے بچے کو پیدائش کے فوراً بعد اس سے دور کردیا گیا تھا لیکن وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ لڑکا تھا یا لڑکی۔ یہ سب جاننے کے بعد کیرن کو یقین ہو گیا کہ وہی روزا کی بیٹی ہے جسے اس کی پیدائش کے فوراً بعد ہی ایک فیملی نے گود لے لیا تھا۔ اسی لیے اس نے کانسٹیبل جیکسن سے کہا تھا کہ وہ خود روزا کو لے کر تفریحی مرکز جائے گی۔ اس کے دل میں اشتیاق پیدا ہو رہا تھا کہ وہ روزا کو گلے لگا کر بتائے کہ وہی اس کی بچھڑی ہوئی اولاد ہے لیکن اس کی نازک ذہنی کیفیت کے پیشِ نظر وہ اس معاملے میں جلدی نہیں کرسکتی تھی۔ جب روزا نے تفریحی مرکز میں آنے کے بعد اسے سب کچھ بتادیا تو اس نے تعین کرلیا کہ یہ انکشاف ان کی خوشیوں پر اثر انداز نہیں ہوگا۔ اب وہ اور اس کی حقیقی ماں ماضی کو بھلا کر نئی زندگی کی شروعات کرسکتی تھیں۔

کیرن نے کبھی جارج جیکسن کو قتل کرنے کے بارے میں نہیں سوچا تھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ وہ باقاعدگی سے کاٹیج کے چکر لگا رہا ہے اور اس نے نہ صرف یہ کہ پورے گھر کی تلاشی لی بلکہ باغ کے معائنے کے دوران اس کی نظر ان قبروں پر بھی گئی ہوگی اور وہ معاملے کی تہ تک پہنچ گیا ہوگا۔ اس نے سوچا کہ 1965ء میں پیش آنے والے بدقسمت واقعے کی بھنک حکامِ بالا کو ہوگئی تو باغ کی کھدائی کے بعد سب کچھ واضح ہوجائے گا اور روزا کی زندگی ایک بار پھر برباد ہوجائے گی۔ وہ اسے نانی کے جرم کے نتائج سے بچانا چاہتی تھی جس کے لیے جیکسن کو راستے سے ہٹانا ضروری تھا۔

اس نے جیکسن کو بے ہوش کرنے کے لیے اپنا ڈنڈا استعمال کیا اور جب وہ ہوش میں آنے لگا تو وہ خوفزدہ ہوگئی اور اس نے اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر پے در پے کئی وار کرکے اسے دوسرے جہان میں پہنچا دیا۔

باغ میں موجود دو قبروں کے برابر میں کافی جگہ تھی چنانچہ اس نے تیسری قبر تیار کرکے اس کی لاش وہاں دفنا دی۔ یہ بڑی عجیب بات تھی کہ کسی کو بھی جیکسن کی کمی محسوس نہیں ہوئی اور جب اس کی کار ساحلِ سمندر سے ملی تو سب یہی سمجھے کہ وہ کسی حادثے کا شکار ہوگیا ہے یا اس نے خودکشی کرلی ہے۔

بہرحال وہ ایک تنہا شخص تھا جس کا کوئی خاندان تھا اور نہ کوئی دوست۔ وہ اس علاقے میں ایسا اجنبی تھا جس نے اپنے کیریئر میں کوئی ترقی نہیں کی اور اس کی ذاتی زندگی ہمیشہ ایک معما بنی رہی۔

کیرن نے کھڑکی سے باہر سبزی کی تین کیاریوں کو دیکھا۔ اس سال بہت اچھی فصل ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر اطمینان پھیل گیا۔ اس ویران کاٹیج میں زندگی لوٹ آئی تھی۔

قاتل کمیٹی

طیب سنجرانی

کبھی کبھی انسان بغیر کسی ہتھیار کے بھی قتل ہوجاتا ہے کیونکہ... جب دل کا بوجھ حد سے بڑھ جائے تو اس سے بڑا قاتل اور کون ہوسکتا ہے۔ کچھ ایسا ہی دباؤ ان پر بھی تھا جس کے بوجھ تلے دب کر اس نے ہمت ہار دی۔

بساط سے بڑھ کر بار اٹھانے والوں کا انجام



یہ اس زمانے کا قصہ ہے جب بچے دودھ برتنوں میں دن میں دو تین بار لایا کرتے تھے۔ جب کوئی مہمان آیا بچے کو دوڑا دیا کہ بھاگ کر دودھ لے آئے اور اگر یہ عمل دن میں دوسری مرتبہ دہرایا جا رہا ہو تو ایک پاؤ چینی اور ایک پتی کی پڑیا بھی ساتھ آتی تھی کہ محبت زیادہ تھی بناوٹ کم۔ لوگ خوش زیادہ رہتے تھے اور فکرمند کم۔

انہی لوگوں میں ایک جگت ماموں ممانی بھی تھے جنہیں محلے کے سارے لوگ اسی تعلق سے پکارتے تھے۔ دونوں ملنسار، خوش اخلاق اور پُرتپاک رویّوں کے حامل تھے۔ ممانی بچوں کو قرآن پاک اور سیپارہ پڑھاتی تھیں۔ رمضان میں ہر جمعے کو صلوٰۃ التسبیح کا اہتمام ہوتا تھا۔ عام دنوں میں مہینے میں ایک بار قرآن خوانی کا ختم کراتی تھیں بعد میں محافل لوگوں کے

مل بیٹھنے کا ذریعہ بھی بن جاتی تھیں۔

ماموں درزی تھے، محلے بھر کے کپڑے سیتے تھے، بعد میں محلے کے معروف بازار میں دکان لے لی تھی۔ ممانی کا اخلاق اور عمومی رویہ بہترین تھا۔ سب کے دکھ درد میں کام آتی تھیں۔ ممانی کی کوئی سگی اولاد نہ تھی۔ عمر عزیز کا اچھا خاصا حصہ امید وبیم کی کیفیت میں گزارنے کے بعد ماموں ممانی نے ایک بچہ گود لے لیا جس کا نام عمران تھا جو ہر کام میں تیز، شرارتی، چالاک مگر پڑھائی میں کمزور اور یہ کمزوری آہستہ آہستہ نمایاں ہوتی جا رہی تھی لیکن ان سب کے باوجود زندگی مناسب طور پر گزر رہی تھی اور اسے دیکھ کر خوشی وطمانیت کا احساس ہوتا تھا۔

ممانی کے تمام رشتے دار ہندوستان میں رہائش پذیر تھے۔ وقت وحالات کے جبر نے ممانی کو اپنے رشتے داروں سے دور کر دیا تھا۔ اس دوری کی کسک ان کی گفتگو میں بھی پائی جاتی تھی۔

جب پہلی وہ بار ہندوستان گئیں تو جانے سے پہلے خوشی ان کے چہرے پہ رقصاں رہتی تھی اور نہ چاہتے ہوئے بھی دیکھنے والوں کو ایسا محسوس ہوتا کہ ممانی کوئی خوشی کا گیت گنگنا رہی ہیں۔

خیر ممانی ہندوستان چلی گئیں اور کئی ماہ بعد واپسی بھی ہو گئی لیکن درحقیقت واپسی کے بعد بھی واپسی نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ ذہنی طور پر ہندوستان میں ہی کہیں رہ گئی تھیں۔ اپنی بہنوں کی باتیں، اپنے اکلوتے بھائی کی باتیں۔ اس کی شادی کی تیاری کے حوالے سے منصوبہ سازی اور بہنوں کا ایک جیسے ملبوس پہننے کا پروگرام، غرض کہ پورا محلہ کافی عرصے تک ممانی کی ہندوستان یاترا سے مہکتا رہا۔

وقت کا دیوہیکل پرندہ ماہ وسال کو اپنے خوفناک پنجوں میں دبوچے پرواز کرتا رہا، اس دوران اڑوس پڑوس کے لوگ بھی بدل گئے۔ گھروں کے نقشے اور لوگوں کے مزاج بھی تبدیل ہو گئے نتیجتاً ممانی تنہا رہ گئیں۔

اس تنہائی کا سب سے بڑا المیہ یہ ہوتا ہے کہ اڑوس پڑوس کو اس کا ادراک نہیں ہو پاتا اور اگر ہو بھی جائے تو بہت تاخیر ہو چکی ہوتی ہے۔ شاید یہی ممانی کے ساتھ بھی ہوا۔ ہماری فیملی بڑے مکان اور چھوٹے دل کے ساتھ نئی جگہ منتقل ہو گئی۔ پرانے محلے اور پرانے لوگوں سے رابطہ پہلے کمزور پڑا اور پھر منقطع ہو گیا۔ تبدیلی سکونت کے بعد شروع شروع کی ملاقاتوں میں یہی تبصرہ سنتے اور کرتے تھے کہ وہ بھی کیسا اچھا وقت تھا جب سب مل کر کھیلتے تھے اور ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے تھے۔ آج کل حالات بدل گئے ہیں اور لوگ کیسے ہو گئے ہیں؟

حالانکہ ان کیسے لوگوں میں ہمارا کردار ہراول دستے کا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ پرانا محلہ، غربت، غریب پڑوسی بالکل اچھے نہیں لگتے۔

عرصہ دراز کے بعد بچپن کے ایک دوست توقیر سے ملاقات ہوئی۔ توقیر اب بھی اسی محلے میں رہتا تھا، اپنی بوڑھی ماں، بیوی اور سات بچوں کے ساتھ ویسے ہی ماحول میں بسا ہوا تھا۔

جب سے تعیشات اور خواہشات نے ضروریات مجبوری کی شکل اختیار کر لی ہے تب سے اس مہنگائی سے نبرد آزما ہونے کے لیے یا تو خصوصی فضل ربی یا غیر معمولی بے حسی درکار ہوتی ہے۔ یہی بے حسی مجھے توقیر کی شخصیت کے گرد ہالہ کیے ہوئے نظر آئی۔ پرانے تعلق کی ایک خرابی یہ بھی ہے کہ آدمی خیالات اور گفتگو متعین رخ پر برقرار نہیں رہ سکتی۔ بات شروع ہوئی تھی توقیر سے ملاقات سے، اس نے بتایا سب ویسے کا ویسا ہی ہے۔ بس عمران کا انتقال ہو گیا۔ ”کون عمران؟“

”ممانی کا عمران اور کون عمران؟“ توقیر نے جھلا کر جواب دیا۔

میں نے اس سے استفسار کیا...... ”کیسے؟“

جواب میں اس نے ایک دردناک واقعہ بیان کیا

”بھائی کی شادی میں شرکت کے لیے ممانی ہندوستان گئی تھیں۔ وہاں کسی وجہ سے بھائی کی شادی ملتوی ہو گئی اور ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں عمران کا انتقال ہو گیا۔ حالانکہ ایک مہینے تک عمران ہندوستان میں زیر علاج بھی رہا لیکن جانبر نہ ہو سکا اور وہیں انتقال کر گیا۔“ میں نے پوچھا۔

”ماموں ممانی کیسے ہیں......؟“ توقیر بولا۔

”ٹھیک ہیں، دونوں ویزے کی میعاد ختم ہونے کے بعد پاکستان واپس آ گئے اور آج کل پرانے گھر میں رہ رہے ہیں جہاں خاموشی کا راج ہے۔“ بات ختم کر کے توقیر نے بیرے کو بل لانے کا اشارہ کیا اور تھکے تھکے انداز میں ہاتھ جیب میں لے جانے لگا۔ میں نے دوسرے ہاتھ پر تسلی کی تھپکی دی اور بل کی ادائیگی اپنے ذمے لی۔ توقیر کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے آنے والی ممنونیت کی چمک نے مجھے دو احساس دلائے۔ ایک یہ کہ میرا بل دینے کا فیصلہ درست تھا کیونکہ مہنگائی واقعی اتنی بڑھ گئی ہے کہ دو کپ چائے اور کچھ لوازمات کے بل کی ادائیگی آئندہ دنوں میں بجٹ پر کیسے پریشان کن اثرات مرتب کرتی اس خیال نے توقیر کے ہاتھ کی حرکت سست رکھی۔ میرے دوبارہ تسلی دینے اور بل کی ادائیگی سے توقیر کے تناؤ زدہ اعصاب معمول پر آ گئے تھے۔ مجھے دوسرا احساس یہ ہوا کہ چائے پینے کی میری تجویز سے اس نے بادل ناخواستہ اتفاق

تھا لیکن اب وہ مطمئن تھا۔ یہ تمام خیالات سیلابی ریلے کی طرح ایک لمحے میں ادھر سے ادھر ہو گئے۔

وقت کے مہیب پرندے نے ایک اور جست بھری۔ کئی کیلنڈر پرانے ہو کر بچوں کی کاپیوں کے کور بن گئے۔ چند بچے یونیورسٹی، چند کالج، چند دنیا میں وارد ہوئے اور کچھ لوگ اپنی ابدی رہائش گاہوں میں مکین ہو گئے کہ زندگی اور وقت کا چلن یہی ہے۔ نامعلوم سے معلوم اور پھر نامعلوم کی جانب گامزن۔ ان ابدی رہائش گاہوں میں رہائش پذیر ہونے والوں میں ماموں بھی شامل تھے۔

یہ آگاہی مجھے ظفر سے ملی۔ ظفر بھی ان پرانے لوگوں میں شامل تھا جو کہ ابھی تک وہیں رہائش پذیر تھے۔ اگرچہ توقیر سے ملاقات کو کافی عرصہ بیت گیا تھا لیکن بل کی ادائیگی پر اس کی آنکھوں سے جھانکتی ممنونیت مجھے آج تک یاد ہے۔

توقیر اور ظفر سے ملاقاتوں کے درمیان برسوں حائل رہے، اخلاقیات کا معیار بھی بہت بدل گیا تھا۔ دل مزید پکے ہو گئے تھے، یا صحیح اصطلاح میں پتھرا گئے تھے۔ ظفر چائے کے ساتھ اور میں اس کی گفتگو کے ساتھ انصاف کرنے میں منہمک تھا۔ اس نے بتایا کہ ماموں کا عین چاندرات کو عید کی صبح انتقال ہوا تھا۔

”کیسے؟“ میں نے پوچھا۔

”یار ماموں کا ہارٹ فیل ہو گیا تھا۔“

”ہارٹ فیل!“ میں نے استعجاب سے پوچھا۔

”ہاں ہارٹ فیل......“

”مگر کیسے؟“ میں نے مزید وضاحت چاہی۔ ”کیا وہ بہت موٹے ہو گئے تھے؟“ کیونکہ میرے ذہن میں ماموں کا جو حلیہ تھا اس حلیے وضع قطع کے شخص کا ہارٹ فیل سمجھ سے بالاتر تھا۔ ماموں دھان پان سے دبلے پتلے آدمی تھے۔ سواری کے نام پر پہلے ان کی دو ٹانگیں تھیں پھر تھوڑی سی خوش حالی آئی تو انہوں نے ایک سائیکل لے لی تھی۔ کم خوراکی، پانچ وقت کی نماز، کم بولنا، اور ہر کسی سے خوش اخلاقی اور ملنساری سے ملنا۔ سب یہ ناقابل یقین تھا۔ ظفر نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

”تمہیں تو معلوم ہے ماموں درزی تھے۔ چاندرات کو کام کا رش بہت ہوتا ہے۔ وہ رمضان کا انتیسواں روزہ تھا اور امکان تھا کہ صبح عید ہو بھی سکتی ہے اور نہیں بھی۔ رویت ہلال کمیٹی کا اجلاس شروع ہوا، جب رات کے دس بج گئے اور رویت ہلال کمیٹی کی جانب سے چاند دیکھنے یا نہ دیکھنے کا کوئی اعلان نہیں ہوا تو عمومی طور پر یہ خیال زور پکڑ گیا کہ اس مرتبہ [illegible] کا ہوگا لہٰذا ماموں بھی اسی خیال کے تحت دکان بند کر کے گھر چلے آئے کہ تھوڑا سا آرام کر لیں پھر سحری کے وقت جا کر دکان کھول لیں گے اور نامکمل کام مکمل کر کے لوگوں میں عید کی خوشیاں بانٹنے میں معاون ثابت ہوں گے لیکن شومئی قسمت اس رات، رویت ہلال کمیٹی کے آپس کے اختلافات، یا کسی اور وجہ سے کمیٹی کا اجلاس طول پکڑ گیا اور رات تین بجے رویت ہلال کمیٹی نے چاند نظر آنے کا اعلان کر دیا۔

”واللہ عالم! کمیٹی کا اجلاس اتنا طویل کیوں ہوا؟ چاند نظر آنے کی شہادت اتنی دیر سے کہاں سے آئی؟ بہرحال! اس اعلان کے بعد ایسا لگا جیسے جادو کے زور سے سویا ہوا سارا شہر جاگ اٹھا ہو اور دیکھتے ہی دیکھتے بازار لوگوں سے بھر گئے۔

”ماموں بھی بھاگم بھاگ گھر سے دکان آئے اور وقت کے منہ زور گھوڑے کے ساتھ طبع آزمائی شروع کر دی لیکن ماموں کو زندگی میں اس احساس کی شدت نے آگھیرا کہ محلے پڑوس کے ان بچوں، جوانوں کو کیا منہ دکھاؤں گا کہ تمہارے کپڑے نہیں سل سکے اور عید تم لوگ بغیر نئے کپڑوں کے مناؤ کیونکہ رویت ہلال کمیٹی نے بند کمرے کے اجلاس میں چاند نظر آنے کی شہادت اتنی رات گئے کہاں سے پائی اور کیسے پائی؟ اسی سوچ بچار میں غلطاں ماموں کو سینے میں بائیں جانب تکلیف کا احساس ہوا۔ تکلیف دستک تو بہت دیر سے دے رہی تھی لیکن ماموں نے تنگی وقت کی بنا پر نظر انداز کر دیا کہ کسی طرح وقت کے منہ زور گھوڑے کو قابو کر کے لوگوں میں عید کی خوشیاں بانٹ سکیں لیکن کچھ دیر بعد تکلیف نے ایسی منہ زور دستک دی جس سے ماموں کے دل کے بند دروازے کھل گئے اور نماز فجر سے پہلے ماموں ہار جیت سے بے نیاز ہو کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ یہ طے ہے کہ بھلے ماموں اس عید پر لوگوں کو نئے کپڑے پہنانے میں معاون ثابت نہ ہوئے ہوں لیکن وہ خود نئے کپڑے پہن کر شاداں وفرحاں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔“

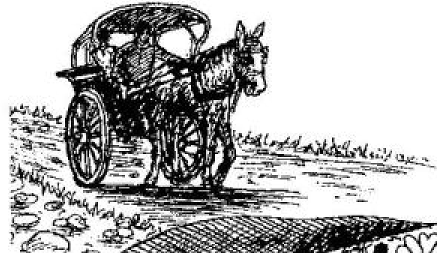
اس تمام تفصیل سے آگاہی کے بعد میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ”گویا ماموں کو قتل کیا گیا ہے۔“

”قتل!“ ظفر نے استعجاب سے پوچھا۔

”ہاں قتل!“ میں نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں جواب دیا۔

”قاتل کون ہے ماموں کا؟“ ظفر کا انداز اب بھی سوالیہ تھا۔ میں نے کہا۔

”کمیٹی قاتل ہے۔ جو آدھی رات کو پہلی کا چاند دیکھ لیتی ہے، بلکہ پورے ملک کو دکھا بھی دیتی ہے......“



مُک مُکا

ملک صفدر حیات

جس طرح عشق اور مشک کا چُھپنا ممکن نہیں ہوتا اسی طرح تعفن پر بھی لاکھ پردے ڈال دیے جائیں اپنا پتا ضرور دیتا ہے۔ یہی حال اس طاقتور شخص کا بھی تھا جسے اپنے اقتدار پر بڑا گھمنڈ تھا مگر جب دست قدرت کو جنبش ہوئی تو سارا گھمنڈ کانچ کے مانند زمیں بوس ہوگیا اور......... بالآخر مُک مُکے کی نوبت چلی آئی کیونکہ تکبّر کو ایک نہ ایک دن خاک میں ہی ملنا ہوتا ہے... یہی بات ملک صفدر ہمیشہ سے ہی چودھریوں کو سمجھاتے آئے ہیں مگر مجال ہے جو یہ بات ٹھوکر کھانے سے پہلے کسی کی سمجھ میں آگئی ہو۔

پولیس آفیسر کی یادوں سے ایک اور

ناقابل فراموش واقعہ

مراد پور کے نامراد چودھری نے میرے اختیار کو للکارا تھا۔ الیاس گھمن خاصا دُھری ٹائپ کا چودھری تھا۔ اس کے بارے میں مجھے جو اطلاعات ملتی رہتی تھیں، ان کے مطابق الیاس گھمن ایک ظالم، جابر اور دھونس دھاندلی کا ماہر چودھری تھا۔ مراد پور کے وسنیک اس کی غیر نصابی حرکتوں سے عاجز اور ناخوش تھے لیکن کوئی اس کے سامنے دم مارنے کی مجال نہیں رکھتا تھا چنانچہ اس کی چوری اور سینہ زوری کا کاروبار سرگرم تھا۔ میری معلومات کے مطابق وہ مجرموں کی پشت پناہی بھی کرتا تھا اور ڈاکوؤں کو پناہ بھی دیتا تھا۔ چودھری سے میرا براہِ راست واسطہ بشریٰ مرڈر کیس میں پڑا تھا اور پہلے ہی قدم پر الیاس گھمن نے میری تھانے داری کو چیلنج کر دیا تھا۔

ان دنوں میری تعیناتی ضلع لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کے ایک مضافاتی تھانے میں تھی۔ موضع مراد پور میرے تھانے سے صرف ایک میل کے فاصلے پر واقع تھا اور یہ گاؤں میرے تھانے کی حدود یعنی میری عمل داری میں آتا تھا۔ ایک روز میں حسبِ معمول تیار ہو کر تھانے پہنچا تو پتا چلا کہ مراد پور میں ایک عورت نے خودکشی کرلی ہے۔ میں نے اے ایس آئی نوید علی کو ساتھ لیا اور ہم ایک تانگے پر سوار ہو کر جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔

وہ ماہ مئی کا آغاز تھا۔ گرمی اپنے جوبن پر تھی۔ گندم کی فصل کی کٹائی ہوچکی تھی۔ مراد پور کے جس گھر میں عورت نے خودکشی کی تھی، وہ گاؤں کے آخری کنارے پر واقع تھا۔ میں وہاں پہنچتے ہی لاش کے معائنے میں مصروف ہوگیا۔

بشریٰ نامی اس عورت کی عمر پچیس سال کے آس پاس تھی۔ وہ درمیانے قد کی مالک ایک خوب صورت عورت تھی لیکن اس وقت وہ زندگی کی رعنائی سے محروم ہوچکی تھی۔ اس کی لاش چھت سے جھول رہی تھی۔ جی ہاں، بشریٰ نامی اس بدنصیب عورت نے چھت سے لٹک کر خودکشی کی تھی۔

یہ وہ تاثر تھا جو اس جھولتی ہوئی لاش کو دیکھ کر میرے

ذہن میں قائم ہوا تھا اور اس کا سبب وہ اطلاع تھی جسے سن کر میں تھانے سے یہاں پہنچا تھا لیکن یہ تاثر چند لمحات سے زیادہ پائیدار ثابت نہ ہوسکا۔ میری چھٹی حس نے مجھے باخبر کردیا کہ بشریٰ نے خودکشی نہیں کی بلکہ اسے قتل کیا گیا ہے۔

اس گھر میں کُل تین کمرے تھے۔ ایک کمرا گھر کے سامنے والے حصے میں تھا جو بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ دو کمرے پہلو بہ پہلو مکان کے عقبی حصے میں تعمیر کیے گئے تھے جن میں سے ایک بڑا کمرا رہائشی تھا جبکہ دوسرا بارہ ضرب بارہ فٹ کا چھوٹا کمرا اسٹور روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس کمرے میں زراعت میں استعمال ہونے والے مختلف آلات اور دیگر کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا اور اسی کمرے کے شہتیر سے بشریٰ کی لاش لٹک رہی تھی۔ مجھے جس بات نے چونکنے پر مجبور کیا اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے......

مذکورہ اسٹور روم کی فرش سے چھت تک اونچائی کم وبیش ساڑھے دس فٹ تھی۔ بشریٰ کا قد سوا پانچ اور ساڑھے پانچ فٹ کے درمیان رہا ہوگا۔ شہتیر سے بشریٰ کی گردن تک رسّی کی لمبائی تقریباً دو فٹ تھی۔ متوفی بشریٰ کے جھولتے ہوئے پاؤں کے نیچے ایک چوبی اسٹینڈ رکھا دکھائی دیتا تھا۔ یہ اسٹینڈ پانی کے مٹکے رکھنے کے لیے استعمال ہوتا لیکن اس وقت مذکورہ اسٹینڈ پر مٹکے موجود نہیں تھے۔ اس اسٹینڈ کی اونچائی لگ بھگ دو فٹ تھی اور میرے لیے الجھن وحیرت کا باعث یہ امر تھا کہ متوفی کے پاؤں اور چوبی اسٹینڈ کے بیچ ایک فٹ کا خلا موجود تھا۔

نمبر ایک، متوفی کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ چوبی اسٹینڈ کے اوپر کھڑے ہوکر چھت کے شہتیر کے ساتھ پھانسی کے لیے رسی باندھتی۔ کمرے میں ایسا کوئی دوسرا ذریعہ بھی نظر نہیں آرہا تھا کہ خیال کیا جاتا، متوفی نے اس ذریعے کے اوپر کھڑے ہوکر چھت تک رسائی حاصل کی ہوگی لہٰذا یہ بات طے ہوگئی کہ پھانسی کا یہ پھندا متوفی نے خود تیار نہیں کیا تھا۔

نمبر دو، اپنے ہاتھوں خود اپنی جان لینے والے افراد جب پھانسی کا ذریعہ اختیار کرتے ہیں تو وہ پھانسی کے پھندے کو اپنی گردن میں فٹ کرنے کے لیے کسی کرسی یا کسی میز یا کسی اسٹول یا اسی قسم کی کسی چیز کا استعمال کرتے ہیں اور موت کو گلے لگانے سے پہلے وہ پاؤں کی ٹھوکر سے اس چیز کو گرا دیتے ہیں تاکہ ان کا بدن پھندے پر لٹک سکے۔ ایسی صورت میں خودکشی کے خواہش مند انسان کے جسم کے بوجھ سے پھانسی کا پھندا گردن کو اس سختی سے اپنی گرفت میں جکڑ لیتا ہے کہ سانس کی آمدوشد کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ علاوہ ازیں پاؤں کے نیچے سے کھڑے ہونے کا سہارا نکلتے ہی بدن کے بوجھ سے گردن کو ایسا خطرناک جھٹکا لگتا ہے کہ آنِ واحد میں اس بدنصیب کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کرجاتی ہے۔ جائے وقوعہ پر نہ تو مٹکوں کا اسٹینڈ الٹا دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی کوئی اور ایسی شے نظر آتی تھی۔ یہ صورت حال بتاتی تھی کہ بشریٰ نے خود اپنی جان نہیں لی بلکہ اسے کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت پھانسی دے دی گئی تھی۔

نمبر تین، اس امکان کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا کہ بشریٰ کو پہلے قتل کیا گیا ہو اور بعدازاں اس کی موت کو خودکشی کا رنگ دینے کے لیے اسے پھانسی پر لٹکا دیا گیا ہو۔ اس امکان میں مجھے زیادہ جان نظر آتی تھی۔ میں نے متوفی کے شوہر کی مدد سے اس کی لاش کو نیچے اتارا پھر اس کے ابتدائی معائنے میں مصروف ہوگیا۔

بدقسمت بشریٰ کے ہاتھ پاؤں، چہرے، سر اور جسم کے دیگر کھلے ہوئے حصوں پر مجھے کسی ایسی چوٹ یا زخم کا نشان نظر نہیں آیا جو اس کی موت کا سبب بن سکتا ہوتا ہم اس کے لباس کی بےترتیبی سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے ساتھ کسی نوعیت کی زورزبردستی کی گئی تھی۔ میں اس کے کپڑوں کے نیچے بدن کو چیک نہیں کرسکتا تھا اور نہ ہی یہ جان سکتا تھا کہ کہیں اسے زہر دے کر تو موت کے گھاٹ نہیں اتارا گیا؟ میرے ان تمام تر سوالات کے جوابات پوسٹ مارٹم رپورٹ ہی دے سکتی تھی۔

میں نے اے ایس آئی سے کہا۔ ”نوید! تم بشریٰ کی لاش کو لے کر ضلعی اسپتال روانہ ہوجاؤ۔ میں موقع کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد تھانے آرہا ہوں۔“

”ٹھیک ہے ملک صاحب۔“ وہ فرماں برداری سے بولا۔ ”میں یہ تانگا لے جاؤں یا لاش کو ڈسٹرک ہاسپٹل پہنچانے کے لیے کوئی اور بندوبست کروں؟“

”تم تانگا لے جاؤ۔“ میں نے کہا۔ ”میں کسی اور ذریعے سے واپس آجاؤں گا۔“

اے ایس آئی اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ میں متوفی کے شوہر اصغر علی کو لے کر گھر کے صحن میں ایک سایہ دار درخت کے نیچے چارپائی پر بیٹھ گیا۔ یہ کُل دو افراد کا خاندان تھا یعنی متوفی بشریٰ اور اس کا خاوند اصغر علی...... لہٰذا سب سے پہلے مجھے اصغر علی ہی سے پوچھ گچھ کرنا تھی۔ جب کسی گھر میں صرف دو افراد رہائش پذیر ہوں اور ان میں سے کسی ایک کی پراسرار موت واقع

ہوجائے تو دوسرے فرد کی ذات مثبت اور منفی دونوں زاویوں سے بہت زیادہ اہمیت اختیار کرجاتی ہے۔ موجودہ کیس بھی ایسی ہی حیثیت کا حامل تھا۔

اصغر علی کی عمر تیس کے قریب تھی۔ وہ ایک دبلا پتلا اور دراز قامت شخص تھا۔ اس کا قد اور جسامت آپس میں لگا نہیں کھاتے تھے چنانچہ اصغر علی کو اگر لم ڈھینگ کہا جائے تو بےجا نہ ہوگا۔ ان کی شادی کو لگ بھگ تین سال ہوئے تھے لیکن ابھی تک ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اصغر علی ایک معمولی سا زمیندار تھا۔ مراد پور میں اس کی آٹھ کلے (ایکڑ) زرعی اراضی تھی۔ بیوی کی حسرت ناک موت نے اصغر علی کو بہت افسردہ کردیا تھا۔

قبل اس کے کہ میں اصغر سے سوال وجواب کا سلسلہ شروع کرتا، مجھے بتایا گیا کہ چودھری صاحب مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ اطلاع دینے والے شخص کی مراد چودھری الیاس گھمن سے تھی۔ میں اصغر کو گھر کے اندر چھوڑ کر باہر نکل آیا۔ چودھری الیاس گھمن مجھے اس تانگے کے نزدیک کھڑا نظر آیا جس پر سوار ہوکر ہم یہاں پہنچے تھے اور اے ایس آئی نوید اسی تانگے کے ذریعے بدبخت بشریٰ کی لاش کو ضلعی اسپتال پہنچانے والا تھا۔

چودھری اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ دو تین ہٹے کٹے نمک خوار بھی دکھائی دے رہے تھے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد چودھری مجھے ایک طرف لے گیا اور بڑے گمبھیر انداز میں بولا۔ اس کے لہجے میں خاصی بیزاری پائی جاتی تھی۔

”ملک صاحب! یہ تو ایک دن ہونا ہی تھا۔ میں جانتا تھا، کبھی نہ کبھی اصغر کی غیرت ضرور جاگے گی۔ شریف بندہ ہے۔ جب تک ممکن ہوا اس نے برداشت کیا۔ جب ہمت جواب دے گئی تو...... آہ! بشریٰ کا یہی انجام ہونا تھا......“

چودھری کی باتوں نے مجھے الجھن میں ڈال دیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”چودھری صاحب! آپ کی باتیں میرے سر کے اوپر سے گزر گئی ہیں۔ میرے کچھ پلے نہیں پڑا۔ جو بھی کہنا ہے، کھل کر کہیں۔“

”ملک صاحب! بشریٰ کوئی اچھے کردار کی عورت نہیں تھی۔“ وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”اصغر علی بہت ہی سیدھا آدمی ہے۔ یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی نظرانداز کرتا رہا مگر مجھے تو یہ خودکشی کا واقعہ نہیں لگتا۔ آپ کا مشاہدہ کیا کہتا ہے؟“

”میں آپ کے خیال سے اتفاق کرتا ہوں چودھری صاحب۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”میرے اندازے کے مطابق بشریٰ کو قتل کرنے کے بعد پھانسی پر لٹکایا گیا ہے۔“

”اللہ آپ کا بھلا کرے۔ مجھے شک نہیں بلکہ یقین ہے کہ یہ کام اصغر کے سوا کسی اور کا نہیں ہوسکتا۔“

”ہوں......“ میں نے سوچتی ہوئی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”جو بھی ہے، پوسٹ مارٹم رپورٹ میں کھل کر سامنے آجائے گا۔“

”آپ موقع کی کارروائی ضرور کریں اور ابتدائی تفتیش میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔“ وہ مجھے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ”لیکن میں سمجھتا ہوں، بشریٰ کی لاش کی چیرپھاڑ کی ضرورت نہیں۔ آپ رسمی سی کارروائی کرکے لاش اصغر کے حوالے کردیں۔ یہ بےچارہ پہلے ہی بہت دکھی ہے۔ پوسٹ مارٹم کے بعد ذلت ورسوائی کی جو کہانیاں منظرِعام پر آئیں گی، وہ اصغر کو جیتے جی مار ڈالیں گی۔ بشریٰ نے تو خودکشی نہیں کی لیکن مجھے یقین ہے کہ بدنامی کے بوجھ تلے دب کر اصغر ضرور اپنی جان سے کھیل جائے گا۔“

”آپ بھی میری طرح ہی سوچتے ہیں کہ بشریٰ نے خودکشی نہیں کی۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”بلکہ آپ کی سوچ مجھ سے دس ہاتھ آگے ہے۔ آپ کو یقین ہے کہ اس کی موت میں اصغر کا ہاتھ ہے۔ قاتل چاہے کتنا بھی دکھی، مجبور اور لاچار کیوں نہ ہو، میں اس کے جرم کی پردہ پوشی نہیں کرسکتا لہٰذا بشریٰ کی لاش کا پوسٹ مارٹم تو لازمی ہوگا اور اگر اصغر اپنی بیوی کی موت کا ذمے دار ہے تو اسے قرار واقعی سزا بھی ملے گی۔“

وہ چند لمحات تک متذبذب نظر سے مجھے تکتا رہا پھر قدرے خفگی بھرے لہجے میں بولا۔ ”آپ میری بات سمجھ نہیں رہے......“

”میں سب سمجھ رہا ہوں چودھری صاحب۔“ میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ”میں اس ڈیپارٹمنٹ میں کوئی نیا نہیں آیا ہوں۔ میں اپنے کام کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ کس قسم کی صورتِ حال میں مجھے کون سا قدم اٹھانا چاہیے۔ اس بات کو تو آپ اپنے ذہن سے نکال دیں کہ میں بشریٰ کی لاش کا پوسٹ مارٹم کرانے سے باز آجاؤں گا۔“

میرے اٹل انداز نے اسے گہری سوچ میں ڈال دیا۔ چند لمحات تک وہ مجھے ٹٹولتی ہوئی نظر سے گھورتا رہا پھر مصلحت آمیز لہجے میں بولا۔ ”آپ موقع کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد میری حویلی پر تشریف لائیں۔ مجھے آپ

سے بہت سی ضروری باتیں کرنا ہیں پھر ساری صورتِ حال آپ اچھی طرح سمجھ جائیں گے۔"

اس امر میں تو کسی شک وشبے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ چودھری الیاس گھمن بشریٰ کی لاش کا پوسٹ مارٹم رکوانے کی کوشش کر رہا تھا۔ چودھری کی جو شہرت مجھ تک پہنچی تھی اس کی روشنی میں، میں غلطی سے بھی یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ اس کے دل میں اصغر علی کے لیے ہمدردی کے جذبات کے دریا بہہ رہے ہوں گے یقیناً اس کوشش میں اس کا کوئی ذاتی مفاد چھپا ہوا تھا۔

"ضرور چودھری صاحب۔" میں نے اسے ٹالنے کی غرض سے کہا۔ "میں ادھر سے فارغ ہوتے ہی سیدھا آپ کی حویلی آؤں گا۔"

وہ واپس اپنے حواریوں کی جانب بڑھ گیا۔ نوید علی کو میں نے ہدایات دیں۔ "لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال پہنچانا ہے۔"

"بس جناب، میں لاش کو تانگے پر رکھوا رہا ہوں۔" وہ چاق وچوبند لہجے میں بولا۔ "سمجھیں، میں زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔"

"دس منٹ میں نہیں۔" میں نے چودھری الیاس گھمن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "جب تک یہ لوگ نگاہ سے اوجھل نہیں ہو جاتے، تم ایسا ظاہر کرنا جیسے تمہارا لاش اٹھانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے یعنی چودھری الیاس گھمن کو یہ تاثر ملنا چاہیے کہ میں نے لاش کے پوسٹ مارٹم کا پروگرام کینسل کر دیا ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

"اچھی طرح سمجھ گیا ملک صاحب۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "آپ بے فکر ہو کر اپنا کام نمٹائیں۔ میں بڑی صفائی سے متوفی کی لاش کو اسپتال پہنچا دوں گا۔"

میں مطمئن ہو کر اصغر علی کے پاس آ گیا۔ اس دوران میں اصغر نے صحن میں درخت کی چھاؤں میں بچھی چارپائی کے نزدیک ہی میرے لیے ایک کرسی رکھ دی تھی۔ میں نے مذکورہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔

"اصغر علی! مجھے تمہاری بیوی کی موت کا بہت دکھ ہے۔ میرا تم سے یہ وعدہ ہے کہ میں بہت جلد بشریٰ کے قاتل کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دوں گا۔"

"قاتل کو......" اس نے حیرت بھری الجھن سے مجھے دیکھا اور بے حد پریشان لہجے میں بولا۔ "تھانے دار صاحب! بشریٰ نے تو خودکشی کی ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں، اس نے چھت سے لٹک کر اپنی جان دے دی ہے۔"

مجھے اصغر کی بے وقوفی نما سادگی کا یقین آ گیا۔ جو اہم بات میں نے اور الیاس گھمن نے لاش کو ایک نظر دیکھتے ہی بھانپ لی تھی وہ اس بدھو اصغر کی سمجھ میں بالکل نہیں بیٹھی تھی۔

وہ میرے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا حیران اور پریشان صورت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے نرمی بھرے انداز میں چارپائی کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آرام سے بیٹھ جاؤ پھر بات کرتے ہیں۔"

اس نے میرے حکم کی تعمیل کی پھر سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

"اگر تم سمجھتے ہو کہ بشریٰ نے خودکشی کی ہے تو تمہارا اندازہ بالکل غلط ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنی بات کو آگے بڑھایا۔ "میرا پیشہ ورانہ تجربہ یہ کہتا ہے کہ تمہاری بیوی کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد پھانسی دی گئی ہے تاکہ تاثر یہی ابھرے کہ بشریٰ نے خودکشی کی ہے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میرے اس اندازے کی تصدیق کر دے گی۔ کل شام تک دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔"

اس کے چہرے پر خدشات اور پریشانی کے ملے جلے تاثرات نمودار ہوئے۔ وہ بے یقینی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "لیکن...... بشریٰ نے کسی کا کیا بگاڑا ہے؟ کوئی اسے کیوں قتل کرے گا؟"

"یہ دونوں سوال تو مجھے تم سے پوچھنا چاہئیں۔" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے تیکھے لہجے میں کہا۔

"مجھ سے کیوں تھانے دار صاحب......؟" وہ فکرمندی سے بولا۔

"تم سے اس لیے کہ بشریٰ تمہاری بیوی تھی۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "اور اس گھر میں کوئی درجن بھر افراد تو رہائش پذیر ہیں نہیں جو میں ایک ایک سے پوچھ پرتیت کرتا پھروں۔"

"میں سوہنے رب کی قسم کھا کر کہتا ہوں تھانے دار صاحب۔" وہ ملتجیانہ انداز میں بولا۔ "میں بشریٰ کی موت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

"لیکن میں تمہاری بات پر اعتبار نہیں کر سکتا۔" میں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "میں ہرگز یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ ایک چھت کے نیچے دو افراد رہ رہے ہوں، ان میں سے ایک کو

موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد پھانسی پر لٹکا دیا جائے اور دوسرے کو کانوں کان خبر نہ ہو......" لمحاتی توقف کر کے میں نے ٹٹولتی ہوئی نظر سے اسے دیکھا پھر سنسناتے ہوئے لہجے میں اضافہ کیا۔

"اصغر علی! ابھی تو میں بڑے پیار اور بڑی شرافت کے ساتھ تم سے پوچھ گچھ کر رہا ہوں، لہٰذا جو بھی حقیقت ہے، مجھے صاف صاف بتا دو۔ اگر میں سختی پر اتر آیا تو تمہارے لیے جان چھڑانا مشکل ہو جائے گی۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں تھانے دار صاحب۔ آپ میری بات کا یقین کریں۔" وہ رونی صورت بنا کر بولا۔ "بشریٰ کے ساتھ پچھلی رات کیا واقعہ پیش آیا، مجھے اس کی مطلق خبر نہیں ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا...... ! تمہیں بشریٰ کو پیش آنے والے سنگین حالات کی خبر کیوں نہ ہوئی؟" میں نے تیز نظر سے اسے گھورا۔ "گھر میں اتنا بڑا واقعہ رونما ہو گیا اور تم گدھے گھوڑے بیچ کر غفلت کی نیند سوتے رہے۔"

"جناب! میں تو پچھلی رات گھر میں تھا ہی نہیں۔" وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ "مجھے تو خود آج صبح بشریٰ کی موت کا پتا چلا ہے اور میں ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا کہ اس نے چھت سے لٹک کر خودکشی کی ہے۔"

میں نے فروعی باتوں کو نظرانداز کرتے ہوئے نہایت ہی اہم سوال کیا۔ "تو کیا گزشتہ رات تمہاری بیوی گھر میں اکیلی ہی تھی؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ "تم پچھلی رات کہاں تھے؟"

"میں فرید نگر گیا ہوا تھا۔" اس نے بتایا۔

موضع فرید نگر، مراد پور سے دس میل کے فاصلے پر واقع ایک گاؤں تھا۔ میں نے اصغر سے استفسار کیا۔

"تم فرید نگر کیا لینے گئے تھے؟"

"وہاں پر میرا ایک دوست ہے...... مہر سلیم۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "میں نے اس سے کچھ رقم لینا تھی۔ ارادہ یہی تھا کہ رات کو واپس آ جاؤں گا لیکن مہر سلیم نے مجھے زبردستی اپنے پاس روک لیا اور آج صبح جیسے ہی ہلکا سا اجالا ہوا، میں فرید نگر سے نکل آیا اور یہاں آ کر......" بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔ چند لمحات کے توقف کے بعد وہ ادھوری بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"مجھے کیا پتا تھا کہ میری غیر موجودگی میں بشریٰ کے ساتھ اتنا بڑا واقعہ پیش آ جائے گا۔ میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ جب میں فرید نگر سے لوٹوں گا تو اپنی بیوی کی جھولتی ہوئی لاش سے میرا سامنا ہو گا۔"

ان لمحات میں میرے ذہن میں الیاس گھمن کے کہے ہوئے الفاظ گردش کر رہے تھے۔ الیاس گھمن کا خیال تھا بلکہ اسے یقین تھا کہ بشریٰ کی موت میں اصغر کا ہاتھ ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ بشریٰ کا چال چلن ٹھیک نہیں تھا اور اصغر نے غیرت میں آ کر اپنی بیوی کا کام تمام کر دیا۔

اگرچہ میں نے الیاس گھمن کی بات پر من وعن بھروسا نہیں کیا تھا لیکن ان امکانات کو یکسر مسترد بھی نہیں کیا تھا۔

"تم یہ نہیں سمجھنا کہ میں آنکھیں بند کر کے تمہاری سنائی ہوئی کہانی کو سچ مان لوں گا۔" میں نے کڑی نظر سے اصغر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں اپنے کسی خاص بندے کو فرید نگر بھیج کر مہر سلیم سے تمہارے بیان کے ایک ایک حصے کی تصدیق کروں گا۔"

"آپ ضرور تصدیق کریں تھانے دار صاحب۔" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ "میں نے آپ سے کوئی غلط بیانی نہیں کی۔ مہر سلیم آپ کو بتائے گا کہ اس نے ضد کر کے مجھے اپنے پاس روک لیا تھا۔ آپ کو اس بات کا ثبوت مل جائے گا کہ پچھلی رات میں نے فرید نگر میں مہر سلیم کے ساتھ گزاری ہے۔"

اسی لمحے اے ایس آئی نوید علی میرے پاس آیا اور آنکھوں کے اشارے سے بتایا کہ وہ بشریٰ کی لاش کو ضلعی اسپتال لے کر جا رہا ہے۔ میں نے بھی جواباً اشارے ہی سے اسے جانے کی اجازت دے دی پھر اصغر کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"تم نے مہر سلیم سے کتنی رقم لینا تھی؟"

"دو ہزار روپے۔" اس نے بتایا۔ "مہر سلیم نے گندم کی کٹائی کے بعد رقم کی واپسی کا وعدہ کر رکھا تھا اسی لیے میں کل رقم کی وصولی کے لیے فرید نگر گیا تھا۔"

"کیا مہر سلیم نے وہ رقم واپس کر دی؟"

"جی......" اس نے مختصر جواب دیا۔

"کیا اس وقت رقم تمہارے پاس ہے؟"

اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

"مجھے دکھاؤ۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

آئندہ ایک منٹ کے اندر اس نے میرے حکم کی تعمیل کر دی۔ اصغر علی نے دو ہزار روپے کی رقم کو تین چار جگہ پر تقسیم کر کے اپنے لباس کی مختلف جیبوں میں چھپا رکھا تھا۔ اس نے رقم کو ایک جگہ جمع کر کے گنا اور میری طرف

بڑھاتے ہوئے بولا۔
''آپ بھی گن کر اپنی تسلی کر لیں۔''
''تمہارے ہاتھوں اور میری نگاہ نے ایک ساتھ دو ہزار روپے گنے ہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس رقم کو تم اپنے پاس محفوظ کر لو اور مجھے بتاؤ کہ تم فرید نگر کس ذریعے سے گئے تھے؟''
''اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر جی۔'' وہ سادگی سے بولا۔ ''اور اسی گھوڑے پر واپس بھی آیا ہوں۔''
''کیا ادھر مراد پور میں تمہاری یا بشریٰ کی کسی سے کوئی دشمنی وغیرہ ہے؟''
''بالکل نہیں جناب۔'' وہ قطعی انداز میں بولا۔
میں نے ایک نازک پہلو کو چھیڑتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ''کیا تمہیں اپنی بیوی سے کسی قسم کی کوئی خاص شکایت تھی؟''
چند لمحے تذبذب کا شکار رہنے کے بعد اس نے گول مول جواب دیا۔ ''تھانے دار صاحب! آپ کو تو پتا ہی ہے کہ میاں بیوی کے بیچ تھوڑی بہت نوک جھوک کا سلسلہ تو چلتا ہی رہتا ہے۔''
''میں معمولی نوک جھوک کی بات نہیں کر رہا۔'' میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔
''پھر......پھر......؟'' وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے تکنے لگا۔
''کوئی ایسی شکایت جسے سن کر مرد کا خون کھول اٹھے۔'' میں نے اپنے استفسار کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''شوہر کو ایسا محسوس ہو کہ بیوی نے اس کی ناک کٹوا دی ہے، اس کی عزت کو خاک میں ملا دیا ہے اور......پھر طیش میں آ کر شوہر کوئی بھی انتہائی سنگین قدم اٹھانے پر مجبور ہو جائے اور......وہ اپنی بیوی کی جان لینے سے بھی دریغ نہ کرے۔''
''مجھے بشریٰ سے ایسی کوئی شکایت نہیں تھی۔'' وہ ایک افسردہ سی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''حالانکہ میں نے بعض لوگوں کو اشاروں کنایوں میں اس کے کردار پر انگلیاں اٹھاتے دیکھا تھا لیکن میں نے کبھی ایسی باتوں پر یقین نہیں کیا۔ مجھے اس بات کا اطمینان تھا کہ بشریٰ نے کبھی مجھ سے بے وفائی نہیں کی اور جہاں تک لوگوں کی... چہ میگوئیوں کی بات ہے تو......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے مضمحل نظر سے مجھے دیکھا اور گہری سنجیدگی سے بولا۔
''پیٹھ پیچھے تو لوگ بادشاہوں کو بھی گالیاں دیتے ہیں۔''
''تمہاری بات میں وزن ہے اصغر علی۔'' میں نے تصدیقی انداز میں کہا۔
ابھی تک اصغر سے میری جتنی بھی گفتگو ہوئی تھی، اس کی روشنی میں میرا پیشہ ورانہ تجربہ یہ کہتا تھا کہ وہ ایک سادہ دل انسان تھا۔ اگر کسی بھی حوالے سے بشریٰ کی موت میں اس کا ہاتھ ہوتا تو میں کہیں نہ کہیں اس کے رویّے یا ردعمل سے ضرور بھانپ لیتا۔ مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر اس نے استفسار کیا۔
''تھانے دار صاحب! بشریٰ کو پیش آنے والے واقعے کے حوالے سے کہیں آپ مجھ پر تو شک نہیں کر رہے......؟''
''اصغر علی! تمہارے سوال کا سیدھا سا جواب تو یہ ہے......ہاں!'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں جس محکمے سے تعلق رکھتا ہوں وہاں کسی بھی معاملے کی تفتیش کے لیے ''شک'' کی بڑی اہمیت ہے۔ جب تک بشریٰ کی پوسٹ مارٹم رپورٹ نہیں آ جاتی، تمہاری ذات شک کے دائرے کے اندر ہی رہے گی اور اگر یہ رپورٹ تمہارے خلاف جاتی ہوئی نظر آئی تو پھر دنیا کی کوئی طاقت تمہیں سزا سے نہیں بچا سکے گی۔''
''میں نے کوئی جرم نہیں کیا تھانے دار صاحب۔'' وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔ ''لہٰذا میرے دل میں کسی بھی قسم کا ڈر خوف نہیں ہے۔ اللہ میرے حق میں بہتر کرے گا۔''
''اللہ تو ہمیشہ بہتر ہی کرتا ہے اصغر علی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔
وہ بے تاثر نظر سے مجھے دیکھتا چلا گیا۔ میں نے ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا۔ ''یہ الیاس گھمن کیسا بندہ ہے؟''
''وہ ہمارے گاؤں کے چودھری صاحب ہیں جناب۔'' وہ بے حد محتاط لہجے میں بولا۔
''یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ الیاس گھمن موضع مراد پور کا چودھری ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ اس پنڈ میں بسنے والے لوگوں کا آقا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''
''میں کیا جواب دوں تھانے دار صاحب۔'' وہ بے بسی سے بولا۔ ''چودھری صاحب ہم سب کے مالک ہیں۔ وہ ہمارے بڑے ہیں۔ ہم ان کے سامنے کیسے کچھ بول سکتے ہیں......''
''سب کا مالک تو وہ ذاتِ پاک ہے جو کُل کائنات کا خالق اور ہر ذی روح کا رازق ہے۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''ویسے تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے۔''
''کیسی خوش خبری تھانے دار صاحب؟'' وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

''جس الیاس گھمن کو تم اس گاؤں کا مالک سمجھ رہے ہو، اس کے دل میں تمہارے لیے بڑی ہمدردی پائی جاتی ہے۔'' میں نے معنی خیز انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''تھوڑی دیر پہلے تمہارے گھر کے باہر چودھری سے میری بات چیت ہوئی ہے۔ مجھے وہ تمہارے لیے خاصا فکر مند نظر آیا ہے۔ اس نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ میں ایسا کوئی بھی قدم نہ اٹھاؤں جس سے تمہارے لیے کوئی مشکل کھڑی ہو جائے۔''
میں نے اشاروں کنایوں میں اصغر علی سے کچھ اگلوانے کی کوشش کی تھی لیکن مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ حد سے زیادہ سیدھا ہے۔ اس نے میرے استفسار کے جواب میں دھیرے سے کہا۔
''یہ تو چودھری صاحب کی مہربانی ہے جناب......!''
میں مزید تھوڑی دیر اصغر علی کے پاس بیٹھ کر اسے کھنگالنے کی کوشش کرتا رہا کہ شاید مجھے کوئی ایسا اشارہ مل جائے جس سے میں بشریٰ کی موت کا معما حل کر سکوں لیکن سردست مجھے اس کوشش میں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ میں نے اصغر کو ضروری ہدایات دیں اور اس کے گھر سے نکل آیا۔
اصغر علی کے گھر کے سامنے ایک تانگا تیار کھڑا تھا۔ مجھے گھر سے باہر نکلتے دیکھا تو اس تانگے کا کوچوان تیزی سے چلتے ہوئے میرے نزدیک آ گیا اور بڑے ادب سے بولا۔
''تھانے دار صاحب! میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔ آپ کے اے ایس آئی صاحب نے میری ڈیوٹی لگائی ہے کہ میں آپ کو تھانے پہنچا دوں۔''
چودھری الیاس گھمن نے مجھ سے فرمائش کی تھی کہ میں جائے وقوعہ کی کارروائی سے فارغ ہونے کے بعد اس کی حویلی جاؤں۔ وہ اس واقعے کے حوالے سے مجھ سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن میرا اس کی حویلی پر جانے کا کوئی موڈ نہیں تھا لہٰذا میں تانگے پر سوار ہو کر تھانے کی سمت روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

چودھری الیاس گھمن نے بڑے واضح انداز میں مجھے بشریٰ کی لاش کا پوسٹ مارٹم کرانے سے منع کیا تھا۔ اس کے پیچھے اس کا کون سا مقصد کارفرما تھا، اس بارے میں فی الحال مجھے کوئی درست اندازہ نہیں تھا۔ میں نے چودھری سے ہونے والی گفتگو سے جو نتیجہ اخذ کیا یا یوں سمجھ لیں کہ میں نے اس کی باتوں سے جو تاثر لیا، وہ یہ تھا کہ چودھری اصغر علی سے گہری ہمدردی جتانے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ متوفی بشریٰ کے لیے چودھری کے ہر انداز سے خفگی اور ناپسندیدگی جھلکتی تھی۔ میں نے سردست یہی فیصلہ کیا تھا کہ پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ آنے کے بعد ہی میں الیاس گھمن سے تفصیلی ملاقات کروں گا۔
تھانے میں آنے کے بعد میں روزمرہ کے کاموں میں اس قدر مصروف ہو گیا تھا کہ مجھے وقت کے گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ جب میں تھانے پہنچا تو اس وقت ظہر کی اذان ہو رہی تھی۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق تب تک نوید علی کو اسپتال سے واپس آ جانا چاہیے تھا مگر وہ مجھے تھانے میں کہیں نظر نہیں آیا تھا پھر میں کام میں لگ گیا تھا۔ لگ بھگ عصر کے وقت مجھے تشویش نے گھیر لیا کیونکہ ابھی تک اے ایس آئی کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔
مراد پور سے میرے تھانے کا فاصلہ صرف ایک میل تھا اور تھانے سے سرکاری اسپتال محض آدھے میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ اسپتال میں چاہے کتنی بھی دیر لگتی، ہر حال میں نوید کو اب تک تھانے پہنچ جانا چاہیے تھا مگر اس کا دور دور تک کچھ پتا نہیں تھا۔
اس صورتِ حال میں، میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے فوراً دو ہوشیار قسم کے پولیس اہلکاروں کو سرکاری اسپتال کی سمت دوڑا دیا تاکہ وہ اے ایس آئی کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کریں۔ نوید علی سے میں کسی غفلت اور کوتاہی کی توقع نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ایک تجربہ کار پولیس اہلکار اور میرے بھروسے کا بندہ تھا۔
آدھا میل کوئی فاصلہ نہیں ہوتا۔ وہ دونوں اہلکار گھوڑوں کو سرپٹ بھگاتے ہوئے تھانے سے روانہ ہوئے تھے اور واپسی کا سفر بھی انہوں نے ایسی ہی تیز رفتاری سے طے کیا تھا۔ وہ دونوں شام سے پہلے میرے سامنے موجود تھے۔
ان کے اترے ہوئے چہروں نے میری تشویش میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا۔ میں نے باری باری ان کی لٹکی ہوئی صورتوں کا جائزہ لیا اور سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔
''نوید علی کی کیا خبر ہے؟''
بولنے سے پہلے انہوں نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر ایک نے گمبھیر انداز میں بتایا۔
''ملک صاحب! کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔''
''بجھارتیں نہیں ڈالو۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''مجھے کھل کر بتاؤ، اے ایس آئی کے ساتھ کیا ہوا ہے؟''
''اسپتال سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق نوید علی وہاں پہنچا ہی نہیں۔'' دوسرے کانسٹیبل نے جواب دیا۔

”نوید اسپتال نہیں پہنچا......کیا مطلب؟“ کانسٹیبل کی فراہم کردہ اطلاع نے مجھے اچھلنے پر مجبور کردیا تھا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو......ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟“

”ایسا ہی ہوا ہے ملک صاحب۔“ پہلے والے کانسٹیبل نے قدرے زور دے کر کہا۔ ”یہی حقیقت ہے کہ اے ایس آئی نوید اسپتال نہیں پہنچا۔ وہ لوگ ہم سے بھلا غلط بیانی کیوں کریں گے۔“

”اگر نوید اسپتال نہیں پہنچا تو پھر کہاں چلا گیا......؟“ میں کرسی سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ”اور بشریٰ کی لاش کا کیا ہوا......؟“

”ملک صاحب! اسپتال کے ریکارڈ کے مطابق آج کی تاریخ میں کسی بھی لاش کو وہاں نہیں پہنچایا گیا۔“ مجھے بتایا گیا۔ ”نوید علی، کوچوان امیر بخش اور بشریٰ کی لاش کا کوئی اتا پتا ہے اور نہ ہی اس تانگے کا کوئی سراغ جس پر نوید بشریٰ کی لاش کو مراد پور سے سرکاری اسپتال پہنچانے والا تھا۔“

میری پوری پیشہ ورانہ زندگی میں ایسا واقعہ پہلے کبھی پیش نہیں آیا تھا۔ میرا ذہن برق رفتاری سے اپنے اے ایس آئی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ایک چہرہ میری نگاہ کے سامنے گھوم گیا اور ...... وہ چہرہ تھا، مراد پور کے چودھری الیاس گھمسن کا۔

چودھری اس بات کے حق میں نہیں تھا کہ میں بشریٰ کا پوسٹ مارٹم کراؤں۔ اس نے بڑے واضح الفاظ میں مجھے اس کام سے باز رہنے کی تاکید کی تھی۔ اس تناظر میں میرے ذہن میں یہ خیال چمکا...... کہیں اے ایس آئی کی گمشدگی میں الیاس گھمسن کا ہاتھ تو نہیں؟

میری اطلاعات کے مطابق الیاس گھمسن جس قماش کا آدمی تھا، اس سے کسی بھی گھٹیا حرکت کی توقع کی جاسکتی تھی۔ میں نے فیض احمد حوالدار کو ساتھ لیا اور ہم ایک تانگے پر سوار ہوکر مراد پور کی جانب روانہ ہوگئے۔ مجھے امید تھی کہ یہ پراسرار گمشدگی میرے تھانے اور مراد پور کے بیچ ہی کہیں ہوئی ہوگی کیونکہ تھانے اور اسپتال کے درمیان کا آدھا میل کا ٹکڑا خاصا بارونق اور مصروف تھا۔ اس سڑک پر ٹریفک کی آمدورفت جاری رہتی تھی۔ اگر یہاں پر کوئی غیر معمولی واقعہ رونما ہوا ہوتا تو وہ چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔

جبکہ تھانے اور مراد پور کے درمیان حائل ایک میل کے فاصلے کی کیفیت بالکل مختلف تھی۔ ایک تو یہ کچا راستہ تھا جو کھیتوں کے بیچوں بیچ گزرتا تھا پھر اس ایک میل کے ٹکڑے کا ایک حصہ جنگل سے بھی ملتا تھا۔ اغلب امکان اسی بات کا تھا کہ اے ایس آئی والا تانگا اسی علاقے میں کہیں غائب ہوا ہوگا۔

میں نے ادھر کا رخ کرنے سے پہلے ہر نوعیت کی ضروری تیاری کرلی تھی۔ شام ہونے والی تھی اور اس کے بعد رات کو آنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا اور رات اپنے ساتھ تاریکی بھی ضرور لاتی ہے۔ اسی بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے دو طاقتور ٹارچز بھی ساتھ رکھ لی تھیں تاکہ اگر اے ایس آئی اینڈ کمپنی کی تلاش میں ہمیں دیر بھی ہوجائے تو ہم ان ٹارچز کو روشن کرکے اندھیرے کا سینہ چیر کر اپنا کام پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں۔

فیض احمد کو میں نے الیاس گھمسن سے ہونے والی باتوں کے بارے میں بتا دیا تھا۔ اس نے کہا۔ ”ملک صاحب! مجھے تو لگتا ہے، یہ چودھری کی شرارت ہے۔ الیاس گھمسن نہیں چاہتا تھا کہ بشریٰ کی لاش کا پوسٹ مارٹم ہو۔“

”تمہیں تو صرف لگتا ہے اور...... مجھے یقین ہے فیض احمد!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”چودھری کو بالکل بھی اندازہ نہیں کہ اس نے کہاں سینگ پھنسائے ہیں۔ یہ شرارت اسے بہت مہنگی پڑے گی۔“

”اگر آپ کو یقین ہے کہ یہ سب چودھری کا کیا دھرا ہے تو پھر ہم سیدھا اسی کی حویلی چلتے ہیں۔“ حوالدار نے تجویز دی۔ ”بلی خود ہی تھیلے سے باہر آجائے گی۔“

”فیض احمد! یہ بڑی چال باز بلی ہے۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”اس نے تھیلے میں گھستے ہی بچے دے دیے ہیں۔ اسے تھیلے سے نکالنا اتنا آسان ثابت نہیں ہوگا جتنا تم سمجھ رہے ہو۔“

”پھر کیا کریں ملک صاحب؟“ اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”وہاں تانگا روک لو۔“

اس تانگے میں صرف ہم دو افراد ہی تھے۔ حوالدار فیض احمد میری معاونت کے علاوہ کوچوان کی ڈیوٹی بھی دے رہا تھا۔ ہم نے اپنے ساتھ بھیڑ بھاڑ جمع کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کسی زمانے میں فیض احمد تانگا چلایا کرتا تھا۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب اس نے پولیس ڈیپارٹمنٹ کو جوائن نہیں کیا تھا۔ فیض احمد کی تعلیم تو واجبی سی تھی لیکن وہ اپنی ذہانت اور محنت کے بل پر ترقی کرکے حوالدار کے عہدے تک پہنچ گیا تھا۔ ذہانت کا تعلق تعلیم سے ہرگز نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو بے ڈگری کے تمام انسان یا تو بھوکے مر جاتے یا پھر انہیں غلام بنالیا جاتا۔

حوالدار نے میرے حکم کی تعمیل میں ایک جگہ تانگا روک دیا۔ یہ وہ مقام تھا جہاں سے کچا راستہ جنگل کو چھوتا ہوا نکلتا تھا۔ کوئی نادیدہ قوت میرے اندر چیخ چیخ کر یہ اشارہ دے رہی تھی کہ نوید علی کی تلاش میں مجھے سب سے پہلے جنگل کو چیک کرنا چاہیے۔ آپ اسے میری چھٹی حس یا وجدان یا غیبی مدد بھی کہہ سکتے ہیں۔

”فی الحال ہم اس جنگل کے اندر جارہے ہیں۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”جہاں تک تانگا آسانی سے جاسکتا ہے، تم اسے چلاتے رہو۔ اس کے بعد ہم پیدل چلتے ہوئے اپنا مشن جاری رکھیں گے اور اگر ہمیں اس مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی، تب ہم چودھری کی حویلی کا رخ کریں گے۔ میری بات سمجھ میں آرہی ہے نا؟“

”جی ملک صاحب!“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں آپ کی پلاننگ کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔“

جنگل کے اندر تانگا زیادہ آگے تک نہ جاسکا لہٰذا فیض احمد نے تانگے کو ایک موٹے تنے والے درخت کے ساتھ ”پارک“ کیا اور ہم محتاط قدموں سے آگے بڑھنے لگے۔ سورج غروب ہونے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا لیکن جنگل کے اندرونی حصے میں گھنے درختوں کی وجہ سے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے رات نے اپنی سیاہ زلفیں کھول دی ہوں تاہم ابھی اس قدر اجالا تھا کہ ٹارچز آن کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہورہی تھی۔

آئندہ آدھے گھنٹے میں ہم نے عقل، اپنی ہمت اور اپنی ٹارچز کی مدد سے جنگل کے اندر اے ایس آئی نوید علی اینڈ کمپنی کی تلاش میں جو جو اقدام اٹھائے، ان کی تفصیل بیان کرنے بیٹھا تو یہ کہانی پھیل کر لمبی ہوجائے گی مختصراً یہ کہ ہم نے اس مشن میں کامیابی حاصل کرلی تھی۔

نوید علی اور کوچوان امیر بخش زخموں سے چور جنگل کے اندرونی حصے میں مل گئے۔ وہ دونوں زندہ تھے لیکن نیم بے ہوشی کی حالت میں تھے۔ تانگے اور بشریٰ کی لاش کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ اغلب امکان یہی تھا کہ جن لوگوں نے انہیں اس حال کو پہنچایا تھا وہ تانگے اور بشریٰ کی لاش کو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ گویا میرے اندازے کے عین مطابق، یہ ہنگامی کارروائی صرف اور صرف بشریٰ کی لاش کو حاصل کرنے کے لیے کی گئی تھی۔ مقصد واضح تھا کہ وہ لوگ بشریٰ کی لاش کا پوسٹ مارٹم نہیں چاہتے تھے اور میری معلومات کے مطابق یہ خواہش الیاس گھمسن کی تھی۔ اب اس امر میں کسی شک وشبہے کی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی کہ اے ایس آئی اینڈ کمپنی کو پیش آنے والے افسوس ناک واقعے کے پیچھے چودھری الیاس گھمسن کا ہاتھ تھا۔

مضروب نوید علی اور امیر بخش کی حالت ایسی نہیں تھی کہ میں ان سے کسی قسم کے سوال وجواب کرتا لہٰذا ہم نے ان دونوں کو اٹھا کر تانگے میں ڈالا اور پہلی فرصت میں ضلعی اسپتال پہنچا دیا۔ اسی اسپتال میں جہاں آج دن میں نوید علی، بشریٰ کی لاش کو پہنچانے والا تھا۔ قسمت کی ستم ظریفی کہ بشریٰ کی لاش کا کوئی اتا پتا نہیں تھا اور نوید اپنی ٹریٹمنٹ کے لیے اسی اسپتال پہنچ گیا تھا۔

متاثرہ دونوں افراد کو باقاعدہ ہوش وحواس میں آنے میں تین گھنٹے لگ گئے۔ نصف شب کے بعد ڈاکٹر نے مجھ سے کہا۔ ”دونوں بندے خطرے سے باہر ہیں لیکن بہتر یہی ہوگا کہ انہیں تھوڑا آرام کرنے دیا جائے۔ آپ نے ان سے جو کچھ بھی پوچھنا ہے، آپ صبح آکر پوچھ لیجیے گا۔“

”ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب۔“ میں نے تشکرانہ لہجے میں کہا۔ ”میں آپ کی ہدایت کو ذہن میں رکھوں گا۔“ میں نوید علی سے بہت کچھ پوچھنے کے لیے بے قرار ہورہا تھا لہٰذا میں نے رات کا باقی حصہ اسپتال ہی میں رکنے کا فیصلہ کیا اور حوالدار سے کہا۔

”فیض احمد! تم تھانے جاؤ اور تھوڑا آرام کرلو۔ کل کا دن بہت لمبا ہونے والا ہے۔“

”اور آپ؟“ اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

”میں اس وقت تک اسپتال ہی میں رکوں گا جب تک نوید یا کوچوان کی زبان سے یہ معلوم نہیں ہوجاتا کہ ادھر جنگل کے قریب ان لوگوں کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا اور اس سانحے کا ذمے دار کون ہے۔“

”میں سمجھ گیا ملک صاحب۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

میں نے کہا۔ ”اور جب میں تھانے پہنچوں تو تمہیں ایک دم ریڈ الرٹ پاؤں۔ ہوسکتا ہے، ہمیں کسی فوری کارروائی کے لیے مراد پور کا رخ کرنا پڑے۔“

میں نے تعریفی کلمات کے ساتھ اسے رخصت کردیا۔

آئندہ دو گھنٹے میں نے بڑی بے چینی سے گزارے پھر میری مراد بر آئی۔ اے ایس آئی اور کوچوان کی حالت اس قدر سنبھل گئی تھی کہ میں ان سے بات چیت کرسکتا تھا۔ لگ بھگ آدھے گھنٹے کی محنت کے بعد میں نے ان دونوں کی زبانی جو معلومات اکٹھا کیں، اس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔

وہ لوگ تانگے میں بشریٰ کی لاش ڈالے مراد پور سے اسپتال کی جانب رواں دواں تھے کہ جنگل کے نزدیک کچے

راستے پر سامنے سے ایک گھڑسوار ان کے قریب آیا اور انہیں رکنے کے لیے کہا۔ اس گھڑسوار نے ایسا تاثر دیا تھا جیسے وہ کوئی راہ بھٹکا ہوا مسافر ہو اور ان سے راستہ پوچھنا چاہ رہا ہو۔ نوید کے کہنے پر کوچوان نے تانگا روک دیا۔ گھڑسوار نے پوچھا۔

''مراد پور یہاں سے کتنی دور ہے؟''

''زیادہ سے زیادہ آدھا میل۔'' کوچوان امیر بخش نے جواب دیا۔ ''بس، سیدھے آگے بڑھتے رہو۔ دس، پندرہ منٹ میں تم مراد پور پہنچ جاؤ گے۔''

گھڑسوار ان کا شکریہ ادا کر کے آگے بڑھ گیا۔ امیر بخش نے لگام کو جھٹکا دے کر گھوڑے کو ''اسٹارٹ'' کرنے کی کوشش کی لیکن قبل اس کے کہ تانگے کے آگے جتا ہوا گھوڑا ایک قدم بھی اٹھاتا، یکایک جنگل کے اندر سے چار پانچ لٹھ بردار افراد نمودار ہوئے۔ انہوں نے ڈھاٹے باندھ رکھے تھے اور ان کی حرکات وسکنات سے برق پھرتی جھلکتی تھی۔ ان لٹھ بردار افراد نے نوید علی اور امیر بخش کو کچھ بھی سوچنے کی مہلت نہ دی۔ اس سے پہلے کہ یہ لوگ صورتِ حال کو سمجھ پاتے، حملہ آور چاروں جانب سے ان پر ٹوٹ پڑے۔ یہ افتاد اتنی اچانک ٹوٹی تھی کہ نوید علی اور امیر بخش کو زخمی ہو کر بے ہوش ہونے میں چند منٹ ہی لگے ہوں گے۔

''اس کارروائی کے بعد یقیناً ان لوگوں نے آپ دونوں کو اٹھا کر جنگل کے اندرونی حصے میں پھینکا ہوگا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور بشریٰ کی لاش سمیت تانگے کو لے کر وہاں سے غائب ہو گئے ہوں گے......''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' نوید علی نے کہا۔ ''سر پر لگنے والی لاٹھی نے مجھے دنیا ومافیہا سے بے خبر کر دیا تھا۔ مجھے اسپتال پہنچنے کے بعد ہوش آیا ہے۔''

''ادھر جنگل میں آپ لوگ جب ہمیں اٹھا کر تانگے میں ڈال رہے تھے تو مجھے خواب کے مانند احساس ہے۔'' امیر بخش نے بتایا۔ ''یوں سمجھ لیں کہ میں بے ہوشی کی کیفیت سے نکل کر نیم بے ہوشی کی حالت میں آچکا تھا۔ مجھے یہ تو ہلکا سا محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی مجھے اٹھا کر کہیں لے جا رہا ہے۔ کون؟...... اور...... کہاں کہیں؟ کے بارے میں، میں کچھ نہیں جانتا تھا۔''

''جس گھڑسوار نے راستہ پوچھنے کے بہانے تمہارے تانگے کو رکوایا تھا، وہ یقیناً انہی حملہ آور ڈھاٹا پوش لٹھ بردار افراد کا ساتھی تھا۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''کیا اس نے بھی ڈھاٹا باندھ رکھا تھا؟''

''نہیں ملک صاحب۔'' نوید نے بتایا۔ ''اس کا چہرہ کھلا تھا۔''

''کیا تم دونوں میں سے کوئی اس گھڑسوار کو جانتا ہے؟''

''نہیں۔'' نوید نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''لیکن اگر وہ دوبارہ نظر آجائے تو میں اسے دیکھتے ہی پہچان لوں گا۔''

''مستقبل قریب میں تو اس گھڑسوار کے دکھائی دینے کا امکان نظر نہیں آرہا۔'' میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ''اور تم لوگ ڈھاٹا پوش حملہ آوروں کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے......''

''اگر میرا شک غلط نہیں تو میں ایک حملہ آور کے بارے میں آپ کو کچھ بتا سکتا ہوں۔'' امیر بخش نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

''شک، وہم، گمان...... تم ان چکروں میں نہ پڑو۔'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''تم جو کچھ بھی جانتے ہو، مجھے بتاؤ، جلدی اور اچھی طرح سوچ کر...... شاباش!''

کوچوان امیر بخش کی بظاہر سادہ سی بات میں میرے لیے کوئی سنسنی خیز انکشاف چھپا ہوا تھا۔ میرا تن بدن یکایک ہائی الرٹ ہو گیا تھا اور سماعت کوئی خوشخبری سننے کی منتظر تھی۔

''ڈھاٹا پوش حملہ آور تعداد میں چار تھے یا پانچ، یہ تو مجھے یاد نہیں۔'' امیر بخش نے بتایا۔ ''لیکن ان میں سے ایک کا قد کاٹھ، جسامت اور چال کو میں پہچان سکتا ہوں...... وہ مجھے ظفری لگا تھا۔''

''کون ظفری؟'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''اس کا اصل نام تو ظفر علی ہے لیکن سب اسے ''ظفری'' ہی کہتے ہیں۔'' امیر بخش وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ظفر ایک پستہ قامت اور بھاری جسم کا مالک شخص ہے اور اس کی چال میں ہلکی سی لنگڑاہٹ ہے مگر ہے بہت پھرتیلا۔ جب وہ حرکت میں ہوتا ہے تو یوں ہی لگتا ہے جیسے کوئی فٹ بال لڑھک رہا ہو۔ بھاری جسامت اور پستہ قامتی نے ظفری کی لمبائی چوڑائی کو ایک جیسا کر دیا ہے۔''

''ہم نے فرض کر لیا کہ تم جس ڈھاٹا پوش حملہ آور کے بارے میں بتا رہے ہو، وہ ظفری ہی ہے۔'' میں نے امیر بخش کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب یہ بھی تو بتاؤ کہ ظفری ملے گا کہاں؟''

میرے اس اہم سوال کا جواب دیتے ہوئے امیر بخش نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔ ''ظفری، چودھری الیاس گھمن کا خاص آدمی ہے اور یہ بندہ زیادہ تر ڈیرے پر رہتا ہے۔''



سالگرہ نمبر 2 حصے کے دلکش مضامین و رنگا رنگ سلسلے لیے مئی 2018ء کا دل پذیر شمارہ

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

رفعت سراج اور **شیریں حیدر** کے ماہرانہ قلم کے شاہکار مسلسل ناول

حیا بخاری نے کھلائے محبت کے حسین گلاب...... **محبت لفظ ہے لیکن**...... کی صورت

عالیہ حرا کے خالص افسانوی ہنر کا شاہکار مکمل ناول...... **جب پھاگن پھول کھلائے**

مایہ ناز مصنفہ **نگہت سیما** کی خصوصی تحریر...... **کوئی شہر یار وفاؤں کا**

عنیزہ سید، عقیلہ حق اور **سیما رضا ردا** کی پُراثر کاوشیں

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کے پُرنور جذبوں کا بیان

شیف ثمینہ سے دلچسپ ومزیدار

ملاقات **شائستہ زریں** کے تعاون سے

اس کے علاوہ

نفیسہ سعید، ہما بیگ، فرح طاہر، دردانہ نوشین،

نبیلہ نازش راؤ، شمع تفسیر و دیگر قابلِ قدر قلمکاروں کی دلفریب تحریریں

پڑھیے **گوشۂ ظرافت** میں نامور مزاح نگاران کی شگفتہ شگفتہ باتیں

اس کے ساتھ ساتھ قارئین کے خوب صورت مراسلات، بزمِ شاعری، حریمِ دانشوراں اور بہت، بہت کچھ صرف آپ کی اعلیٰ ذوقی کی نذر

اس زنجیر کی ساری کڑیاں ایک ایک کر کے آپس میں مل رہی تھیں۔ اس کیس کا ہر سراغ اور ہر اشارہ الیاس گھمن کی ذات سے جڑا ہوا تھا۔ مجھے اپنی کارروائی کو پٹری پر ڈالنے کے لیے بہت اچھا بریک تھرو مل گیا تھا۔

میں اذانِ فجر تک اسپتال میں نوید اور امیر بخش کے ساتھ موجود رہا پھر یہ کہہ کر اٹھ گیا۔ ''آپ دونوں کو آج کا پورا دن اسپتال کے بستروں پر ہی آرام کرنا ہے۔ انشاء اللہ! شام میں ملاقات ہوگی اور یہ میرا وعدہ ہے کہ میں خالی ہاتھ نہیں آؤں گا۔ میں آپ لوگوں کے لیے کوئی خوشخبری لے کر ہی یہاں آؤں گا۔''

اس کے بعد میں نے اسپتال کے کمپاؤنڈ میں نمازِ فجر ادا کی پھر اللہ کا نام لے کر تھانے کی جانب روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

جب ہم مراد پور پہنچے تو سورج کافی اوپر اٹھ آیا تھا اور دھوپ نے پورے ماحول کو اپنی آغوش میں لے کر گرما رکھا تھا۔ میں اور فیض احمد باقاعدہ سرکاری یونیفارم میں گھوڑوں پر سوار ہو کر وہاں پہنچے تھے۔ راستے میں، میں نے فیض احمد کو ان معلومات سے آگاہ کر دیا تھا جو گزشتہ شب مجھے نوید علی اور امیر بخش کی زبانی پتا چلی تھیں۔ فیض احمد اس وقت خاصے جوش میں تھا کیونکہ ہماری تفتیش کی گاڑی کو دوڑنے کے لیے ایک باقاعدہ ٹریک مل گیا تھا۔

میں نے چودھری الیاس گھمن کی حویلی کا رخ نہیں کیا بلکہ ہم گاؤں کی دوسری سمت سے اس ڈیرے کی طرف بڑھ رہے تھے جس کا ذکر امیر بخش نے کیا تھا۔ مذکورہ ڈیرا نہر کے کنارے درختوں کے جھنڈ کے درمیان واقع تھا۔ یہ درخت دراصل آم کے باغات تھے اور تمام درخت پھلوں سے لدے ہوئے تھے۔ میرے مطلوبہ بندے ظفر علی عرف ظفری کو اسی ڈیرے پر ہونا چاہیے تھا۔

ہم باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے کہ سامنے سے ایک گھڑسوار تیزی سے ہماری طرف آتا دکھائی دیا۔ اس کے عقب میں تھوڑے فاصلے پر تین مزید گھوڑے بھی دوڑتے ہوئے آرہے تھے جن کی پشتوں پر سوار بھی موجود تھے۔ اس وقت ہم جہاں سے گزر رہے تھے، وہاں سے درختوں کے جھنڈ میں چودھری کا ڈیرا صاف نظر آرہا تھا۔

''ملک صاحب! یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟'' فیض احمد نے ان گھڑسواروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میری نگاہ بھی انہی لوگوں پر جمی ہوئی تھی۔ میں نے سب سے آگے والے اکیلے گھڑسوار کو دور ہی سے پہچان لیا۔ میں نے فیض احمد کے سوال کے جواب میں کہا۔

''لگتا ہے، چودھری نے مراد پور کی حدود میں جاسوسی کا ایک مربوط نظام قائم کر رکھا ہے۔ اسے ہماری خفیہ آمد کی خبر ہو چکی ہے۔''

''اوہ......'' حوالدار نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔ ''یہ کمبخت چودھری ہمارے کام میں کہیں روڑے نہ اٹکا دے۔''

''اٹکا دے تو اٹکا دے، کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' میں نے بے پروائی سے کہا۔ ''آج یہ مجھے کسی بھی قسم کی کارروائی سے نہیں روک سکتا۔ میں اس کے تمام روڑوں کو تفتیش کے بلڈوزر کے نیچے کچل ڈالوں گا۔ تم نے ایک کام کرنا ہے۔''

''جی حکم ملک صاحب۔'' وہ بے حد سنجیدگی سے بولا۔

''میں چودھری کو باتوں میں لگاؤں گا۔'' میں نے الیاس گھمن پر نگاہ رکھتے ہوئے کہا۔ ''اس بیچ میں تم چپکے سے کھسک لینا اور ایک چکر لگا کر ڈیرے کی عقبی سمت نکل جانا پھر نہر اور ڈیرے کے درمیان کسی جگہ رک کر ڈیرے پر کڑی نگاہ رکھنا۔ عین ممکن ہے کہ جب میں تفتیش نما ہانکا کروں تو ظفری ڈیرے کی عقبی جانب سے فرار ہونے کی کوشش کرے۔ ایسی صورت میں تم نے اسے بھاگنے کا موقع نہیں دینا۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا......؟''

''اچھی طرح سمجھ گیا ملک صاحب۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''آپ اس سلسلے میں بے فکر ہو جائیں۔''

''اگر امیر بخش کا اندازہ درست ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس کا اندازہ درست ہوگا تو...... ظفری اور اس کے ڈھاٹا پوش گھڑسوار ساتھیوں نے نوید علی اینڈ کمپنی کے ساتھ جو کچھ بھی کیا ہے، وہ چودھری الیاس گھمن کے ایما پر ہی کیا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''چودھری پر براہِ راست ہاتھ ڈالنے کے لیے مجھے اس کی کارستانی کا ٹھوس ثبوت چاہیے اور یہ ثبوت میں ظفری کی زبان سے اگلواؤں گا لہٰذا ہمیں پہلی فرصت میں ظفری کو اپنی تحویل میں لینا ہے۔''

''انشاء اللہ...... ایسا ہی ہوگا۔'' فیض احمد نے کہا۔

چند لمحات کے بعد وہ لوگ ہمارے سامنے تھے۔ چودھری الیاس نے تیکھی نظر سے مجھے دیکھا پھر طنزیہ لہجے میں بولا۔

''ملک صاحب! ادھر میرے گاؤں میں کیا کارروائیاں ہو رہی ہیں؟''

''میں آپ کا سی آئی ڈی کا نظام چیک کرنے

مراد پور آیا تھا......'' میں نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔

''پھر آپ نے کیا نتیجہ اخذ کیا؟''

''آپ کا نظام بڑا فعال ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جس کے ثبوت کے طور پر آپ اس وقت میرے سامنے کھڑے ہیں۔''

وہ چند لمحات تک ٹٹولنے والی نگاہ سے مجھے دیکھتا رہا پھر برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''ملک صاحب! میں آپ سے خفا ہوں۔''

''ملک صاحب!'' قبل اس کے کہ میں الیاس گھمن کی خفگی کی وجہ دریافت کرتا، حوالدار فیض احمد نے مجھے مخاطب کر لیا۔ ''پکے ہوئے آموں کی خوشبو مجھے مست کر رہی ہے۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں دو چار آم چوس لوں؟''

مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ فیض احمد نے وہاں سے کھسکنے کے لیے یہ بہانہ تراشا تھا۔ میں نے دریا دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے قدرے شوخ لہجے میں کہا۔

''مجھے تو کوئی اعتراض نہیں کیونکہ ہم جس کام کی غرض سے یہاں آئے تھے وہ مکمل ہو چکا۔ اب تم میری طرف سے بالکل فری ہو لیکن......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ باغات چودھری صاحب کی ملکیت ہیں۔ اخلاقی طور پر ان کی اجازت کے بغیر تمہیں کسی درخت سے ایک آم بھی نہیں توڑنا چاہیے۔''

میری ''کام مکمل ہو چکا'' والی بات نے چودھری کو چونکا کر دیا تھا۔

فیض احمد سوالیہ نظر سے چودھری الیاس گھمن کو تکنے لگا۔ چودھری ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''حوالدار صاحب! ان باغات کو آپ اپنا ہی سمجھو۔ جتنا دل چاہے، پیٹ بھر کر کھاؤ اور اگر خواہش ہو تو تھیلے میں بھر کر اپنے ساتھ لے جاؤ۔''

فیض احمد فوراً سے پیشتر چودھری کا شکریہ ادا کر کے گھوڑے کو ایک جانب بڑھا لے گیا۔ میں نے الیاس گھمن کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

''چودھری صاحب! آپ مجھ سے کیوں خفا ہیں؟''

''میں نے کل آپ کو اپنی حویلی آنے کی دعوت دی تھی۔'' وہ ناراضی بھرے انداز میں بولا۔ ''لیکن آپ نے میری بات کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی۔''

''کوئی بات نہیں چودھری صاحب۔'' میں نے بے پروائی سے کہا۔ ''کل نہیں تو آج میں آپ کی حویلی یاترا کر ڈالوں گا۔''

''اور آپ نے میری وہ بات بھی نہیں مانی......'' وہ شکایتی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے آپ سے کہا تھا کہ بشریٰ کی لاش کا پوسٹ مارٹم کرانے کی ضرورت نہیں مگر آپ نے اپنے اے ایس آئی کی نگرانی میں لاش کو سرکاری اسپتال بھجوا دیا۔''

ابھی تک چودھری ہی مجھ سے ہم کلام تھا۔ اس کے تینوں حواری چپ چاپ تھوڑے فاصلے پر موجود تھے۔ اس دوران میں، میں وقفے وقفے سے فیض احمد کی جانب نگاہ اٹھا کر بھی دیکھ لیتا تھا۔ کچھ ہی دیر میں حوالدار میری نظر کے فریم سے نکل گیا۔ یہ ایک اطمینان بخش صورتِ حال تھی اور اس سے بھی زیادہ تسلی آمیز یہ بات تھی کہ چودھری کے حواریوں میں سے کسی نے فیض احمد کی نگرانی کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''وہ میری پیشہ ورانہ مجبوری تھی چودھری صاحب۔'' میں نے اس کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ اسے قانون کا تقاضا بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس نوعیت کی اموات میں لاش کا پوسٹ مارٹم لازمی ٹھہرتا ہے۔''

چودھری سے بات کرتے ہوئے میں نے اپنے اندرونی جذبات کو بڑی مہارت کے ساتھ قابو میں کر رکھا تھا۔ وہ میرے چہرے کے تاثرات سے قطعاً یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ میں اس کی کمینگی اور حرام زدگی سے اچھی طرح آگاہ ہو چکا ہوں۔ جب تک ظفری میرے ہتھے نہ چڑھ جاتا اس نوعیت کی اداکاری کامیابی کے لیے ضروری تھی۔

''پھر کیا رپورٹ آئی ہے پوسٹ مارٹم کی؟'' اس نے استہزائیہ انداز میں دریافت کیا۔

''ابھی بشریٰ کی لاش کا پوسٹ مارٹم نہیں ہو سکا۔'' میں نے چہرے پر مصنوعی فکرمندی طاری کرتے ہوئے کہا۔ ''اسپتال والوں نے ایک اڑنگا لگا دیا ہے۔''

میں نے آخری جملہ اتنی سادگی اور معصومیت سے ادا کیا تھا کہ اس نے آنکھیں سکیڑ کر سرسراتی ہوئی آواز میں مجھ سے استفسار کیا۔

''کیسا اڑنگا......؟''

''وہ کہتے ہیں، پوسٹ مارٹم کی پالیسی تبدیل ہوگئی ہے۔'' میں نے بدستور سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ ''اب انہوں نے اس کام کو ٹو پیس کر دیا ہے جیسا کہ ٹو پیس سوٹ ہوتا ہے۔''

اس کی الجھن میں حیرت بھی شامل ہوگئی، عجیب سے

لہجے میں بولا۔ ''آپ کی بات میرے پلّے نہیں پڑی۔''

''یہ میری نہیں، اسپتال والوں کی بات ہے چودھری صاحب۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''پہلے پہل یہ بات میرے بھی پلّے نہیں پڑی تھی لیکن پھر انہوں نے مجھے سمجھا دیا۔''

''آپ مجھے بھی سمجھائیں۔'' وہ دلچسپی لیتے ہوئے بولا۔

''اللہ آپ کا بھلا کرے چودھری صاحب۔'' میں نے رسانیت بھرے انداز میں کہا۔ ''اسپتال والوں نے مجھے بتایا ہے کہ اب کسی مُردے کا اکیلا پوسٹ مارٹم نہیں ہوا کرے گا بلکہ اس کے ساتھ ہی ایک زندہ انسان کا پوست ماتم بھی ہوگا۔''

''پوست ماتم!'' اس نے منہ بگاڑ کر دہرایا۔ ''یہ کیا بلا ہے؟''

''یہ بلا نہیں چودھری صاحب بلکہ ایک اسپیشل ٹیسٹ ہے۔'' میں نے اداکاری کی معراج کو چھوتے ہوئے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''پوست یعنی کھال اور ماتم مطلب کھنچائی...... اس اسپیشل ٹیسٹ میں زندہ انسان کی کھال کھینچی جاتی ہے اور اس ٹیسٹ کے لیے زندہ انسان کا انتخاب بھی اسپتال والے ہی کرتے ہیں۔ بشریٰ کی لاش کے پوسٹ مارٹم کے ساتھ جس زندہ انسان کا پوست ماتم کیا جائے گا اس کا نام......''

''کیا آپ مجھے بے وقوف سمجھتے ہیں......؟'' وہ غصیلے انداز میں بولا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اللہ نہ کرے چودھری صاحب۔''

''آپ کو یہ مذاق بہت مہنگا پڑے گا ملک صاحب۔'' وہ ایک دم ہتھے سے اکھڑ گیا۔

میں نے اس کی کیفیت سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔ ''آپ اسپتال والوں کے تجویز کردہ زندہ انسان کا نام نہیں جاننا چاہیں گے چودھری صاحب؟''

''بھاڑ میں گیا وہ بندہ۔'' وہ کینہ توز نظر سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ''اور آگ لگے آپ کے اسپتال کو۔''

میں نے جلتی پر ہائی اوکٹین چھڑکتے ہوئے کہا۔ ''اسپتال کو آگ لگنے والی آپ کی خواہش تو پوری نہیں ہوسکتی البتہ، اس زندہ انسان کے پوست ماتم کے بعد میں اسے بھاڑ میں ضرور ڈالوں گا۔''

''آپ کا مطلب کیا ہے؟'' وہ بے حد چوکنا نظر سے مجھے گھورنے لگا۔

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ''میں یہاں ظفری کی تلاش میں آیا ہوں۔'' پھر میں نے درختوں کے جھنڈ میں ایک سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے پتا چلا ہے کہ ظفری اس ڈیرے پر ملے گا۔''

''آپ کو کسی نے بالکل غلط بتایا ہے۔'' وہ رعب دار آواز میں بولا۔

''میری معلومات غلط نہیں ہوسکتیں۔'' میں نے چودھری کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اٹل لہجے میں کہا۔ ''ظفری اور راکھا آپ کے دو خاص ملازم ہیں اور وہ دونوں اس ڈیرے پر ہی رہتے ہیں۔''

''یہ ٹھیک ہے کہ ظفری اور راکھا میرے آدمی ہیں اور اس ڈیرے پر رہ کر کاشت کاری کی نگرانی کرتے ہیں۔'' وہ بڑی رعونت سے بولا۔ ''لیکن ظفری اس وقت ڈیرے پر موجود نہیں۔''

''وہ کہاں گیا ہوا ہے؟'' میں نے محض خانہ پُری کی غرض سے پوچھ لیا۔

''وہ پرسوں شیخوپورہ گیا تھا اور ابھی تک واپس نہیں آیا۔'' چودھری نے بتایا پھر پوچھا۔ ''آپ کو کس سلسلے میں ظفری کی تلاش ہے؟''

''بتایا تو ہے، ظفری کا پوست ماتم کرنا ہے۔'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''وہ ڈکیتی کی ایک سنگین واردات میں مجھے مطلوب ہے۔''

''ڈکیتی...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''میں نے وہی کہا جو آپ نے سنا۔'' میں نے حقارت بھری نظر سے چودھری کی طرف دیکھا پھر اپنا گھوڑا ڈیرے کی سمت بڑھاتے ہوئے بڑی سفاکی سے کہا۔ ''ابھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوجائے گا۔''

''رک جاؤ ملک صفدر حیات۔'' وہ مجھے میرے نام سے مخاطب کرتے ہوئے تحکمانہ انداز میں بولا۔

''نہیں رک سکتا الیاس گھمن!'' میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

وہ آپے سے باہر ہوگیا اور ''آپ'' سے ''تم'' تک کا سفر پلک جھپکتے میں طے کرتے ہوئے خاصے بدتمیز لہجے میں بولا۔ ''یہ تم اچھا نہیں کر رہے۔''

''میں اپنے اچھے بُرے کا خود ذمے دار ہوں۔'' میں نے پیش قدمی جاری رکھتے ہوئے اکھڑ انداز میں کہا۔

اس کے تینوں حاشیہ بردار اپنے گھوڑوں کو چلاتے ہوئے ہمارے عقب میں آ رہے تھے جبکہ میرے اور الیاس گھمن کے گھوڑے پہلو بہ پہلو قدم اٹھا رہے تھے۔ وہ اپنی کنگ سائز مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے غضب ناک لہجے میں بولا۔

''صفدر حیات! تم بہت غلط جگہ ہاتھ ڈالنے جا رہے ہو......!''

اس کے انداز میں دھمکی چھپی ہوئی تھی لیکن میں اس کی دھونس دھاندلی سے مرعوب یا خوف زدہ ہونے والا نہیں تھا۔ میں جو سوچ کر مراد پور آیا تھا، وہ کر کے ہی مجھے یہاں سے لوٹنا تھا۔ میرے لیے اطمینان کا باعث یہ بات تھی کہ اللہ دار فیض احمد نے احتیاطی پوزیشن سنبھال لی تھی۔

''میں نے خوب سوچ سمجھ کر ہی اس غلط جگہ ہاتھ ڈالنے کا فیصلہ کیا ہے چودھری۔'' میں نے بھی لحاظ مروت اور ادب و آداب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کھرے لہجے میں کہا۔ ''تم یہ رعب کسی اور پر جا کر ڈالنا۔ میں تمہاری گیدڑ بھبکیوں میں آنے والا نہیں ہوں۔''

''یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ کون گیدڑ ہے اور کون شیر۔'' وہ سنسناتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''چودھری الیاس گھمن سے متھا لگانا تمہیں بہت مہنگا پڑے گا۔''

''پروا نہیں ہے۔'' میں نے بے پروائی سے کہا۔ ''مہنگے سستے کا حساب بعد میں کریں گے۔''

میرے لہجے میں چودھری کے لیے اس قدر بے اعتنائی اور حقارت بھری ہوئی تھی کہ وہ سلگ کر رہ گیا۔ اگلے ہی لمحے اس کی غراہٹ نے میری سماعت تک رسائی حاصل کر لی۔

''تمہیں سرکار نے وردی اس لیے نہیں دی تھی کہ تم کہیں بھی دندناتے ہوئے گھس جاؤ۔ میں تمہاری شکایت اوپر تک پہنچاؤں گا۔''

''اوپر والے کے ساتھ میرے تعلقات بہت اچھے ہیں۔'' میں نے اسے تپانے کی غرض سے کہا۔ ''اس ذاتِ پاک نے مجھے کبھی مایوس نہیں کیا اور جہاں تک اس وردی کا معاملہ ہے تو میں نے کبھی کسی بے گناہ اور بے قصور کو خوانخواہ تنگ نہیں کیا اس لیے مجھے امید ہے کہ اوپر والا مجھے کسی بھی میدان میں شرمندہ نہیں کرے گا۔''

''میں تمہارے سینئر افسران کی بات کر رہا ہوں......'' وہ جھنجلا کر بولا۔ ''اور تم کہیں سے کہیں پہنچ گئے ہو؟''

''میں تو تھانے سے نکل کر مراد پور پہنچا ہوں۔'' میں نے انتہائی سادگی سے کہا۔ ''اور ایک آدھ منٹ میں تمہارے ڈیرے کے اندر پہنچنے والا ہوں۔''

''میں پھر یہی کہوں گا کہ ظفری شیخوپورہ گیا ہوا ہے۔'' اس نے ایک مرتبہ پھر مجھے بھٹکانے کی کوشش کی۔ ''تم...... خوامخواہ اپنا اور میرا وقت ضائع کر رہے ہو صفدر حیات!''

''میں تمہارے مشوروں کا محتاج نہیں ہوں۔ اگر تم نے تفتیش کے راستے میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی تو میں ظفری سے پہلے تمہیں آہنی زیور پہنا دوں گا۔''

''تم اپنی حد سے بڑھ رہے ہو۔'' وہ پھنکار سے مشابہ لہجے میں بولا۔ میرے دوٹوک اور بے مروت انداز نے اس کی جھوٹی انا پر کاری ضرب لگائی تھی۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس نے عامیانہ انداز میں کہا۔ ''یہ مت بھولو کہ سرکار تمہیں ہمارے پیسوں سے تنخواہ دیتی ہے۔''

وہ گھٹیا پن پر اتر آیا تھا۔ اس کی چھوٹی سوچ کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ اس کی بات سن کر مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن جواباً میں بھی اس کی سطح پر نہیں آ سکتا تھا چنانچہ میں نے حیرت بھرے لہجے میں اس سے پوچھا۔

''وہ کیسے چودھری......؟''

''ہم بڑے بڑے چودھری، زمیندار اور نمبردار سالانہ سرکار کو جولگان (ٹیکس) دیتے ہیں، اسی پیسے سے تمام سرکاری ملازمین کو تنخواہیں دی جاتی ہیں۔'' وہ بڑی رعونت سے بولا۔

ڈیرے کے گیٹ پر پہنچ کر میں اپنے گھوڑے سے نیچے اتر آیا پھر چودھری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم بڑے زمیندار جتنا ٹیکس چوری کرتے ہو اس کا مجھے بخوبی علم ہے۔ تم چاہے جتنی بھی گھٹیا باتیں کر لو مگر نہ تم مجھے ڈیرے میں داخل ہونے سے روک سکتے ہو اور نہ ہی اپنے نمک خوار ظفری کو گرفتاری سے بچا سکتے ہو......''

میرے دوٹوک انداز اور چٹانی لہجے نے چودھری کو گہری سوچ میں ڈال دیا۔ چند لمحات تک وہ خشمگیں نظر سے مجھے گھورتا رہا پھر اس کے چہرے پر شیطانی چمک نمودار ہوئی۔ اگلے ہی لمحے وہ بڑے عجیب سے لہجے میں بولا۔

''تم اس ڈیرے کی تلاشی کا شوق پورا کر لو لیکن میں ایسے ہی خالی خولی تمہیں اندر نہیں گھسنے دوں گا۔'' بات ختم کرتے ہی وہ گھوڑے سے نیچے اتر آیا اور کہا۔ ''اس ڈیرے کی خانہ تلاشی کے لیے تمہیں عدالت سے سرچ وارنٹ لے کر آنا پڑے گا۔''

''تم میرے شکوک کو یقین میں بدل رہے ہو چودھری!'' میں نے تیکھے انداز میں کہا۔ ''کارِ سرکار کے بیچ تم جو رکاوٹیں کھڑی کرنے کی کوشش کر رہے ہو، یہ ظفری کے ساتھ تمہیں بھی جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیں گی۔''

''میں نے تو اصول کی بات کی ہے۔'' وہ رکھائی سے بولا۔ ''کسی بھی گھر کی تلاشی کے لیے قانوناً سرچ وارنٹ کی ضرورت ہوتی ہے...... ہوتی ہے یا نہیں؟''

''ہوتی ہے۔'' میں نے غراہٹ آمیز لہجے میں کہا پھر

پوچھا۔ ''تمہیں سرچ وارنٹ دیکھنا ہے؟''

''ہاں دکھاؤ۔'' وہ مضحکہ خیز انداز میں مسکرایا۔

''لو دیکھو......'' میں نے پاٹ دار آواز میں کہا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ڈیرے کے دروازے پر ایک زوردار لات رسید کردی۔

میری اس لات میں چھ بارس پاور کی طاقت تھی یا گیٹ کی اندرونی کنڈی کمزور تھی، ایک طوفانی دھماکے کے ساتھ گیٹ کے دونوں پٹ وا ہوگئے۔

چودھری ہکا بکا مجھے دیکھتا رہ گیا۔ میرے جارحانہ انداز کو دیکھ کر اس کی عقل دنگ رہ گئی تھی۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ میں ایسی ہنگامہ خیز کارروائی پر اتر آؤں گا۔ قبل اس کے کہ چودھری کی حیرت ٹوٹتی، میں بھڑّا مار کر ڈیرے کے اندر داخل ہوگیا۔

اسی وقت فیض احمد کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ وہ للکار کر کسی سے کہہ رہا تھا۔ ''رک جاؤ، ورنہ میں گولی ماردوں گا۔''

صورت حال کو سمجھنے میں مجھے قطعاً کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی۔ حوالدار کو میں نے ڈیرے کی عقبی جانب ریڈ الرٹ رہنے کو کہا تھا۔ اگر وہ کسی کو روکنے کی کوشش کررہا تھا تو اس کا ایک یہی مطلب تھا کہ کوئی ڈیرے کی عقبی دیوار پھلانگ کر وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کررہا تھا اور اغلب امکان یہی تھا یہ ''کوئی'' ظفری ہی ہوگا۔ باقی جہاں تک حوالدار کی اس دھمکی کا تعلق تھا کہ...... وہ گولی ماردے گا...... تو یہ ایک کھوکھلی دھمکی تھی کیونکہ فیض احمد کے پاس اس وقت کسی قسم کی کوئی گن نہیں تھی۔

یہ تمام تر خیالات سیکنڈ کے دسویں حصے میں میرے ذہن سے گزرے اور میں ڈیرے کے صحن میں دوڑ لگا کر عقبی دیوار کے قریب پہنچ گیا۔ ڈیرے کی چوحدی کی اونچائی بمشکل چار فٹ تھی۔ میں نے اس دیوار کے اوپر سے فیض احمد کو ایک لمبے تڑنگے آدمی کے تعاقب میں بھاگتے ہوئے دیکھا۔

وہ بندہ کسی بھی صورت میں ظفری نہیں ہوسکتا تھا۔ کوچوان امیر بخش نے ظفری کے بارے میں مجھے جو معلومات فراہم کی تھیں، ان کے مطابق وہ پستہ قامت اور بھاری جثے کا مالک تھا۔ علاوہ ازیں اس کی چال میں بھی لنگڑاہٹ تھی۔ جب وہ بھاگتا تھا تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی فٹ بال لڑھک رہا ہو جبکہ یہ بندہ نہ تو لنگڑا رہا تھا اور نہ ہی اس کا قد پستہ تھا۔ میرے ذہن نے چیخ کر کہا...... یہ ماکھا کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔

اس ڈیرے پر چودھری کے دو خاص آدمی رہا کرتے تھے، ظفری اور ماکھا۔ یقیناً یہ ماکھا ہی تھا۔ اس نے ڈیرے کے گیٹ پر میرے اور الیاس گھمن کے بیچ ہونے والی گفتگو کو سن لیا تھا اور وہ جان گیا تھا کہ میں کن خطرناک عزائم کے ساتھ وہاں پہنچا ہوں اسی لیے اس نے عقبی دیوار پھلانگ کر راہِ فرار اختیار کی تھی۔

فیض احمد جلد ہی اس کے سر پر پہنچ گیا اور اسے قابو کرنے کی کوشش کی لیکن ماکھا کچھ زیادہ ہی پھرتیلا ثابت ہوا۔ اس نے پلٹ کر جوابی حملہ کیا۔ فیض احمد کو ماکھا سے ایسے ردعمل کی توقع نہیں تھی اس لیے وہ مار کھا گیا۔ نتیجے میں حوالدار چاروں خانے چت زمین پر پڑا تھا۔ ماکھا نے فیض احمد کو دھوبی پاٹ مارا تھا۔ بعدازاں پتا چلا کہ ماکھا مراد پور کا ایک جانا مانا ہوا پہلوان بھی تھا۔

فیض علی کو زمین چٹانے کے بعد ماکھا نے نہر کی جانب دوڑ لگادی۔ اس دوران میں، میں دیوار پھلانگ کر ڈیرے کی حدود سے باہر نکل چکا تھا۔ ماکھا، فیض احمد پر سوا سیر ثابت ہورہا تھا لہٰذا میں ایکشن میں آگیا۔

میں نے اپنے سروس ریوالور سے ایک ہوائی فائر کیا اور اس کے ساتھ ہی بہ آوازِ بلند گرج کر کہا۔ ''ماکھا! جہاں ہو وہیں رک جاؤ۔ اگر تم نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو میں تمہارے بھیجے میں سوراخ کردوں گا۔''

گولی کی آواز کے ساتھ دی جانے والی دھمکی کارگر ثابت ہوئی۔ ماکھا کے دوڑتے ہوئے قدموں کو بریک لگ گئے۔ اس دوران میں، میں دوڑتے ہوئے اس کے نزدیک پہنچ گیا اور ریوالور کو ماکھا پر تانتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''ہینڈز اپ......!''

ماکھا نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھادیے۔

اسی اثنا میں حوالدار فیض احمد بھی ہمارے قریب پہنچ گیا۔ میں نے حوالدار سے کہا۔ ''اس تیس مار خاں کو گرفتار کرلو۔''

فیض احمد کسی اور ہی موڈ میں تھا۔ اس نے میرے حکم کی تعمیل تو کی مگر بہ اندازِ دگر...... فیض احمد نے وہاں آتے ہی ماکھا پر لاتوں اور گھونسوں کی برسات کردی۔ وہ اپنی ہزیمت کا حساب چکتا کرنا چاہتا تھا۔ پھر ماکھا کے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنادی۔

''میری ہتھکڑی کھول دے تھانے دارا'' وہ زخمی سانپ کے مانند پھنکار کر بولا۔ ''ورنہ تیرے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔''

''اوئے، بکواس بند کر۔'' میں نے طیش کے عالم میں

کہا اور اس کے ساتھ ہی اس کے گال پر ایک زناٹے دار تھپڑ بھی رسید کردیا پھر غضب ناک انداز میں اضافہ کیا۔ ''یہ ہتھکڑی تو اب جیل میں جا کر ہی کھلے گی۔''

وہ مجھے دھمکانے کی کوشش کرنے لگا۔ ''میرا نام ماکھا جٹ ہے، تم مجھے جانتے نہیں ہو۔ میں چودھری الیاس گھمن کا خاص بندہ ہوں۔''

''تیرے چودھری کی تو میں......'' فیض احمد نے ماکھا کو ایک ناقابلِ اشاعت گالی سے نوازا پھر اس کی پنڈلی کے سامنے والے حصے پر اپنے سرکاری بوٹ سے ایک زوردار ٹھڈا رسید کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم نے زبان سے مزید ایک لفظ بھی نکالا تو مار مار کر میں تمہیں باندر بنادوں گا۔''

پنڈلی کے سامنے والا حصہ بہت ہی نازک اور حساس ہوتا ہے۔ یہاں پر ہڈی کھال کی گہرائی میں نہیں بلکہ بالکل اوپن ہوتی ہے۔ حوالدار کے ہیوی بوٹ کی طوفانی ٹھوکر نے ماکھا کو بلبلانے پر مجبور کردیا تھا۔ اوپر سے میرے سفاک انداز نے اس کے ہوش کا سوا ستیاناس ماردیا۔ وہ بے دریغ مجھے اور حوالدار کو مغلظات میں تولنے لگا۔

اس دوران میں چودھری الیاس گھمن اپنے حواریوں سمیت وہاں پہنچ گیا تھا۔ میں نے فاتحانہ نظر سے اسے دیکھا اور سلگانے والے انداز میں کہا۔

''چودھری! میں سرچ وارنٹ کے بغیر ہی تمہارے بندے کو گرفتار کرکے اپنے ساتھ لے جارہا ہوں۔ اس کے پیٹ میں جتنی بھی گندگی بھری ہوئی ہے، جب یہ اگلے گا تو پھر میں سرچ وارنٹ نہیں بلکہ اریسٹ وارنٹ کے ساتھ تمہاری گردن ناپنے حویلی آؤں گا۔ اس طرح مجھے حویلی میں بلانے کی تمہاری خواہش بھی پوری ہوجائے گی......''

اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہوئے۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ہمارے ٹکڑے کرکے چیل کوؤں کو کھلا دیتا۔ انتہائی بے بسی اور بے کسی کے عالم میں اس نے اپنی جھوٹی شان کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''صفدر حیات! تم چودھری الیاس گھمن کی پہنچ سے واقف نہیں ہو۔ تمہیں بری طرح پچھتانا پڑے گا۔''

''دیکھا جائے گا......'' میں نے اس کی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے خاصے خطرناک لہجے میں کہا۔ ''تم ڈی سی کے پاس جاؤ یا گورنر سے ملو، آئی جی کا دروازہ کھٹکھٹاؤ یا وزیراعلیٰ کے آداب بجالاؤ، مجھے کسی کی پروا نہیں کیونکہ میں حق کی راہ پر چلتے ہوئے قانونی تقاضے پورے کر رہا ہوں اور جیت ہمیشہ حق ہی کی ہوتی ہے......'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''چودھری! تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ پورے بدن پر تیل مل کر کسرت شروع کردو۔ خوب ڈنڈ بیٹھکیں لگا کر تیار ہوجاؤ۔ میں کسی بھی وقت تمہاری گوشمالی کے لیے مراد پور آنے والا ہوں۔''

وہ مجھے ایسی نظر سے دیکھنے لگا جیسے کچا ہی چبا ڈالے گا۔ میں نے اس کی معاندانہ نگاہ کی پروا نہیں کی اور اس کی اونچی اونچی دھمکیوں کو جوتے کی نوک پر مار کر وہاں سے چلا آیا۔

تھانے پہنچ کر میں نے ایک کانسٹیبل کو بھیج کر ہیڈ کانسٹیبل بابر علی کو اپنے کمرے میں بلالیا۔ بابر فوراً حاضر ہوگیا۔ اس نے مجھے سیلیوٹ کرنے کے بعد مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

''جی، ملک صاحب۔ کیا حکم ہے؟''

بابر علی تفتیشی شعبے کا اسپیشلسٹ تھا۔ مجرموں کی زبان کھلوانے کے اس کے پاس ایک سو ایک گر تھے۔ وہ ایک ہٹا کٹا، جلاد صورت پولیس اہلکار تھا۔

''بابر علی!'' میں نے ماکھا جٹ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ہیڈ کانسٹیبل کو مخاطب کیا۔ ''یہ مراد پور کا ایک جانا اور مانا ہوا پہلوان ہے لیکن اس وقت یہ اپنے فنِ پہلوانی کو نکھار بخشنے کے لیے یہاں آیا ہے۔ میں اسے تمہاری شاگردی میں دیتا ہوں، اس امید کے ساتھ کہ تم اسے خاص الخاص داؤ پیچ سکھاؤ گے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا......؟''

''چنگی طراں سمجھ رہا ہوں ملک صاحب۔'' وہ ماکھا کو ایسی نظر سے دیکھنے لگا جیسے قصاب بکرے کو دیکھتا ہے۔ ''آپ فکر ہی نہ کریں ملک صاحب!'' وہ چہرے پر پراسرار خوشی کو سجاتے ہوئے بولا۔

''شاباش!'' میں نے توصیفی نگاہ سے بابر علی کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''میں مانتا ہوں، تم ایک سچے فن کار ہو لیکن اس دیو کے ہڈ گوڈ نہیں کھولنا، بس اس کی زبان کا تالا کھولنا ہے۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟''

''جی ملک صاحب!'' وہ سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کی خواہش کے مطابق اس مریض کا علاج کروں گا۔ یہ آپ کو صحیح سلامت ملے گا اور اس کی زبان ٹیپ ریکارڈر کی طرح بج اٹھے گی۔''

اس موقع پر حوالدار فیض احمد بھی کمرے میں موجود تھا۔ اس نے امید بھری نظر سے مجھے دیکھا اور منت ریز لہجے میں بولا۔ ''ملک صاحب! آپ سے میری ایک

درخواست ہے۔''

''ہاں بولو......'' میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

وہ بولا۔ ''اگر آپ ماکھا جٹ کو میرے حوالے کریں تو مجھے خوشی ہوگی۔''

میں فیض احمد کی اس التماس کے پس منظر سے بخوبی آگاہ تھا۔ ماکھا نے ادھر مراد پور میں دھوبی پاٹ مار کر جس برے انداز میں حوالدار کو زمین پر پٹخا تھا، فیض احمد اس واقعے کو اس وقت تک بھول نہیں سکتا تھا جب تک وہ ماکھا کی عظیم الشان درگت نہ بنا ڈالتا۔ اس مرحلے پر میں نے فیض احمد کو مایوس کرنا مناسب نہ سمجھا اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ماکھا جٹ کو میں آپ دونوں کے حوالے کر رہا ہوں۔ تم اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرکے اس کی خاطر داری کرو۔ میں کچھ دیر کے لیے تھانے سے باہر جا رہا ہوں۔ جب میں واپس آؤں تو اس وقت تک تمہارا کام پایۂ تکمیل کو پہنچ جانا چاہیے۔ اوکے؟''

''اوکے ملک صاحب!'' وہ بیک زبان ہوکر بولے۔

اس امر میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں کہ بعض اوقات مجرموں کی زبان کھلوانے کے لیے جو تفتیشی ہتھکنڈے آزمائے جاتے ہیں انہیں ''انسانی حقوق کی علم بردار تنظیموں'' کی زبان میں ''انسانیت سوز سلوک'' کہا جاتا ہے لیکن یہ سب کرنا ہماری مجبوری بلکہ تفتیش کا حصہ ہے۔

☆☆☆

سہ پہر کے وقت میں ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر پہنچا اور اپنے سینئر آفیسر کو صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے بعد اپنی اب تک کی کارکردگی کی رپورٹ بھی پیش کردی۔ میں نے انہیں بتایا کہ تفتیش کے سلسلے میں کس نوعیت کی مشکلات پیش آرہی ہیں۔ انہوں نے میری کوششوں کو سراہا اور مجھے ہر قسم کی کارروائی کے مکمل اختیارات دے دیے۔ مجھے اس بات کا یقین دلایا گیا کہ محکمہ اس کیس میں ہر ممکنہ حد تک مجھ سے تعاون کرے گا۔ مجھے ہدایت کی گئی کہ اگلے روز میں عدالت سے چودھری الیاس گھمن کی حویلی کے سرچ وارنٹ بھی نکلوالوں اور اگر میں ضرورت محسوس کروں تو چودھری کی گرفتاری کا حکم نامہ بھی حاصل کرلوں۔

ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر سے نکل کر میں ضلعی اسپتال چلا گیا تاکہ اے ایس آئی نوید علی اور کوچوان امیر بخش کی مزاج پرسی کرسکوں۔ جب آج علی الصباح میں اسپتال سے رخصت ہوا تھا تو وہ دونوں ہوش وحواس میں تھے تاہم ان کی جسمانی حالت کو تسلی بخش نہیں کہا جاسکتا تھا۔

اب جوان سے میری ملاقات ہوئی تو وہ قدرے ب تھے۔ میں نے متعلقہ ڈاکٹر سے بھی بات کی۔ ڈاکٹر کا مشو یہی تھا کہ آج کا دن انہیں اسپتال ہی میں رہنا چاہیے تا ان کی مناسب دیکھ بھال کی جاسکے۔ اس نے بتایا کہ آئن روز وہ انہیں ڈسچارج کردے گا۔ میں نے ڈاکٹر مشورے پر صاد کیا۔

میں کافی دیر تک ان کے پاس بیٹھا اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ اے ایس آئی کو میں نے آج کی مراد پ والی کارروائی کے بارے میں مختصراً بتایا۔ وہ نقاہت بھرے لہجے میں بولا۔

''میں ماکھا جٹ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ ایک تجربہ کار اور ماہر پہلوان ہے۔ آپ نے اسے زیر کرکے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔''

''میں نے ماکھا سے کوئی اکھاڑے میں دو دو ہاتھ نہیں کیے جو اس کی گرفتاری کو میرا عظیم کارنامہ تصور کیا جائے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ماکھا نے فیض احمد کو دھوبی پاٹ مار کر چاروں خانے چت کردیا تھا۔ اس کی اس کارکردگی سے لگا کہ وہ فنِ پہلوانی میں کافی مہارت رکھتا ہے۔''

''آپ ماکھا کو بابر اور فیض کے حوالے کر آئے ہیں۔'' اے ایس آئی نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''بابر تو ماکھا کی جو خاطر داری کرے گا سو کرے گا لیکن مجھے یقین ہے، فیض اپنی بے عزتی کا سود در سود بدلہ چکائے گا۔''

''مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''ملک صاحب! آپ نے ماکھا جٹ کو گرفتار کرکے حوالات میں پہنچا دیا ہے۔'' امیر بخش کوچوان جو کافی دیر سے خاموش لیٹا ہماری باتیں سن رہا تھا، مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''لیکن اصل مسئلہ اس وقت حل ہوگا جب ظفری آپ کی گرفت میں آئے گا۔''

''چودھری نے مجھے بتایا تھا کہ ظفری وقوعہ سے پہلے شیخوپورہ گیا ہوا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن میں چودھری کی بات پر بھروسا نہیں کرسکتا۔ ماکھا میرے ہتھے چڑھ گیا ہے۔ آج کی تاریخ میں، میں ماکھا کی زبان سے ظفری کا ٹھکانا اگلوالوں گا۔ ظفری اور ماکھا ایک ساتھ چودھری کے ڈیرے پر رہتے ہیں اور یہ دونوں چودھری کے خاص

ے بھی ہیں۔''

''آپ نے صحیح کہا ملک صاحب۔'' امیر بخش تائیدی ز میں بولا۔ ''چودھری الیاس گھمن ان دونوں پر بہت وسا کرتا ہے لیکن میری معلومات کے مطابق ظفری ھری کا خاص الخاص بندہ ہے۔ اہم نوعیت کے منصوبوں ں چودھری، ظفری ہی سے کام لیتا ہے۔'' لمحاتی توقف کے اس نے ایک مضمحل سی سانس لی پھر عجیب سے لہجے ں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''یہ لنگڑا لنگو جتنا زمین کے اوپر نظر آتا ہے، اس سے یں زیادہ یہ زمین کے اندر چھپا ہوا ہے۔ لوگ اس کی پستہ تی اور معذوری سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔ بے بس، وم اور لاچار دکھائی دینے والا یہ بندہ بڑا عیار اور چال ہے تھانے دار صاحب۔''

''جب یہ میرے ہتھے چڑھے گا تو... اس کی ساری ی، چالبازی اور پھرتی نکل جائے گی اور کسی کو اپنا ال سناتے ہوئے اس کی گردن شرم سے جھک جائے ں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''گزشتہ روز جنگل کے نزدیک ڈھاٹا پوش گھڑ اروں نے ہمارے ساتھ جو کارروائی کی اس میں امیر بخش ے بقول ظفری پیش پیش تھا۔'' اے ایس آئی نوید علی گہری یدگی سے بولا۔ ''اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ یہ سب کچھ دھری الیاس گھمن کے اشارے پر کیا گیا تھا۔ آپ نے یا تھا کہ چودھری بشریٰ کی لاش کا پوسٹ مارٹم کرانے کے ق میں نہیں تھا اسی لیے اس کے ڈھاٹا پوش حملہ آوروں نے یں آناً فاناً زدوکوب کرکے بشریٰ کی لاش کو تانگے سمیت ب کردیا۔''

''میں تمہارے خیالات سے اتفاق کرتا ہوں نوید۔'' یں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''میں اپنے طور پر اس نتیجے پر چکا ہوں کہ بشریٰ کی لاش کا پوسٹ مارٹم ہونے میں دھری کا کوئی بڑا نقصان چھپا ہوا تھا اور لاش کا پوسٹ مارٹم ہونے کی صورت میں اسے کوئی فائدہ پہنچنے والا تھا۔ بس، ب یہ پتا چلانا باقی ہے کہ چودھری کے اس فائدے اور صان کی نوعیت کیا ہے اور...... اس راز تک مجھے ماکھا اور فری پہنچائیں گے۔''

''ملک صاحب......'' امیر بخش نے منت ریز انداز یں کہا۔ ''وہ تانگا ہی میرے روزگار کا واحد ذریعہ تھا۔ میں یب انسان تو یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا ہوں کہ میری ری روٹی کا کیا ہوگا......؟''

''تمہارا تانگا اور اصغر علی کی بیوی بشریٰ کی لاش ایک ساتھ غائب ہوئے ہیں۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے رسانیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''ہیں کہ نہیں......؟''

''جی، جناب! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جلدی سے بولا۔

''مجھے ہر قیمت پر بشریٰ کی لاش کو بازیاب کرنا ہے تاکہ فی الفور اس کا پوسٹ مارٹم کرایا جاسکے۔'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''جب بشریٰ کی لاش ملے گی اور مجھے یقین ہے کہ وہ جلد از جلد ملے گی تو اس لاش کے ساتھ ہی تمہارا تانگا بھی مل جائے گا لہٰذا......'' میں نے ذرا سا توقف کرکے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''لہٰذا تمہیں اپنے تانگے کے لیے پریشان ہونے کے بجائے اس مالک کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرنا چاہیے جس کے کرم کے طفیل تم اس وقت زندہ ہو ورنہ ظفری اینڈ کمپنی نے تو تم لوگوں کو ''انا للہ'' کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب۔'' وہ ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولا۔ ''ماکھا ہو یا ظفری یہ سب چودھری الیاس گھمن کے غلام اور اس کے اشارے کے منتظر و محتاج ہیں۔'' اے ایس آئی نے کہا۔

''ہمارا اصل ٹارگٹ تو چودھری ہی ہوا نا۔''

''بالکل...... الیاس گھمن ہی ہمارا اصل ٹارگٹ ہے۔'' میں نے قطعی انداز میں کہا۔ ''اور میں اسی کو گھیرنے کے لیے یہ سارا کشٹ اٹھا رہا ہوں۔ میں الیاس گھمن کو ایسے طریقے سلیقے سے شکار کروں گا کہ اس کے وہم وگمان میں بھی نہ ہوگا۔ کل شام تک میں اپنا مقصد حاصل کرلوں گا۔''

''انشاء اللہ......!'' نوید علی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

میں تھوڑی دیر مزید ان کے پاس بیٹھ کر اٹھ آیا۔ جب میں تھانے پہنچا تو مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔

میں اپنے کمرے میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ حوالدار فیض احمد اور ہیڈ کانسٹیبل بابر علی میرے پاس آگئے۔ ان کے چہرے فاتحانہ تاثرات سے چمک رہے تھے۔ میں نے باری باری ان کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

''کیا رپورٹ ہے؟''

''رپورٹ کافی حوصلہ افزا ہے ملک صاحب۔'' فیض احمد نے جوشیلے انداز میں کہا۔

بابر معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''میں نے گاڑی کی سروس کردی ہے۔ آپ تھوڑی سی بھی ریس دیں گے تو یہ منجھی منجھائی ہوئی گاڑی گولی کی رفتار سے دوڑنے لگے گی۔ اس

کی زبان کے سارے قفل کھل چکے ہیں۔ اگر آپ ٹرائی کرنا چاہیں تو میں گاڑی کو گیراج سے نکال کر آپ کی خدمت میں پیش کر دیتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے......'' میں نے بابر علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم پندرہ منٹ کے بعد ماکھا کو میرے کمرے میں لے آؤ۔ میں خود اس سے سوال جواب کروں گا۔''

ان کے جانے کے بعد میں نے اپنے کمرے ہی میں نمازِ مغرب ادا کی۔ میں نماز سے فارغ ہو کر اپنی کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ ہیڈ کانسٹیبل، ماکھا جٹ کو میرے پاس لے آیا۔ ماکھا کی حالت ناگفتہ بہ ہو رہی تھی۔ میں نے بابر علی کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا اور ماکھا کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے بتایا گیا ہے کہ تم نے سچ بولنے کا فیصلہ کر لیا ہے......؟''

''تھانے دار صاحب! آپ میری بات کا یقین کریں۔'' وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر ملتجیانہ انداز میں بولا۔ ''بشریٰ کو پیش آنے والے واقعے میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔''

''کیا حوالدار اور ہیڈ کانسٹیبل نے تمہاری اس بات کا یقین کر لیا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''نہیں جناب!'' وہ سراسیمہ لہجے میں بولا۔ ''یہ دونوں بہت ہی ظالم اور سفاک انسان ہیں۔ انہوں نے مجھے مارنے کے سوا کوئی دوسرا کام نہیں کیا۔''

''میں بہت رحم دل اور خدا ترس انسان ہوں۔'' میں نے ماکھا پر ایک نفسیاتی حربہ آزمایا۔ ''میں تمہیں ایک تھپڑ بھی نہیں ماروں گا اور تمہاری ہر بات کا یقین بھی کروں گا لیکن میری ایک شرط ہے......''

میں نے جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ بے ساختہ مستفسر ہوا۔ ''کیسی شرط؟''

میں نے اپنائیت بھرے انداز میں کہا۔ ''پہلے بیٹھ جاؤ، پھر بات کرتے ہیں۔''

وہ بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس کا یہ ردِعمل عین فطری تھا۔ پچھلے چند گھنٹوں میں فیض احمد اور بابر علی نے اسے جن کڑی آزمائشوں سے گزارا تھا اس کے بعد میرا یہ رویّہ اسے ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ اس کی ہچکچاہٹ کو دیکھتے ہوئے میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

''تم نے سنا نہیں، میں نے کیا کہا ہے؟''

ایک لمحے کے تذبذب کے بعد وہ ایک چوبی کرسی پر بیٹھ گیا پھر الجھی ہوئی رحم طلب نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے اس کا نفسیاتی ٹریٹمنٹ شروع کرتے ہوئے کہا۔

''میری شرط بس اتنی سی ہے کہ تم مجھ سے کسی … غلط بیانی نہیں کرو گے۔ میں جو بھی پوچھوں، اس کا … کھرا اور سچا جواب دو گے تو میں تمہاری ہر بات کا … کروں گا اور تمہیں ایک طمانچہ تک نہیں ماروں گا لیکن … مجھے ذرا سا بھی محسوس ہوا کہ تم مجھے کوئی چکر دینے کی کو… رہے ہو تو میں تو تمہارا جو حشر کروں گا وہ بعد کی بات، فوری طور پر تو میں تمہیں ہفتہ دس دن کے لیے حوالدار … ہیڈ کانسٹیبل کے حوالے کر دوں گا۔''

وہ کمرے کے دروازے کی طرف دیکھتے ہو… حد ہراساں لہجے میں بولا۔ ''تھانے دار صاحب! میں … کر کہتا ہوں کہ میں آپ سے رتی برابر بھی جھوٹ نہیں … گا۔ آپ کو خدا کا واسطہ، آپ مجھے ان درندوں کے … نہیں کرنا......''

''ٹھیک ہے۔ آرام سے بیٹھ جاؤ۔'' میں … ''ابھی پتا چل جائے گا کہ تم اپنی بات پر کتنے سچے … ہو۔ سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے ڈیرے سے فرار … کی کوشش کیوں کی تھی؟''

''جناب! میں نے آپ کو چودھری صاحب … ساتھ گرما گرمی کرتے سن لیا تھا۔'' وہ بتانے لگا۔ '' … ظفری کی تلاش میں ڈیرے پر آئے تھے۔ مجھے یہی … ہوا کہ ظفری کو وہاں غیر حاضر پا کر آپ مجھے گرفتار کر … گے۔ بس، میں نے اسی ڈر سے دوڑ لگا دی تھی۔''

''تمہارے بہ قول......'' میں نے اس کی آنکھ… میں جھانکتے ہوئے استفسار کیا۔ ''بشریٰ کو پیش آنے وا… واقعے میں جب تمہارا کوئی ہاتھ نہیں تو پھر تمہیں کس بات … ڈر تھا؟''

''جناب! سیانے کہتے ہیں کہ گیہوں کے ساتھ گھن … پس جاتا ہے۔'' وہ عجیب سے انداز میں بولا۔

میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''ماکھا! تم … بہت اچھی مثال دی ہے۔ گھن ہمیشہ گیہوں کے ساتھ … ہے اسی لیے اسے گیہوں کے ساتھ ہی چکی میں پسنا پڑ… ہے۔ تم بھی ظفری کے ساتھ گیہوں اور گھن کے مانند … ڈیرے پر ایک ساتھ رہتے ہو...... میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانے … صاحب۔'' وہ ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولا۔ ''ان … جلادوں نے تو پیس کر میری ہڈیوں کا سرمہ بنا ڈالا ہے۔''

''ظفری اس وقت کہاں ہے؟'' میں نے سنسنا… ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

…اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ مجھے یہ … دیر نہیں لگی کہ وہ ظفری کے موجودہ ٹھکانے سے … طرح آگاہ تھا۔ اسے تذبذب کی کیفیت میں دیکھا تو … وارننگ دینے والے انداز میں کہا۔

''تم مجھ سے سچ بولنے کا وعدہ کر چکے ہو ماکھا، یہی … نے الیاس گھمن سے بھی کیا تھا اور اس نے مجھے … کہ ظفری اس واقعے سے ایک روز پہلے شیخوپورہ چلا … لیکن مجھے چودھری کی بات کا اعتبار نہیں ہے کیونکہ … ظفری کو گزشتہ روز یعنی وقوعہ کی دوپہر جنگل کی طرف … دیکھا تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار تھا اور اس نے ڈھاٹا لگا … بلکہ...... اس کے ساتھ چار پانچ اور ڈھاٹا پوش … بھی تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ لوگ کسی ڈکیتی کی … پر نکلے ہوئے ہیں......'' لمحاتی توقف کر کے میں … گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے … کہا۔

''اب میں تمہاری زبان سے حقیقت سننا چاہتا ہوں۔''

میں نے جس مہارت سے ماکھا کے اوپر اپنی تفتیش کا … جال پھینکا تھا، اس نے ماکھا کے ذہن کو جکڑ کر رکھ دیا … بے حد خوف زدہ لہجے میں بولا۔

''وہ...... وہ اپنی چاچی کے گھر میں ہے......'' ماکھا چند … ''نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن'' کی کیفیت میں رہ … اُگلنے پر مجبور ہو گیا۔ ''چاچی غفوراں کے گھر۔''

''کیا یہ غفوراں مراد پور کی وسنیک ہے؟''

''نہیں جناب! غفوراں موضع اسلام گنج میں رہتی …'' اس نے بتایا۔

اسلام گنج نامی یہ چھوٹا سا گاؤں مراد پور سے دو میل کی … پر واقع تھا۔ اسلام گنج میں کم و بیش پچاس گھر آباد ہوں … میں اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ماکھا سے پوچھا۔

''ٹھنڈا پانی پیو گے؟''

''جی پیوں گا......'' وہ اپنی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے … پیاس کی وجہ سے میرا حلق سوکھ کر کانٹا بن چکا ہے۔''

میں کمرے سے باہر نکلا اور ایک کانسٹیبل سے کہا کہ … ماکھا جٹ کو ٹھنڈا پانی پلائے۔ اس کے بعد میں نے فیض … ضروری ہدایات دینے کے بعد گمبھیر انداز میں کہا۔

''تم دو کانسٹیبلو کو لے کر اسی وقت موضع اسلام گنج … ہو جاؤ۔ مجھے ہر حال میں صبح سے پہلے ظفری تھانے … پہنچے۔ جب تک تم واپس نہیں آ ؤ گے، میں اپنے کوارٹر … جاؤں گا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

ضرب الامثال

آٹھ گاؤں کا چوہدری، بارہ گاؤں کا راؤ
اپنے کام نہ آئے تو ایسی تیسی میں جاؤ

(کوئی بااختیار شخص کسی کام نہ آئے تو ہونا نہ ہونا برابر ہے)

بھاٹ بھٹیاری بیسوا، تینوں جات کجات
آنے کا آدر کریں جاتے نہ پوچھیں بات

(مطلب کے وقت قدر کرنے اور بعد میں بھول جانے والوں کے لیے)

پارس ناتھ سے چکی بھلی جو آٹا دیوے پیس
دو کوڑھ نر سے مرغی بھلی جو انڈے دیوے بیس

(بے فیض سے وہ شخص اچھا جس سے لوگوں کو فائدہ ہو)

مراسلہ نگار...... راحیل نواب، ملتان

''اچھی طرح سمجھ گیا ملک صاحب۔'' وہ دانت پیستے ہوئے خاصے خطرناک لہجے میں بولا۔ ''ظفری نے محکمۂ پولیس پر بہت سا قرض چڑھا دیا ہے۔ اس قرض کی ایک ایک پائی اتارنا ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کو زیادہ انتظار نہیں کراؤں گا۔''

ظفری کی گرفتاری کے حوالے سے مطمئن ہونے کے بعد میں دوبارہ ماکھا جٹ کے پاس آ گیا۔ ٹھنڈا پانی پینے کے بعد اس کی حالت کافی بہتر ہو گئی تھی۔ میں نے دوبارہ تفتیش کا عمل آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''تو ظفری کل سے اپنی چاچی غفوراں کی بغل میں چھپا بیٹھا ہے......؟''

''جی بالکل......'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''تو میرا اندازہ درست تھا۔ الیاس گھمن نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''ظفری کو آخری مرتبہ کل تم نے کہاں دیکھا تھا اور کتنے بجے؟''

''کل دوپہر میں جب آپ اصغر علی کے گھر میں موقع

کی کارروائی کر رہے تھے تو ظفری میرے پاس آیا تھا۔'' ماکھا نے بتایا۔ ''اس نے کہا کہ وہ چودھری صاحب کے کسی ضروری کام سے اسلام گنج جا رہا ہے اور چند دن ادھر ہی رکے گا۔''

''چودھری کا ضروری کام......'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا ظفری نے اس ضروری کام کی وضاحت کی تھی؟''

''جی نہیں......'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''میں تمہیں بتاتا ہوں کہ وہ ضروری کام کیا تھا۔'' میں نے زہر خند لہجے میں کہا پھر اسے اے ایس آئی اینڈ کمپنی کو پیش آنے والے واقعے سے آگاہ کیا اور آخر میں نظریہ ضرورت کے تحت چھوٹی سی غلط بیانی بھی کر دی۔ ''اے ایس آئی نوید علی اور کوچوان امیر بخش کی لاشیں میں نے جنگل میں دریافت کر لی ہیں۔ امیر بخش کے تانگے اور بشریٰ کی لاش کی تلاش ہنوز جاری ہے۔''

میری بات سن کر ماکھا جٹ کا چہرہ پیلا پڑ گیا، لکنت زدہ لہجے میں اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''کیا واقعی یہ دونوں افراد ہلاک ہو چکے ہیں......؟'' پھر وہ سہمی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تھانے دار صاحب! آپ مجھ سے بڑی سے بڑی قسم لے لیں۔ اس واقعے سے میرا کوئی تعلق واسطہ نہیں۔''

''تم مجھ سے وعدہ کر چکے ہو کہ سچ بولو گے اور میں تم سے وعدہ کر چکا ہوں کہ اگر تم سچ بولو گے تو میں تم پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنے وعدے پر قائم ہوں اور تم پر مکمل بھروسا کر رہا ہوں۔ میں یقین کرتا ہوں کہ کل والی ڈھاٹا پوش گھڑسواروں کی کارروائی میں تمہارا کوئی کردار نہیں ہے۔ ظفری نے میری تفتیش کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے جو کچھ بھی کیا، وہ الیاس گھمن کے ایما پر کیا لہٰذا میں انہی دو افراد کے خلاف قانونی چارہ جوئی کروں گا۔ تمہیں اپنے لیے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''جی......'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''آپ کا بہت شکریہ۔''

میرے نفسیاتی ٹریٹمنٹ نے خاطر خواہ نتائج دیے تھے۔ میں نے اپنے کام کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ''تھوڑی دیر پہلے تمہاری زبان سے دو اہم باتیں نکلی ہیں۔ نمبر ایک...... بشریٰ کو پیش آنے والے واقعے میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ نمبر دو...... ظفری کے کسی بھی فعل سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں تمہارے ان بیانات کی وضاحت سننا چاہتا ہوں۔ مجھے بتاؤ کہ وقوعہ کی رات بدنصیب بشریٰ کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا اور ظفری کے فعل سے تمہاری مراد ہے؟''

وہ مجھ پر اندھا اعتماد کرنے لگا تھا اس لیے اس اندر کی کہانی کھول دی۔ میری نظر میں ماکھا کی بیان کہانی ایک مکمل اور تفصیلی پوسٹ مارٹم رپورٹ تھی۔ اس مجھے بتایا کہ ظفری کی کافی عرصے سے بشریٰ پر بری نگاہ تھی وقوعہ کی رات اصغر علی کو گھر میں موجود نہ پا کر اسے من ما کرنے کا موقع مل گیا۔ اس نے بشریٰ کو اپنی ہوس کا نشا بنا ڈالا۔ اسی فعلِ بد کے دوران میں بشریٰ جذباتی صد سے جان کی بازی ہار گئی۔ ظفری نے بشریٰ کے ساتھ درندگی کا مظاہرہ کیا تھا، بشریٰ کی غیرت اسے برداشت کر سکی اور وہ تار تار عصمت کے ساتھ اللہ کو پیاری ہو گئی۔

میں نے ماکھا جٹ کی بات کو تحمل سے سنا اور اس خاموش ہونے پر کہا۔ ''بشریٰ کی موت کے بعد ظفری اس کے لباس کو درست کیا پھر اسے گھر کے ایک کمرے اس طرح پھانسی پر لٹکایا کہ یہ خودکشی کا واقعہ نظر آئے......''

''جی...... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ سر اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''ایسا ہی ہوا تھا۔''

''اگر سب کچھ ایسا ہی ہوا تھا تو پھر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی......'' میں نے الجھن زدہ نظر سے ماکھا کی طرف دیکھا۔

وہ جلدی سے بولا۔ ''کون سی بات جناب؟''

''ظفری، بشریٰ کی عزت کا لٹیرا تھا اور اس کی موت کا ذمے دار بھی۔'' میں نے بہ دستور ماکھا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''ظفری نے مردہ تباہ حال بشریٰ کو پھانسی دے کر خودکشی کا تاثر قائم کرنے کی کوشش کی۔ یہاں تک تو ٹھیک ہے لیکن چودھری الیاس گھمن بشریٰ کے پوسٹ مارٹم کے خلاف کیوں تھا؟ وہ بشریٰ کی موت کو اصغر علی کے کھاتے میں لکھوانے کی کوشش میں کیوں تھا؟ اس نے مجھ سے ایسی باتیں کیوں کیں جن سے بشریٰ کی کردار کشی کا پہلو اجاگر ہوتا تھا......؟''

''اصل میں...... چودھری صاحب کو ڈر تھا کہ آپ حقیقت تک پہنچ جائیں گے......'' وہ رک رک کر بولا۔

''کس بات کا ڈر...... کون سی حقیقت؟''

''یہی کہ بشریٰ نے خودکشی نہیں کی بلکہ موت کے بعد اسے پھانسی دی گئی ہے۔''

''مگر چودھری نے تو خود انہی خیالات کا اظہار کیا تھا۔'' میرے لہجے میں الجھن برقرار رہی۔ ''وہ بھی بشریٰ کی

...کو خودکشی نہیں سمجھ رہا تھا۔ اس کے مطابق بشریٰ ایک ...دار عورت تھی۔ اصغر علی کافی عرصے سے اس کی ...الیوں کو برداشت کر رہا تھا۔ جب اصغر کے صبر کا پیمانہ ...ز ہو گیا تو اس نے فرید نگر جانے کا ناٹک کیا پھر رات میں ...س آ کر اپنی بیوی کو قتل کیا اور پھر اسٹور روم کی چھت سے ...بیوی کو لٹکا کر یہ بتانے کی کوشش کی کہ اس کی عدم ...دگی میں بشریٰ نے خودکشی کر لی تھی۔ مجھے بتاؤ، چودھری ...جانب اصغر علی کو بشریٰ کے قتل میں کیوں ملوث کرنا چاہتا ...اور دوسری طرف وہ اس کا حمایتی بھی بنا ہوا تھا۔ چودھری ...خود مجھ سے کہا تھا کہ اصغر علی نے غیرت کا مظاہرہ کر کے ...ٰی کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ آپ بشریٰ کی لاش کا ...ٹ مارٹم نہ کریں، خوامخواہ اصغر کی بدنامی ہو گی۔''

''چودھری صاحب کو اصغر کی بدنامی سے کوئی مطلب ...یں تھا تھانے دار صاحب!'' ماکھا انکشاف انگیز انداز میں ...دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے ترت پوچھا۔ ''پھر چودھری کو کس سے ...لب تھا؟''

''چودھری صاحب اپنے بندوں کو بچانا چاہتے ...ے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اگر لاش کا پوسٹ مارٹم ...ہا تا تو پھر دو باتیں کھل جاتیں۔ ایک تو یہ کہ بشریٰ نے ...شی نہیں کی۔ جب اسے پھانسی دی گئی اس سے پہلے اس ...موت واقع ہو چکی تھی اور دوسری بات یہ کہ موت سے قبل ...کی آبروریزی کی گئی تھی۔''

''بالکل...... پوسٹ مارٹم میں یہ حقائق چھپ نہیں ...تھے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن تم ...کہا کہ چودھری اپنے بندوں کو بچانا چاہتا تھا۔ تم کن ...وں کا ذکر کر رہے ہو؟ بشریٰ کے ساتھ تو صرف ظفری نے ...م ڈھایا تھا......''

میرے استفسار کا جواب دینے سے پہلے ماکھا نے ...لمحہ سوچا پھر کسی فیصلے پر پہنچنے کے بعد مضبوط لہجے میں ...لا۔ ''وقوعہ کی رات ظفری نے اکیلے ہوس کا کھیل نہیں ...یلا تھا......''

''پھر......'' میں نے اضطراری انداز میں پوچھا۔ ...اور کون تھا اس بدبخت کے ساتھ؟''

''عباس گھمن......'' ماکھا نے ٹھہرے ہوئے لہجے ...بتایا۔

''یہ عباس گھمن کون ہے؟''

''چودھری صاحب کا چھوٹا بھائی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''عباس گھمن اور ظفری میں کافی گہری دوستی ہے۔''

''اوہ......'' میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

اس کیس کے تمام پہلو روزِ روشن کی طرح مجھ پر عیاں ہو گئے تھے۔ ماکھا نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔

''تھانے دار صاحب! میں نے اپنا وعدہ نبھاتے ہوئے آپ کو سب کچھ سچ بتا دیا ہے۔ اب آپ نے مجھے چودھری صاحب کے غضب سے بچانا ہے۔ اگر انہیں پتا چل گیا کہ میں نے آپ سے یہ باتیں کی ہیں تو وہ میرے ان گنت ٹکڑے کر کے نہر میں پھنکوا دیں گے۔''

''چودھری کی طرف سے تو تم بالکل بے فکر ہو جاؤ۔'' میں نے تشفی آمیز لہجے میں کہا۔ ''تم نے اگر اپنا وعدہ نبھایا ہے تو میں بھی کسی قدم پر عہد شکنی نہیں کروں گا۔ تم فکر نہیں کرو۔ میں سارا ملبا ظفری پر ڈال دوں گا۔''

''وہ کس طرح......؟'' وہ الجھن آمیز حیرت سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''میں نے ایک ٹیم کو اسلام گنج روانہ کر دیا ہے۔ وہ لوگ تھوڑی دیر میں ظفری کو گرفتار کر کے یہاں لے آئیں گے۔ تم سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں، میں ظفری سے کڑی پوچھ تاچھ کروں گا اور اس پوچھ پرتیت سے پہلے میں ظفری کو کچھ دیر کے لیے فیض احمد اور بابر علی کے حوالے کروں گا۔ تم اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر بتاؤ کہ میرے ان دو اہلکاروں سے خاطر مدارات کرانے کے بعد ظفری جھوٹ بولنے کی جرأت کر سکے گا۔''

''بالکل نہیں تھانے دار صاحب!'' وہ ایک جھرجھری لینے کے بعد بولا۔ ''آپ کے یہ دونوں بندے تو پتھروں کو بھی بولنے پر آمادہ کر لیتے ہیں......''

''بس تو پھر تم اطمینان رکھو کہ تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔'' میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ''میں نے تفتیش کے دوران میں تم سے پوچھا...... ظفری کہاں ہے؟ تم نے جواب دیا، وہ شیخوپورہ گیا ہوا ہے۔ میں نے دریافت کیا، ظفری کے رشتے دار کہاں کہاں رہتے ہیں؟ تم نے تین چار جگہوں کے نام بتائے جن میں موضع اسلام گنج بھی شامل تھا۔ اس کے بعد ظفری کی گرفتاری کے لیے میں نے جو بھی کارروائی کی، وہ میرا ذاتی منصوبہ تھا۔ اس میں تمہاری کوئی کوتاہی اور روش نہیں ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''جی اچھی طرح سمجھ گیا۔'' وہ سکھ کی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

میں نے ماکھا جٹ کا بیان قلم بند کر کے اس کا انگوٹھا

لگوالیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔
"یہ محض کاغذی کارروائی ہے۔ اس سلسلے میں تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"
وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔ "اب میں جاؤں؟"
"نہیں۔ تمہیں ایک آدھ دن مزید حوالات میں گزارنا ہوگا۔" میں نے اٹل لہجے میں کہا۔ "اس کیس کا اونٹ کسی کروٹ بیٹھ جائے پھر میں تمہیں رہا کردوں گا۔ اگر ابھی چھوڑ دیا تو چودھری کو تم پر شک ہوجائے گا اور تم کسی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔"
"یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ پُرسوچ انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔
میں نے ماکھا جٹ کو دوبارہ حوالات میں بھیج دیا۔
نصف شب کے قریب اسلام گنج والی ٹیم واپس آگئی۔ فیض احمد، ظفری کو گرفتار کرکے اپنے ساتھ لایا تھا۔ میں نے فیض احمد سے کہا کہ وہ جاکر آرام کرے اور ظفری کو بابر علی کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔
"بابر! تمہارے لیے نئی خوراک آگئی ہے اور اس میں کوئی ساجھے دار بھی نہیں۔ تم نے اکیلے ہی اس پر ہاتھ صاف کرنا ہے۔"
وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ "آپ فکر ہی نہ کریں ملک صاحب۔ میں اس لنگڑے کی چال اور ڈھال کو تیر کی طرح سیدھا کردوں گا۔" پھر وہ ظفری کو ایک زوردار دھکا دیتے ہوئے کرخت لہجے میں بولا۔ "آؤ...... آپریشن سے پہلے میں تمہیں اپنی لیبارٹری کی سیر کرادوں۔"
میں نے بابر علی کو اچھی طرح وہ پوائنٹس ذہن نشین کرا دیے جن پر ظفری سے اقبالِ جرم کرانا تھا۔ خاص طور پر یہ نکتہ کہ اے ایس آئی اور کوچوان کی لاشیں پولیس کو جنگل سے مل گئی ہیں۔ یہ ایک ایسا داؤ تھا کہ ظفری فرفر اپنے کالے کرتوتوں کی کہانی سنانے پر مجبور ہوجاتا اور خود کو بچانے کے لیے وہ چودھری کے خلاف بیان دینے پر تیار ہوجاتا۔ میں نے بابر علی کو یہ بھی سمجھا دیا کہ وہ ظفری سے کہے کہ اگر وہ حقیقت کا اقرار کرلے گا تو میں اسے سلطانی گواہ یعنی وعدہ معاف گواہ بنالوں گا۔ اس کے بعد میں اپنے کوارٹر میں آگیا۔ میں نے دونوں حوالاتیوں کو الگ الگ رکھنے کی تاکید بھی کردی تھی۔

☆☆☆

آئندہ روز صبح ہی صبح میں عدالت پہنچ گیا اور چودھری الیاس گھمن کو قابو کرنے کے سرکاری منتر لے کر واپس تھانے آگیا۔ اس دوران میں بابر علی نے ظفری سے اقبالِ جرم کروالیا تھا۔ ظفری نے بتادیا تھا کہ اس نے بشریٰ کی لاش کو جنگل کے کس حصے میں دفن کیا تھا۔ امیر بخش والا تانگا تو موضع اسلام گنج ہی سے بازیاب کرلیا گیا تھا۔ میں ظفری کا بیان قلم بند کرکے اس کا انگوٹھا لگوایا اور اس سے وعدہ کیا کہ اگر وہ عدالت میں حقائق کو بیان کرے گا تو اس کے ساتھ خاص رعایت کرکے اسے سزائے موت سے بچالوں گا۔ ان دو دنوں میں، میں نے چودھری الیاس گھمن کی اندرونِ خانہ اور بیرونِ خانہ ہر نوعیت کی معلومات اور حالات سے آگاہی بھی حاصل کرلی تھی چنانچہ میں حوالدار فیض احمد اور دو مستعد کانسٹیبلو امتیاز حسین اور فیروز شاہ کو ساتھ لیا اور پوری تیاری کے ساتھ چودھری کی حویلی پر چڑھائی کردی۔
جب چودھری کو پتا چلا کہ میں اسے اور اس کے چھوٹے بھائی عباس گھمن کو گرفتار کرنے آیا ہوں تو وہ آپے سے باہر ہوگیا۔ سانپ سے مشابہ پھنکار میں اس نے مجھ سے کہا۔
"صفدر حیات! یہ تمہارے باپ کا گھر نہیں ہے جو یوں منہ اٹھائے چلے آئے ہو۔"
"چودھری! میں جانتا ہوں، یہ تمہارے باپ کا گھر ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور میں تمہیں اور تمہارے چھوٹے بھائی عباس گھمن کو اس گھر سے بے گھر کرنے آیا ہوں۔ تمہارے دونوں نمک خوار اس وقت میری تحویل میں ہیں۔"
"دونوں......؟" اس نے سوالیہ نظر سے چونک کر مجھے دیکھا۔
"ہاں دونوں!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "ماکھا تو ایک دم بے کار ہے لیکن ظفری بہت کام کا بندہ ثابت ہوا ہے۔ اس کا اقبالی بیان تم دونوں بھائیوں کو ساری زندگی جیل میں سڑانے کے لیے کافی ہے۔"
"یہ تم کیا بکواس کررہے ہو؟" اس کا غیظ و غضب دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا، وہ حقارت آمیز لہجے میں بولا۔ "تم نے چودھری الیاس گھمن کے قہر کو للکار کر اپنی آنے والی نسلوں کے ساتھ بہت برا کیا ہے۔"
"میں صرف اپنے مالک کے قہر سے ڈرتا ہوں چودھری۔" میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔ "تمہارے جیسے بدقماش اور بدکردار چودھریوں کو تو میں جوتے کی نوک پر رکھتا ہوں۔"

"میں اپنے سامنے اونچی آواز میں بولنے والے کی ...ن کو گدی سے کھنچوا کر چیل کوؤں کو کھلا دیتا ہوں۔" وہ ...ٹ اڑاتے ہوئے بولا۔ "ایک منٹ کے اندر میری حویلی ...دفع ہوجاؤ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"
"خوب کہا......" میں نے اس کی کیفیت سے محظوظ ...تے ہوئے کہا۔ "میں بھی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں ...م سے زیادہ برا اور کوئی نہیں ہوسکتا اور جہاں تک میرے ...ی سے نکلنے کا تعلق ہے تو میں خالی ہاتھ واپس نہیں جاؤں ...ظفری کا اقبالی بیان میں قلم بند کرچکا ہوں اور......" میں ...ڈرامائی توقف کرکے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا پھر ...رے ہوئے لہجے میں اضافہ کیا۔
"اور تم دونوں عاقبت نااندیش بھائیوں کا عدالتی ...لانہ گرفتاری بھی ہے میرے پاس۔"
تھوڑی دیر پہلے آتش زیرپا دکھائی دینے والا ...ھری ایک دم ڈھیلا پڑ گیا اور معتدل انداز میں بولا۔
"اچھا...... تو تم سرچ وارنٹ ساتھ لائے ہو۔"
"سرچ وارنٹ بھی اور ریسرچ وارنٹ بھی۔" میں نے ...ی خیز نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ "پہلے میں تمہاری ...ی حویلی کی سرچ کروں گا پھر دونوں بھائیوں کو گرفتار کرکے ...نے کے ٹرائل روم میں تم پر ریسرچ کروں گا۔"
وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولا۔ "میں تمہاری بات کا ...ن نہیں کرسکتا۔ مجھے وہ وارنٹ دکھاؤ۔"
میں نے اپنی جیب میں سے حویلی کی مکمل تلاشی اور ...ھری گھمن برادران کی گرفتاری کے وارنٹ نکال کر ...اس گھمن کی آنکھوں کے سامنے لہرائے پھر دونوں ...ٹیبلو سے تحکمانہ انداز میں کہا۔
"چودھری کے چھوٹے بھائی عباس گھمن کو ڈھونڈ کر ...ر نکالو۔"
پھر میں نے فیض احمد سے کہا۔ "حوالدار! چودھری کو ...فتار کرلو۔"
میرے خطرناک تیور اور غیر متزلزل ارادے کو دیکھ کر ...ھری قدرے نرم پڑ گیا۔ وہ اڑی ہوئی رنگت کے ساتھ ...۔ "آپ نے میرے دو خاص بندوں کو حراست میں لے ...ا ہے۔ ساری کارروائی انہی پر ڈال دیں۔ ہم بھائیوں کو ...فتار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ جو کہیں گے، میں ...پ کی ہر خدمت کرنے کو تیار ہوں۔"
"چودھری! تم سیدھی طرح گرفتاری دیتے ہو یا میں ...ے مرادپور کے سامنے جوتے مارتے ہوئے تمہیں ہتھکڑی پہنا کر اپنے ساتھ لے جاؤں۔" میں نے ہر لحاظ اور ہر مروت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا پھر حوالدار کی طرف دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔
"فیض احمد! تم نے سنا نہیں، میں نے کیا کہا ہے؟"
حوالدار نے آگے بڑھ کر چودھری کو آہنی زیور پہنا دیا۔
اسی وقت دونوں کانسٹیبلو عباس گھمن کو دھکے دیتے ہوئے ہمارے قریب پہنچ گئے۔ میں نے عباس گھمن کو بھی ہتھکڑی لگائی اور پہلی فرصت میں چودھری برادران کو تھانے لے آیا۔
چودھری الیاس گھمن کو اچھی طرح اندازہ ہوگیا تھا کہ میں کسی بھی قیمت پر اس کی جاں بخشی کرنے والا نہیں ہوں۔ آخری کوشش کے طور پر اس نے لجاجت بھرے لہجے میں کہا۔ "تھانے دار صاحب! میں علیحدگی میں آپ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"
ایک لمحہ سوچنے کے بعد میں اسے اپنے کمرے میں لے آیا اور نفرت آمیز لہجے میں استفسار کیا۔ "بولو...... کیا کہنا چاہتے ہو؟"
"ابھی معاملہ تھانے کے اندر ہی ہے ملک صاحب۔" وہ منت ریز لہجے میں بولا۔ "آپ بڑے بااختیار تھانے دار ہیں۔ اگر آپ چاہیں گے تو یہ معاملہ ادھر ہی ختم ہوجائے گا۔"
"وہ کس طرح؟" میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔
وہ آواز دبا کر بولا۔ "سرکار! مرنے والے کو تو دوبارہ زندہ نہیں کیا جاسکتا۔ آپ اس کیس کا سارا ملبا ماکھا اور ظفری پر ڈال دیں۔ اس کے بدلے میں، میں آپ کو خوش کردوں گا۔"
"کان کھول کر سن لو الیاس گھمن! میں نے کبھی لاشوں کا کاروبار نہیں کیا۔" میں نے اس کے کان کے کیڑے جھاڑتے ہوئے دوٹوک انداز میں کہا۔ "بکروں کی قربانی سے یہ بلا ٹلنے والی نہیں۔ موجودہ صورتِ حال دو ہٹے کٹے مرکھنے بیلوں کی قربانی کا مطالبہ کررہی ہے یعنی...... چودھری برادران کی صحت مند قربانی البتہ......" لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔
"البتہ، میں یہ ضرور جاننا چاہوں گا کہ تم مجھے کس طرح خوش کرنا چاہتے ہو؟"
"دیکھیں ناجناب!" وہ اپنی گھٹیا سوچ کو زبان تک لاتے ہوئے بولا۔ "پولیس کی اس نوکری سے آپ کو ملتا ہی کیا ہوگا۔ اگر آپ میری تجویز پر عمل کریں تو میں آپ کو مالا مال کردوں گا...... پانچ ہزار...... دس ہزار...... یا جتنے بھی

آپ کہیں، میں دینے کو تیار ہوں۔ بس اس معاملے کو ادھر ہی رفع دفع کردیں۔“

”ہوں......“ میں نے گہری نظر سے اسے دیکھا اور کہا۔ ”تو گویا تم مک مکا کرنا چاہتے ہو؟“

”آپ یہی سمجھ لیں......“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

”چودھری! میں مک مکا کے لیے تیار ہوں۔“ میں نے اس کے دل کی بات کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن یہ مک مکا میری شرائط پر ہوگا۔“

اس کی جان میں جان آئی۔ ”آپ حکم کریں سرکار!“ وہ بے حد فدویانہ انداز میں بولا۔ ”میں آپ کی ہر شرط ماننے کو تیار ہوں۔“

”ہر شرط......؟“ میں نے تصدیق طلب نظر سے اسے دیکھا۔

”جی بالکل......“ وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ ”اگر آپ ہم دونوں بھائیوں کو اس مصیبت سے نکال دیں تو میں آپ کا ہر مطالبہ پورا کرنے کو تیار ہوں۔“

”ظفری کو تو میں کسی بھی صورت نہیں چھوڑ سکتا۔“ میں نے اپنے مقصد کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے کہا۔

”آپ ظفری اور ماکھا کا جو جی چاہے، حشر نشر کریں۔ مجھے ان کی پروا نہیں ہے۔“ وہ خود غرضانہ انداز میں بولا۔ ”آپ ہم دونوں بھائیوں کو چھوڑنے کی قیمت بتائیں؟“

”میں آپ دونوں کو دیت کے قانون کی بنا پر چھوٹ دے سکتا ہوں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں خون بہا میں اصغر علی کو منہ مانگی رقم دینے کو تیار ہوں۔“ وہ خاصے توانا لہجے میں بولا۔ ”آپ بتائیں، کتنے میں مک مکا ہوجائے گا؟“

”یہ معاملہ محض رقم دینے سے حل نہیں ہوگا چودھری۔“ میں نے اپنا مقصد الیاس گھمن پر واضح کرتے ہوئے کہا۔ ”تم ایک بھاری رقم تو اصغر علی کو دو گے ہی۔ چونکہ اس کی عزت کا خون ہوا ہے لہٰذا خون بہا میں تم اسے عزت بھی دو گے......“

”میں سمجھا نہیں؟“ وہ الجھی ہوئی نظر سے مجھے تکنے لگا۔ ”میں اصغر علی کی بیوی کو کیسے زندہ کرسکتا ہوں؟“

”تم کیا...... بشریٰ کو کوئی بھی زندہ نہیں کرسکتا۔“

”پھر آپ کی اس بات کا مطلب کیا ہے؟“

”میں چاہتا ہوں، اصغر کا گھر بس جائے۔“ میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اسی ہفتے یا زیادہ سے زیادہ ایک مہینے کے اندر......“

”یہ کون سا مشکل کام ہے۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”میں آج ہی اصغر کی شادی مراد پور کی کسی لڑکی سے کروا دیتا

”نہیں چودھری!“ میں نے نفی میں گردن ہلا

”اصغر کو مراد پور کی کسی بھی ”اے بی سی“ لڑکی سے نہیں کرنا۔“

”پھر......؟“

”خون بہا کون دے رہا ہے؟“

”میں......!“ وہ بے ساختہ بولا۔

”بس تو پھر اصغر علی کی شادی بھی آپ کے گھر ہوگی۔“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”وہ مراد پور کی داماد بنے گا۔“

”آپ ہوش میں تو ہیں......؟“ وہ بپھرے لہجے میں بولا۔

”میں ہوش میں ہوں جبھی تو دیت کی تجویز پر کرنے کو کہہ رہا ہوں۔“ میں نے سمجھانے والے انداز کہا۔ ”تمہاری بیٹی جمیلہ دو سال پہلے بیوہ ہوگئی تھی۔ تم خون بہا میں اصغر کی بیوی بنا سکتے ہو۔ اس طرح جمیلہ اصغر کا گھر بھی بس جائے گا اور آپ دونوں بھائی بھی ورسوا ہونے سے محفوظ رہو گے بلکہ آپ دونوں کی جان ہوجائے گی۔“

”یہ نہیں ہوسکتا......!“ اس کے جاگیردارانہ خون جوش مارا۔

”تو پھر مک مکا کو بھول جاؤ۔“ میں نے بھرے انداز میں کہا۔ ”اصغر کو تو بہت سی عورتیں مل جائیں شادی کے لیے لیکن جمیلہ کو باپ اور چاچا کبھی نہیں مل سکے میں تم دونوں بھائیوں کے خلاف ایسا مضبوط کیس بناؤں گا اگر تمہیں پھانسی کی سزا نہیں بھی ہوئی تو تم دونوں جیل کی دیواروں کے پیچھے زندگی بھر سڑتے رہو گے اور...... تم طرح جانتے ہو کہ میں ایسا کرسکتا ہوں کیونکہ میرے پاس دونوں بھائیوں کے خلاف ٹھوس ثبوت موجود ہیں......“

چودھری الیاس گھمن چند لمحات تک ٹٹولتی ہوئی سے مجھے دیکھتا رہا۔ میں نے اسے بند گلی میں پہنچا دیا تھا اقرار کی صورت میں ناک کٹتی تھی اور انکار کرنے پر گردن تھی۔ وہ اندر سے بہت گھٹیا اور چھوٹا انسان تھا۔ ایسے افراد اپنی جان سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ ان کا شمار غیر میں کٹ مرنے والوں میں نہیں کیا جاسکتا۔ چودھری الیاس گھمن نے بھی میرے مطالبے کے سامنے گردن جھکا دی۔

گویا وہ ”مک مکا“ کے لیے راضی ہوگیا تھا......!

(تحریر: حسام بٹ)

اندر سے زہریلے، اوپر سے محبت کی چاشنی میں ڈوبے ہوئے کرداروں کا قصہ

ایک دوسرے کی جان بن جانے والے رشتے جب ایک دوسرے کی جان کے دشمن بن جاتے ہیں تو آزمائشوں کا دور شروع ہوجاتا ہے۔ وہ جو جیون ساتھی کے طور پر ساتھ ساتھ رہے تھے مگر ہمیشہ ایک دوسرے کا ساتھ نباہنے کے بجائے میٹھی چھری سے وار کرتے ہوئے جان چھڑانے کے منصوبوں پر عمل پیرا رہے۔

ازدواجی دلدل

انجم فاروق ساحلی

ٹیلی ویژن پر ایک لمبوترے چہرے والے شخص کی دکھائی دینے لگی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”یوں بارنی اپنے میں کامیاب رہی۔ اس نے چائے میں زہر گھولنے مگر کامیاب تجربہ کیا تھا۔ جیسا کہ آپ سب جانتے کوئی بھی شخص جرم کرکے قانون کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں ۔ لہٰذا ہم اس جرم کی تہ تک پہنچ گئے۔“ اس نے بند کرکے کچھ توقف کے بعد کہا۔ ”آئندہ ہفتے ہم آپ کی دلچسپی کے لیے جرم وسزا کی ایک اور کہانی پیش کریں گے...... اب اجازت۔“

میں نے قریب پڑا ہوا پمفلٹ اٹھایا اور دیگر پروگراموں کی تفصیل پڑھنے لگا۔ میری بیوی قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے تازہ ترین کہانی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ عورت بارنی بالکل احمق معلوم ہوتی ہے۔ اسے سنکھیا استعمال نہیں کرنا چاہیے تھا۔ پوسٹ مارٹم کرنے پر سنکھیا

کا فوراً پتا چل جاتا ہے۔“

میں نے ٹیلی ویژن کا چینل بند کرتے ہوئے پوچھا۔ ”اگر تم بارنی کی جگہ ہوتیں تو کون سا زہر استعمال کرتیں، ڈیئر؟“ میں نے ٹیلی ویژن کی آواز اور اس کی روشنی درست کی اور پھر کرسی پر بیٹھ کر ٹانگیں پسار لیں۔ ایک منٹ کی خاموشی کے بعد مجھے احساس ہوا کہ ایڈونا نے میرے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے استفہامیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ اس کی انگلیاں بدستور اون اور سلائیوں میں الجھی ہوئی تھیں اور اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

”تم نے یہ کیسے فرض کرلیا کہ میں بھی کوئی ایسا ویسا کام کرسکتی ہوں؟ میں نے تو کبھی زہر استعمال کرنے کا تذکرہ بھی نہیں کیا۔“ وہ خاموش ہوتے ہی قریب رکھا ہوا گلاس اٹھا کر باقی ماندہ سوڈا ایک ہی سانس میں پی گئی، گلاس منہ سے لگاتے وقت اس میں پڑے ہوئے برف کے ٹکڑے کھنکھنائے تھے۔ ایڈونا کو سوڈے میں برف کی ڈلیاں ڈال کر پینے کا شوق تھا۔

میں دوبارہ ٹیلی ویژن کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ایک سراغ رساں اپنے تجربات بیان کررہا تھا کہ منگل کے روز جب اسے پولیس ہیڈ کوارٹر بلایا گیا تو ایک لاش وہاں اس کی منتظر تھی۔ اس وقت رات کے آٹھ بج کر بارہ منٹ ہوئے تھے وغیرہ وغیرہ۔

میں نے اکتا کر نگاہ ہٹائی اور دوبارہ ایڈونا کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اس سے شادی کرنے کے بعد میں نے پندرہ سال تک نہایت پھیکی اور بدمزہ سی زندگی بسر کی تھی۔ اس وقت میں اس کے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا مگر وہ مجھ پر توجہ دینے کے بجائے اپنے سویٹر میں الجھی ہوئی تھی۔ وہ سلائی پر بنے ہوئے پھندے گن رہی تھی مگر میں جانتا تھا کہ اس کا دماغ یقینی طور پر کسی سازش کا تانا بانا تیار کررہا ہے۔

میں نے اسے نظر انداز کرکے ایک بار پھر ٹیلی ویژن دیکھنا شروع کردیا۔ اسکرین پر کسی عورت کی لاش نظر آرہی تھی۔ عورت کو زدوکوب کرکے ہلاک کیا گیا تھا۔ اناؤنسر کہہ رہا تھا کہ عورت کا شوہر مفرور ہے اور ابھی تک اس کا کچھ پتا نہیں چلا...... پولیس کو شبہ ہے وہی اپنی بیوی کا قاتل ہے۔ میں تجسس سے آگے جھک گیا تو ایڈونا نے تیزی سے مداخلت کی۔ ”تم چینل تبدیل کرکے کوئی اور پروگرام نہیں لگا سکتے؟ میں ان قتل و غارت کے مناظر سے بیزار ہوگئی ہوں۔“

”کیوں؟“ میں نے زہرخند سے پوچھا۔ ”چونکہ کسی عورت کو قتل ہوتے دکھایا گیا ہے اس لیے تم کو ناگوار......“

”فضول باتیں مت کرو۔ میں کوئی دوسرا پروگرام دیکھنا چاہتی ہوں۔“ ایڈونا غرائی۔ وہ ایک بھاری بھرکم قدآور عورت تھی۔ جسم کی طرح اس کی آواز بھی کرخت تھی۔ جب وہ کسی چیز کو سختی سے منع کرتی ہے تو مجھے فوراً محتاط ہونا پڑتا ہے۔ کیونکہ میں پستہ قامت اور کمزور سا آدمی ہوں۔ میں نے قدرے تذبذب سے چینل تبدیل کردیا۔ اب ایک ٹیکسی ڈرائیور اپنے تاثرات بیان کرتا دکھائی دیا۔

”ہنری!“ ایڈونا نے تھوڑی دیر بعد کہا۔ ”اس ماہ تم نے اپنے بیمے کی قسط ادا کردی ہے؟“

”ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اپنی ہی نہیں، تمہارے بیمے کی قسط بھی جمع کروادی ہے۔“

”تم نے بلاوجہ میرا بیمہ کروالیا۔ میں اسے بالکل غیر ضروری سمجھتی ہوں۔“ اس نے ناک بھوں چڑھائی۔

”تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو؟“ میں نے کہا۔ ”کسی بھی لمحے تمہیں کچھ ہوسکتا ہے۔“ ایڈونا نے آنکھیں سکیڑ کر میری طرف دیکھا۔ اس کے ماتھے پر تفکر کی سلوٹیں پڑ گئی تھیں اس لیے میں نے اپنی جوتیاں پہنتے ہوئے مزید کہا ”میرے سگار ختم ہوگئے ہیں۔ اس لیے ملر کی دکان تک جارہا ہوں۔“

میں گنگناتا ہوا ملر کی دکان پر پہنچا تو اس نے سگار کا ڈبا میری طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ”ہنری! تمہیں چوہوں سے نجات مل گئی؟“

”کون سے چوہے؟“ میں نے سگار سلگاتے ہوئے پوچھا۔

”جو تمہارے گھر میں ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”تمہاری بیوی نے ان کے لیے کل یہاں سے زہر خریدا تھا۔“ میرے حلق میں تلخی سی گھل گئی اور سگار مجھے کڑوا کڑوا سا محسوس ہونے لگا۔

”فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ چوہے مار زہر تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اس میں ایسی کیمیائی اشیا ملی ہوئی تھیں کہ اس سے کتوں، بلیوں اور انسانوں کا کچھ نہیں بگڑتا۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”البتہ میں نے یہی بات تمہاری بیوی کو بتائی تھی تو اسے خاصی مایوسی ہوئی تھی۔ اس زہر کو ماہرین نے حال ہی میں تیار کیا ہے۔“

میں نے سگار کا دوسرا کش لیا تو ذائقہ قدرے بہتر محسوس ہوا۔ میں نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی اور ملر کی طرف دیکھنے لگا جو ہاتھ کاؤنٹر پر رکھے، میری طرف دیکھتا ہوا کہہ رہا تھا۔ ”اگر وہ تمہیں زہر دے کر قتل کرنا چاہتی ہو......“

......اسے اپنے بھائی سے مدد لینی چاہیے۔ وہ کیمسٹ اور آسانی سے کوئی ایسا زہر منتخب کرسکتا ہے جس کا بعد میں سراغ نہ لگایا جاسکے۔“

میری آنکھوں کے سامنے جیرالڈ کا چہرہ ناچنے لگا۔ دن کے آٹھ گھنٹے اس کے ساتھ گزارتا تھا، ہم دونوں ایک ہی لیبارٹری میں کام کرتے تھے۔

میں نے ملر کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور شدید اضطراب کے عالم میں گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ راستے بھر میں اپنے دانت پیسنے سے بھی باز نہ رہ سکا تھا۔

میں گھر میں داخل ہوا تو مجھے دیکھتے ہی ایڈونا کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ”جب تمہیں بھوک لگے تو ریفریجریٹر میں رکھے ہوئے سینڈوچ کھالینا۔ میں نے انہیں موی کاغذ میں لپیٹ دیا ہے تاکہ خراب نہ ہوں۔“

میں اس وقت بھوک محسوس کررہا تھا۔ اس لیے خاموشی سے کچن کی طرف بڑھ گیا۔ سینڈوچ مجھے ریفریجریٹر کے نچلے خانے میں رکھے ہوئے دکھائی دیے۔ میں نے موی کاغذ الگ کرکے اوپر والا سینڈوچ اٹھایا۔ دفعتاً میری نگاہ سینڈوچ میں رکھے ہوئے پنیر پر جم گئی اور میں چونک پڑا۔ اس میں چھوٹے چھوٹے سوراخ نظر آرہے تھے اور ان میں پاؤڈر بھرا ہوا تھا۔ میں نے دوسرا سینڈوچ اٹھایا اس کے ساتھ بھی یہی حرکت کی گئی تھی۔ غالباً ایڈونا کو ملر کی بات پر یقین نہیں آیا تھا اور اس نے چوہے مار دوا پنیر میں ڈال دی تھی۔ یہ سوچ کر میرا دل دھڑک اٹھا کہ اگر میں جلد بازی میں سینڈوچ منہ میں ڈال لیتا تو اس وقت عدم آباد کی طرف روانہ ہوچکی ہوتی۔ خوف میرے ذہن پر غالب آگیا تھا۔

میں بذاتِ خود بھی ایڈونا سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا مگر اس کے لیے ٹھوس منصوبہ بندی اور غور و فکر کی ضرورت تھی۔ فی الوقت میں نے ان سینڈوچز کو دوبارہ موی کاغذ میں لپیٹا اور انہیں کیبنٹ کے اوپری حصے میں چھپا دیا...... پھر میں نے جیلی اور ٹماٹر ملا کر سینڈوچ تیار کیے۔ ایڈونا کو ایسے سینڈوچ بہت پسند تھے کیونکہ ان میں چکنائی نہیں ہوتی۔

سینڈوچ کو تکونا کاٹ کر میں نے اپنے جوتے کی ایڑی سے ایک زہریلا سفوف نکالا اور سینڈوچز پر چھڑک دیا۔ اس سفوف کو میں بطورِ خاص ایڈونا کے لیے لیبارٹری سے لایا تھا۔ اس کی ایک معمولی سی خوراک ہاتھی کو بھی چت کرنے والی تھی۔ ایک سینڈوچ کو میں نے یونہی رہنے دیا تاکہ ایڈونا سینڈوچ کھانے سے جھجکے تو میں اٹھا کر کھانا شروع کردوں۔ زہر کی پڑیا ایڑی میں رکھ کر میں سیدھا ہوا ہی تھا

بولی

ایک شخص نے پرندوں کی دکان پر نیلامی کا بورڈ آویزاں دیکھا۔ وہ دکان میں داخل ہوا اور ایک طوطے کی بولی لگائی۔ بولی بڑھتی گئی۔ وہ بھی بولی بڑھاتا گیا۔ آخر بولی اس کے نام پر ختم ہوئی۔ وہ طوطے کا پنجرہ اٹھا کر باہر آنے لگا تو اچانک جیسے اسے کوئی خیال آگیا۔ وہ دکاندار سے بولا۔

”بھائی...... تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ یہ طوطا بولتا بھی ہے یا نہیں؟“

دکاندار کے بولنے سے پہلے ہی پنجرے سے آواز آئی۔ ”بے وقوف، تمہارے مقابلے میں اتنی دیر سے بولی کون بڑھاتا رہا۔“

☆☆☆

آفٹرنون

فیروز خان نون کی پہلی بیگم، بیگم نون کہلاتی تھیں۔ جب فیروز خان نون نے دوسری شادی کی تو اپنے ایک شناسا مولانا سالک سے بطور مشورہ پوچھا۔

”اب دوسری بیوی کو کیا کہا جائے گا؟“

مولانا نے بے ساختہ جواب دیا۔ ”آفٹرنون۔“

☆☆☆

قبرستان سے

ایک کہانی لکھنے کے شائق جوان نے کسی مشہور مصنف سے سوال کیا۔

”سر...... مصنف بننے کے لیے کن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے؟“ مصنف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ایک قلم، ایک کاغذ کا دستہ اور ایک کھوپڑی کی......“

مصنف بننے کے خواہش مند نے سوچتے ہوئے کہا۔

”کاغذ اور قلم تو بازار سے مل جائیں گے لیکن کھوپڑی کہاں سے ملے گی؟“

”قبرستان سے۔“ مصنف نے سر پکڑتے ہوئے کہا۔

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

کہ ایڈونا کچن میں داخل ہوئی۔ اس نے سینڈوچز پر نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا کررہے ہو ڈیئر؟“

میں نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا۔

”جانِ من! تمہارے لیے سینڈوچز تیار کررہا تھا۔“

”کیوں؟ یہ تمہیں میری فکر کب سے لاحق ہوگئی؟“

”تمہیں اس بات پر حیرت کیوں ہے، کیا اس سے پہلے میں نے تمہارے لیے کبھی سینڈوچ تیار نہیں کیے؟“

ایڈونا سوچ میں پڑگئی۔ ”میں نے جو سینڈوچ تمہارے لیے تیار کیے تھے، وہ تم نے کھالیے؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں ڈیئر!“ میں نے جواب دیا۔

”ہوں...... شاید تم نے انہیں بہت تیزی سے کھالیا ہے، بہرحال ذائقے میں کیسے تھے؟“

”بہت عمدہ۔“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”البتہ ایسا محسوس ہوا جیسے ان میں کسی دھات کی آمیزش ہوگئی ہو۔“

”احمقانہ باتیں نہ کیا کرو۔“ وہ غرائی۔ ”میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ کوئی احمق ہی ہوگا جو......“ دفعتاً اس نے کسی خیال کے تحت کوڑے دان میں جھانکا اور بولی۔ ”تم واقعی جلدی میں تھے، تم نے سینڈوچز کے ساتھ موی کاغذ بھی کھالیا۔“

کوڑے دان سے ہٹ کر وہ کچن کے وسط میں کھڑی ہوئی۔ اس نے میرا بنایا ہوا ایک سینڈوچ اٹھایا اور اسے غور سے دیکھنے لگی۔ اسے شاید مجھ پر شبہ ہوگیا تھا مگر سینڈوچ پر چھڑکا ہوا سفوف پگھل کر سینڈوچ میں یوں جذب ہوچکا تھا کہ وہ اس کا پتا نہیں لگاسکتی تھی۔

”ہنری! تم اس میں سے ایک کیوں نہیں کھاتے؟“ اس نے گھورتے ہوئے کہا۔ میں نے فوراً وہ سینڈوچ اٹھالیا جس پر سفوف نہیں چھڑکا تھا مگر اسے منہ تک لے جانے کی حسرت دل میں ہی رہ گئی۔

ایڈونا نے پھرتی سے میری کلائی پکڑی اور کہا۔ ”یہ ٹکڑا میں کھاؤں گی۔“ سینڈوچ کا وہ ٹکڑا منہ میں رکھتے وقت اس کے ہونٹوں پر مکار لومڑی جیسی مسکراہٹ تھی۔ میں بھی جواباً مسکرادیا مگر اتنی جاندار مسکراہٹ نہیں تھی۔

”میں دودھ گرم کرنے جارہی ہوں تم یہیں ٹھہرو...... کیونکہ تمہیں بھی دودھ پینا ہے۔ مجھے دیکھتے رہو تاکہ میں اس میں کوئی چیز ملانے میں کامیاب نہ ہوں۔“

میں وہیں کھڑا رہا۔ اس نے انڈا پھینٹ کر دودھ میں ملایا اور دو گلاس تیار کرکے ایک میری طرف بڑھادیا۔ میرے اطمینان کے لیے اس نے دودھ کا ایک گھونٹ بھرا اور مجھے اشارہ کیا کہ میں بھی دودھ پینا شروع کردوں۔ میں نے گلاس ہونٹوں سے لگالیا۔ ہم دونوں نے ہی ڈ[illegible] ڈرتے دودھ ختم کیا۔ ایک گلاس پینے میں مجھے پورے [illegible] منٹ لگ گئے تھے۔

دودھ پی کر ہم دوبارہ خواب گاہ میں آگئے۔ [illegible] ویژن پر ایک انسپکٹر کہہ رہا تھا...... ”اب آپ یہ پوچھیں گے کہ مسٹر لارنس کیوں ہلاک نہیں ہوئے؟ جبکہ انہوں نے سرانتھونی کے ساتھ ہی چائے پی تھی۔ بات دراصل یہ تھی [illegible] مسٹر لارنس کئی مہینوں سے اس زہر کی تھوڑی [illegible] مقدار پابندی سے استعمال کرتے رہے تھے۔ جو انہوں نے سرانتھونی کی پیالی میں ڈالا تھا لہٰذا انہیں تو کچھ نہیں [illegible] جبکہ سرانتھونی ہلاک ہوگئے۔“

ایڈونا اور میں ایک ساتھ قے کرنے کے لیے واش روم کی طرف دوڑے۔ اس رات نہ ایڈونا اچھی طرح سوئی اور نہ ہی مجھے نیند آئی۔ میں بھوکا پیاسا بیٹھا چاند کو گھورتا رہا اور وہ بستر پر کروٹیں بدلتی رہی۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو ٹھکانے لگانے کی فکر میں تھے اور اس کوشش میں وہی کامیاب ہوسکتا تھا جو زیادہ ہوشیار ثابت ہوتا۔

زہر استعمال کرنے کے علاوہ انسان کو ہلاک کرنے کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں۔ مجھے چاہیے تھا کہ ان میں سے کوئی طریقہ آزماتا۔ تو کیا پھر مجھے اسلحہ استعمال کرنا چاہیے؟ مگر نہیں...... ایڈونا مجھ سے زیادہ طاقتور ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اس پر ریوالور تانوں تو وہ اسے چھین کر میری ہی کھوپڑی میں سوراخ کردے۔ کسی قاتل کی خدمات حاصل کروں؟ مگر مجھے تو یہ بھی پتا نہیں تھا کہ کرائے کے قاتل کہاں ملتے ہیں۔ پھر وہ لمبی چوڑی رقم بھی تو طلب کرے گا اور ایڈونا مجھے اتنی رقم کبھی نہیں دے گی، چاہے میں کیسے ہی بہانے کیوں نہ بناؤں۔ لاش کو ٹھکانے لگانا میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میں اس کی لاش گاڑی میں لاد کر کسی ویرانے میں لے جاؤں گا اور گڑھا کھود کر دفن کردوں گا۔ پولیس جب اس کی غیر موجودگی پر بازپرس کرے گی تو میں چپ سادھ لوں گا۔ لاش کی غیر موجودگی میں وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔

لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ایڈونا کو زہر کیسے کھلایا جائے؟

میں اس الجھن میں تھا کہ صبح پانچ بجے میرے ذہن میں اچانک ایک ترکیب آئی۔ میں فوراً بستر سے اٹھ بیٹھا۔ تب ہی ایڈونا کی آواز سنائی دی۔ ”کیا بات ہے، تم ساری رات سوئے نہیں؟“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور نچلی منزل پر آگیا۔

اپنا ناشتا مجھے خود ہی تیار کرنا تھا۔ پندرہ سالہ ازدواجی زندگی میں اس نے کبھی میرا ناشتا تیار نہیں کیا تھا۔ میں نے کچن میں جاکر ڈبل روٹی کی طرف ہاتھ بڑھایا، پھر ٹھٹک کر رہ گیا۔ میرے ذہن میں یہ اندیشہ سر اٹھانے لگا کہ ایڈونا نے کہیں ہر چیز کو زہر آلود نہ کردیا ہو۔ یہ سوچ کر میں نے ناشتا تیار کرنے کا ارادہ ملتوی کردیا۔

ساڑھے سات بجے میں گھر سے نکل آیا تاکہ کسی اچھے سے ہوٹل میں ناشتا کرسکوں۔ لیبارٹری پہنچ کر میں حسبِ معمول اپنے کام میں مصروف ہوگیا مگر اس عرصے میں ہر لمحے میری نگاہ ایڈونا کے بھائی جیرالڈ کا تعاقب کرتی رہی۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ میرے لیے کوئی خاص قسم کا زہر تو نہیں بنارہا۔ جیسے تیسے کرکے وقت پورا ہوا اور میں پانچ بجے لیبارٹری سے نکل آیا۔

گھر پہنچ کر میں نے چابی سے تالا کھولا اور کان لگا کر سننے کی کوشش کی مگر کوئی آواز سنائی نہ دی۔ گھر میں سناٹا تھا۔ اس وقت مجھے یہ سناٹا بہت اچھا اور پُرسکون محسوس ہوا۔ خوشی سے سرشار میں ڈرائنگ روم تک پہنچا تو ایڈونا کو ہاتھ پاؤں پھیلائے صوفے پر پڑے دیکھا۔ اس کے قریب ہی ایک خالی گلاس پڑا ہوا تھا۔ سوڈے کی بوتل بالکل نئی تھی۔ یقیناً وہ بازار سے دوسری بوتل خرید کر لائی تھی لیکن اتنا محتاط رہنے کے باوجود بھی وہ میرے بچھائے ہوئے جال سے نہ بچ سکی۔

میں نے کچن میں جاکر ریفریجریٹر کھولا اور برف کی ٹرے نکال کر واش بیسن میں بہادی۔ اس میں موجود ایک برف کے ٹکڑے میں اتنا زہر تھا کہ بیک وقت تین افراد کی ہلاکت کے لیے کافی تھا۔

ایڈونا کو دیکھ کر مجھے آزادی کا احساس ہوا۔ اس جذبے سے سرشار، میں نے اس کی ٹانگیں پکڑیں اور گھسیٹتا ہوا گیراج کی طرف لے گیا۔ اس خبیث کے جسم میں واقعی بے انتہا چربی تھی۔ جب میں اسے لے کر اپنی گاڑی کے قریب پہنچا تو پسینے میں شرابور ہوچکا تھا۔

جب میں نے ایڈونا کی لاش ایک ویرانے میں دفن کردی تو رات ہوچکی تھی اور چاند پوری آب وتاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ وہ چاندنی مجھے بے حد مسحور کن اور دلکش لگی۔ یوں محسوس ہوا جیسے ہر چیز نکھری نکھری اور نئی نئی سی ہو۔

واپس گھر پہنچ کر میں نے کھانے پینے کی تمام اشیا کوڑے دان میں پھینک دیں کیونکہ میں کسی قسم کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ اب مجھے پولیس اسٹیشن جاکر ایڈونا کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانا تھی۔ مجھے سادہ سا بیان دینا تھا کہ ایڈونا رات کو فلم دیکھنے گئی تھی اور اب تک لوٹ کر نہیں آئی۔ چونکہ میں عموماً جلد سوجاتا ہوں چنانچہ اس کی غیر موجودگی کا علم مجھے رات کو نہیں ہوسکا۔

وہ رات میں نے بے حد سکون سے گزاری۔ بہت میٹھی اور گہری نیند سویا تھا۔ صبح الارم بجنے پر میری آنکھ کھلی تو میں نے غسل کیا اور پھر شیو کرنے کے لیے آئینے کے سامنے جاکھڑا ہوا۔ ’بے چاری ایڈونا......!‘ میں نے تاسف سے سوچا۔ ’وہ میری چال کو نہ سمجھ سکی اور خاموشی سے جاں بحق ہوگئی، میں بلاشبہ اس سے زیادہ ذہین اور زیرک تھا۔ ہم میں سے زندہ بھی وہی رہ سکتا تھا جو دوسرے سے زیادہ ہوشیار ہو۔‘

شیو کرتے ہوئے میں زہر اور ان کی اقسام کے بارے میں سوچتا رہا۔ لیبارٹری میں کام کرنے کی وجہ سے مجھے بیشتر زہروں کے بارے میں تفصیلی معلومات تھیں۔ بنیادی طور پر زہر کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ اول وہ جو براہِ راست انجکشن کے ذریعے آپ کی رگوں میں پہنچادیے جاتے ہیں۔ دوسرے وہ جنہیں آپ غذا میں استعمال کرتے ہیں جبکہ تیسری قسم دھات پر استعمال کی جاتی ہے۔ کسی بھی دھار دار چیز پر لگا کر جب اسے آزمایا جاتا ہے تو شکار کو زیادہ سانس لینے کی مہلت بھی نہیں ملتی۔ مثال کے طور پر کسی سوئی کو زہر آلود کرکے آپ کے جسم میں چبھو دیا جائے تو آپ......

بے توجہی کی بنا پر میری ٹھوڑی میں شیو کرتے کرتے زخم آگیا۔ میں نے آیوڈین لگائی اور خون بند ہوتے ہی دوبارہ سیفٹی ریزر اٹھالیا۔

دھات پر لگایا جانے والا زہر اتنا سریع الاثر ہوتا ہے کہ......

دفعتاً ٹھوڑی پر لگا ہوا زخم تکلیف دینے لگا۔ تھوڑی دیر بعد یوں محسوس ہونے لگا جیسے کسی نے وہاں آگ بھردی ہو، پھر یہ آگ سارے جسم میں پھیلتی چلی گئی اور میں بری طرح کانپنے لگا۔

بلیڈ پر لگے ہوئے زہر نے اپنا کام دکھانا شروع کردیا تھا۔ شیو کرتے ہوئے میرے چہرے پر ہلکے پھلکے زخم لگتے رہے تھے اور وہ زہر سرایت کرتا رہا پھر ٹھوڑی کے قدرے گہرے زخم نے رہی سہی کسر بھی پوری کردی۔

ایڈونا نے واقعی مجھ سے زیادہ ذہانت کا ثبوت دیا تھا۔ اچانک میری ٹانگیں کانپنے لگیں، میں لڑکھڑایا اور فرش پر ڈھیر ہوگیا۔ مگر اتفاق سے مجھے میرے اچانک آجانے والے دوست نے بروقت طبی امدادی دے کر بچالیا تھا۔ میں ایڈونا کی ذہانت کی داد دیے بنا نہ رہ سکا۔

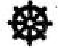


محفلِ شعر و سخن

❁ منشی محمد عزیز مئے......لڈن ضلع وہاڑی
ہوتا تھا اُن کے ایک تبسم پہ روز قتل
بے ساختہ ہنسے تو قیامت ہی آ گئی

❁ جنید احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
نیا اک رشتہ پیدا کیوں کریں ہم
بچھڑنا ہے تو جھگڑا کیوں کریں ہم
خموشی سے ادا ہو رسم دوری
کوئی ہنگامہ برپا کیوں کریں ہم

❁ زرین خان آفریدی......حیدرآباد
میرے احباب مجھے لوٹ کر نکلے ہیں ابھی
میرے دشمن تجھے اس بار بھی تاخیر ہوئی



❁ فیصل علی......میانوالی
آ مرا حال پوچھنے والے
تجھ کو اب تک مری خبر . ہوئی
ہجر کی رات کاٹنے والے
کیا کرے گا اگر سحر نہ ہوئی

❁ شہریار خان......پشاور
ہم گلستاں کے قیدی، ہمیں کیا دکھائی دے
آزاد ہوں تو وسعتِ صحرا دکھائی دے

❁ بریرہ ملک......کراچی
کیسے زمیں پرست تھے عہدِ وفا کے پاس دار
اُڑ کے بلندیوں میں ہم، گردِ ملال ہوگئے

❁ رمضان پاشا......گلشن اقبال، کراچی
بھولی بسری یادیں ہم سے ملنے آتی ہیں
شام ڈھلے اس سُونے گھر میں میلا لگتا ہے

❁ حسنین عباس، کمیل عباس......گلیانہ روڈ، کھاریاں
کبھی یوں بھی آ مری آنکھ میں کہ مری نظر کو خبر نہ ہو
مجھے ایک رات نواز دے مگر اس کے بعد سحر نہ ہو
وہ بڑا رحیم و کریم ہے مجھے یہ صفت بھی عطا کرے
تجھے بھولنے کی دعا کروں تو میری دعا میں اثر نہ ہو

❁ محمد نصیر شہیر اسامہ سیال......سکھر
حاصلِ زندگی حسرتوں کے سوا کچھ بھی نہیں
یہ کیا نہیں، وہ ہوا نہیں، یہ ملا نہیں، وہ رہا نہیں

❁ محمد صفدر معاویہ ......خانیوال
مجھ کو یہ سوچ ہی کافی ہے جلانے کے لیے
میں نہ ہوتا تو کوئی اور تمہارا ہوتا

❁ جہانزیب غوری......لاہور
لوگ تو پیڑ ہوا کرتے ہیں
سبز رکھو تو دعا دیتے ہیں

❁ پری، فضل عباس......گلیانہ روڈ، کھاریاں
ہماری زندگی میں پھول بن کر کوئی آیا تھا
اس کی یاد میں اب تک یہ تحریریں مہکتی ہیں
مجھے لگتا ہے دل کھنچ کر چلا آتا ہے ہاتھوں پر
تجھے لکھوں تو میری انگلیاں ایسے دھڑکتی ہیں

❁ ریاض بٹ......حسن ابدال
اے ہوا تو میرے دامن کو اڑا نہ اس طرح
پیٹ پر باندھے ہوئے پتھر نہ کوئی دیکھ لے

❁ مدحت......کراچی
اپنے اپنے حوصلے اپنے طلب کی بات ہے
چن لیا ہم نے تمہیں سارا جہاں رہنے دیا

❁ بابر عباس......گلیانہ روڈ، کھاریاں
تمہارے یوں ساتھ رہنا اچھا لگتا ہے
کہ اب سجنا سنورنا اچھا لگتا ہے
تیرے خیالوں میں گم صم رہنا
خود سے یوں بیگانہ رہنا اچھا لگتا ہے

❁ رضوان احمد......اسلام آباد
ہے یہ بازار جھوٹ کا بازار
پھر یہی جنس کیوں نہ تولیں ہم
کر کے اک دوسرے سے عہدِ وفا
آؤ کچھ دیر جھوٹ بولیں ہم

❁ محمد طلحہ......نارتھ کراچی، کراچی
تم بھی بدل ہی جاؤ زمانے کے ساتھ ساتھ
میرا نہ ساتھ دو کہ برا مانتے ہیں لوگ

❁ کمال انور......اورنگی ٹاؤن، کراچی
اب سہل پسندی کو بنائیں گے وتیرہ
تا دیر کسی باب میں سوچا نہ کریں گے
غصہ بھی ہے تہذیبِ تعلق کا طلب گار
ہم چپ ہیں بھرے بیٹھے ہیں، غصہ نہ کریں گے

❁ زوہیب احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
کون سود و زیاں کی دنیا میں
دردِ غربت کا ساتھ دیتا ہے
جب مقابل ہوں عشق اور دولت
حُسن دولت کا ساتھ دیتا ہے

❁ صبا سحر......کراچی
یہ کہہ کے اک پرندہ قفس میں لوٹ آیا
رہی نہ خواہشِ پرواز جو اڑائے مجھے

❁ خورشید اعظم......منڈی بہاؤالدین
یوں جا رہا ہوں جیسے نہ آؤں گا پھر کبھی
مڑ مڑ کے دیکھتی ہے تیری راہگزر مجھے

❁ محمد قدرت اللہ نیازی......حکیم ٹاؤن خانیوال
ہے جنون شوق عجب جنوں، نہ خلش خلش نہ سکوں سکوں
کبھی خار وجہِ نشاط ہے کبھی پھول وجہِ ملال ہے

❁ زرمین نیازی......میانوالی
سر میں تکمیل کا تھا اک سودا
ذات میں اپنی تھا ادھورا میں
کیا کہوں تم سے کتنا نادم ہوں
تم سے مل کر ہوا نہ پورا میں

❁ ظہیر الدین......شاہ فیصل کالونی، کراچی
حسنِ فردا کے خواب دیکھے ہیں
شوق نے تیری خواب گاہوں میں
ہم نے اپنا سراغ پایا ہے
تیری گلیوں میں تیری راہوں میں

❁ محمد آریز ملک......گلستان جوہر، کراچی
جو تھے دشمن تری امنگوں کے
کب انہیں بے گرفت چھوڑا ہے
ہم نے اپنے درشت لہجے سے
آمروں کا غرور توڑا ہے

❁ شاکر حسین......حیدرآباد
مرا حال آج زبوں ہے کیوں، مرا درد آج فزوں ہے کیوں
مرے مہرباں مرے چارہ گر تیری آبرو کا سوال ہے

❁ ساجدہ انصاری......گگو منڈی، بورے والا
خالی خالی سے نظر آتے ہیں وہ سرِ محفل
کوئی تو پیدا کر دے ان کے دل میں بھی ہلچل

❁ محمد اکبر......راولپنڈی
وقت کے جسم کی خراش ہوں میں
اپنے اندر سے پاش پاش ہوں میں

❁ نادیہ ریاض......سرگودھا
حال یہ ہے کہ خواہشِ پرسشِ حال بھی نہیں
اس کا خیال بھی نہیں اپنا خیال بھی نہیں
اے شجرِ حیات شوق، ایسی خزاں رسیدگی!
پوششِ برگ و گل تو کیا جسم پہ چھال بھی نہیں

❁ شہباز نوئی، نعیم بودلہ......ڈھپئی، پاک پتن شریف
غلط تھے وعدے مگر میں یقین رکھتا تھا
وہ شخص لہجہ ہی بڑا دلنشیں رکھتا تھا

❄ مہوش..... حیدرآباد

جو اپنے طور سے ہم نے کبھی گزارے تھے
وہ صبح و شام تو جیسے فسانے ہوگئے ہیں

❄ چلبلی ہیر..... جھنگ، صدر

ملائم ہاتھ، خمِ زلف، ادائے نین، یاقوت ہونٹ
قتل ہی باقی ہے اوزار تو سبھی پورے ہیں

❄ ادریس احمد خاں..... ناظم آباد، کراچی

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

❄ وزیر محمد خان..... بٹل ہزارہ

بہکا تو بہت بہکا سنبھلا تو ولی ٹھہرا
اس خاک کے پتلے کا ہر رنگ نرالا ہے

❄ افشاں جبیں..... نواب شاہ

مجھے تو گردشِ حالات پہ رونا آیا
رونے والے تجھے کس بات پہ رونا آیا

❄ صغیر احمد..... ملتان

دل دھڑکتا تھا تو میلا سا لگا رہتا تھا
اب دھڑکتا ہے تو دھڑکا سا لگا رہتا ہے

❄ جبران احمد ملک..... گلشن اقبال، کراچی

اک نظر ہو تو کیا سے کیا ہو جاؤں
میں جو پتھر ہوں آئینہ ہو جاؤں

❄ منصور اصغر..... سرگودھا

کس کی تحویل میں تھے کس کے حوالے ہوئے لوگ
چشمِ گریہ میں رہے دل سے نکالے ہوئے لوگ

❄ نرگس..... لاہور

بارش میں تنہا بھیگو یا بھیگو یار کے ساتھ
کتنے زخم مہک اٹھتے ہیں پہلی پھوار کے ساتھ

❄ شاہین تبسم..... ٹنڈو الہ یار

کیسے ہنگامۂ فرصت میں ملے ہیں تجھ سے
ہم بھرے شہر کی خلوت میں ملے ہیں تجھ سے

❄ امتیاز احمد..... منڈی بہاؤالدین

خامشی اتنی رہی ہے مجھ میں
گفتگو ڈوب گئی ہے مجھ میں

❄ وردہ ملک..... کراچی

لوگ کہتے ہیں محبت اک بار ہوتی ہے
میں جب جب اسے دیکھوں، مجھے ہر بار ہوتی ہے

❄ اویس کمال..... نواب شاہ

رہی ہمیشہ دریدہ قبائے جسم تمام
کبھی نہ دستِ ہنرمند سے رفو ہوئے ہم

❄ رضوانہ ..... گوجرانوالہ

کرتا ہوں بہت یاد مگر آتے نہیں یاد
کچھ حرف مرے دل میں کھٹکتے ہیں ابھی تک

❄ عمران علی..... سیالکوٹ

چاند کرتا ہے خواہشیں کیسی
چاہتا ہے کہ آفتاب ملے

❄ کلثوم بانو..... کوئٹہ

وہ نام ہوں کہ جس پہ ندامت بھی اب نہیں
وہ کام ہیں کہ اپنی جدائی کماؤں میں

❄ شہباز علی خان ..... جھنگ

ہُو کا عالم ہے یہاں نالہ گروں کے ہوتے
شہر خاموش ہے شوریدہ سروں کے ہوتے

❄ یوسف ملک..... اورنگی ٹاؤن، کراچی

نہ گلے رہے نہ گماں رہے نہ گزارشیں ہیں نہ گفتگو
وہ نشاطِ وعدۂ وصل کیا ہمیں اعتبار بھی اب نہیں

❄ مریم..... ملتان

بادِ بہاری کے چلتے ہی لہری پاگل چل نکلے
جانا تھا کس سمت کو جانے بس بے اٹکل چل نکلے

❄ فرید احمد..... فیصل آباد

دل نے وفا کے نام پر کارِ وفا نہیں کیا
خود کو ہلاک کرلیا خود کو خدا نہیں کیا

کوپن برائے شمارہ جولائی 2018

مُحفلِ شعر و سخن

نام :---

پتا :---

’’وال چاکنگ اور ہورڈنگز کا سواد ہی الگ ہوتا ہے۔ ...ؤں کی کچی پکی اور شہر کی چپ دیواروں کو سجا بنا کر بولنے کے قابل بنا دیا جاتا ہے اور پھر خاموش دیواروں پر رنگ ...تیں کرنے لگتے ہیں اور اس بار......!‘‘

جمشید ملک نے بات کرتے کرتے سانس لیا تو اس کی چارپائی کے نزدیک بیٹھے چھیدو ماچھی نے حقے کی نے کو دوسری طرف گھماتے ہوئے لقمہ دیا۔

’’ملک صاحب! قسم سے...... کیا مزے ہوتے تھے

گلوبلائزیشن

علی اختر

دنیا ایک مختصر سے گاؤں کی شکل اختیار کرگئی ہے... کیونکہ جدّت نے ہر انسان کو ایک نئی دنیا سے آشنا کرا دیا ہے مگر... اس ترقی نے ہزاروں میل کی دوری سے رابطوں میں آسانی دے کر قریب رہنے والوں کے درمیان فاصلے پیدا کر دیے ہیں... کیونکہ مفاد پرستی انسان کو دور دور تک سوچنے اور ذمے داریوں سے نظریں چرانے پر مجبور کر دیتی ہے۔

عہدِ حاضر کے تقاضوں کی عکاسی

ایک پُرفکر تحریر



پچھلے الیکشنوں کے...... آپ کو تو یاد ہی ہوگا۔ جب پچھلے سال آپ الیکشن لڑے تھے۔ اسٹیشن سے باہر نکلتے ہی گاؤں کی طرف آنے والے راستے پر آپ کے نام کا اتنا بڑا بورڈ لگا ہوا تھا جس پر آپ کی تصویر بنی ہوئی تھی...... میری بیوی نے جب وہ تصویر دیکھی تو دوپٹے سے اپنا منہ اور سر ڈھک لیا تھا۔ جب میں نے اس کی حالت دیکھ کر پوچھا کہ کیا ہوا تو کہنے لگی۔

''رے...... کیا پتا ہووے ملک جی ابھی بورڈ سے نیچے اتر آئیں۔ مجھے تو ان کی آنکھوں میں لالی دیکھ کر ہی شرم آنے لگی ہے......''

''یہ تو صرف میری گھر والی کی بات ہے۔ قسم سے اس طرح کا بھلیکا کئی لوگوں کو پڑتا تھا۔''

''ہوں......'' جیسے اسے بھی اب چھیدو ماچھی کی بات کا اعتبار آ گیا ہو۔ تب اس نے دوبارہ بات شروع کی۔

''نا...... ماسٹر جی...... اس بار تو یوں لگتا ہے جیسے الیکشن نہ ہو، کسی مرے ہوئے کا چہلم ہو رہا ہو۔ بھلا یہ کیا تک ہے کہ الیکشن ہو اور اس پر دھوم دھڑکا نہ ہو...... ڈھول باجے اور پھلجڑیاں پٹاخے نہ ہوں۔ تو لوگوں کو کیا خاک پتا چلے گا کہ الیکشن ہو رہے ہیں۔ الیکشن تو ہوتے ہی پیسے والوں کے ہیں۔ یہ سب نہ ہو تو کیا خاک مزہ آئے گا الیکشن کا......''

''یہ تو اوپر والوں کے معاملات ہیں، جو انوکھے ہی ہوتے ہیں۔ اب یہ بھی تو کوئی بات نہیں کہ الیکشن پر اس قدر خرچہ کر دیا جائے جس سے غریبوں کی دو تین بیٹیاں بیاہی جاسکتی ہوں۔ ان فضول خرچیوں کے بغیر بھی تو الیکشن ہو سکتے ہیں۔'' ماسٹر جی نے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔

''معاملہ یہ نہیں ماسٹر جی...... دراصل اوپر والے کمال ہوشیاری سے پرانے لوگوں کو الیکشن کی مہم سے نکال باہر کرنے کی سوچ رہے ہیں۔ اب بھلا بتاؤ، یہ کمی کمین بھی ہمارے مقابلے میں الیکشن لڑنے کی سوچ رہے ہیں۔ ہے نا قیامت...... یہ چھیدو ماچھی ساری عمر ہمارے حقے کی نے سیدھی کرتا رہا ہے۔ اب یہ بھی ہمارے مقابلے پر آجائے۔ قیامت کی نشانیاں نہیں تو اور کیا ہیں......'' ملک جمشید نے اپنی دلیل کو وزنی بنانے کی خاطر کہا۔

''اللہ معافی...... نہ ملک صاحب! کم از کم چھیدو ماچھی تو اپنی اوقات سے باہر نہیں ہو سکتا۔ میں تو جی...... اپنی گھرداری آپ کے ٹکڑوں سے پوری کرتا ہوں۔ بچوں کو کہاں سے پڑھاؤں گا...... نہ بچے پڑھیں اور نہ ہی وہ اپنے مالکوں کے سامنے آنے کا سوچیں......''

چھیدو ماچھی نے ابھی اپنی بات ختم نہ کی تھی کہ ملک جمشید نے اپنے دوسرے ملازم کو مخاطب کر کے پوچھا۔

''ارے...... تو سنا شیفے...... کیا خبریں ہیں، اس بار سنا ہے ہمارے حلقے سے بھی بہت سے نئے لوگ الیکشن لڑنے کا سوچ رہے ہیں۔''

''ہاں جی...... بڑی نئی نئی چیزیں الیکشن میں حصہ لینے کا سوچ رہی ہیں...... وہ...... اپنے دینے موچی کا بیٹا...... جو تھوڑا بہت پڑھ بھی گیا ہے، اسے بھی تو شہر کی ہوا لگ گئی ہے۔ وہ بھی الیکشن میں حصہ لینے کا سوچ رہا ہے۔''

''توبہ ہے ملک صاحب...... جب دھرتی کی خاک آسمان کو چھونے لگے، تب قیامت آنے کی نشانیاں ہوتی ہیں۔'' چھیدو ماچھی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''اور......!'' ملک جمشید نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''جنتے تیلن بھی الیکشن لڑنے کا سوچ رہی ہے۔'' شیفے نے بات آگے بڑھائی۔

''لو بھلا...... اور سنو...... یہ سب حکومت کی ڈھیل ہے۔ یہی تو وہ چاہتی ہے کہ ہماری بہو بیٹیاں شہر جا کر خجل خوار ہونے لگیں......'' جمشید ملک نے جواب دیا۔

''اور وہ جو دینے موچی کا بیٹا افتخار ہے، اس کو جب پتا چلا کہ آپ بھی الیکشن لڑ رہے ہیں، تب سے وہ آپ کے خلاف بڑی اوچھی اور غلط باتیں کرنے لگا ہے۔''

''ہوں......'' ملک جمشید نے جیسے گہری سوچ سے بیدار ہو کر جواب دیا۔

''تو گویا...... اس بار معاملہ کچھ زیادہ ہی سخت ہوگا۔ لگتا ہے، اس بار گاؤں کی مینڈکیوں کو بھی زکام ہو گیا ہے......''

''آپ بھی تو ملک صاحب! خدا لگتی کہوں...... جب سے گاؤں چھوڑ کر گئے ہیں، بہت کم کم واپس آئے ہیں۔ آپ کے سارے معاملات تو آپ کا منشی طے کر لیتا ہے۔ پھر بھلا گاؤں کی خوشی غمی کے بارے میں آپ کو کیا پتا...... بس ایسے ہی معاملے لوگوں کو جوش دلاتے ہیں۔'' ماسٹر جی نے قدرے توقف کے بعد اعتراض کیا تو جمشید ملک جھٹ سے بولا۔

''لو...... ان کی سنو...... ماسٹر جی...... اگر میں گاؤں سے باہر ہوتا ہوں...... تو میرے معاملات کا تحفظ میرا منشی تو کرتا ہے نا...... ہمارے اپنے لوگ ہی تو ہیں یہاں پر...... کیا تم میرے اپنے نہیں ہو...... یہ منشی...... میرا خاص نمائندہ ہے اور پھر بھلا ہم لوگ گاؤں سے باہر چلے بھی جائیں تو بھی ہمارا تعلق گاؤں سے نہیں ٹوٹ سکتا۔ کیونکہ ہمارے بڑوں کی قبریں ہیں یہاں...... یہ حویلیاں...... یہ زمین...... کیا اس بات کی گواہی نہیں کہ ملک جمشید اس گاؤں میں موجود ہے اور

پھر یہاں کی ہر غمی، خوشی میں ہمارا یہ منشی کس کے کہنے پر آتا جاتا ہے...... کیوں اوئے منشی...... تو نہیں جانتا...... گاؤں کی غمی اور خوشی میں......''

''جانتا ہوں ملک صاحب...... برابر جانتا ہوں......'' منشی نے آدھے شیشوں کی عینک کو ناک کے پھندنے پر ٹکاتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں تو جی...... موقعے کی مناسبت سے آپ کا پیغام بھی لوگوں کو پہنچا دیتا ہوں اور لوگوں کی ضرورت بھی پوری کر دیتا ہوں۔''

''تو اور کیا چاہیے، گاؤں والوں کو...... بہر حال اب آگئے ہیں تو سنبھال لیں گے لوگوں کو...... اور سنتے ہیں کون...... کیا بکواس کر رہا ہے۔ ہاں تو میں نے آپ لوگوں کو حویلی میں اس لیے تکلیف دی ہے کہ اس بار چونکہ حکومت کو ہم بوڑھے لوگوں کی شکلیں پسند نہیں، اس لیے اس بار میرا چھوٹا بیٹا عکاس الیکشن لڑے گا یہاں سے...... وہ بھی دو ایک روز میں یہاں آجائے گا۔ اتنی دیر تک آپ لوگ سارے مل کر اس کے لیے ماحول بنائیں...... اور لوگوں کو بتائیں کہ اس بار ملک جمشید کے بجائے ملک عکاس یہاں سے الیکشن لڑے گا...... اس کے لیے اشتہار بھی آجائیں گے اور کچھ کپڑے کے بینرز بھی...... لگا دیے جائیں گے۔ حکومت کے اصولوں کو مدنظر رکھ کر الیکشن لڑنا ہے۔ اس لیے زیادہ نمود و نمائش نہ ہو سکے گی۔ بہر حال خرچہ پانی تو چلے گا...... میں یہاں بیٹھا ہوں...... منشی موجود ہے...... اس سے ووٹوں کی توڑ پھوڑ کے لیے جو معاونت چاہیے ہوگی، آپ بتائیں لیکن ایک بات دھیان میں رہے کہ الیکشن بہر حال عکاس کو جیتنا ہے...... کوشش اور محنت آپ سب کی ہوگی......''

ملک جمشید کی اس میٹنگ نے گاؤں میں جیسے ایک نئی لہر سی دوڑا دی تھی۔ کل تک جو لوگ اس بات پر بغلیں بجا رہے تھے کہ اس بار پرانے مہرے سیاست کی بساط سے یکسر نیچے گرا دیے جائیں گے، وہ ایک بار پھر سوچنے پر مجبور ہو گئے۔ ملک جمشید کے دوبارہ سیاست میں آنے کا سن کر الیکشن لڑنے والوں پر ملک کا پھر سے تاثر قائم ہو گیا۔ ایسے ہی حالات پر غور کرنے کے لیے دینے موچی کے بیٹے افتخار نے گاؤں سے باہر سرکاری ڈسپنسری میں لوگوں کی ایک میٹنگ بلالی۔

''آج تو افتخار سرکاری ڈسپنسری میں میٹنگ بلا رہا ہے......'' چھیدو ماچھی نے مخبری کی۔

''تو کوئی بات نہیں...... تم بھی وہاں جانا......'' ملک جمشید نے جواب دیا۔

''اگر آپ کہیں...... تو موچھے بگھیاڑ کو کہہ کر جلسہ درہم برہم کرا دیں......'' اس نے ایک بار پھر نمبر ٹانکنے کی کوشش کی۔

''نہیں چھیدو...... اس بار حکومت کے ہاتھ سخت ہیں۔ وہ بلا دریغ اندر کر دے گی تو خواری کے ساتھ الیکشن بھی ہاتھ سے نکل جائے گا۔ ویسے تم وہاں جا کر سنو تو سہی وہ کیا کہتا ہے......''

اس سے پہلے کہ چھیدو کچھ اور کہتا، جمشید ملک نے منشی کو قریب کھڑے دیکھ کر پوچھا۔

''ہاں بھئی منشی! تم کیا کھاتے اٹھائے پھرتے ہو......''

''وہ جی...... نصیرے کے قرضے کی قسط بھی نہیں آئی...... مجھے لگتا ہے اس بار وہ پھر دھوکا دے گا۔''

''منشی جی...... الیکشن ہو لینے دو...... اسے دیکھ لیں گے۔ تھوڑا بہت دے دلا کے زمین ہی لے لیں گے......'' جمشید ملک نے جواب دیا۔

''مگر...... وہ تو جی...... زمین کے بارے میں بات سننا بھی پسند نہیں کرتا۔'' منشی نے کہا۔

''سنے گا...... ضرور سنے گا، ہم نے دولت ایسے ہی تو نہیں پھیلائی۔ کچھ سوچ سمجھ کر اسے پیسے دیتے رہے ہیں۔ اس سے حساب کر لیں گے۔'' جمشید ملک نے یقین سے کہا۔ تھوڑے توقف کے بعد وہ بولا۔

''اور وہ دوسرا منصوبہ جو تمہیں بتایا تھا، اس کا کیا ہوا......؟''

''وہ بھی چل رہا ہے۔ لوگوں کو بدول کیا جا رہا ہے۔'' منشی نے آہستگی سے جواب دیا۔

''اس سے کیا ہوگا......؟'' ملک جمشید نے پوچھا۔

''تاکہ ہمارا منصوبہ مکمل ہو جائے۔'' منشی بولا۔

''کام جلدی ہونا چاہیے......'' ملک جمشید نے تلخی سے کہا۔

''ٹھیک ہے ملک صاحب......'' منشی نے جواب دیا تو چھیدو بھی بولا۔

''ملک صاحب! حساب تو کئی لوگوں کا ہونے والا ہے۔ اچھا ہے، الیکشن کے بعد ہی ہو......''

شام کے دھندلکے اترتے ہی سرکاری ڈسپنسری میں لوگ اکٹھے ہونے لگے مگر آنے والوں میں کوئی بھی معزز یا ادھیڑ عمر شخص نہ تھا۔ سوائے دینے موچی کے...... سارے لوگ یا تو...... نوجوان اور بے روزگاری کے مارے ہوئے تھے...... یا پھر گاؤں کے بچے...... جو اپنی زندگی میں آنے والا یہ تماشا دیکھنے کے متمنی تھے۔

''آخر ہماری ہی برادری کے لوگ یہاں پہنچے ہیں نا...... میں جانتا تھا...... جانتا تھا...... کہ ملک جمشید کے سامنے آتے ہی یہ سارے جو میرے حمایتی تھے، مفاد پرستی کے بلوں میں گھس جائیں گے لیکن میں پھر بھی ان کے مقابل ڈٹ

کر کھڑا ہوں۔ میرے پاس جو رہی سہی آپ کی قوت ہے، میں دیکھ رہا ہوں۔ اس کا زور بھی ٹوٹ گیا ہے۔ لوگ بکھر سکتے ہیں لیکن میں آندھیوں کے مقابل کھڑے رہنے کی طاقت رکھتا ہوں۔ ان سے خوف کھانے والے لوگوں سے میں پوچھتا ہوں کہ یہ سارے سرمایہ دار، بڑے بڑے جاگیردار ہمارے ساتھ کیا سلوک روا رکھتے ہیں؟ کیا یہ ہمارے ہمدرد ہیں؟ یہ جن کے پاس دولت کے انبار ہیں، وہ دولت اگر بکھیرتے بھی ہیں تو ہمارے لیے نہیں، ہمارے کسی دکھ اور درد کے لیے نہیں۔ وہ دولت کا چھنٹا دے کر ہمارے کھیتوں پر قبضہ کر لیتے ہیں...... وہ تو ہم سے ہماری بہو، بیٹیاں اور بہنیں بھی چھین کر لے جاتے ہیں۔ ہمیں دلاسے اور امیدوں کے چکر میں ڈال کر ہمارا سب کچھ چھین لیتے ہیں اور ہم ان کی طرف دیکھتے رہ جاتے ہیں، کچھ نہیں کر پاتے......"

باتیں لوگوں کی سمجھ میں آ رہی تھیں، اس لیے انہوں نے بے تحاشا تالیاں بجائیں تو افتخار کچھ دیر بعد دوبارہ بولا۔

"رکو میرے بھائیو...... دوستو! یہ تالیاں بجانے کا نہیں افسوس کرنے کا مقام ہے کہ ہمارے بچے تعلیم کے ساتھ ساتھ دو وقت کی روٹی کو ترسیں اور وہ...... جو یہاں رہتے بھی نہیں...... صرف راج کرنے کے لیے آتے ہیں اور یہاں سے ہمارے حصے کا سکھ سمیٹ کر لے جاتے ہیں، ان کے بچے باہر کے ممالک میں جا کر پڑھیں۔ یاد رکھو اگر آج بھی آپ سے بھول ہوئی تو وقت کبھی آپ کو معاف نہیں کرے گا۔ منافقت اور اقربا پروری کے سارے جال توڑ کر باہر نکلنے کا وقت ہے۔ نکلو اور مجھ ایسے کی کا ساتھ دو...... تاکہ آپ کے حقوق کی بات ہو سکے...... اور آپ کے لیے کام ہو سکے......"

ایک بار پھر تالیاں بجائی گئیں...... اور یوں گاؤں کا سارا ماحول ایک...... حیرت اور خوف کے حصار میں آ گیا۔ الیکشن میں اب دن ہی کتنے رہ گئے تھے اسی لیے تو گاؤں کا ماحول الیکشن کے نقطۂ عروج کی طرف گامزن تھا۔

وہ ایک ایسی ہی عجیب سی دوپہر تھی جب اسٹیشن پر چند لمحوں کے لیے گاڑی آ کر رکی تو اس میں سے چند مسافر یہاں اترے۔ ٹرین آگے روانہ ہوگئی۔ اترنے والے دھیرے دھیرے گاؤں کی طرف روانہ ہوگئے مگر وہ ابھی تک پلیٹ فارم پر کھڑا تھا اور بڑی خوش گوار حیرت اور امید و بیم کی پھوٹتی چنگاریاں اپنے چہرے پر سجائے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

کتنی ہی دیر بعد جب اسے احساس ہوا کہ وہ اکیلا رہ گیا ہے اور ابھی اسے آگے جانا ہے تو اس نے اپنا سفری بیگ ہاتھ میں پکڑ کر کندھے کی دوسری جانب لٹکایا اور گاؤں کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر چل پڑا۔ وہ ابھی تھوڑی دور تک گیا ہوگا زنانی...... آواز نے اس کے اوسان خطا کر دیے۔

"اوئے شہریئے......!"

اس نے ارد گرد دیکھا۔ اسے آواز دینے والی تو نظر آئی مگر اس کی آواز کی کھنک ابھی تک فضا میں بکھری ہوئی تھی

"اوئے شہریئے...... کہاں گم ہو...... میں ہوں......!" آواز ایک بار پھر گونجی۔

اُس نے آواز دینے والی کی طرف دیکھا۔ وہ رُت کی طرح جوان اور کھلے گلاب کی طرح خوب صورت نازک بھی......

"یہ ذرا گٹھڑ تو اٹھوا دے......" نغمگی پھر سے بکھری

اس نے بیگ وہیں پگڈنڈی پر چھوڑا اور کھیت اتر گیا جہاں وہ اس کی منتظر کھڑی تھی۔ وہ اس کے قریب اور ہرے چارے کا گٹھا اٹھوانے کے لیے جھکا تو ہنستی گنگناتی آواز کی گھنٹیاں بجیں۔

"ذرا دھیان سے ہاتھ ڈالنا...... تھوڑا بھاری ہے گاؤں آئے ہو...... کس سے ملنا ہے۔ یہاں کے دکھتے تو ہو......!" وہ ایک دم سارے سوال کر بیٹھی۔

"میں جشید ملک کا چھوٹا بیٹا ہوں...... عکاس......" اس نے گھبرائے گھبرائے لہجے میں کہا۔

"ایں...... ارے تم عکسی ہو......" اس نے حیرانی سے پوچھا

"ہاں میں عکسی ہوں......" وہ دھیرے سے بولا۔

"اوئے شہریئے...... اب تو تم اتنے بڑے ہوگئے ہو ولایت سے ہو آئے ہو......" گھنٹیاں جیسے کسی نے ہلا کے چھوڑ دی تھیں اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا کر اب مدھر آواز پیدا کر رہی تھیں۔

اس نے پہلی بار اسے بھرپور نظروں سے دیکھا اور ہولے سے پوچھا۔

"لیکن...... تم مجھے کب سے جانتی ہو......؟"

"اس وقت سے شہریئے...... جب تم ریشم کے بلے کی طرح اتنے سے تھے۔" اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کے اشارے سے بتایا تو وہ لمحہ بھر کے لیے جھینپ سا گیا۔

"اتنی دیر بعد آئے ہو...... رہو گے نا......؟" اس نے اگلا سوال کیا۔

"تم نے اپنا تعارف تو کروایا نہیں۔" عکاس نے خود میں حوصلہ پیدا کر کے پوچھا۔

"ارے...... میں بلقیس ہوں...... بابے اللہ بخش کی بیٹی...... لے...... جب تو چھوٹا تھا تو تیرے ساتھ ہی تو کھیلتی

......" اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"ہوں......" اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

"میں نے پوچھا تھا...... اب رہو گے......؟" اس نے دوبارہ سوال کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

الیکشن لڑنے آیا ہوں...... ظاہر ہے مستقل نہ سہی کچھ ہوگا۔" اس نے جواب دیا۔

"تو سمجھ لے...... میری ووٹ پکی...... نہ صرف بلکہ میں تمہاری سب سے بڑی سپورٹر ہوں گی اس میں...... پوری دس جماعتیں کر رکھی ہیں۔ وہ تو گاؤں کوئی کالج نہ تھا ورنہ میں بھی تمہاری طرح پڑھ لے...... تو بھی کیا یاد کرے گا......" بلقیس نے ہنستے کہا۔

"دیکھ لوں گا......" اس نے بھی مسکرا کر جواب دیا اور اٹھا کر اس کے سر تک لے جانے لگا، ایک موقع پر گٹھا تھا کہ وہ چیخ کر بولی۔

"اوئے...... شہریوں والا ہاتھ نہ لگا۔ ذرا ہمت کر کے......"

اس نے چارے کا گٹھا اس کے سر پر رکھا اور دوبارہ اٹھا کر آگے چلنے لگا۔ وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ دور تک چلنے کے بعد جب ان کا درمیانی فاصلہ بڑھنے پیچھے سے اس کی آواز آئی۔

"وے شہریئے...... آہستہ چل...... ایسے بھاگ رہا میں کوئی چڑیل ہوں......"

مگر وہ اپنی چال چلتا ہوا سنی ان سنی کر کے حویلی پہنچ اس کے والد نے اسے دیکھتے ہی نعرہ لگایا۔

"لو...... اپنا عکسی پتر آ گیا......" اس نعرے پر اس کے بیٹھے سارے لوگوں نے اپنے اپنے زاویے بدل کر والے کی طرف دیکھا۔

"تا...... تم کیا پیدل آئے ہو......؟" جشید ملک نے سے پوچھا۔

"ریل گاڑی پر آیا ہوں...... اسٹیشن پر اترا تھا۔ وہاں پیدل آیا ہوں۔" عکسی نے افسردگی سے بتایا۔

"پتر...... وہ...... وہ...... دو گاڑیاں کس مرض کی دوا؟" جشید ملک نے ایک بار پھر پوچھا۔

"بابا...... وہ ماما بھی تو شہر کی سیٹ سے الیکشن لڑ رہی وہ کہہ رہی تھیں، وہاں گاؤں کا حلقہ تو چھوٹا سا ہے۔ کنویسنگ کے لیے اور ووٹوں کی دوڑ دھوپ کے لیے ڑیاں بھی کم ہیں۔ اس لیے تم ریل گاڑی سے وہاں چلے جاؤ...... وہی مجھے اسٹیشن تک چھوڑنے آئی تھیں۔ سچ بابا...... مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے میرے جسم کی کوئی نہ کوئی پسلی اپنی جگہ سے ہل گئی ہے۔ گاڑی میں بٹھا کر آدمی کو یوں بلویا جاتا ہے میرے تو علم میں نہ تھا۔ ویسے ایک تھرل اپنی جگہ قائم تھی۔"

عکسی کی اس بات پر وہاں بیٹھے سارے لوگ ہنس دیے۔ تب جشید ملک نے بیٹے کو نہ صرف آنے والے لمحوں کے بارے میں بتایا...... بلکہ وہ ساری باتیں بھی گوش گزار کر دیں جن کو بنیاد بنا کر اس کے مخالف باتیں کر کے ووٹروں کو ورغلا رہے تھے۔ اس لیے ملک جشید نے اپنی پہلی میٹنگ گاؤں کے بیچوں بیچ بلائی تھی جس سے پہلی بار عکاس نے مخاطب ہونا تھا۔ اس شام ارد گرد کے مکانوں کی چھتوں پر عورتیں اور بچے بیٹھے ہوئے تھے جبکہ پورے گاؤں کے مرد اس میٹنگ میں پہنچے ہوئے تھے۔ جب سارے لوگ اکٹھے ہو گئے تو ملک جشید نے اپنے بیٹے کا تعارف کروا کر اسے ہلکی سی تھپکی دے کر کھڑا کر دیا۔ ملک عکاس نے کھنکھار کر اپنا گلا صاف کیا اور بولا۔

"میرے دوستو...... بھائیو...... آپ جانتے ہیں کہ آج کا یہ اکٹھ کس سلسلے میں ہو رہا ہے۔ الیکشن ہمارے سروں پر آ پہنچا ہے اور ابھی ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ ووٹ کس کو دیں۔ ہر جگہ لوگ بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں۔ بڑے بڑے اور دلفریب دعووں سے آپ لوگوں کو ورغلا رہے ہیں اور اپنے مخالفین کے خلاف الٹی سیدھی باتیں کر کے آپ کی ہمدردیاں اپنے حق میں کر رہے ہیں۔ شاید وہ نہیں جانتے کہ اب ایسے دعووں کا وقت گزر گیا ہے۔ لوگوں کو شعور آ گیا ہے اور پھر آپ سب جانتے ہیں کہ اب زمانہ گلوبلائزیشن کا ہے۔ ساری دنیا آج ایک مثالی گاؤں کی طرح ہے اور ہم سب ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں ساجھی ہیں بلکہ آج تو ہم ایک خاندان کی طرح ہیں جس میں ایک کی تکلیف سے دوسرا پریشان ہو جاتا ہے۔ آج جب پوری دنیا اس اصول پر عمل کر رہی ہے تو ہم پیچھے کیوں رہیں۔ صرف اس لیے کہ ہمیں بتانے والا کوئی نہیں...... میرے بابا نے آپ لوگوں کی جو خدمات کی ہیں، میں انہی خدمات کو اپنی جھولی میں ڈال کر آپ سے ووٹ مانگنے آیا ہوں تاکہ خدمات کا یہ سلسلہ آگے تک جاری رکھ سکوں...... میں ووٹ کے لیے آپ سے درخواست گزار ہوں۔ بندہ دیکھیے...... اور اس کی پرانی خدمات دیکھیے...... تب اپنے ووٹ کا درست استعمال کریں......"

عکسی کی اس بات پر لوگوں نے بے تحاشا تالیاں

بجائیں...... اور نعرے لگائے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے الیکشن کا فیصلہ اسی میٹنگ پر ہوگیا ہو...... مردوں کے علاوہ عورتوں نے بھی عکسی کی باتوں کو سراہا۔ بعض باتوں پر تو بلقیس نے باقاعدہ کھڑے ہوکر تالیاں بجائیں۔ عکسی کی میٹنگ کیا ختم ہوئی، پورے گاؤں میں گرم جوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اب گلیوں اور کھیت کھلیانوں میں بھی اسی بات کے چرچے تھے کہ اس بار عکسی جیت جائے گا۔ اس میٹنگ کی گرد ابھی بیٹھی نہ تھی کہ افتخار نے بھی اپنی میٹنگ کا اعلان کردیا۔

لوگ محض یہ دیکھنے کے لیے کہ افتخار...... عکاس کی باتوں کا کیا جواب دیتا ہے، اس میٹنگ میں آئے تھے۔ پہلے کی نسبت اس بار افتخار کی میٹنگ میں رش تھا۔ افتخار نے کھڑے ہوتے ہی کہا۔

''دوستو...... بزرگو...... ماؤں اور بہنو...... میں جانتا ہوں، آپ نے بہت تالیاں بجائی ہیں۔ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے جلسے میں...... انہوں نے باتیں بھی بہت اچھی کیں...... خوب صورت لفظوں اور لچھے دار فقروں میں آپ کو الجھانے میں وہ کامیاب بھی ہوگئے ہوں گے مگر ذرا کوئی ان سے پوچھے کہ جس گلوبل ویلج، جس مثالی گاؤں کی وہ بات کررہے ہیں اور جس جنت نظیر معاشرے کی وہ جھلک دکھا رہے ہیں، وہ کیا ہے...... کیا ہے وہ گلوبلائزیشن جس کو سن کر آپ نے بے تحاشا تالیاں بجائیں اور نعرے لگائے۔ میں بتاتا ہوں۔ یہ گلوبلائزیشن سرمایہ دار اور طاقت ور لوگوں کا ایک فریب ہے۔ اس بہانے وہ آپ کی زمینیں ہتھیانے کا پروگرام بنارہے ہیں۔ وہ اپنی بدمعاشی کو تحفظ دینے کی خاطر ایسی لچھے دار باتوں میں آپ کو الجھا کر اپنا الو سیدھا کرنا چاہتے ہیں۔ اپنا مفاد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ آپ کو تکلیف میں دیکھ کر بظاہر تلملائیں گے مگر اس حد تک جہاں تک ان کا مفاد انہیں اجازت دے گا۔ وہ آپ کے دکھوں کو دیکھ کر اسے مٹانے کے بہانے وہ دکھ خرید لیں گے۔ ایسا ہرگز نہ ہوگا لیکن آپ کو اگر اپنے دکھوں کو مٹانے کے لیے سرمائے کی ضرورت ہوگی، وہ مسکرا کر اسے فراہم کریں گے مگر اس کے بدلے وہ اپنی شرائط منوائیں گے۔ اپنی من مانی کریں گے۔ وہ دندناتے پھریں گے اور دوسروں کو تاثر دیں گے کہ وہ آپ کے دکھوں کا علاج کررہے ہیں۔ حالانکہ ایسا کچھ بھی نہ ہوگا...... وہ اپنے مفاد کے لیے کام کریں گے اور اس کو فروغ دینے کے لیے آپ کی امداد کریں گے۔ جہاں اور جب ان کا مفاد ختم ہوگا، وہ آپ سے منہ موڑ لیں گے...... میرے دوستو! وہ آپ سے آپ کی انفرادی شناخت چھین لیں گے اور پھر ایک ایسا وقت آئے گا کہ خود آپ کی ذات میں آپ کا اپنا عکس اور اپنا کردار بھی باقی نہ رہے گا۔ وہ آپ کو گلوبلائزیشن کا دلفریب نعرہ د... آپ سے آپ کی شناخت چھین کر اپنی شناخت اور اپنا... آپ کی جھولی میں ڈال دیں گے۔ شاید آپ کو علم نہ ہو... لوگوں میں عدم تحفظ اور بددلی پھیلا رہے ہیں۔ وہ آج کل... پاس کی افواہ پھیلا کر زمینیں خریدنے کے چکر میں ہیں... فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے......''

الیکشن کیا ہونے کا اعلان ہوا، لوگوں کو ایک نیا موضو... مل گیا۔ نئے نعرے اور نئی باتیں سننے کو ملنے لگیں جن... ٹولیوں کی صورت جگہ جگہ بکھرے بحث کرنے لگے... بلقیس اس کے لیے بڑی ہی مفید سپورٹر ثابت ہوئی۔ اس... اپنی تگ ودو سے عورتوں کو عکاس کے لیے ووٹ ڈالنے... رضامند کرلیا تھا۔

الیکشن والے دن خاصی گہما گہمی رہی۔ ملک جمشید... خاصی سمجھ سے کام لے کر کئی بار جھگڑے کو ہوتے ہوتے رو... عکاس چکر لگاتے لگاتے جب لیڈیز بوتھ پر گیا تو بلقیس ا... دیکھ کر کھڑی ہوگئی۔

''شہریے...... الیکشن جیتنے کی پیشگی مبارک باد قبول کرلو۔'' اس نے موقع دیکھتے ہوئے اس کے قریب آ... آہستگی سے کہا۔

''یہ سب تمہاری محنت ہے، تمہیں بھی مبارک ہو...'' عکاس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''الیکشن کی جیت میں کیا دو گے......؟'' اس نے روایتی بے باکی سے پوچھا۔

''جو تم مانگو...... شرط یہ کہ اگر میں جیت گیا...... تو......'' عکاس نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

''وعدہ......!'' بلقیس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہوں......'' عکاس مختصر سا جواب دے کر آگے نکل گیا۔

اور پھر وہ واقعی الیکشن جیت گیا۔ اس کا مخالف افتخار ہار گیا...... اس جیت کی جہاں سارے گاؤں نے خوشی منائی، وہاں بلقیس کو اس کی خوشی اور ہی طرح سے محسوس ہورہی تھی۔ اس کے پاؤں تو زمین پر نہ ٹک رہے تھے۔ الیکشن جیتنے کے بعد جب عکاس اپنے والد ملک جمشید کے ساتھ گاؤں میں گھر گھر شکریہ ادا کررہا تھا تو شور مچ گیا۔

''نصیرے کو کسی نے گولی ماردی......'' یہ سنتے ہی گاؤں میں جیسے بھگدڑ مچ گئی ہو۔ چھوٹے بڑے سارے نصیرے کے گھر اور اس کے کھیتوں کی طرف دوڑ گئے۔ عکاس اور ملک جمشید بھی جلدی سے حویلی واپس آگئے۔ ملک جمشید نے حویلی میں داخل ہوتے ہی منشی کو بلایا۔ اس کے آتے ہی وہ بولا۔

''منشی...... نصیرے کا حساب کتاب تیار رکھنا...... ...بعد تو افتخار پر بنے گا ہی...... لیکن اس کی زمینوں پر اب ...ہمارے چلیں گے......''

عکاس کچھ نہ سمجھتے ہوئے خاموشی سے کھڑا دیکھتا رہا۔ ...ے توقف کے بعد ملک جمشید نے اپنے سارے کمیوں ...ملازموں کو اکٹھا کیا۔ ''تا تمہیں تو علم ہے...... الیکشن پر ...رے نے افتخار کو ووٹ نہیں دیا تھا اور ان کی آپس میں اسی ...پر تلخ کلامی بھی ہوئی تھی......''

وہ سب حیران پریشان ملک جمشید کی طرف دیکھنے لگے ...کہ وہ دوبارہ بولا۔

''بات یہی ہے اور سارے گاؤں میں یہی بات پھیلنی ...سمجھے......''

شام تک یہی بات پورے گاؤں میں پھیل چکی تھی اور ...س تو باقاعدہ تفتیش کے لیے افتخار کو تھانے بھی لے جاچکی ...ی۔ اسی رات...... عکاس اپنے والد ملک جمشید سے پوچھ ...ا تھا۔

''لیکن بابا...... مجھے لگتا ہے، نصیرے کو گولی افتخار کے ...رندوں نے نہیں ماری...... مگر پھر بھی ساری گواہیاں اس ...کے خلاف کون بھگتا رہا ہے......''

''یہ سب سیاست ہے بچے...... سب چلتا ہے اور اسی ...رح چلتا ہے جیسے ملک جمشید چاہتا ہے۔'' ملک جمشید نے ...مروہ سی ہنسی ہنس کر کہا۔ ممکن تھا وہ کچھ اور بھی کہتا...... کہ وہ ...ری شیرنی کی طرح ان کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔

''وہ بے گناہ ہے...... پھر بھی پولیس اس کو پکڑ کرلے گئی ...ہے...... ملک صاحب...... خدا کے لیے افتخار کو بچانے کے ...لیے کچھ کریں......'' عکاس اور ملک جمشید دونوں کی نظریں اس ...کی طرف اٹھیں۔

''وہ بلقیس تھی...... اور نہ جانے وہ کس طرح جرأت ...کر کے حویلی میں اکیلی ہی چلی آئی تھی۔''

''تم کیسے کہہ سکتی ہو...... کہ وہ بے گناہ ہے......'' ملک ...جمشید نے دہاڑ کر پوچھا۔

''میرا دل گواہی دیتا ہے۔ افتخار ایسا نہیں کرسکتا...... ...آپ کو اس کے لیے کچھ کرنا ہوگا۔ کیا ہوا وہ آپ کا ...مخالف تھا......''

''بابا یقیناً ہمیں اس کے لیے کچھ کرنا پڑے گا...... یہ ...دشمنیاں تو صرف الیکشن تک تھیں۔ انہیں آگے نہیں بڑھنا ...چاہیے......'' عکسی نے بلقیس کی حمایت کرتے ہوئے دلیل دی۔

''ہوں......'' ملک جمشید کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے بولا۔

''منشی......'' پتا نہیں گلے کی پاتال سے یہ آواز کس طرح نکلی۔

''ذرا جلدی سے...... دیکھو...... افتخار بے گناہ ہے...... یہ بچی کہہ رہی ہے اور گاؤں کی بچی جب گواہی دے تو بات ٹھیک ہی لگتی ہے...... اس لیے اس کے لیے کچھ کرو...... جاؤ...... تم آرام کرو...... ہم کرتے ہیں کچھ......'' ملک جمشید نے گھورتے ہوئے بلقیس کی طرف دیکھا اور بلقیس چلی گئی۔

تب وہ پھر عکاس سے مخاطب ہوا۔

''لیکن تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم شہر جا کے آرام کرو...... میں سارے معاملات سنبھال لوں گا۔ جاؤ...... کل واپس جانے کی تیاری کرو...... اور ہاں تمہیں مبارک ہو...... تمہاری ماما بھی الیکشن جیت چکی ہیں۔''

''او کے...... بابا......'' عکاس نے جواب دیا اور اگلے دن وہ شہر جانے کے لیے پوری طرح تیاری کرچکا تھا اور پھر اسے شہر لے جانے کے لیے گاڑی بھی منگوائی جاچکی تھی۔ وہ گاڑی میں بیٹھنے والا تھا جب ایک بوڑھا ان کی حویلی میں داخل ہوا۔ وہ بے حد پریشان لگ رہا تھا۔ عکاس لمحہ بھر کو ٹھٹکا۔ وہ تقریباً روہانسا ہو کے ہاتھ جوڑتے ہوئے ملک جمشید سے مخاطب ہوا۔

''ملک صاحب...... وہ رات سے گھر نہیں آئی۔ پتا نہیں اسے زمین نے نگل لیا ہے یا آسمان اٹھا کرلے گیا......''

''کون نہیں آئی بابا اللہ بخش......'' ملک جمشید نے اس سے پوچھا۔

''وہ جی میری بیٹی...... بلقیس......'' وہ تقریباً رو دینے والے انداز میں بولا۔

عکاس کا گاڑی میں بیٹھنے کے لیے اٹھا ہوا پاؤں وہیں رک گیا...... وہ بھاگ کر واپس مڑا، اس سے پہلے کہ وہ اپنے والد سے کچھ کہتا، وہ مسکرا کر بولا۔

''تم جاؤ میرے بچے...... تمہاری ماما انتظار کررہی ہوں گی وہاں پر...... گھبراؤ نہیں...... مت پریشانی لو...... میں ہوں نا یہاں پر......''

وہ اسے دھکیلتا ہوا گاڑی تک لے آیا اور گاڑی میں بٹھا کر اسے شہر روانہ کر کے ہاتھ جھاڑتا ہوا واپس مڑ آیا...... بابے اللہ بخش کے دکھ میں شریک ہونے کے لیے...... کہ اس کا دکھ...... ملک جمشید کا اپنا دکھ جو تھا......!

قسط نمبر: 15

وقت

حسام بٹ

موت کے کنویں میں بھی وقت جس کا ہم رکاب تھا۔ ایک ایسے پرعزم بازی گر کی بازی گری ...... سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک دلربا طویل داستان

قت بادشاہ اور کائنات کی ہر شے اس کی رعایا ہے لیکن . . . اس کی نہ کوئی شکل اور نہ ہی وجود ہے۔ اس کے باوجود یہی وقت روپ بدل بدل کر سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ جس کی گردش انسان کی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ ایک ہی پل میں کسی کو بادشاہت سے نوازتا ہے اور کسی کو زمین کی خاک چاٹنے پر مجبور کردیتا ہے۔ کبھی دن اور رات میں ڈھل کر عمرِ رواں کا نام پاتا ہے اور موسم کی طرح گزر جاتا ہے۔ کبھی مہربان اور مخلص دوست بن جاتا ہے اور کبھی سفاک دشمن کا کردار ادا کرتا ہے۔ کبھی محبت بن کر ہونٹوں پر ہنسی بکھیرتا ہے اور کبھی درد کی صورت آنسو بن کر دلوں میں گھاؤ ڈال دیتا ہے۔ چونکہ یہ کسی کا غلام نہیں اسی لیے کسی کی پروا بھی نہیں کرتا لیکن . . . اتنا سنگدل ہے جو اس کی پروا نہیں کرتا اسے ایسی مار مارتا ہے کہ پینے کو دو بوند پانی تک نہیں ملتا اور اتنا بے ایمان بھی ہے کہ جس پر اپنی مرضی سے مہربان ہوجائے اس کے لڑکھڑاتے قدموں سے بھی قدم ملا کر عروج عطا کرتا ہے مگر شرارت سے پلٹ کر ان کی طرف بھی دیکھتا ہے جنہیں وہ بیچ بھنور میں تنہا چھوڑ آتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی مہربان لمحے کا اسیر تھا . . . جسے یہ تک خبر نہ تھی کہ وہ کون ہے اور کس خاندان سے وابستہ ہے۔ جس کی اپنی کوئی شناخت نہ تھی، اس کے باوجود اس کی داستانِ حیات میں چاہنے والوں کی کمی نہ تھی۔ دو مختلف معاشروں اور تہذیبوں کا حسین امتزاج . . . ایک ایسا سلسلہ جو برسوں یاد رہے گا۔



گذشتہ اقساط کا خلاصہ

اس کا نام اسد علی رکھا گیا جسے ''علی'' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ علی اپنے والدین کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تو خود کو علی سلطان کی نگہداشت میں پایا۔ علی سلطان ٹیکساس (امریکا) کا ایک معتبر کاروباری شخص تھا۔ ایک حادثے نے علی سلطان کو وہیل چیئر تک محدود کر دیا تھا۔ اس کی اپنی بیوی ریٹا میگڈالین سے علیحدگی ہو چکی تھی۔ وقت رخصت ریٹا اپنی اکلوتی بیٹی گلفی کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ علی سلطان نے اپنی اور علی کی دیکھ ریکھ کے لیے ایک کل وقتی ملازمہ رکھی ہوئی تھی اور بچپن سے جوانی تک علی کی تعلیم و تربیت کے تمام تر اخراجات اٹھائے تھے۔ وہ علی کے ساتھ اپنی اولاد کا سا برتاؤ کرتا تھا جو اسے انکل کہتا تھا۔ اپنے والدین کے حوالے سے علی کے ذہن میں سیکڑوں سوالات اس کے ساتھ ہی پل بڑھ کر جوان ہوئے تھے۔ اس نے جب بھی اپنے محسن و مربی انکل سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تو اس بردبار شخص نے نہایت ہی خوب صورتی سے اسے ٹال دیا۔ یہ تشنگی علی کے تجسس کو ہوا دیتی تھی لہٰذا نتیجے کے طور پر اس کا ذہن بے سمت سوچوں کے جالے میں الجھ کر رہ جاتا تھا مگر اس اضطرابی کیفیت میں بھی اس نے زندگی کے سفر کی روانی میں کوئی رکاوٹ نہیں آنے دی تھی۔ کالج میں قدم رکھتے ہی اس نے ٹیکساس کے علاقے ہنگلٹن میں واقع ''سرکل اے'' نامی ایک اسٹور پر جز وقتی ملازمت کر لی تھی۔ بیس سال کی عمر میں جب علی نے سائیکالوجی میں بیچلر ڈگری حاصل کر لی تو نت نئے ہنگامے اس کے تعاقب میں لگ گئے۔ ایک روز دو میکسیکن لڑکے ڈکیتی کی نیت سے ''سرکل اے'' میں گھس آئے۔ تمام کیش لوٹنے کے بعد وہ ڈکیت علی کے ساتھ موجود سیلز مین نظار کو شوٹ کر گئے۔ پولیس نے شک کی بنیاد پر علی کو بھی شامل تفتیش کر لیا۔ علی کا دامن صاف تھا۔ پولیس کے سوالات کے جواب میں اس نے انہیں مطمئن کر دیا۔ بعد ازاں ان دونوں میکسیکن ڈکیت کو فی تکس (ایری زونا) سے گرفتار کر لیا گیا۔ علی کا کالج لیک جیکسن (ٹیکساس) میں تھا جبکہ علی سلطان کی رہائش بے سٹی (ٹیکساس) میں تھی۔ علی ایک ہوٹل میں رہتا تھا اور لیک جیکسن کے اکثر ریسٹورنٹس میں اس کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ''ونی لاؤنج'' نامی ایک ریسٹورنٹ میں ہسپانوی دوشیزہ شارو اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھی۔ اس دل نشیں مہ جبیں نے علی کے در دل پر دستک دی تو اس کی زندگی میں بہار اتر آئی۔ ایک رات ونی لاؤنج میں جب لیونارڈو نامی ایک میکسیکن غنڈے اور اس کے حواریوں نے شارو سے بدتمیزی کی کوشش کی تو علی بیچ میں کود پڑا۔ اس مارا ماری کو ایک امیر و کبیر اسپینش لیڈی ڈیلفینا نے بڑی دلچسپی سے دیکھا اور اپنا وزیٹنگ کارڈ علی کو تھما کر رخصت ہو گئی...... اس واقعے کے بعد گویا لیونارڈو سے علی کی دشمنی کا باقاعدہ آغاز ہو گیا تھا۔ آنے والے دنوں میں علی اور لیونارڈو کے غنڈوں میں گاہے بہ گاہے مڈبھیڑ ہوتی رہی۔ لیونارڈو نے اپنی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لیے شارو کو ٹارگٹ کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ ونی لاؤنج والے ناخوشگوار واقعے کی بنا پر علی نے شارو کی ریسٹورنٹ والی جاب چھڑوا کر اسے انکل سلطان کی خدمت کے لیے گھر میں رکھ لیا تھا۔ ایک روز جب شارو اسٹیلے اسٹورز سے گروسری خریدنے گئی تو لیونارڈو نے اسے اغوا کر لیا۔ علی نے شارو کی تلاش میں ہمت نہ ہاری اور شارو کو ڈھونڈتا رہا بالآخر ایک رات لیونارڈو کا ایک قریبی ساتھی پیبلو اس کے ہتھے چڑھ گیا۔ دونوں کے بیچ خونیں معرکہ ہوا مگر پیبلو، شارو اور لیونارڈو کے حوالے سے زبان کھولنے کو تیار نہیں ہوا۔ علی نے طیش کے عالم میں مار مار کر پیبلو کو ادھ موا کر دیا۔ آئندہ روز پیبلو کے قتل کی خبر لیک جیکسن اور اس کے قرب و جوار میں گردش کر رہی تھی۔ پولیس قاتل کی تلاش میں تھی۔ لیک جیکسن میں مزید قیام خطرناک ثابت ہو سکتا تھا لہٰذا علی نے انکل سلطان کو صورتِ حال سے آگاہ کیا اور لیک جیکسن سے ہوسٹن پہنچ گیا۔ اس سنگین صورتِ حال میں علی نے ڈیلفینا سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ رابطہ ہونے پر ڈیلفینا نے علی کی کتھا سننے کے بعد کہا کہ اگر وہ بہتر گھنٹے تک باہر کی دنیا سے کٹ کر اس کے ساتھ بنگلے میں رہے تو وہ اسے تمام مسائل سے نجات دلا دے گی۔ راضی ہونے پر ان بہتر گھنٹوں میں ہر پل علی پر حیرتوں کا ایک نیا در وا ہوتا رہا۔ ڈیلفینا بہت اونچی پہنچ کی مالک ایک پراسرار لیڈی تھی۔ اس نے اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے علی کو پیبلو مرڈر کیس سے اس طرح نکال لیا جیسے مکھن سے بال...... علاوہ ازیں ڈیلفینا نے ٹھوس ثبوت کی مدد سے علی کو بتایا کہ لیونارڈو، شارو کو اغوا کر کے کیوبا کے شہر ہوانا لے گیا ہے جہاں وہ شارو کو عصمت فروشی کے جہنم میں جھونکنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ڈیلفینا نے علی کو یقین دلایا کہ اگر وہ بہتر گھنٹے پورے ہونے کے بعد اس کی ایک خواہش پوری کر دے تو وہ شارو کو صحیح سلامت واپس لے آئے گی۔ شارو کے حصول کی خاطر علی ڈیلفینا کی بات ماننے کے لیے تیار ہو گیا۔ پریسٹن ہالو والے اس بنگلے میں ڈیلفینا کی سنگت میں گزرنے والے وہ طلسم ہوش ربا بہتر گھنٹے بڑے رنگین، سنگین، رومان پرور اور ناقابلِ یقین تھے۔ ڈیلفینا کی شخصیت کسی معمے سے کم نہ تھی...... اس پر مستزاد، ڈیلفینا نے اپنے ہی ایسی دو پراسرار شخصیات ربی آئزک باروخ لاؤ اور ریما ایپل بام سے علی کی ملاقات بھی کروا دی۔ تب علی پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ تمام افراد یہودیوں کی ایک سیکرٹ اور بہت طاقتور سوسائٹی ''اسکل اینڈ بونز'' سے تعلق رکھتے تھے جو لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں آزاد تھے۔ یہ لوگ خود کو زمینی خدا سمجھتے تھے۔ انہیں علی کے ہم عمر ایک ایسے نوجوان کی تلاش تھی جس کی ماں مسلمان اور باپ عیسائی تھا۔ انہیں شک تھا کہ علی وہی نوجوان ہے جس کے والدین اسے علی سلطان کے حوالے کر کے کہیں روپوش ہو گئے تھے۔ ڈیلفینا کی تمنا تھی کہ علی ان کی شرائط پر صاد کرتے ہوئے ''اسکل اینڈ بونز'' کی رکنیت حاصل کرنے پر آمادگی ظاہر کر دے لیکن علی نے ڈیلفینا کی خواہش کو ٹھکرا دیا اور ڈیلس سے بے سٹی اپنے انکل کے پاس آ گیا۔ یہاں حالات کی ایک نئی کروٹ اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ انکل نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں علی کو اس کی زندگی کے دیرینہ اور سربستہ راز سے آگاہ کر دیا۔ علی سلطان کے مطابق، انیس سال پہلے، ایک برس کی عمر میں علی کو کراچی (پاکستان) سے نیویارک (امریکا) مرزا عامر بیگ کے پاس پہنچایا گیا تھا۔ مرزا عامر بیگ، علی سلطان کا دوست تھا۔ اس نے علی کو علی سلطان کے حوالے کر دیا تھا۔ علی سلطان نے ایک گارجین کی حیثیت سے انیس برس تک علی کی پرورش کی تھی۔ اس سلسلے میں ہونے والے تمام تر اخراجات کراچی میں مقیم ایک نیک خاتون برداشت کر رہی تھیں مگر پچھلے چند ماہ سے اچانک کراچی سے یہ رقم آنا بند ہو گئی تھی جس سے مرزا عامر نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ خاتون کسی مصیبت میں گرفتار ہو گئی ہے چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ علی کو فی الفور کراچی روانہ ہو جانا چاہیے۔ علی سلطان اور مرزا عامر بیگ مذکورہ خاتون کے بارے میں

زیادہ معلومات نہیں رکھتے تھے۔ ان کا اندازہ تھا کہ اس خاتون کا علی کے ساتھ کوئی خونی رشتہ ہے۔ مرزا عامر بیگ نے علی کو چند ایسے اشارے دیے جن کی مدد سے علی کراچی میں اس خاتون کو تلاش کر سکتا تھا۔ علی نے تیاری کی اور ہوسٹن سے کراچی آ گیا۔ پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی نئے ہنگاموں نے اس کا استقبال کیا۔ وہ ائرپورٹ سے ایک ٹیکسی پکڑ کر اپنے ہوٹل کی جانب روانہ ہوا تو ٹیکسی ڈرائیور نے اسے ویرانے میں جا کر لوٹنے کی کوشش کی مگر علی نے اسے ناکام بنا دیا۔ علی کی دوستی عظیم نامی نوجوان سے ہو گئی۔ عظیم نے اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے علی کی والدہ کا پتا لگا لیا اور انہیں گھر لے آیا۔ علی کی ملاقات اپنی ماں سے ہو گئی۔ علی کو اپنی ماں کے حالات جان کر بہت دکھ ہوا اور وہ دشمنوں سے انتقام لینے کے بارے میں سوچنے لگا۔ علی ماں کے بنگلے پر رہنے لگا۔ وہیں اسے اطلاع ملی کہ انکل علی سلطان کا دل کے دورے کے سبب انتقال ہو گیا ہے۔ علی نے ماں کو امریکا ساتھ لے جانے کے لیے وزٹ ویزا کے حصول کے لیے کوشش شروع کر دی۔ علی کو ایک رات خواب میں ڈیلفینا نظر آئی۔ اس نے علی کو دھمکی دی کہ وہ کہیں بھی چلا جائے اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ کچھ نامعلوم افراد نے حملہ کر کے علی کی والدہ کو قتل کر دیا۔ علی نے تہیہ کر لیا کہ وہ ماں کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچائے گا۔ علی نے تمام حقیقت پینا کو بھی بتا دی۔ وہ علی کی اچھی دوست اور ہمراز بن گئی تھی۔ علی کو اس کی رہائش گاہ کے پتے پر ایک خط ملا جس میں اس کی ماں کے قتل کا اعتراف کیا گیا تھا۔ علی نے نادر شاہ کو چیک کرنے کا ارادہ کیا۔ علی نے عظیم کے ساتھ مل کر منصوبہ بنایا کہ نادر شاہ کو اغوا کر کے اس سے سچ اگلوایا جائے۔ عظیم نے کچھ لوگوں کو پیسے دے کر نادر شاہ کو اغوا کرایا۔ تاہم اس میں سے ایک شخص نے عظیم کو کال کر کے بتایا کہ ان کے آدمیوں کو پولیس نے گھیر لیا ہے۔ نادر شاہ اور اغوا کنندگان پولیس کی تحویل میں پہنچ گئے تھے۔ علی نے فوری طور پر بنگلا چھوڑ دیا اور پینا کے ہمراہ اس کے فلیٹ پر آ گیا۔ علی نے بنگلے پر جمشید کو چھوڑا تھا اور خاص نظر رکھنے کی ہدایت کی تھی۔ علی کو دو جرمن شیفرڈ کی مدد سے تلاش کیا جا رہا تھا۔ اس کے درپردہ ڈیلفینا کا ہی ہاتھ تھا۔ وہ کسی بھی طرح علی کو قابو کرنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے پولیس کو پیچھے لگا دیا تھا جو بڑی شد و مد سے علی کی تلاش میں سرگرداں تھی۔ علی نے نادر شاہ کو سبق سکھانے کے لیے اسے قابو کیا اور بدترین تشدد کر کے اسے محتاجی کی زندگی گزارنے کے لیے چھوڑ دیا۔ وہ ابھی بنگلے سے نکلنے والا تھا کہ جرمن شیفرڈز کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

چشم تصور بھی کیا قیامت ہے۔ اس کی نیرنگیاں لامحدود اور حیرت انگیز ہیں۔ آنکھوں دیکھی حقیقت بھی بعض اوقات ناقابلِ یقین لگتی ہے اور بسا اوقات ان دیکھی، ان سنی چیزوں پر بھی ایمان لانے کو جی چاہتا ہے۔ میں اس وقت بڑی تشویش ناک صورتِ حال میں گھر چکا تھا اور ان نازک لمحات میں آنکھ کی کاریگری پوری طرح مجھ پر آشکار ہو رہی تھی۔ چشم تصور نے یک بیک میرے حواسِ خمسہ کو حسِ واحد یعنی قوتِ سماعت میں بدل دیا تھا۔ میں نے بنگلے کے باہر کسی ہیوی گاڑی کو رکتے ہوئے سنا تھا، پھر اس گاڑی کے ہارن کی تیز آواز میری سماعت تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی تھی اور اس کے بعد غراہٹ ابھری، رونگٹے کھڑے کر دینے والی ''غوں...... بھوں بھوں!''

مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا کہ تین ہزار پانچ سو سی سی کی جرمن شیفرڈز بردار ڈبل کیبن ٹویوٹا ہائی لکس جیپ ''سیاہ ویگو'' وہاں پہنچ چکی تھی اور یہ بھی طے تھا وہ سیاہ ویگو منڑگشت پر نہیں تھی یقیناً وہ میری ٹرپ میں دو ''کے۔ نائن'' کتوں کی راہنمائی میں وہاں آئی تھی۔

گاڑی نے ایک مرتبہ پھر ہارن بجایا۔ میں سمجھ گیا کہ ویگو کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص بنگلے کے سیکیورٹی گارڈ کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے ہارن کا سہارا لے رہا تھا تاکہ وہ اس کے لیے گیٹ کھول دے لیکن اس نامراد کی یہ مراد کسی بھی قیمت پر پوری ہونے والی نہیں تھی کیونکہ اس بنگلے کا چوکیدار کم سیکیورٹی گارڈ ویگو کے ہارن کی رینج سے بہت دور جا چکا تھا۔ یہ جیپ اور اس پر سوار جرمن شیفرڈز جمشید کی گرد کو بھی نہیں پا سکتے تھے۔

اس امر میں بھی کسی شک و شبہے کی گنجائش تلاش نہیں کی جا سکتی تھی کہ جمشید کی طرف سے کوئی ردعمل نہ پا کر ویگو پر سوار افراد نے تشویش میں مبتلا ہو جانا تھا جس کے بعد وہ اپنی مدد آپ کے تحت بنگلے کے اندر گھس آتے اور کتوں کی نشاندہی آمیز ''بھوں بھوں'' کی انگلی پکڑ کر وہ مجھ تک پہنچنے کی کوشش کرتے۔ دونوں جرمن شیفرڈ اپنی مخصوص غراہٹ سے مسلسل وہاں میری موجودگی کا اعلان کر رہے تھے۔

میں نے بنگلے میں داخل ہونے کے بعد اپنے سیل فون کو سائلنٹ موڈ پر سیٹ کر کے اس کے وائبریٹر کو آن کر دیا تھا۔ یہ تمام تر خیالات سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں میرے ذہن سے گزرے اور میں عملی اقدام کے لیے تیار ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے میرے سیل فون میں تھرتھراہٹ جاگ اٹھی۔ میں نے جینز کی جیب میں سے سیل فون نکال کر دیکھا۔

وہ پینا کی کال تھی۔ پینا اس وقت میرے انتظار میں، بنگلے کی عقبی گلی میں تھوڑے فاصلے پر موجود تھی۔ یقیناً جرمن شیفرڈز کے بھونکنے کی آواز اس نے بھی سن لی تھی اسی لیے اس نے پریشان ہو کر مجھے کال کی تھی۔ میں نے بیڈروم سے باہر نکلتے ہوئے اس کی کال اٹینڈ کر لی۔ میرے ''ہیلو'' کے جواب میں اس کی تشویش بھری آواز ابھری۔

"علی! تم خیریت سے تو ہونا......؟"

"میں ٹھیک ہوں۔" میں نے بیڈروم کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ "تم فوراً یہاں سے نکلو اور کیفے یوفوریا میں بیٹھ کر میرا انتظار کرو۔"

اس نے متذبذب لہجے میں پوچھا۔ "اور تم؟"

"میں بھی تھوڑی دیر میں وہاں پہنچ رہا ہوں۔" میں نے راہداری میں قدم بڑھاتے ہوئے دھیمے انداز میں کہا۔ "اگر مجھے تاخیر ہو جائے تو تم فکرمند نہیں ہونا۔ میں ادھر ہی پہنچوں گا۔ کیفے آج رات دو بجے تک کھلا رہے گا۔"

"تمہارے مشن کا کیا ہوا؟" اس نے استفسار کیا۔

"آخری مراحل میں ہے۔" میں نے کہا۔ "باقی باتیں کیفے یوفوریا میں ہوں گی......اوکے!"

"اوکے......!" اس نے سمجھ داری کا ثبوت دیتے ہوئے بات ختم کر دی۔

میں نے سیل فون کو واپس جیب میں رکھا تو مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ میں نے خود کو ماں والے بیڈروم کے اندر پایا۔ بینا سے سیلولر گفتگو کے دوران میں، میں بے دھیانی میں، ماں کے بیڈروم میں داخل ہو گیا تھا۔ میرے اور ماں کے بیڈرومز کے درمیان چند قدموں کا فاصلہ تھا اور یہ مختصر سی مسافت میں نے کسی غیبی قوت کے زیرِ اثر طے کی تھی۔ ان لمحات میں مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرا دماغ کسی اور کے کنٹرول میں ہو کیونکہ میں جو کچھ بھی کر رہا تھا، اس میں میرے ارادے کو دخل نہیں تھا۔ میرے افعال و اعمال کسی خودکار نظام کے تحت ظہور پذیر ہو رہے تھے۔ یہ خودکار نظام داخلی تھا یا خارجی، اس کا بھی مجھے مطلق ادراک نہیں تھا۔ بس، میں بلا سوچے سمجھے کسی نامعلوم اسکرپٹ کے مطابق پرفارم کرتا چلا جا رہا تھا......اس روبوٹ کے مانند جو کسی اور کے پروگرام پر محوِ حرکت ہو۔

یہ ایک فیصلہ کن مرحلہ تھا لیکن اس وقت میں اپنے اختیار میں نہیں تھا۔ سب کچھ بے ساختہ ہو رہا تھا۔ آج سہ پہر میں، میں نے عظیم سے کہا تھا...... "صورتِ حال چاہے کتنی بھی سنگین اور تشویش ناک کیوں نہ ہو، اگر انسان اپنے دماغ کو قابو میں رکھے تو پھر ہر الجھن کی سلجھن نظر آ جاتی ہے۔" میں اس وقت یہ دعویٰ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا کہ میرا دماغ میرے قابو میں ہے کیونکہ میرا دماغ تو کسی نادیدہ طاقت کے اشارے پر کام کر رہا تھا اور یہ پراسرار قوت مجھے بزدلوں کی طرح فرار کی راہ نہیں دکھا رہی تھی بلکہ کسی خاص حکمتِ عملی کے ذریعے پیش آمدہ حالات کو اپنے لیے مفید بنانے کا درس دے رہی تھی۔ میں اس خیر خواہ غیبی طاقت کی خواہش کی تکمیل میں مصروف ہو گیا۔

میں نے ماں والے بیڈروم کا دروازہ کھلا ہی چھوڑ دیا اور میکانکی انداز میں قدم اٹھاتے ہوئے بڑی سرعت سے ماں کی ڈریسنگ ٹیبل کی سمت بڑھا۔ میں نے اس بیڈروم کی لائٹ کو آن نہیں کیا تھا۔ راہداری کے راستے اتنی روشنی بیڈروم کے اندر پہنچ رہی تھی کہ وہاں اپنی مرضی کے مطابق چہل قدمی کی جا سکتی تھی یعنی وہاں موجود ہر شے تک بہ آسانی رسائی حاصل کی جا سکتی تھی۔

میں نے ڈریسنگ ٹیبل کے اوپر سے پرفیومز کی دو بوتلیں اٹھائیں اور جتنی جلدی ممکن تھا، میں نے خود کو پرفیومز میں نہلا دیا۔ میری ٹی شرٹ اور جینز خوشبو میں پوری طرح بس گئی تھیں۔ میں نے پرفیوم کی چھوٹی بوتل کو جیب میں ٹھونسنے کے بعد خود کو ایک موٹی چادر میں اچھی طرح لپیٹا پھر ایک "چھ بائی دس" فٹ کے فرشی غالیچے میں خود کو رول کر کے بیڈروم کی ایک دیوار سے لگا لیا۔ مذکورہ دیوار بیڈ کی مخالف سمت میں تھی یعنی اسے بیڈ کی اوٹ میسر تھی۔ بیڈروم میں داخل ہونے والے کسی بھی شخص کی نظر براہِ راست اس لپٹے ہوئے قالین تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی تھی۔

اس عمل سے فارغ ہونے کے بعد میں نے ایک اطمینان بھری گہری سانس خارج کی کیونکہ میں وہاں آنے والے افراد کی نگاہوں اور دونوں جرمن شیفرڈز کے اسنفنگ پاور سے مالا مال نتھنوں سے سرِدست محفوظ ہو گیا تھا۔ اگلے ہی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں واپس اپنے حواس میں آ گیا ہوں۔ اب سب کچھ مجھے نارمل لگ رہا تھا۔ میں خود کو کسی ان دیکھی قوت کے زیرِ اثر نہیں پا رہا تھا۔

میں قالین کے اندر لپٹا ہوا اپنے ان ہنگامہ خیز حالات پر غور کر رہا تھا کہ میں نے گیٹ کے کھلنے کی آواز سنی۔ گویا وہ لوگ بنگلے کے اندر داخل ہو رہے تھے۔ میں ریڈ الرٹ ہو گیا اور سانس کو قابو میں رکھ کر ان کی طرف سے کی جانے والی کارروائی کا انتظار کرنے لگا۔ میں انہیں اور ان کے ساتھ آنے والے دو جرمن شیفرڈز کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ تاہم ان سنسنی خیز لمحات میں میری تمام حسیات سمٹ کر قوتِ سماعت کے دامن میں، پناہ گزیں ہو چکی تھیں۔ گویا میرے سننے کی حس بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔

میں انسانوں اور کتوں کے قدموں کی چاپ کو الگ الگ سن اور پہچان رہا تھا۔ وہ دو سے تین افراد اور دو جرمن شیفرڈز تھے تاہم اب کتوں کے بھونکنے کی آواز مفقود ہو چکی

...ن کا واضح مطلب یہی تھا کہ انہیں میرے بدن کی ...بو نہیں مل رہی تھی۔ میں خوشبو کے اندر، خوشبو موٹی ...اندر اور موٹی چادر اونی قالین کے اندر لپٹ کر ...ڈز کی تلاش کے راستے میں دیوارِ چین کے مانند ...بن گئی تھی۔ یہ میرے لیے اطمینان بخش صورتِ حال ...اب یہ بھی سمجھ میں آ گیا کہ یہاں پہنچتے ہی ...ن" نے "بھوں بھوں" کرنا کیوں شروع کر دیا ...نادر شاہ کو عبرت ناک انجام سے دوچار کرنے کے ...میں اچھا خاصا جذباتی ہو گیا تھا جس کے باعث ...دماغ کا پارا اونچے درجے تک جا پہنچا تھا۔ نتیجے کے ...بلڈ پریشر بڑھ گیا تھا اور جسم کے میٹابولزم میں ...ئی تھی۔ اس کنڈیشن میں سویٹ گلینڈز (پسینے کے ...غیر معمولی متحرک ہو گئے تھے اور ایپوکرین ...رین نے وافر مقدار میں پسینا اگلنا شروع کر دیا تھا ...ے بدن پر اور لباس پر چھڑکی جانے والی خوشبویات کا ...ل ہو گیا تھا اور میرے بدن کی مخصوص بُو کو پھوٹ ...کا موقع مل گیا تھا جس نے جرمن شیفرڈز کو میری ...متوجہ کر دیا تھا۔ مالک کا شکر کہ اب میں ان کتوں کو ...دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

قدموں کی چاپ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ قریب ...یب تر چلی آ رہی تھی۔ پھر وہ لوگ ماں والے کمرے ...کھلے ہوئے دروازے کے پاس پہنچ گئے۔ میں نے ...روک لی اور ہر قسم کے حالات کے لیے ذہنی طور پر ...ہو گیا۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ ان میں سے ...شخص کمرے کے اندر بھی داخل ہوا تھا۔ دو سیکنڈ کے بعد ...شخص نے جھنجلاہٹ بھرے انداز میں کہا۔

"یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔ نہ شاہ جی اور نہ ہی چوکیدار......"

اس کی بات سے بخوبی اندازہ ہو گیا کہ آنے والوں ...معلومات کے مطابق اس وقت بنگلے کے اندر دو افراد کو ...موجود ہونا چاہیے تھا۔ ایک نادر شاہ اور دوسرا جمشید۔ اس کا ...سبب یہ تھا کہ نادر شاہ انہی کے ایما پر رات گزارنے یہاں ...تھا۔ گویا، یہ سب ان کے پروگرام کا حصہ تھا۔

اس آدمی کی جھنجلاہٹ کے جواب میں باہر سے آواز آئی۔ ...ان میں سے کوئی اس کمرے میں نہیں ہے تو انہیں بنگلے کے ...دوسرے حصوں میں تلاش کرو۔ انہیں یہیں کہیں ہونا چاہیے اور اس ...کو بھی جس کی نشاندہی کتے کر رہے تھے......"

اس شخص کی آواز میں رعب اور دبدبہ پایا جاتا تھا۔ ...مانہ انداز میں بات کر رہا تھا جس سے مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ ان کا کوئی سینئر تھا۔ یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ وہ معمول کے راؤنڈ پر ادھر آئے تھے۔ ان کی معلومات کے مطابق اس وقت بنگلے پر نادر شاہ اور جمشید کو موجود ہونا چاہیے تھا۔ اس کے علاوہ "لڑکے" سے اس شخص کی مراد میں تھا۔ اسی لیے کتوں نے اس بنگلے پر میری موجودگی کو محسوس کر کے اپنے مخصوص انداز میں بھونکنا شروع کر دیا تھا۔

بجلی کی سی سرعت سے یہ خیالات میرے ذہن سے گزرے اور اس کے ساتھ ہی میں نے اس آدمی کے جاتے ہوئے قدموں کی آواز سنی جس نے جھنجلاہٹ بھرے انداز میں، ماں والے بیڈروم میں کسی کے بھی موجود نہ ہونے کا اعلان کیا تھا۔ میری پراسرار روپوشی نے مجھے بال بال بچا لیا تھا۔ میں نے سکون کی سانس لی کہ وقتی طور پر ہی سہی مگر انہوں نے اس کمرے کو کلین چٹ دے دی تھی۔ یہ بات بھی میرے لیے اطمینان کا باعث تھی کہ جرمن شیفرڈز نے یک بیک چپ شاہ کا روزہ رکھ لیا تھا۔ ظاہر ہے، جب انہیں میرے بدن کی مخصوص بو نہیں مل رہی تھی تو وہ کوئی انسان تھوڑی تھے جو بعض اوقات بلا مقصد بھی "بھوں بھوں" شروع کر دیتے ہیں۔ خیر، یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ میرے اس بے اختیاری جملے پر برا منانے سے پہلے اس بات پر ضرور غور کیجیے گا کہ جب بھی کہیں "وفاداری" کا تذکرہ ہو رہا ہو تو اشرف المخلوقات یہ حضرتِ انسان ہمیشہ خود کو نظرانداز کر کے کتے ہی کی مثال دیتا ہے۔

میں سکون کی سانس لے کر فارغ ہوا ہی تھا کہ اس بیڈروم کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی جہاں میں نے نادر شاہ کو ناقابلِ فراموش سبق سکھایا تھا۔ مذکورہ کمرے سے نکلتے وقت میں اس کا دروازہ بند کر آیا تھا۔ دروازہ کھلنے کا مطلب تھا کہ میرا "کارنامہ" ان کے سامنے آنے والا تھا اور پھر وہی ہوا جس کا مجھے یقین تھا۔ ان لوگوں نے نادر شاہ کو دریافت کر لیا تھا۔

میں نے تین افراد کو افراتفری کے عالم میں محوِ گفتگو پایا۔ ان میں سے ایک وہی شخص تھا جس کے لہجے میں تحکم پایا جاتا تھا۔ باقی دو اس کے ساتھی تھے۔ نادر شاہ کو اس حالت میں دیکھ کر ان کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ ان کی آواز میں اضطرار کی جھلک تھی۔

"سر! شاہ جی تو بے ہوش ہو چکا ہے......" یہ اسی شخص کی آواز تھی جو چند لمحے پہلے سرسری انداز میں میرے کمرے میں جھانک کر گیا تھا۔

"یہ تو مجھے بھی نظر آ رہا ہے۔" سر کے لقب سے

پکارے جانے والے سینئر شخص نے سٹپٹائے ہوئے انداز میں کہا۔ ”اور مجھے لگتا ہے، یہ سب اسی سیکیورٹی گارڈ کا کیا دھرا ہے جو بنگلے سے غائب ہو چکا ہے۔ آفتاب! تم نادر شاہ کو ہوش میں لانے کی کوشش کرو۔ یہ بہت ضروری ہے۔“

”اوکے سر!“ آفتاب نامی شخص نے فرماں برداری سے کہا۔

”سر! میں محسوس کر رہا ہوں کہ نادر شاہ کو فوراً کسی اسپتال پہنچانا چاہیے۔“ یہ تیسرے شخص کی آواز تھی۔ ”میں نے کتوں کی مدد سے پورے بنگلے کو چیک کرلیا ہے۔ وہ لڑکا یہاں کہیں بھی موجود نہیں ہے۔ میرا ذہن یہ کہتا ہے کہ کتوں نے ہمیں دھوکا نہیں دیا۔ وہ لڑکا ہمارے یہاں پہنچنے سے پہلے بنگلے پر موجود تھا اور مجھے شک ہے کہ اس نے سیکیورٹی گارڈ کو اپنے ساتھ ملالیا ہے اور ان دونوں نے مل کر نادر شاہ کا یہ حشر کیا ہے اور ہماری آمد سے پہلے ہی وہ یہاں سے رفو چکر ہو چکے ہیں۔“

”جاوید! تمہاری بات میں وزن ہے۔“ سینئر نے سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ہمیں بتایا گیا تھا کہ وہ لڑکا بہت تیز طرار ہے اور یہ ہم نے اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیا ہے۔ ہم اس کی تلاش میں ”خان ہاؤس“ پہنچے تو وہ وہاں سے نکل گیا تھا اور اس چالباز نے جس طرح جنید خان کو بے وقوف بنایا، وہ اسٹوری بھی ہم لوگوں کے علم میں آچکی ہے اور...... یہاں بھی وہ اپنا کام کرکے کسی چھلاوے کی طرح غائب ہو چکا ہے۔“

”سر! نادر شاہ کو اسپتال پہنچانے کے لیے گاڑی منگوانا ہوگی۔“ آفتاب نے تشویش ناک انداز میں کہا۔ ”ہم اسے کتوں کے ساتھ جیپ پر سوار نہیں کرسکتے۔“

”میں گاڑی کا بندوبست کرتا ہوں۔“ ان کے سر نے جواب دیا۔ ”تم لوگ سیکیورٹی گارڈ کے کوارٹر کو اچھی طرح چیک کرو۔ شاید وہاں سے کوئی ایسا سراغ مل جائے جس کی مدد سے ہم اس لڑکے یا سیکیورٹی گارڈ تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائیں۔ یہ بہت ضروری ہے اور جلد از جلد بھی ورنہ اوپر سے ایسی کھنچائی ہوگی کہ جس کا تم تصور بھی نہیں کرسکتے۔ ہماری پیٹیاں بھی اتر سکتی ہیں۔ جس بلا کے اشارے پر یہ ہنگامی کارروائی کی جارہی ہے وہ کوئی بہت ہی طاقتور عورت ہے۔ اس نے ہمارے پورے ڈیپارٹمنٹ کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ بڑے بڑے اعلیٰ افسران کی نیندیں اڑی ہوئی ہیں۔ اس عورت نے جادو کی چھڑی گھما کر پولیس ڈیپارٹمنٹ کو لائن حاضر کردیا ہے۔ اس لڑکے کو ہم نے ہر حال میں اور ہر قیمت پر پکڑ کر اس عورت کے حوالے کرنا ہے اور وہ بھی اس کا ایک بال بیکا ہوئے بغیر......“

اس شخص نے ”بلا“ کا لفظ یقیناً ڈیلفینا کے ... استعمال کیا تھا۔ یہ سب کچھ اسی ہسپانوی دوشیزہ کے ایما ... ہورہا تھا۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ کو اپنی نوکریوں کے ... پڑگئے تھے۔ ویسے ایک بات ماننے کی تھی کہ ڈیلفی کو ... بہت خیال تھا اسی لیے اس نے یہ حکم صادر کر رکھا تھا کہ ... اس طرح حراست میں لیا جائے کہ میرا ایک بال تک با... ہو، میرے بدن پر ایک خراش تک نہ آئے اور مجھے کسی ... نوعیت کی تکلیف کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

ان آزمائشی لمحات میں ڈیلفی کے اس حسنِ سلوک ... بارے میں سوچتے ہوئے مجھے اس پر پیار بھی آیا۔ جب کوئی ... خاص طور پر آپ کا خیال رکھ رہا ہو تو آپ کے دل میں ا... کے لیے اچھی خاصی گنجائش نکل آتی ہے۔ میں نے زیرِ ... مسکرا کر بہ زبانِ خاموشی کہا۔

”ڈیلفی! جب تم میرے تصرف میں آؤ گی تو ... تمہارے ایک ایک احسان کو ریڈ کارپٹ خراجِ تحسین پ... کروں گا...... کم آن، لیٹس گو، رئیل سلو۔ ڈونٹ یو س... بی! اسی ایس پرفیکٹو“ (کسلمندی چھوڑ دو۔ نکل کر سامنے آ... تم نے دیکھا نہیں بے بی! یہ ہوتا ہے پرفیکشن)

میں نے غالیچے کے اندر لپٹے لپٹے ایک آسودہ سانس خارج کی اور اس شخص پر توجہ مرکوز کردی۔ اس دوران ... آفتاب اور جاوید وہاں سے جمشید کے کوارٹر کی جانب روا... ہوچکے تھے اور اس شخص نے نادر شاہ کے لیے گاڑی منگوا... کے بعد اپنے کسی اعلیٰ افسر سے رابطہ بھی کرلیا تھا۔ اس ... بڑے مؤدب انداز میں اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

”سر! میں ڈی ایس پی سکندر عرض کر رہا ہوں......“

مجھے اس سینئر کا نام بھی معلوم ہوگیا۔ وہ عہدے ... اعتبار سے حاضر ڈیوٹی ڈی ایس پی تھا۔ اس نے یقیناً ... ایس پی صاحب یا اس سے بھی بڑے افسر کو فون کیا تھا ... میرے اندازے کے مطابق، دوسری طرف بولنے وا... اعلیٰ افسر نے اس سے رپورٹ طلب کی ہوگی۔ ڈی ایس پی سکندر نے جواب دیا۔

”صورتِ حال نہایت سنگین اور تشویش ناک ہے......“

پھر اس نے نادر شاہ کا تازہ ترین احوال دوسر... جانب منتقل کیا اور بولا۔ ”سر! میں نے نادر شاہ کو اسپ... پہنچانے کے لیے گاڑی منگوالی ہے۔ جب تک یہ بندہ ہو... میں نہیں آئے گا، بنگلے پر پیش آنے والے واقعے کی حقیقت تک رسائی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ لگتا ہے، اس لڑکے ... سیکیورٹی گارڈ کو اپنے ساتھ ملا کر یہ واردات کی ہے۔“

چند لمحات تک اس نے اپنے افسر کی بات سنی پھر ...ام بھرے لہجے میں بولا۔

”یس سر! میں آپ کے خیال سے اتفاق کرتا ہوں۔ ...ے وہاں پہنچنے سے پہلے تک وہ لڑکا بنگلے کے اندر موجود ...ی لیے کتوں نے ہماری راہنمائی کی تھی ورنہ ہم تو معمول ...لفت پر تھے۔ اس طرف آنے کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں ...کتوں کی نشاندہی پر ہم نے بنگلے کا رخ کیا تھا۔“

وہ ایک مرتبہ پھر خاموش رہ کر اعلیٰ افسر کی بات سننے ...اس کے بعد بڑے یقینی انداز میں بولا۔

”بالکل سر...... اب دونوں کتے اس کی بو نہیں پارہے اس ...وہ بھونک بھی نہیں رہے۔ اس بات میں کسی شک وشبے کی ...کش نہیں کہ وہ شیطان ان کتوں کی رینج سے دور جاچکا ہے۔“

چند لمحات کے لیے اس نے توقف کیا پھر اعلیٰ افسر کو ...ب دیا۔

”یس سر! آپ فکر نہ کریں۔ میں نادر شاہ کو سب انسپکٹر ...اب کے ساتھ اسپتال بھجوانے کے بعد خود سب انسپکٹر ...ید کے ہمراہ آس پاس کے علاقے کو چیک کرتا رہوں گا۔ ...لگتا ہے، وہ چھلاوا ادھر ڈیفنس سوسائٹی کے علاقے ہی میں ...یں چھپا بیٹھا ہے۔ میں جرمن شیفرڈز کی مدد سے، صبح سے ... اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔ انشاء اللہ! کل کا سورج طلوع ...نے سے قبل میں آپ کو کوئی خوشخبری دوں گا......“

ڈی ایس پی سکندر کی بات نے مجھے چونکا دیا۔ اس نے ...لوں تک رابطہ تو موقوف کردیا تھا لیکن مجھے سپردِ اضطرار کرگیا ...۔ ان لمحات میں سنسنی میرے خون میں شامل ہوکر رگوں میں ...رہی تھی۔ اس شخص کا یہ اندازہ صد فیصد درست تھا کہ میں ...س سوسائٹی ہی میں روپوش تھا۔ سکندر نے پوری رات ...ری تلاش جاری رکھنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا اور سورج طلوع ...نے سے پہلے مجھے بازیاب کرنے کا عندیہ بھی دیا تھا۔ گویا ...ع کی رات دونوں جرمن شیفرڈز کو ڈیفنس سوسائٹی کی سڑکوں ...جھے سرچ کرنا تھا۔ اس خیال نے مجھے بڑی تقویت دی اور ... جھپکتے میں میرے ذہن میں ایک اچھوتا آئیڈیا آگیا۔ ...ہی لمحے بیتا کو فون کرنے کے لیے میرا دل مچلنے لگا۔

میں ایسی پوزیشن میں نہیں تھا کہ فوراً سیل فون نکال کر ...و کال کرنے لگتا۔ جب تک وہ ڈی ایس پی اور اس کے ...چیلے چانٹے سب انسپکٹرز میرے قرب وجوار میں موجود ...، میں اس نوعیت کی غلطی کرنے کے بارے میں سوچ ...نہیں سکتا تھا۔

اسی وقت دونوں سب انسپکٹرز، ڈی ایس پی سکندر

تعریف

انسپکٹر (چور سے): ”تم نے بڑی دلیری سے گھر کی دیوار پھلانگی، بڑی آسانی سے زیور چرایا اور بغیر آہٹ پیدا کیے رفو چکر ہوگئے۔“

چور (شرماتے ہوئے): ”جناب! اتنی تعریف کرکے شرمندہ تو نہ کریں۔“

☆☆☆

بھول

ایک پروفیسر صاحب کوئی بات بھول گئے۔ یاد کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ رات کے دو بجے جاکر یاد آیا کہ آج انہیں جلدی سونا تھا۔

☆☆☆

خوش لباس

اکبر صاحب دولت مند مگر نہایت کنجوس آدمی تھے اس لیے ہمیشہ بوسیدہ اور بے ڈھنگے لباس میں نظر آتے۔ آخر ایک روز ان کا دوست کہنے لگا۔ ”اکبر صاحب! خدا کے لیے ڈھنگ کا لباس پہنا کریں، کچھ نہیں تو اپنے والد مرحوم کا خیال کریں۔ وہ تو بڑے خوش لباس تھے۔“

اکبر صاحب نے ناراضی سے پوچھا۔ ”آپ پھر مجھ سے خفا کیوں ہیں۔ میں ہمیشہ ان ہی کے کپڑے پہنتا ہوں۔“

مرسلہ۔ غلام حسین اختر، سرگودھا

ترکیب

بیگم۔ ”سنو جی! لڑکا پیسے اڑانے لگا ہے، جہاں چھپاتی ہوں ڈھونڈ لیتا ہے۔“

میاں۔ ”کمینے کی کتاب میں رکھ دو، امتحان تک نہیں ڈھونڈ پائے گا۔“

☆☆☆

صحت مند بڑھاپے کا راز

ایک صحت مند خوش حال بوڑھے سے پوچھا گیا۔ ”آپ نے غموں سے پاک صحت مند بڑھاپا کیسے پایا؟“ اس نے جواب دیا۔

”میں نے کبھی اپنے گھر والوں سے اور تعلق والوں سے ناراضی اور غصے کو دل میں نہیں رکھا اور کبھی اپنے سے زیادہ مرتبے والے پر حسد نہیں کیا اور نہ کسی کے نقصان پر کبھی خوشی منائی۔“

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

کے پاس پہنچ گئے۔ آفتاب نے کہا۔

”سر! سیکیورٹی گارڈ اپنے ضروری سامان کے ساتھ غائب ہوا ہے۔ کوارٹر میں اس کی چارپائی اور بستر کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ وہاں سے ہمیں کوئی ایسی چیز نہیں ملی جس کی مدد سے اس تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہو۔“

”اس کے استعمال کا کوئی کپڑا تو وہاں ضرور ہوگا۔“ سکندر نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ”اگر اس کا استعمال شدہ کوئی کپڑا ہاتھ لگ جائے تو ہم کتوں کی مدد سے اسے تلاش کر سکتے ہیں۔ اگر وہ لڑکے کے ساتھ ملا ہوا ہے تو پھر وہ دونوں ہمارے ہتھے چڑھ سکتے ہیں۔“

”نو سر......“ جاوید نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”وہ مکار اپنے تمام کپڑے بھی ساتھ لے گیا ہے اور مجھے تو اس بات میں کسی شک کی گنجائش نظر نہیں آتی کہ اس بنگلے کا سیکیورٹی گارڈ اس لڑکے کے ساتھ پوری طرح ملا ہوا ہے۔“

”دونوں جائیں بھاڑ میں۔“ آفتاب سٹپٹائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”ان دونوں شیطانوں کی وجہ سے ہماری خواری ہو رہی ہے۔“

میری حکمتِ عملی خاصی کارگر رہی تھی۔ جمشید نے میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اپنے کوارٹر میں ایسی کوئی بھی شے نہیں چھوڑی تھی جس کے ذریعے جرمن شیفرڈز اس کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو جاتے۔

آفتاب کے جھلاہٹ آمیز تبصرے کے جواب میں ڈی ایس پی سکندر نے سنسنی خیز انداز میں کہا۔ ”اس خواری ہی میں ہماری عافیت ہے۔ اگر وہ دونوں بھاڑ میں چلے گئے تو ہمیں سیدھا سیدھا جہنم پہنچا دیا جائے گا۔ تم لوگوں کو اس معاملے کی سنگینی کا اندازہ نہیں ہے۔ ہماری نوکریاں اس وقت داؤ پر لگی ہوئی ہیں۔ کل کا سورج طلوع ہونے سے پہلے ہر قیمت پر ہمیں اس لڑکے کو تلاش کرنا ہے۔ ہماری نظر میں صرف اس لڑکے کی اہمیت ہے۔ باقی وہ سیکیورٹی گارڈ بھاڑ میں جائے یا جہنم میں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

ادھر سکندر کی بات ختم ہوئی، ادھر بنگلے کے باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔ ڈی ایس پی سکندر نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

”تم دونوں نادر شاہ کو اٹھا کر گاڑی میں ڈالو۔ اسے فوری طور پر اسپتال پہنچانا ضروری ہے۔ اگر اس کے جسم سے زیادہ خون نکل گیا تو اس کی موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔ ہمیں ہر صورت میں اسے بچانا ہے۔ یہ ہوش میں آئے گا تو کچھ بتانے کے قابل ہو پائے گا۔ تبھی ہم جان سکیں گے کہ اس بنگلے پر ہماری آمد سے پہلے کیا واقعہ پیش آیا تھا“ لمحاتی توقف کرکے اس نے گہری سانس لی پھر ا... احکامات کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

”آفتاب! تم نادر شاہ کے ساتھ اسپتال جاؤ گے۔ جاوید! تم میرے ساتھ کتوں والی جیپ میں موجود رہو گے۔ ہم نے ڈیفنس سوسائٹی کی سڑکوں پر رات کے باقی حصے میں گشت جاری رکھنا ہے۔ اغلب امکان اس بات کا ہے کہ وہ دونوں مفرور ادھر آس پاس ہی کہیں روپوش ہیں۔“

آفتاب نے استفسار کیا۔ ”ادھر بنگلے پر کون رکے گا؟“

”یہاں اب کسی کو پہرا دینے کی ضرورت نہیں۔“ ڈی ایس پی نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ”پہلی بات تو یہ کہ وہ دونوں پوری منصوبہ بندی کے ساتھ یہاں سے فرار ہوئے ہیں لہٰذا وہ دوبارہ ادھر کا رخ نہیں کریں گے۔ دوسری بات یہ کہ انہوں نے نادر شاہ کے ساتھ جو ”سلوک“ کیا ہے، اس کارنامے کے بعد وہ دونوں اس بنگلے کے اندر قدم رکھنے کی غلطی کبھی نہیں کریں گے چنانچہ اب یہاں کسی کو رکنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بات میں موجودہ حالات کی روشنی میں کہہ رہا ہوں۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔“

”اوکے سر......!“ آفتاب اور جاوید نے بہ یک زبان ہوکر کہا۔

میں سانس کو قابو میں رکھتے ہوئے غالیچے کے اندر لپٹا پوری توجہ سے ان کے بیچ ہونے والی گفتگو سن رہا تھا۔ یہ مالک کی مہربانی تھی کہ ان پولیس والوں کو وہاں میری موجودگی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ میں نادر شاہ کو عبرت ناک انجام سے دوچار کرنے کے بعد وہاں سے فرار ہوگیا ہوں اور آئندہ کبھی پلٹ کر ادھر نہیں آؤں گا اور یہ کہ میں نے بنگلے کے گارڈ کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے ارادہ ظاہر کیا تھا کہ صبح سے پہلے میں ان کی گرفت میں ہوں گا۔ انہیں اس بات کا بھی یقین تھا کہ میں ڈیفنس سوسائٹی ہی میں کہیں چھپا ہوا ہوں۔ میں مانتا ہوں کہ پولیس منطقی انداز میں سوچ رہی تھی اور ان کے بیشتر اندازے درست تھے لیکن میں نے ان کے ساتھ جو کچھ کرنے کا سوچ لیا تھا اس کے بعد ان کے چودہ طبق گل ہو جانا تھے۔ میں نے ان کی اور ان کے توسط سے ڈیلفی کی نیند اڑانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

جب وہ لوگ وہاں سے رخصت ہوگئے تو میں نے اطمینان کی سانس لی۔ جب تک دونوں گاڑیوں کے جانے کی آواز معدوم نہیں ہوئی، میں غالیچے کے اندر ہی رہا اور جب مجھے یقین ہوگیا کہ اس وقت میرے سوا بنگلے میں اور

نہیں اور پولیس والے اس بنگلے کو حالات کے رحم و کرم وڑ کر اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہوگئے ہیں...... تو غالیچے کے اندر سے باہر نکل آیا۔

میں نے غالیچے کے اندر رول ہونے سے پہلے خود کو طرح ایک چادر میں لپیٹ لیا تھا۔ اس احتیاط کا فائدہ یہ کہ میرا لباس گرد آلود ہونے سے بالکل محفوظ رہا تھا۔ میں باہر آتے ہی تازہ اور آزاد ہوا میں چند گہری سانسیں۔ اس کے بعد اپنے لباس پر مزید اسپرے کیا، گویا خود کو بو میں نہلا دیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ جرمن شیفرڈز مجھ سے دور گئے تھے لیکن عقل مندی کا تقاضا یہی تھا کہ میں اپنے بدن مخصوص بو کو فضا تک اس کی اصل شکل میں رسائی حاصل نہ نے دوں۔ جب تک یہ مخصوص بو خوشبویات کے حصار رہتی، وہ جرمن شیفرڈز مجھے تلاش نہیں کر سکتے تھے، ہے میں ان سے چند گز کے فاصلے پر موجود کیوں نہ ہوتا تھوڑی دیر پہلے اس امر کا عملی تجربہ ہو چکا تھا۔ وہ دونوں ٹائن پولیس ڈاگز پورے بنگلے میں مجھے سونگھتے پھر ہے تھے مگر ان کے حساس نتھنے مجھے تلاش کرنے میں ناکام ہے تھے۔ گویا ان کے توسط سے میں نے میڈم ڈیلفینا کا بجا دیا تھا۔ میں نے چشمِ تصور سے ڈیلفی کو پیچ و تاب کھاتے دیکھا، حالتِ شکست میں وہ اور بھی حسین دکھائی دے رہی تھی۔ بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

”آمور! تے آمو، تے بیسو......“

(جانِ من! مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔ میں تمہیں منا چاہتا ہوں)

ڈیلفینا ایسے ہی دلکش حسن کی مالک تھی کہ اس کا تصور سان کو بے خود کر دیتا تھا۔ آنکھ اس کی ہسپانوی رعنائی سے ر کر رہ جاتی تھی اور دل بے ساختہ پکار اٹھتا تھا...... آئی و بے بی!

میں نے ڈیلفینا کو بہت قریب سے دیکھا اور سانسوں کے نزدیک محسوس کیا تھا۔ پریسٹن ہالو والے بنگلے پر میں نے اس کے قیامت خیز جوبن اور مستی بھری ہوش ربا جوانی کی گفتنی اور ناگفتنی نظارے اپنی آنکھ کے کیمرے میں محفوظ کیے تھے۔ وہ چلتی پھرتی مدھوشالا تھی، دل و دماغ کو مدہوش کر دیتی تھی۔ وہ میرے اور قریب ہونا چاہتی تھی، میرے اندر اترنے کی خواہش مند تھی مگر میں نے اس کے ان ارمانوں پر اوس چھڑک دی تھی اور میں اس کے دماغ کی بوڑ اڑا کر پریسٹن ہالو والے بنگلے سے نکل آیا تھا۔ وہ جلتی رہ گئی تھی اور اب...... وہی ہسپانوی ساحرہ مجھے قابو

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ



رمضان کی بابرکت ساعتوں کا آغاز

جاسوسی کی دل لبھاتی کہانیوں کا اعتراز

اولین صفحات

حسن و عشق کے پیچ و خم...... دہشت و محبت کے سنسنی خیز رومانوی ملاپ کی داستان......

امجد رئیس کے قلم سے......

انگارے

دشمنوں کے شکنجے میں آہنی اعصاب کے مالک چیمپئن کا امتحان۔ محبت اور جنگ کی فضا میں آگے بڑھتا

طاہر جاوید مغل کے یادگار سلسلے کی ایک اور کڑی

آوارہ گرد

چلچلاتی دھوپ میں ہر دم ایک نئی مصیبت سے برسرِپیکار نوجوان کی سرگزشت......

عبدالرب بھٹی کی سلسلے وار کہانی

سرورق کے رنگ

نفرت کے بیچ کھو جانے والی محبت اور جرم کی کہانی......

رشتوں اور ناتوں کے ٹوٹنے اور بکھرنے کا احوال

چینی نکتہ چینی

آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کھتائیں

کرنے کے لیے یہاں کی پولیس کو اپنے اشاروں پر نچا رہی تھی اور مزے کی بات یہ تھی کہ کوئی اس کافر ادا، مجسم جفا... خوامخواہ خفا اسپینش دوشیزہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ ہر کوئی اپنے سے سینئر افسر کے حکم کی تعمیل میں لگا ہوا تھا اور خدمات کا یہ سلسلہ نیچے سے اوپر کافی دور تک دراز تھا۔

ڈیلفینا کی دلفریب ذات کے بارے میں یہ تمام تر خیالات ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں میرے ذہن سے گزرے۔ اگلے ہی لمحے میں نے پینا کو فون لگا دیا۔ کال ریسیو کرتے ہی اس نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''علی! تم کن چکروں میں پھنس گئے ہو۔ میں کب سے کیفے یوفوریا میں بیٹھی تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ تم ٹھیک تو ہونا......؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس کے استفسارات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم کیفے میں بیٹھی ہو تو فوراً سے پیشتر اٹھ کر کھڑی ہو جاؤ اور جہاں تک چکروں میں پھنسنے کی بات ہے تو جب سے میں تمہارے چکر میں پھنسا ہوں، دنیا جہاں کے باقی چکر مجھ سے پناہ مانگنے لگے ہیں......''

''علی! میں سیریس ہوں۔'' وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا۔ ''مذاق کے موڈ میں تو میں بھی نہیں ہوں۔''

''مجھے کچھ بتاؤ تو سہی کہ تمہیں وہاں سے نکلنے میں اتنی دیر کیوں لگ رہی ہے؟'' وہ تشویش بھرے لہجے میں بولی۔ ''میں تمہارے لیے بہت پریشان ہو رہی ہوں۔''

''کچھ سننے کے لیے تیار ہو تو بتاتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں بولو...... میں سن رہی ہوں۔''

''تم فوراً کیفے سے نکل کر اپنے اپارٹمنٹ پر جاؤ۔'' میں نے اسے اپنے ذہن میں موجود منصوبے سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''چار شاپنگ بیگز سے بھرا ہوا جو سفری بیگ میں نے بیڈ کے نیچے گھسا رکھا ہے اسے لے کر تم فوراً ائرپورٹ روانہ ہو جاؤ۔''

''مطلب یہ کہ صبح والا کام ابھی سرانجام دینا ہے؟'' وہ فوراً بات کی تہ میں پہنچ گئی۔

''یس!'' میں نے قطعی لہجے میں کہا۔ ''میں نے یہاں قیام کے دوران میں کافی اہم اور قیمتی معلومات حاصل کی ہیں۔ تفصیلات تمہیں ملاقات پر بتاؤں گا۔''

''میں اپنی گاڑی میں جاؤں؟'' اس نے پوچھا۔

''فی الحال اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''آدھی رات کو اس مقصد کے لیے رکشا ٹیکسی استعمال کرنا مناسب نہیں ہوگا اور یہ کام جتنا جلدی ممکن ہو جا... ہمارے حق میں بہتر ہے۔ ہمیں جرمن شیفرڈز والی ٹیم ک... تاثر دینا ہے کہ بنگلے پر ہنگامی کارروائی کرنے کے بعد... نے ائرپورٹ کا رخ کیا تھا اور نائٹ کوچ پر سوار ہو کر ک... سے باہر کہیں اڑ گیا ہوں۔ اگر معاملہ نائٹ کوچ تک م... رہا تو ڈیلفینا مجھے پاکستان کے دوسرے شہروں خصوصاً لا... اور اسلام آباد میں تلاش کرنے کی کوشش کرے گی لیکن ا... انہی اوقات میں کسی انٹرنیشنل فلائٹ کا ڈیپارچر ہوا تو... معاملہ الجھ کر رہ جائے گا اور میرا مطمح نظر بھی یہی ہے۔... جرمن شیفرڈز کو گمراہ کر کے ڈیلفینا کو ٹکڑی کے حوالے کے... کرنا چاہتا ہوں۔ بلیو پاسپورٹ کا حامل امریکی شہری... کے دو سو اٹھارہ ممالک میں سے ایک سو چوہتر ممالک... بغیر ویزا کے داخل ہو سکتا ہے۔ ڈیلفی کو میری سمت کا تعی... کرنے میں وقتی طور پر مشکل پیش آئے گی۔''

''میں تمہاری چال کو اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔'' ... پُراعتماد انداز میں بولی۔ ''میں کیفے سے نکل رہی ہوں......'' پھ... اس نے استفسار کیا۔ ''کیا تمہیں بھی بنگلے سے پک کرنا ہے؟''

''نہیں......'' میں نے قطعی لہجے میں کہا۔ ''ابھی یہاں پر میرا کام ختم نہیں ہوا۔''

''ایسا کون سا لمبا چوڑا کام شروع کر دیا ہے تم نے؟''

''ملاقات پر تمہیں تفصیلات سے آگاہ کروں گا۔'' میں نے سرسری لہجے میں کہا۔

''کام نمٹانے کے بعد تم سے کہاں ملاقات ہوگی؟'' اس نے پوچھا۔

''اسی ایریا میں کہیں مگر بنگلے پر نہیں۔'' میں نے گول مول جواب دیا۔ ''جب تمہارے پاس آخری شاپنگ بیگ باقی رہ جائے تو تم مجھے کال کرنا۔ تب میں تمہیں بتاؤں گا کہ میں اس وقت کہاں پر ہوں۔ آخری بیگ ہم دونوں مل کر ڈسپوز آف کریں گے۔ او کے؟''

وہ کوئی جرح کیے بغیر بولی۔ ''او کے!''

رات کے ابتدائی حصے میں، میں نے پینا کو جو منصو... بتایا تھا اس کے مطابق ایک جیسے فاصلے پر، چار مختلف... مقامات پر ایک ایک شاپنگ بیگ کو کھول کر رکھنا تھا۔ آخری یعنی چوتھا بیگ زمزمہ کے علاقے میں ماں کے بنگلے... قریب ہی کہیں رکھا جاتا۔ اس طرح سب سے پہلے جرمن شیفرڈز اسی بیگ سے فضا میں منتقل ہونے والی میرے بدن کی مخصوص بو کو سونگھنے کے بعد آگے بڑھتے۔ جب وہ اگلے مقام پر پہنچتے اور مجھے وہاں نہیں پاتے تو ان کے نتھنے حساس...

...ز کی طرح اردگرد کی فضا میں مجھے سرچ کرتے۔ اس ...بعد وہ دوسرے مقام کی جانب روانہ ہو جاتے۔ یہ ...لہ اسی طرح جاری رہتا حتیٰ کہ جرمن شیفرڈز میری تلاش ...ائرپورٹ پہنچ جاتے۔ تب ڈی ایس پی سکندر اس نتیجے ...پہنچتا کہ میں نائٹ کوچ پکڑ کر کراچی سے کسی دوسرے شہر ...طرف پرواز کر گیا ہوں یا جیسا کہ میں نے تھوڑی دیر ...کہا کہ اگر اس وقت کسی انٹرنیشنل فلائٹ کا ڈیپارچر ہوا تو ...میرے بارے میں یہی تاثر لیا جائے گا کہ میں پاکستان ...چھوڑ کر کسی اور ملک روانہ ہو گیا ہوں۔ کون سے ملک؟ ...سوال کا جواب مذکورہ فلائٹ کی منزل معلوم کے بعد ...حل کیا جا سکتا تھا اور اس فلائٹ کے مسافروں کی فہرست ...یہ بھی پتا چلایا جا سکتا تھا کہ ان میں اسد علی کا نام بھی ...ل ہے یا نہیں مگر یہ سب بعد کی باتیں تھیں۔

آپ جتنا بھی جامع منصوبہ کیوں نہ تیار کر لیں، اس ...میں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی ایسی خامی ضرور رہ جاتی ہے کہ اگر ...پکڑنے والے کی نظر میں آجائے تو آپ کا منصوبہ فیل ...ہو جاتا ہے۔ ویسے تو میں ڈیلفینا اور جرمن شیفرڈز کو گمراہ ...کرنے کے لیے جو ترکیب آزما رہا تھا اس کے اندر بھی ایک ...خامی موجود تھا۔ جب وہ ہوشیار کتے ڈیفنس سوسائٹی زمزمہ ...کے علاقے میں میرے جسم کی مخصوص بو پاتے تو عین ممکن تھا ...کہ وہ اس بو پر قناعت نہ کرتے بلکہ اس کے ماخذ تک پہنچنے کی ...کوشش کرتے اور بالآخر وہ میرے استعمال شدہ کپڑوں کو ...تلاش کر لیتے۔ اس وقت یہ تاثر قائم کیا جاتا کہ میں اپنے ...پہنے ہوئے کپڑوں کو یہاں پھینک کر آگے بڑھ گیا ہوں ...ان آگے کے دو تین مقام پر بھی اگر یہی ہسٹری دہرائی جاتی ...تو جرمن شیفرڈز کو آپریٹ کرنے والا ڈی ایس پی سکندر یہ ...سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ کہیں میں نے انہیں دھوکا دینے کے ...لیے تو یہ چال نہیں چلی؟ اس کی اس سوچ کو اس وقت تقویت ...ملتی جب نائٹ کوچ یا ان اوقات میں پرواز کرنے والے کسی ...بھی جہاز کے مسافروں کی فہرست میں میرا نام موجود نہ ہوتا۔

کامل ذات صرف مالک کی ہے جس کے منصوبے بے ...عیب اور ہر عیب سے پاک ہوتے ہیں۔ ویسے بھی زیادہ ...خوش فہمی کے خبط میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ کچھ کام مالک کے ...کرنے کے لیے بھی چھوڑ دینا چاہئیں ورنہ اپنی کاملیت کے ...زعم میں انسان کا مالک پر سے بھروسا اٹھ جاتا ہے اور ......اس کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔

اس بات کا امکان تو نہیں تھا کہ ڈی ایس پی سکندر ...جرمن شیفرڈز کے ساتھ جلد اس طرف آئے گا لیکن میں نے پھر بھی لگ بھگ دس منٹ تک ماں کے بیڈروم میں رک کر انتظار کیا اس کے بعد میں نے اس بیڈروم میں جھانکا جہاں نادرشاہ کو میں نے ایک سبق آموز تجربے سے گزارا تھا۔ بیڈروم کے شفاف فرش پر جابجا نادرشاہ کے گندے خون کو دیکھا جا سکتا تھا۔ میں نے ایک فرحت بخش سانس خارج کی اور ٹول کٹ میں سے اسٹیل کی ایک کیل اور ہتھوڑی نکال لی پھر میں کچن کی سمت بڑھ گیا۔

میرے ذہن میں جس آئیڈیا نے جڑ پکڑی تھی اس کا تعلق بنگلے کی رہائشی عمارت سے تھا لہٰذا مجھے جو بھی کرنا تھا، وہ بنگلے کے اندر رہتے ہوئے ہی کرنا تھا۔ میں نے کچن سے دو ماچس کی ڈبیاں اٹھا کر اپنی جیب میں ڈالیں اور گیراج کی جانب نکل آیا۔ ماں کا کارپورچ کشادہ اور ہوادار تھا۔ گیراج نما کمرا مذکورہ کارپورچ سے ملحقہ تھا۔ ماں کی لگژری کار ہنوز پورچ میں کھڑی تھی۔ نمک حرام نادرشاہ نے ابھی تک اس گاڑی کو ٹھکانے نہیں لگایا تھا۔ میں نے اس کار پر الوداعی نگاہ ڈالی اور گیراج کے اندر گھس گیا۔

مطلوبہ شے جلد ہی میری نگاہ میں آگئی۔ گیراج کی ایک دیوار کے ساتھ تین کین رکھے ہوئے تھے جن میں سے دو کین پیٹرول سے فل بھرے ہوئے تھے جبکہ تیسرے کین کے اندر تین چوتھائی پیٹرول موجود تھا۔ یہ وہ ایندھن تھا جو کسی ایمرجنسی یا پھر پیٹرول کی اسٹرائیک کے دنوں میں استعمال کیا جا سکتا تھا۔ میں نے ان کین کو بنگلے کے اندرونی حصے میں پہنچا دیا۔ کارپورچ کو خیرباد کہنے سے پہلے میں ایک کاریگری کرنا نہیں بھولا تھا۔ میں نے اسٹیل کی کیل اور ہتھوڑی کی مدد سے کار کے فیول ٹینک کو متعدد مقامات سے سوراخ دار بنا دیا تھا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ فیول ٹینک میں موجود پیٹرول ان سوراخوں سے خارج ہو کر پورچ کے فرش پر پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔

میں نے کچن کے ان حصوں پر پیٹرول چھڑک دیا جہاں لکڑی سے تیار ہونے والا میٹریل فکس تھا۔ اس کے بعد میں ڈرائنگ روم میں آیا اور تمام چوبی فرنیچر کو ایک دوسرے کے قریب پہنچا کر اس پر بھی پیٹرول کی برسات کر دی۔ یہی سلوک میں نے اپنے اور ماں کے بیڈروم کے ساتھ بھی کیا۔ الغرض، پندرہ بیس منٹ کے اندر میں نے بنگلے کے رہائشی حصے کی ہر چیز کو پیٹرول سے نہلا دیا۔ ایسی سیٹنگ بن گئی تھی کہ کسی بھی جگہ اگر ماچس کی ایک تیلی جلا کر پھینک دی جاتی تو فوراً آگ بھڑک اٹھتی اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے بنگلے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔

پیٹرول میں بسے ہوئے بنگلے کو ماچس دکھانے سے

پہلے مجھے ایک نہایت ہی اہم کام کرنا تھا کیونکہ آج کے بعد مجھے اس بنگلے میں قدم نہیں رکھنا تھا اور یہ ضروری کام اس بنگلے کے اندر رہتے ہوئے ہی کیا جا سکتا تھا۔

میں نے ہپ پاکٹ میں سے اپنا والٹ نکالا پھر والٹ کے اندر سے میں نے جنید خان کا وزیٹنگ کارڈ برآمد کیا اور ماں کے بیڈروم میں موجود لینڈ لائن والے ٹیلی فون سیٹ کی جانب بڑھ گیا۔

میں نے لینڈ لائن سیٹ سے جنید خان کے سیل فون پر کال کی۔ اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بجے تھے۔ دوسری گھنٹی پر اس نے میری کال ریسیو کر لی اور اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

''ہیلو......!''

''خان صاحب!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں آپ کا دوست اسد علی عرف یاسر بیگ بات کر رہا ہوں۔''

''تم اسد علی ہو یا یاسر بیگ، مجھے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' وہ برہمی سے بولا۔ ''میں تمہارے ساتھ سنجیدہ اور مخلص تھا مگر تم نے مجھے دھوکا دیا۔''

''میں نے آپ کو دھوکا نہیں دیا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میں تب بھی آپ کے ساتھ مخلص اور سنجیدہ تھا بلکہ اب بھی ہوں۔ میں نے جو کچھ بھی کیا، وہ میری وقتی مجبوری تھی۔ اگر زندگی نے وفا کی اور وقت نے موقع دیا تو میں اپنی پوزیشن ضرور کلیئر کروں گا۔ میری نظر میں آپ ایک سمجھدار، بردبار اور عظیم انسان ہیں۔''

''اس مسکا پالش کی کوئی ضرورت نہیں۔'' اس کی خفگی میں سرِمو کمی نہیں آئی تھی۔ ''میں تمہاری حقیقت سے واقف ہو چکا ہوں۔''

''میری حقیقت......'' میں نے اُلجھن زدہ انداز میں پوچھا۔ ''کیسی حقیقت؟''

''یہی کہ تم ایک خطرناک مجرم ہو۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ ''جو پولیس کو انتہائی مطلوب ہے اسی لیے وہ لوگ سراغ رساں کتوں کی مدد سے تمہیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔''

''سراغ رساں کتوں کے توسط سے میری تلاش والی بات صد فیصد درست ہے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''البتہ، مجھے خطرناک مجرم گرداننا سراسر زیادتی ہے۔''

''میں نے کہا نا، مجھے تمہاری ذات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' وہ رکھائی سے بولا۔

''لیکن مجھے آپ کی ذات سے گہری دلچسپی ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اسی لیے میں نے آپ کو اس وقت فون کیا ہے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' اس نے جھنجلاہٹ آمیز انداز میں استفسار کیا۔

''میں جو کچھ کہنے جا رہا ہوں، آپ اسے توجہ سے سنیے گا۔'' میں نے کہا۔ ''میری بات پر یقین کرنا یا نہ کرنا آپ کی صوابدید پر منحصر ہے۔''

''اب کہہ بھی چکو......'' اس کی برہمی بھری آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''زمزمہ، ڈیفنس سوسائٹی میں واقع ایک ہزار مربع گز پر تعمیر شدہ جس عالی شان بنگلے کو آپ نے آدھی قیمت پر خریدا ہے، میں اس وقت اس بنگلے کے اندر موجود ہوں اور اسی کی لینڈ لائن سے میں نے آپ کو فون کیا ہے۔'' میں نے گمبھیر انداز میں جنید خان کو بتانا شروع کیا۔ ''میں بنگلے میں اس لیے موجود ہوں کہ نادر شاہ کے ذریعے جس بیوہ مرحومہ خاتون سے آپ نے یہ بنگلا خریدا ہے، وہ میری ماں تھی میں سلمیٰ حیدر کا بیٹا اسد علی ہوں مگر میری مجبوری بلکہ بدقسمتی ہے کہ میں اس سچائی کو سرِدست ثابت نہیں کر سکتا......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''خان صاحب! نادر شاہ نے نمک حرامی کی عظیم الشان مثال قائم کرتے ہوئے سترہ سے بیس کروڑ کا بنگلا اپنے بھاری کمیشن کے لالچ میں محض دس کروڑ میں آپ کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ میں مانتا ہوں، اس ڈیل میں آپ کا زیادہ قصور نہیں ہے۔ آپ کی جگہ کوئی اور شخص ہوتا تو اس موقع سے وہ بھی بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا۔ اس تمام ترپس منظر میں میرے صرف دو دشمن ہیں اور میں ان دونوں دشمنوں کو نشانِ عبرت بنا کر ہی دم لوں گا۔''

''تم کن دو دشمنوں کا ذکر کر رہے ہو؟'' اس نے تشویش بھرے انداز میں پوچھا۔

''ایک نادر شاہ اور دوسرا یہ بنگلا......'' میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ بولا۔ ''میں کچھ نہیں سمجھا......؟''

''میرے پاس سمجھانے کا وقت نہیں ہے خان صاحب!'' میں نے سفاکی سے کہا۔ ''نادر شاہ میرا دشمن نمبر ون ہے۔ اس بدذات نے ایک ٹارگٹ کلر کو دو لاکھ روپے دے کر میری ماں کو قتل کروایا تھا۔ اس ذلیل شخص کو میں نے زندگی بھر کے لیے محتاج و اپاہج بنا کر اسپتال روانہ کر دیا ہے

اب اس بنگلے کی باری ہے۔ جس منحوس کے سبب میری ماں کو زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے۔ تازہ ترین صورت حال کی روشنی میں قانونی اعتبار سے یہ بنگلا آپ کی ملکیت ہے اس لیے آپ کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ فوراً سے پیشتر اس کی تباہی اور بربادی کا تماشا دیکھنے کے لیے یہاں تشریف لے آئیں۔ اگر آپ نے میری دعوتِ نظارہ کو مذاق سمجھا اور یہاں پہنچنے میں تاخیر کر دی تو پھر یہ مرقع حسن و جمال وہائٹ ہاؤس کھنڈر میں تبدیل ہو جائے گا......!''

میں نے کریڈل کو ٹیپ کر کے لائن کاٹی پھر ریسیور کو کریڈل کرنے کے بجائے ایک طرف پھینک دیا۔ اس کے بعد میں حرکت میں آ گیا۔ میں نے انکل سلطان کی زبان سے سن رکھا تھا...... ''حرکت میں برکت ہے۔'' میں بھی اپنے کام میں زیادہ سے زیادہ برکت ڈالنے میں مصروف ہو گیا۔

میرے پاؤں کے ساتھ جیسے بلیاں بندھ گئی تھیں۔ میں تیز رفتاری کے ساتھ بنگلے کے مختلف حصوں میں چکراتا پھر رہا تھا۔ سب سے پہلے میں نے ماں والے بیڈروم کو نظر بھر کر دیکھا پھر نذرِ آتش کر دیا۔ یہی حشر خون آلود بیڈروم کا بھی ہوا۔ اس کے بعد ڈرائنگ روم کی باری آئی، پھر کچن اور اس کے بعد لاؤنج...... سب سے آخر میں، میں نے کار پورچ کے فرش پر ماچس دکھائی اور بنگلے کے عقبی حصے کی جانب دوڑ لگا دی۔ جب میں عقبی دیوار کو پھلانگنے کے لیے اس کے اوپر چڑھا تو میں نے دیکھا، اس دوران میں تیزی سے بھڑکتی ہوئی آگ نے پورے بنگلے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

اسی لمحے میرے ذہن میں جی ایم سر کے یہ الفاظ تازہ ہو گئے۔ ''اگر سکھی رہنا چاہتے ہو تو مال و دولت اور زمین و جائداد کے جھمیلوں سے دور رہنا۔''

میں آگ کی خوف ناک لپٹوں میں گھرے ہوئے اس خوب صورت جھمیلے سے خود کو دور رکھنے کے لیے بیک اسٹریٹ میں کود گیا پھر میں نے تاریک گلی میں ایک جانب دوڑ لگا دی۔

☆☆☆

رات کا ڈیڑھ بجا تھا۔ زمزمہ والے بنگلے سے نکل کر مجھے مطلوبہ مقام تک پہنچنے میں مجھے کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ ایک رکشا والے کو منہ مانگا کرایہ دے کر میں چلا آیا تھا۔ بینا نے مجھے یہیں آنے کے لیے کہا تھا کیونکہ آخری ٹاسک بیگ کو ہم دونوں نے مل کر بنگلے کے قریب کہیں ٹھکانے لگانا تھا تاکہ سراغ رساں کتوں کی ''بے روزگاری'' کا خاتمہ ہو اور وہ بھی خیر سے، کسی کام پر لگ جائیں۔

ماں والے بنگلے پر آمد و شد عقبی دیوار کے توسط سے ہوئی تھی۔ میں نے یہ راستہ جمشید سے ہونے والی گفتگو کے نتیجے میں چنا تھا۔ رات کے ابتدائی حصے میں جمشید نے مجھے اطلاع دی تھی کہ نامراد نادر شاہ بنگلے پر رات گزارنے کے ارادے سے آیا تھا اور شب بسری کے لیے اس نے میرے والے بیڈروم کا انتخاب کیا تھا۔ یہ معلومات حاصل ہو جانے کے بعد ہی میں نے بنگلے کی عقبی دیوار پھلانگنے کا فیصلہ کیا تھا کیونکہ بنگلے کے عقبی حصے کو سی سی ٹی وی کیمراز کی آنکھ سے صرف ماں کے بیڈروم میں دیکھا جا سکتا تھا۔ نادر شاہ چونکہ ماں والے بیڈروم میں نہیں تھا اس لیے عقبی دیوار کے ساتھ کود پھاند کا عمل انتہائی محفوظ تھا۔

اس مشن کو حسبِ منشا پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے میں نے ایک رسک بھی کھیلا تھا۔ جمشید کی اطلاعات کے مطابق ماں کے سامنے والے بنگلے کی چھت پر اس نے چند افراد کی پراسرار سرگرمیاں دیکھی تھیں جس سے ہم نے یہی اندازہ قائم کیا تھا کہ ماں کے بنگلے کی کڑی نگرانی کی خاطر سامنے والے بنگلے کی چھت پر کوئی بندوبست کیا گیا تھا۔ ایسی صورت میں میرا عقبی دیوار پھلانگنا نگرانی کرنے والوں کی نگاہ میں آ سکتا تھا لیکن مالک کا شکر کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ میں نے بہ آسانی ماں کے بنگلے میں داخل ہو کر اپنا کام نمٹایا تھا اور بہ حفاظت وہاں سے نکل بھی آیا تھا۔ میری اس ہنگامی کارروائی نے ثابت کیا تھا کہ جمشید کو کوئی مغالطہ ہوا تھا، مذکورہ بنگلے کی چھت پر خفیہ نگرانی کے انتظامات نہیں کیے گئے تھے۔ اگر ایسا کچھ واقعی تھا تو رات کے اس حصے میں کم از کم وہ بندوبست مستعد اور موثر نہیں تھا ورنہ میرا وہاں سے نکلنا اتنا سہل ثابت نہ ہوتا......

مجھے اپنی ذات اور اپنے مالک پر پورا بھروسا تھا اس لیے میں نے کسی بھی خطرے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے وہ رسک کھیلا تھا۔

زندگی میں قدم قدم پر رسک لینا پڑتا ہے۔ سو میں نے بھی لیا اور کامیاب ہو گیا تھا۔ میں نے بینا کی ریڈ کلٹس میں انٹری دی تو گاڑی کو آگے بڑھاتے ہوئے اس نے مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

''تم عجیب آدمی ہو۔ بنگلے میں اتنی دیر کیا کرتے رہے؟ تمہیں ذرا بھی احساس ہے کہ میں تمہارے لیے کتنی پریشان تھی؟ کہاں رہ گئے تھے تم......؟''

''میں عجیب ضرور ہوں مگر غریب نہیں ہوں۔'' میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''نہ ہی

ذہنی طور پر اور نہ ہی مالی طور پر غریب...... بنگلے میں اتنی دیر میں جو کچھ کرتا رہا اور وہاں رہتے ہوئے مجھے جو گراں قدر معلومات حاصل ہوئی ہیں وہ میں تمہیں بھی بتاؤں گا۔ باقی جہاں تک میرے احساس اور تمہاری ذات کا معاملہ ہے تو میرے خیال میں اس وقت دنیا میں مجھ سے زیادہ اور کوئی تمہارا احساس کرنے والا موجود نہیں ہے۔ تمہاری پریشانی کو میں اپنی پریشانی سمجھتا ہوں۔''

میری اس وضاحت کے بعد وہ شانت ہوگئی۔ میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے نادر شاہ کے بھیانک انجام، ڈی ایس پی سکندر اور اس کے حاشیہ برداروں جاوید اور آفتاب کی سرگرمیوں، جرمن شیفرڈز کی لاحاصل پھرتیوں اور ماں کے بنگلے کی تباہی و بربادی کے بارے میں بتا دیا۔ اس نے توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر اس نے کہا۔

''علی! تم اتنے سفاک ہو......؟''

''نہیں......'' میں نے دو ٹوک انداز میں جواب دیا۔ ''میں نے جو کچھ کیا، وہ وقت اور حالات کا تقاضا تھا۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' وہ الجھن زدہ لہجے میں مستفسر ہوئی۔

میں نے بہ دستور گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''بھئی میں تو ہر بال کو اس کے میرٹ پر کھیل رہا ہوں۔''

''کرکٹ کا کھیل اور انسانی زندگی سے کھلواڑ، دو الگ چیزیں ہیں۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔

''میں تم سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔'' میں نے ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے خواب ناک لہجے میں کہا۔ ''میری ماں بھی ایک انسان تھی اور اس پلید شخص نادر شاہ نے ایک ٹارگٹ کلر کو دو لاکھ روپے دے کر میری ماں کی زندگی کا چراغ گل کرا دیا۔ پھر اس نے ماں کا بیس کروڑ مالیت کا بنگلا اپنے تگڑے کمیشن کے لالچ میں صرف دس کروڑ میں جنید خان کے ہاتھ فروخت کر دیا......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے پہلے نادر شاہ کی زبان سے اس کے تمام سنگین جرائم کا اقبال کروایا پھر اسے اور جنید خان کے بنگلے کو قرار واقعی سزا دی ہے۔ میں ظالم نہیں، منصف ہوں۔''

''میں تو صرف اتنا ہی کہوں گی۔'' وہ گردن کو نفی میں جھٹکتے ہوئے بولی۔ ''یو آر کریزی......''

''سی! ایستوئی لوکو۔'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''وہاٹ...... یہ اسپینش ہے؟'' بینا پلکیں جھپک کر رہ گئی۔

میں نے بتایا۔ ''ہاں! یہ ہسپانوی ہے۔''

''او کے!'' اس نے گردن کو اثباتی جنبش دی۔ [illegible] پوچھا۔ ''ان دو شاپنگ بیگز کا کیا کرنا ہے؟''

''دو بیگز......!'' میں نے چونک کر اس کی [illegible] دیکھا۔ ''کیا تم نے ابھی تک صرف دو بیگز ہی پلانٹ [illegible] اور دو بچا کر لے آئی ہو؟''

''نہیں۔ میں نے چھ بیگز مناسب مقامات [illegible] دیے ہیں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''ا[illegible] میرے پاس ہیں۔''

''مگر وہ تو کل چار بیگز تھے۔'' میں نے بے یقینی [illegible] اس کی طرف دیکھا۔ ''تم نے انہیں آٹھ کیسے بنا لیا [illegible] نے تو صرف چار تیار کیے تھے......؟''

''تم نے تو چار شاپنگ بیگز ہی تیار کیے تھے مگر میں [illegible] ایک فوری خیال کے تحت انہیں آٹھ بنا لیا تھا۔'' اس نے بتایا۔

میں نے پوچھا۔ ''اور وہ فوری خیال کیا تھا؟''

''تم نے جرمن شیفرڈز کی سونگھنے کی قوت کا [illegible] کرتے ہوئے مجھے بتایا تھا کہ وہ کھلی فضا میں ایک [illegible] ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے تک اپنے شکار کو ٹریس کرنے [illegible] صلاحیت رکھتے ہیں۔'' وہ بڑے مستحکم انداز میں بتانے لگی ''اسی پوائنٹ کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے ان [illegible] اعلیٰ نسب کی مشکل کو آسان کرنے کے ارادے سے [illegible] شاپنگ بیگ کے دو بیگ بنا لیے تھے۔ اس طرح ان بیگز [illegible] تعداد آٹھ ہوگئی۔ زمزمہ سے ائرپورٹ تک اچھا خاصا فاصلہ ہے۔ چار بیگز کی بہ نسبت آٹھ بیگز کے ذریعے انہیں [illegible] آسانی تمہارے بدن کی مخصوص بو کا سراغ ملتا رہے گا [illegible] اس طرح وہ کوئی تکلیف اٹھائے اور بغیر بھٹکے بہ سہولت [illegible] تمہاری تلاش میں ائرپورٹ پہنچ جائیں گے۔''

''ویل ڈن!'' میں نے سراہنے والے انداز میں [illegible] ''تم نے خوب ذہن لڑایا ہے۔ اسے کہتے ہیں، ذہانت [illegible]''

''یہ سب میں نے تمہاری دلاری کی خاطر کیا [illegible]'' وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔

میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''کون دلاری؟''

''بھئی وہی......'' وہ بے پروائی سے بولی۔ ''[illegible] قد بائیس سے چوبیس انچ کے بیچ اور وزن بائیس سے [illegible] کلوگرام کے درمیان ہے۔''

''تم مادہ جرمن شیفرڈ کی بات کر رہی ہو؟'' میں [illegible] بات کی تہ تک پہنچتے ہوئے کہا۔

''کوئی مادہ ہی تمہاری دلاری ہوسکتی ہے۔'' وہ [illegible]ت بھرے لہجے میں بولی۔

اس طرف آنے سے پہلے اپارٹمنٹ پر میں نے [illegible] شیفرڈز کے حوالے سے بینا کو الو بنا کر خوب تفریح لی [illegible]۔ وہ میری اسی حرکت کا بدلہ لے رہی تھی۔ میں نے اس [illegible] مذاق کا برا منائے بغیر گہری سنجیدگی سے کہا۔

''ارے...... یاد آیا۔ تم نے تو اس بات کی پیش گوئی [illegible] کر رکھی ہے۔ تم نے کہا تھا کہ بہت جلد وہ مادہ جرمن شیفرڈ [illegible] چاہنے والیوں میں شامل ہوجائے گی کیونکہ مجھے دیکھتے [illegible] اس کا اپنے نر جرمن شیفرڈ سے شدید نوعیت کا جھگڑا ہوجائے [illegible] اور وہ اسے چھوڑ کر میرے کیمپ میں آجائے گی۔''

''یہ تو وقت ہی بتائے گا......'' اس نے گول مول [illegible] کی۔

''بتانا تو سب کچھ وقت ہی نے ہے۔'' میں نے [illegible] یانہ انداز میں کہا۔ ''پچھلے ایک دو روز سے تم عجیب باتیں کر رہے ہو۔ [illegible] ی یاد آرہی ہے؟''

''سچ بتاؤں...... ہاں!''

وہ بھی گویا ضد پر اتر آئی تھی۔ ''شارو......؟''

میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

بینا ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔

یہ ایک حقیقت تھی کہ ان دنوں بڑی شدت سے شارو [illegible] یاد آرہی تھی اسی لیے گاہے بہ گاہے بے ساختہ میری [illegible] ان سے اسپینش کا کوئی لفظ یا جملہ نکل جاتا تھا۔ شارو کا [illegible] ق برازیل کے معروف شہر ریوڈی جینرو سے تھا اور [illegible] الوی یعنی اسپینش اس کی مادری زبان تھی۔

میں شارو کے خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ بینا کی آواز [illegible] مجھے چونکا دیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''تم نے بتایا تھا کہ لیونارڈو نامی کسی غنڈے نے [illegible] اری دوست شارو... کو اغوا کر کے کیوبا کے شہر ہوانا پہنچا [illegible] تھا۔''

''ہاں...... یہی حقیقت ہے۔'' میں نے دھیمے لہجے [illegible] جواب دیا۔

گفتگو میں میری عدم دلچسپی کو محسوس کر کے وہ خاموش ہوگئی۔

ڈیفنس موڑ سے اس کی گاڑی پر سوار ہوتے ہی میں [illegible] اپنے لباس پر حفظ ماتقدم کے طور پر مزید پرفیوم [illegible] سے کر لیا تھا۔ ایک مارکیٹ کے سگنل پر پہنچے تو میں نے [illegible] سے کہا۔

''اب جلد از جلد ان دو شاپنگ بیگز کو بھی ''ڈیلیور'' کر دیں تو بہتر ہوگا تاکہ جرمن شیفرڈز اپنے کام پر لگ جائیں۔''

''او کے!'' اس نے کہا اور سگنل سے گاڑی کو لیفٹ ٹرن دے کر ڈیفنس فیز ٹو کے اندر داخل کر دیا۔

آئندہ پندرہ منٹ میں ہم نے مذکورہ دونوں شاپنگ بیگز کو کھول کر کورنگی روڈ اور زمزمہ کے بیچ مناسب فاصلے پر رکھ دیا۔ اب جرمن شیفرڈز کو میری تلاش میں کسی دقت کا سامنا نہیں ہونا چاہیے تھا۔

بینا نے پوچھا۔ ''اب کیا پروگرام ہے۔ گھر چلنا ہے یا؟''

اس وقت ہم زمزمہ بلیوارڈ پر تھے۔ کیفے یوفوریا منڈے ٹو سیٹرڈے صبح دس بجے سے رات کے دو بجے تک کھلا رہتا تھا اور اس وقت دو بجنے میں آٹھ منٹ باقی تھے گویا ہم کیفے یوفوریا بھی نہیں جا سکتے تھے۔ بینا کے سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا۔

''میرا خیال ہے، واپس اپارٹمنٹ چلتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔

میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ جب سے میں نے اسے یہ بتایا تھا کہ شارو مجھے شدت سے یاد آرہی ہے، بینا بجھ سی گئی تھی۔ وہ میری باتوں کے جواب میں ''ہوں، ہاں'' سے کام لے رہی تھی۔ میں بینا کے اس رویے کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔ یہ اس کا فطری ردعمل تھا۔ وہ میرے پہلو میں بیٹھی تھی۔ وہ موقع ملتے ہی بڑی وارفتگی سے خود سپردگی کی منازل طے کرتے ہوئے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیتی تھی۔ اس کے بدن کی پُرجوش اور معنی خیز جنبشیں حواس کو معطل کر کے کیف و سرور کے نت نئے جہانوں کی سیر کراتی تھیں۔ میں اس کے قرب میں طبیعت سے شاد و آباد تھا۔ وہ میری تنہائی کا ایک انوکھا نشاط انگیز تجربہ تھی اور میں...... اسی بینا کو اپنی بغل میں بٹھا کر اس کے سامنے شارو کی یاد میں آہیں بھر رہا تھا۔

یہ ٹھیک ہے کہ میں نے بینا کے استفسار کے جواب میں کسی غلط بیانی سے کام نہیں لیا تھا مگر یہ بھی سچ ہے کہ میرے جواب سے اس کی دل آزاری ہوئی تھی۔ یہ تو اس کا ظرف تھا کہ وہ میری بات کو پی گئی تھی اور اس نے کوئی شدید قسم کا ری ایکشن نہیں دیا تھا۔

''جب تم بیگ اٹھانے اپارٹمنٹ پر گئی تھیں تو کیا لاتورتا اس وقت سوئی ہوئی تھی؟'' میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

میں نے اس کا دل بہلانے کی خاطر لاتورترا یعنی اس کی بینکر دوست نادیہ کا ذکر چھیڑا تھا۔ نادیہ نے محبت میں چوٹ کھائی تھی اس لیے میں نے اس کا نام ''لاتورترا'' رکھ دیا تھا یعنی ''دی ٹارچ''۔

''ہاں......وہ سو رہی تھی۔'' پینا نے بتایا۔

ادھر اس کی بات ختم ہوئی، ادھر فضا جرمن شیفرڈز کی للکار سے گونج اٹھی۔''بھوں......بھوں بھوں......''

پینا نے گھبراہٹ آمیز انداز میں کہا۔''علی! کتوں نے تمہیں پالیا ہے۔اب کیا ہوگا......؟''

''کچھ نہیں ہوگا۔'' اس کی تشویش کے جواب میں، میں نے اطمینان بھرے انداز میں کہا۔''مجھے پالینا کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ میں تو انسانوں کے بس میں نہیں آتا۔ یہ بے چارے تو کتے ہیں۔ اس جوڑی کے ہاتھ کیسے لگ سکتا ہوں۔تم گاڑی کو گلی میں موڑ کر روک لو۔''

پینا نے چشم زدن میں میری بات کی تعمیل کی اور الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

''تم نے گاڑی روکنے کو کیوں کہا۔ یہ بہت خطرناک ہوسکتا ہے۔ ہمیں فوراً یہاں سے دور نکل جانا چاہیے۔ کتوں کی آواز بہت قریب سے آرہی ہے۔''

''اسی لیے تو میں نے گاڑی روکنے کو کہا ہے۔'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔''تاکہ اپنی کارکردگی کو چیک کرسکوں۔ اگر جرمن شیفرڈز ہم سے زیادہ فاصلے پر ہوتے تو پھر یہاں رکنے کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔''

''تم آخر کرنا کیا چاہتے ہو؟'' اس کے لہجے سے فکرمندی جھلک رہی تھی۔

''میں نے کہا نا، اپنی کارکردگی کو چیک کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے گردن گھما کر زمزمہ بلیوارڈ پر نگاہ جما دی۔ ''میں نے ان کتوں سے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے جو چال چلی ہے، ابھی اس کا ٹیسٹ ہوجائے گا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق ان کتوں کی ''بھوں، بھوں'' ادھر زمزمہ بلیوارڈ پر ہی سے فضا میں منتقل ہورہی ہے۔ اگر وہ مجھے سونگھتے ہوئے اس طرف آرہے ہیں تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم انہیں دھوکا دینے میں کامیاب نہیں ہوسکے اور اگر جرمن شیفرڈز بردار بلیک ویگو زمزمہ بلیوارڈ پر سیدھی آگے نکل جاتی ہے تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ ہماری اسکیم کامیابی سے ہمکنار ہوگئی۔''

''تمہاری بات میری سمجھ میں آرہی ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔''لیکن خوامخواہ یہ رسک لینے کی کیا ضرورت ہے؟''

''کیا تمہیں ڈر لگ رہا ہے؟'' میں نے بدستور زمزمہ بلیوارڈ پر نگاہ رکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

اس دوران میں کتوں کی مخصوص ''بھوں بھوں'' یہی محسوس ہوتا تھا کہ بلیک ویگو چند سیکنڈ میں ہماری نظر کے سامنے ہوگی۔

پینا نے لمحے بھر کے لیے سوچا اور بڑے مضبوط لہجے میں بولی۔''نہیں!''

''گڈ......!'' میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر ... انداز میں کہا۔

وہ بولی۔''مگر میری نظر میں یہ بہادری نہیں بلکہ پاگل پن ہے۔''

''اور میں تو تمہیں بتا ہی چکا ہوں......'' میں نے ... سے لہجے میں کہا۔''ایستوئی لوکو!''

''اب میری یادداشت اتنی بھی خراب نہیں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔''اسپینش میں ''آئی ایم کریزی'' کو ''ایستوئی لوکو'' کہتے ہیں۔''

میرے کان اگرچہ پینا کی بات پر لگے ہوئے تھے لیکن آنکھ زمزمہ بلیوارڈ پر بلیک ویگو کی آمد کی منتظر تھی اور وہ مجھے دکھائی دے گئی۔ زمزمہ بلیوارڈ کا منظر پوری طرح مجھ پر عیاں تھا۔ ڈبل کیبن جیپ کی رفتار زیادہ نہیں تھی ... لوگ اس وقت میری سرچنگ پر لگے ہوئے تھے۔ گاڑی کی رفتار جتنی دھیمی ہوتی، ان کی کامیابی کے امکانات ... ہی بڑھ جاتے۔

میں نے بڑے واضح انداز میں دیکھا، جرمن شیفرڈز والی وہ بلیک ویگو زمزمہ بلیوارڈ پر ایک طرف سے نمودار ہوئی، پھر خراماں خراماں اسی بلیوارڈ پر وہ دوسری جانب بڑھ گئی۔ گویا اس سرچنگ جیپ نے اور اس پر سوار دو ... کے ... پولیس ڈاگز نے میری سمت دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا ... میں نے بہت کچھ دیکھ لیا تھا اور اس ''بہت کچھ'' میں سے اہم چیز تھی بلیک ویگو کی نمبر پلیٹ......!

ایک لمحے کے لیے گاڑی کی نمبر پلیٹ پر میری نظر پڑی تھی مگر وہ نمبر اتنا آسان تھا کہ پلک جھپکتے میں ... میموری میں محفوظ ہوگیا...... ٹیٹرا فائیو یعنی ڈبل فائیو ... فائیو۔ وہ ''تھری پوائنٹ فائیو۔او'' رائٹ ہینڈ ڈرائیو ... ہائی لکس جیپ تھی جس میں میری معلومات کے مطابق ... جوڑی جرمن شیفرڈز کے علاوہ ڈی ایس پی سکندر ... چیلے سب انسپکٹر جاوید کے ساتھ موجود تھا۔ اس کا دوسرا ...

چیلا زخمی نادر شاہ کو اسپتال پہنچانے گیا تھا۔ اس چیلے کا ... غائب تھا۔ میں ان تینوں افراد کا چہرہ شناس نہیں تھا۔ ... صرف ان کے ناموں سے واقف تھا اور ماں والے بنگلے ... نے ان تینوں پولیس والوں کو باتیں کرتا سنا تھا۔ ڈی ... ایس پی نے طلوع آفتاب سے پہلے مجھے پکڑنے کی قسم کھائی ... تھی۔ وقت نے ثابت کرنا تھا کہ کھائی ہوئی یہ قسم ڈی ایس پی سکندر کو ہضم ہوتی ہے یا نہیں۔

''مبارک ہو علی!'' پینا کی سرسراتی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔''ہماری اسکیم ہر لحاظ سے موثر رہی ہے۔''

''مجھے اس اسکیم کی کامیابی کا پورا یقین تھا۔'' میں نے کہا۔

''مطمئن تو میں بھی تھی لیکن ڈر بھی لگ رہا تھا۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا، تمہارا اطمینان کامل نہیں تھا۔'' ... ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ گاڑی کو حرکت میں لاتے ہوئے بولی۔''تم کہہ ... رہے ہو۔''

''میں صرف زبانی کلامی نہیں کہہ رہا بلکہ یہ حقیقت ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔''واپسی کے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے گاڑی کو ماں کے بنگلے کے سامنے سے گزارنا۔ میں اس وہائٹ ہاؤس کی تباہی و بربادی کا آخری عبرتناک دیدار کرنا چاہتا ہوں۔''

''اوکے!'' وہ ریڈ کلٹس کو زمزمہ بلیوارڈ پر لاتے ہوئے بولی۔

تھوڑی ہی دیر میں ہم ماں کے بنگلے کے سامنے پہنچ گئے۔ میں نے بنگلے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''وہ ......!''

''جلا گھر کسی کا......'' وہ میرے الفاظ کو بڑی مہارت سے ... کرتے ہوئے بولی۔''یہ ٹوٹے ہیں کس کے ستارے......''

''تم نے جو کہنا تھا وہ کہہ لیا۔ اب میری بھی سنو۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔''پہلی بات تو یہ کہ یہ جنید ... کا گھر جلا ہے لہٰذا یہ ستارے بھی اسی کے ٹوٹے ہوں ... دوسری بات یہ کہ یہ قسمت بھی جنید خان ہی کی اس ... پر ہنس رہی ہے اور غم کے مارے رونا بھی جنید خان ... ہے مگر......'' میں نے آس پاس نگاہ دوڑاتے ہوئے ... الفاظ میں اضافہ کیا۔''وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا......''

''ہوسکتا ہے، جنید خان نے تمہاری فراہم کردہ اطلاع کو مذاق سمجھا ہو؟'' پینا نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔''اس لیے اس نے ادھر کا رخ نہیں کیا۔''

''ہاں، ایسا ہوسکتا ہے۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔''میری بات کو مذاق میں اڑانا اسے خاصا مہنگا پڑے گا۔ جب وہ اس آتش زدہ کھنڈر کو دیکھے گا تو وہ تمہارے بیان کردہ گانے کی عملی تفسیر بن جائے گا۔''

ہماری گاڑی متاثرہ بنگلے سے تھوڑے فاصلے پر کھڑی تھی اور ہم نے گاڑی میں سے باہر آنے کی غلطی نہیں کی تھی۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا کہ آس پڑوس کو کوئی خبر ہی نہ ہوتی۔ ماں کے بنگلے کے اردگرد موجود بنگلوں میں سے نصف درجن کے قریب افراد باہر نکل چکے تھے اور ''وہائٹ ہاؤس'' کی بربادی کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ وہاں کچھ بھی نہیں بچا تھا جسے بچانے کی کوشش کی جاتی۔ وہ دلکش بنگلا بڑی تیزی سے راکھ کے ڈھیر میں بدل رہا تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ کسی پڑوسی نے فائر بریگیڈ والوں کو ضرور اس سانحے کی اطلاع دے دی ہوگی لیکن میں جانتا تھا کہ فائر بریگیڈ والوں کی کوئی کوشش کامیابی سے ہمکنار ہونے والی نہیں تھی۔ وہ سوختہ بنگلے پر پانی کی برسات کرکے محض اتنا کرسکتے تھے کہ اس کی راکھ کو اڑنے سے روک دیتے۔ گویا اگلے چند لمحات میں اس بنگلے کی چتا کی راکھ فائر بریگیڈ جل میں بہنے والی تھی......!

میں ایسا سوچ ہی رہا تھا کہ فضا فائر بریگیڈ کی مخصوص آواز سے گونج اٹھی۔ میں نے پینا سے کہا۔''کھیل ختم، پیسا ہضم۔ گاڑی آگے بڑھاؤ۔''

اس نے فوراً میری فرمائش پوری کردی۔

ارادہ یہی تھا کہ پینا والے اپارٹمنٹ کا رخ کریں گے لیکن واپسی کا سفر ابھی ابتدائی مرحلے ہی میں تھا کہ میرے سیل فون پر تھرتھراہٹ ابھری۔ یہ نہایت ہی مختصر سی تھرتھراہٹ تھی جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ کسی نے مس کال دی تھی۔ آپوں آپ میرا دھیان جمشید کی طرف چلا گیا۔

اس وقت رات یعنی صبح کے سوا دو بجے تھے۔ یہ اتوار تیرہ جولائی کی صبح تھی۔ یہ وقت کے شمار کے لحاظ سے صبح تھی مگر عملی صبح تو اسی وقت ہوتی جب سورج چاچا اپنی شکل دکھاتے۔

میں نے اپنی جیب میں سے سیل فون نکال کر چیک کیا تو میرا اندازہ درست نکلا۔ وہ مس کال جمشید ہی نے کی تھی۔ میں نے فوراً اس سے رابطہ کیا۔

پہلی گھنٹی پر اس نے کال ریسیو کرلی اور اضطرابی لہجے میں بولا۔''سر! آپ کیسے ہیں؟''

''میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔''تم سناؤ؟''

''سر! آپ نے کہا تھا کہ رات میں کسی وقت آپ مجھے فون کریں گے اور بتائیں گے کہ آگے مجھے کیا کرنا

ہے۔'' جمشید نے کہا۔ ''جب آپ کی طرف سے رابطہ نہیں ہوا تو میں نے آپ کو مس کال کی ہے۔''

''ٹھیک کیا تم نے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''آگے کا پروگرام یہ ہے کہ تمہیں پہلی فرصت میں اپنے گاؤں روانہ ہونا ہے۔ وہاں پہنچ کر تمہیں ایک نئی سم خریدنا ہے اور اپنا نیا نمبر مجھے بھیج دینا ہے اور ...... کراچی سے مظفرآباد تک کے سفر کے دوران میں تمہیں اپنا سیل فون آف رکھنا ہے۔''

''یہ سب ہوجائے گا سر۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''میں سحری وغیرہ سے فارغ ہوکر روانگی کی تیاری کرتا ہوں لیکن......''

اس نے جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے پوچھا۔ ''لیکن کیا؟''

''سر! میں روانگی سے پہلے آپ سے ایک ملاقات کرنا چاہتا ہوں......'' اس نے منت ریز انداز میں کہا۔

''تم اس وقت کہاں ہو؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے بتایا۔ ''اپنے دوست غلام عباس کے کوارٹر میں ہوں...... ریلوے کالونی میں۔''

''ہولڈ کرو......'' میں نے جمشید سے کہا پھر بینا سے پوچھا۔ ''اگر ہم ریلوے کالونی کی طرف جانا چاہیں تو ہمیں کتنا وقت لگے گا؟''

''دس سے پندرہ منٹ۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے جمشید سے کہا۔ ''میں ریلوے کالونی میں تو نہیں آسکتا اور نہ ہی تمہیں کہیں بلانے کے بارے میں سوچ سکتا ہوں۔ تم یہ بتاؤ، کیا تمہارے گھر کے نزدیک کوئی ایسی محفوظ جگہ ہے جہاں ہم چند منٹ کے لیے مل سکیں؟''

''جی بالکل۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''تم دس منٹ میں مطلوبہ مقام پر پہنچو۔ میں وہیں آرہا ہوں۔''

''اوکے سر! میں آرہا ہوں۔''

''تم پہلے وہاں پہنچو یا میں، ہر دو صورت میں تمہیں ریڈ کلٹس کے اندر آکر بیٹھنا ہے۔'' میں نے تاکیدی انداز میں کہا۔ ''میں اسی میڈم بینا کے ساتھ ہوں جس نے تمہیں بنگلے سے پک کیا تھا۔ ہم میں سے کوئی گاڑی سے باہر نہیں نکلے گا۔ سمجھ گئے نا......؟''

''سمجھ گیا سر۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ بینا کی گاڑی کے اندر موجود تھا۔

اس کے پاس پوچھنے کے لیے متعدد سوالات تھے جن کا تعلق میری ذات کے علاوہ حالاتِ حاضرہ سے تھا لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں اس کی تشفی کے لیے کسی تفصیل میں جاتا۔ میں نے اسے اپنے بارے میں [illegible] بتانے کے بعد بنگلے اور نادر شاہ کے ساتھ کیے گئے [illegible] ''سلوک'' کے حوالے سے بھی آگاہی دی۔ میری ہنگا[illegible] کارکردگی نے جمشید کو بہت متاثر کیا۔ اس کا چہرہ خوشی [illegible] تمتما اٹھا، جوش بھرے انداز میں بولا۔

''سر! آپ نے اس کمینے کے ساتھ بہت اچھا کیا [illegible] بلکہ میرے خیال میں نادر شاہ اس سے کہیں زیادہ بُر[illegible] سلوک کا مستحق تھا۔''

میرے پاس وقت بہت کم تھا اس لیے میں [illegible] نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں جمشید کو ضروری ہدایا[illegible] دیں کہ اپنے گاؤں پہنچ کر اسے کس نوعیت کی احتیاطی تدا[illegible] اختیار کرنا ہوں گی۔ میں اس سے ایک ضروری بات پوچھ[illegible] نہیں بھولا تھا۔

''میں نے تمہیں جو رقم دی تھی اس کا کیا ہوا؟'' [illegible] نے پوچھا۔ ''کیا وہ تمہارے پاس ہی ہے؟''

ماں کے قتل کے بعد جب میں نے واپس جانے [illegible] فیصلہ کیا تھا تو میں نے ماں کے دونوں خدمت گاروں [illegible] جمشید اور خانساماں محمد حسین عرف بنگالی بابو کو دس دس لا[illegible] روپے بہ طور انعام دیے تھے تاکہ ان کی فیملی کا مستقبل محفو[illegible] ہوجائے۔ میں نے جمشید سے دس لاکھ کی اسی رقم کے بار[illegible] میں استفسار کیا تھا۔

''سر! میں نے تو اگلے روز ہی وہ رقم گل داد کو بھیج دی تھی۔'' اس نے بتایا۔

گل داد جمشید کا بڑا بھائی تھا جو ادھر گوجر[illegible] (مظفرآباد) کے ایک گاؤں میں کھیتی باڑی کرتا تھا۔ آج [illegible] ہوتے ہی جمشید کو بھی اپنے گاؤں روانہ ہوجانا تھا۔ جمشید [illegible] جواب سے میں مطمئن نہیں ہوا تھا۔

''تم نے کس ذریعے سے اتنی بڑی رقم اپنے بھائی [illegible] بھیجی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''حوالے سے۔'' اس نے بتایا۔ ''میں ایک ا[illegible] بندے کو جانتا ہوں جو کراچی سے پورے پاکستان میں [illegible] بھی جگہ رقم منتقل کرنے کا کام کرتا ہے لیکن وہ کسی اجنبی کو [illegible] سروس فراہم نہیں کرتا۔ آج کل رقم کی منتقلی کے حوالے [illegible] کافی سختی ہے ورنہ پہلے تو یہ کام بہت عام ہوا کرتا تھا۔''

''اوکے......!'' میں نے سر کو اثباتی جنبش د[illegible] ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ''کیا تم نے اس بات کی تصدیق کرلی ہے کہ وہ رقم گل داد تک پہنچ گئی ہے؟''

''جی سر۔'' وہ مطمئن انداز میں بولا۔ ''اسی روز گل [illegible] سے میری بات ہوئی تھی۔ اس نے رقم وصول کرلی ہے۔''

اس کے جواب سے میری تسلی ہوگئی۔

بوقتِ رخصت وہ خاصا جذباتی ہوگیا، بھرائی ہوئی [illegible] میں بولا۔ ''سر! میں آپ کو بہت مس کروں گا۔ وعدہ [illegible]یں کہ جلد ہی ہماری ملاقات ہوگی۔''

''انشاءاللہ......!'' میں نے کہا۔

میں جمشید کو رخصت کرنے کے لیے گاڑی سے باہر آگیا [illegible] میں نے اسے سینے سے لگالیا پھر اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے [illegible] کیا۔ ''اگر زندگی نے وفا کی تو بہت جلد ہم دوبارہ ملیں گے [illegible] بیٹھ کر ڈھیروں باتیں کریں گے۔''

''میں ان انمول لمحات کا انتظار کروں گا سر۔'' اس [illegible] مخلوص جذبات سے بھینچتے ہوئے گلوگیر آواز میں کہا۔ [illegible]شاءاللہ عنقریب ہماری ملاقات ہوگی۔''

میں نے اس سے الوداعی مصافحہ کیا پھر بینا کے پہلو [illegible] پسنجر سیٹ پر آبیٹھا۔ بینا نے گاڑی آگے بڑھادی۔

☆☆☆

جب ہم اپارٹمنٹ پہنچے تو وقت تین سے چند منٹ [illegible] بڑھ چکا تھا۔ جب ہم یہاں سے رخصت ہوئے تھے [illegible] نادیہ اپنے بیڈروم میں سو رہی تھی لہٰذا اس کے اطمینان اور [illegible] کے لیے ہم نے سٹنگ روم کی ٹیبل پر ایک پرچہ چھوڑ دیا [illegible] میں نے بولڈ مارکر کی مدد سے اس پرچے پر لکھا تھا۔ ''ہم [illegible]خوری کے لیے سمندر کی طرف جارہے ہیں اور جلدی [illegible] آئیں گے۔ بفرضِ محال اگر ہماری واپسی میں دیر [illegible] تو فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔''

ہم رات گیارہ بجے اپارٹمنٹ سے نکلے تھے اور [illegible] بینا ''شاپنگ بیگز'' اٹھانے کے لیے بعد میں اپارٹمنٹ [illegible]، تب بھی نادیہ سو رہی تھی لیکن اب کی بار وہ ہمیں جاگتی [illegible] ملی۔ وہ کچن میں مصروف تھی۔ ہمیں اپارٹمنٹ میں [illegible] ہوتے دیکھا تو معنی خیز انداز میں بولی۔

''آپ لوگوں کی ہواخوری کچھ زیادہ ہی طویل نہیں [illegible]......''

واپسی کے سفر میں میرے اور بینا کے بیچ طے ہوگیا تھا [illegible] اگر نادیہ ہمیں جاگی ہوئی ملی تو اسے کیسے مطمئن کرنا ہے۔ [illegible] سٹنگ روم میں بیٹھ چکے تو میں نے نادیہ کے ذومعنی [illegible]سار کے جواب میں کہا۔

''ہواخوری کبھی اتنی طوالت نہ کھینچتی اگر بینا نے گڑبڑ [illegible] ہوتی۔''

''یہ تو ہے ہی گڑبڑ گوٹالا......!'' نادیہ کی معنی خیزی میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔

''میں نے کون سی گڑبڑ کی ہے؟'' بینا بگڑ کر بولی۔

بینا نے یقیناً یہ سوال مجھ سے کیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، نادیہ نے صورتِ حال کو ہائی جیک کرلیا۔ میری طرف دیکھتے ہوئے وہ چمک کر بولی۔

''علی! الزام لگایا ہے تو اب دو جواب......!''

''میں نے کوئی الزام نہیں لگایا۔'' میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ''جو حقیقت ہے وہی بیان کی ہے۔''

''تو پھر اس بیان کردہ حقیقت کی وضاحت بھی کردو۔'' نادیہ اپنے کام میں مصروف رہتے ہوئے مجھ سے مخاطب تھی۔ ''تاکہ ہماری گڑبڑ گوٹالا کو معلوم ہو کہ اس نے کون سی گڑبڑ کر ڈالی ہے۔''

اس امر میں کسی شک وشبے کی گنجائش تلاش نہیں کی جاسکتی تھی کہ نادیہ اس وقت سحری کا اہتمام کررہی تھی۔ میں نے اس کی فرمائش پوری کرتے ہوئے اسی سے پوچھ لیا۔

''نادیہ! تم ہی بتاؤ...... اگر قدیر صاحب کا لڑکا محلے میں کسی قسم کی کوئی گڑبڑ پھیلائے گا تو لوگ کس سے شکایت کریں گے؟''

''ظاہر ہے، قدیر صاحب سے۔'' نادیہ نے جواب دیا۔

''یہ کھٹارا ریڈ کلٹس کس کی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بینا کی!'' نادیہ جھٹ سے بولی۔

''اگر ریڈ کلٹس میں کوئی گڑبڑ ہوگی تو اس کی ذمے داری کس کے سر جائے گی؟''

''ظاہر ہے...... بینا کے سر۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''بس تو پھر نتیجہ یہ نکلا کہ ہماری ہواخوری کے طویل ہونے میں بینا کا ہاتھ ہے۔'' میں نے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''نہ اس کی ریڈ کلٹس دغا دیتی، نہ ہمیں واپسی میں اتنی دیر ہوتی۔''

''تم نے تو مجھے بتایا تھا کہ گاڑی کی کنڈیشن تسلی بخش نہیں ہے۔'' نادیہ نے شکایتی نظر سے بینا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تم اسے کسی مکینک کی ورکشاپ میں جمع کرانے کا ارادہ رکھتی تھیں۔ اسی وجہ سے تو میں نے ائرپورٹ جانے کے لیے وہائٹ کیپ منگوائی ہے۔ پھر تم اس ناقابلِ بھروسا گاڑی کو لے کر آدھی رات کے بعد کہاں چلی گئی تھیں؟''

''ہمارا ارادہ محض ساحل تک جانے کا تھا تاکہ تازہ ہوا میں تھوڑی چہل قدمی کرسکیں۔'' بینا نے اپنی پوزیشن کلیئر کرتے ہوئے کہا۔ ''پھر ہم شارع فیصل کی طرف نکل گئے

اور ہماری قسمت خراب کہ کارساز کے نزدیک گاڑی اچانک بند ہوگئی۔''

''گاڑی کی خرابی کو قسمت کی خرابی کے ساتھ نتھی نہ کرو بینا!'' وہ سرزنش کرنے والے انداز میں بولی۔ ''تم سے جو غلطی ہوئی اسے تسلیم کرلو۔''

''میں کب کہہ رہی ہوں کہ مجھ سے غلطی نہیں ہوئی۔'' بینا بیک فٹ پر جاتے ہوئے بولی۔ ''واقعی، مجھے احتیاط سے کام لینا چاہیے تھا۔ وہ تو خدا کا شکر کہ ہمیں موبائل مکینک مل گیا اور اس نے کلسٹس کو اس قابل کردیا کہ ہم بحفاظت گھر آگئے۔''

''واقعی......!'' نادیہ نے بینا کی وضاحت کے جواب میں کہا۔ ''یہ موبائل مکینک سروس رات میں شارع فیصل پر سفر کرنے والے مسافروں کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں۔''

''تم لوگ گپ شپ کرو۔'' میں نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تو نیند آرہی ہے۔ میں آرام کروں گا...... ہم تو ہواخوری کے لیے نکلے تھے، ہواخواری کرکے واپس آئے ہیں۔''

بات کے اختتام پر میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا تو بینا نے کہا۔ ''نادیہ آج اسلام آباد جارہی ہے۔ کیا اسے سی آف نہیں کروگے؟''

''ضرور کروں گا۔'' میں نے کہا۔ ''نادیہ کے نکلنے میں ابھی کم ازکم تین گھنٹے باقی ہیں۔ جب تک میں نیند کا ایک چھوٹا سا سیٹ لگالوں گا۔ تم چھ بجے تک مجھے جگادینا۔''

''اوکے......تم آرام کرو۔'' بینا نے کہا۔

''اگر تم سونا چاہتے ہو تو آرام سے بھرپور نیند لو۔'' نادیہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں بینا کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ تم چاہو تو ابھی مجھے ''اللہ حافظ'' کہہ دو اور ہاں...... اگر کبھی اسلام آباد آنا ہو تو میری طرف ضرور چکر لگانا۔ تمہارے ساتھ اچھا وقت گزرا ہے۔ دوبارہ ملاقات پر مجھے خوشی ہوگی۔''

بینا نے چونک کر باری باری ہم دونوں کو دیکھا۔ اس کی نگاہ میں درجنوں تشویش ناک سوال تھے تاہم وہ ان استفسارات کو زبان پر لائے بغیر بولی۔

''ہاں ہاں...... کیوں نہیں۔ میں خود علی کو لے کر تمہارے پاس اسلام آباد آؤں گی۔'' پھر وہ مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ''تم بے فکر ہوکر سوجاؤ۔ میں ساڑھے چھ بجے تمہیں جگادوں گی۔ نادیہ لگ بھگ سات بجے گھر سے نکلے گی۔''

میں نے کوئی بحث جرح مناسب نہ سمجھی اور سٹنگ روم سے اٹھ کر بیڈروم میں آگیا۔

میں نے نادیہ سے غلط نہیں کہا تھا۔ ان لمحات میں مجھے نیند آرہی تھی اور بدن بھی تھکن سے چُور تھا۔ پچھلے تین گھنٹے بڑی سنسنی خیز مصروفیت میں گزرے تھے۔ نادرشاہ عبرت ناک ''درس'' دینے سے میرے دل ودماغ کو سکون ملا تھا۔ اگرچہ یہ اس درد کا مداوا نہیں تھا جو نادرشاہ کمینگی نے مجھے دیا تھا۔ ماں کی ابدی جدائی کے زخم کو کوئی شے بھر نہیں سکتی تھی۔ انہی خیالات کے ساتھ میں بھرپور شاور لینے کی غرض سے واش روم میں گھس گیا۔

نادرشاہ کو قرار واقعی سزا دینے کے دوران میرے بدن نے بے تحاشا پسینا اگلا تھا۔ بعدازاں جب نے ماں والے بیڈروم میں خود کو چھ بائی دس فٹ کے قا میں رول کرکے چھپالیا تھا تو اس پوزیشن نے بھی میر لباس کا ستیاناس مار دیا تھا لہٰذا ایک تسلی بخش شاور ضروری ہوگیا تھا۔

میں نے جی بھر کر غسل کیا۔ پہلے پانی سے، اس بعد باڈی اسپرے سے خود کو نہلایا اور صاف لباس پہن واش روم سے باہر نکل آیا۔ جب میں نے بیڈروم میں قد رکھا تو بینا وہاں پہلے سے موجود تھی۔ جس دوران میں، اپنے لباس کو اوڈی کولون سے معطر کرتا رہا، بینا چپ چا میرا تماشا دیکھتی رہی۔ میں جیسے ہی فارغ ہوا، اس نے کہا

''علی! تم واقعی سونا چاہتے ہو یا نادیہ کے سا نے کوئی ناٹک کیا ہے؟''

''ناٹک......!'' میں نے چونک کر اس کی طر دیکھا۔ ''مجھے بھلا کسی ناٹک کی کیا ضرورت ہے۔ تم کیوں کہہ رہی ہو؟''

''ارے...... میں تو مذاق کررہی تھی۔'' وہ بڑے آویز انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔ ''تم تو سیر ہوگئے۔''

''یہ کس قسم کا مذاق تھا؟'' میں نے سوالیہ نظر سے کی جانب دیکھا۔

''مذاق تو بس مذاق ہوتا ہے۔'' وہ پراسرار اند میں بولی۔ ''اس کی قسمیں کہاں ہوتی ہیں۔''

میں بیڈ پر دراز ہوگیا اور کہا۔ ''بینا! تم نادیہ کے ساتھ گپ شپ کررہی تھیں۔ پھر ادھر کیوں چلی آگئیں۔ وہ تمہاری دوست ہے۔ دو تین گھنٹے کے بعد وہ تم سے جدا ہونے وال ہے۔ تمہیں چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ وقت اسے دو۔''

''وہ دوست تو میری ہے......'' وہ ایک ٹھنڈی سا

خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''لیکن تمہارے ساتھ گزارے ہوئے لمحات اس کے لیے کسی یادگار کی حیثیت رکھتے ہیں...... نہ صرف یادگار کی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ وہ تم سے جلدازجلد ملاقات کی امید بھی لگائے بیٹھی ہے۔ ایسا کرتے ہیں......'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ٹٹولنے والی نگاہ سے مجھے دیکھا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''ہم بھی اس کے ساتھ ہی اسلام آباد چلتے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

''میں اپنا خیال تو بعد میں ظاہر کروں گا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''پہلے یہ بتادوں کہ تمہارا خیال خاصا واہیات ہے۔''

''اگر میرا خیال واہیات ہے تو تم اپنے زریں خیال کا اظہار کرو۔'' وہ شرارت بھری نظر سے مجھے گھورتے ہوئے بولی۔

میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے چڑانے کے لیے اس نوعیت کی چھیڑ چھاڑ کررہی تھی۔ میں نے بھی جواباً یہی حربہ آزمایا اور پوچھا۔

''یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے؟''

وہ بگڑ کر بولی۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''تمہیں تو اسپینش کیمپ سے سارے ایشوز تھے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''تمہاری یہ دوست تو لوکل ہے۔ میں نے مذاق میں اس کا نام ''لاتورترا'' رکھ دیا ہے تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ نادیہ بھی اسپینش ہوگئی ہے......؟''

''تم کیا سمجھتے ہو، میں نادیہ سے جیلس ہورہی ہوں؟''

''بات میرے سمجھنے یا تمہارے نہ سمجھنے کی نہیں ہے بینا۔'' میں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے پچھلی رات کچھ وقت نادیہ کے ساتھ کیا گزار لیا کہ تم اس بات کو لے کر طعنہ دے رہی ہو۔''

''میں نے کوئی طعنہ نہیں دیا۔ لگتا ہے، نشیب میں پانی بھر رہا ہے۔'' وہ صاف مکرتے ہوئے بولی۔ ''میں نے تو نادیہ کے الفاظ کا حوالہ دیا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے اس نے تم سے کہا نہیں تھا کہ...... تمہارے ساتھ اچھا وقت گزرا ہے...... دوبارہ ملاقات پر مجھے خوشی ہوگی۔''

''بالکل اس نے یہی کہا تھا۔'' میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''اور اس نے یہ الفاظ اسی مختصر سی سٹنگ کے حوالے سے کہے تھے جو ایک رات پہلے اس اپارٹمنٹ کی گیلری میں میرے اور نادیہ کے بیچ میں ہوئی تھی۔''

''اب مجھے کیا معلوم کہ اس سٹنگ میں تم دونوں میں کون کون سے رازونیاز ہوئے تھے......'' وہ بڑی ادا سے بولی۔

میں اس کی ایک ایک ادا کو سمجھ رہا تھا لیکن اس وقت کوئی طویل بحث چھیڑنے کا موقع نہیں تھا لہٰذا بات ختم کرنے والے انداز میں، میں نے کہہ دیا۔

''یہ بھی اچھا ہے کہ تمہیں کچھ معلوم نہیں ورنہ......!''

میرا یہ جملہ اس کے اندر کھلبلی مچانے کے لیے کافی تھا اور اس کے بے بنیاد شک کو مہمیز کرکے ایک مضبوط فاؤنڈیشن فراہم کرتا تھا۔ میں نے اس کے بڑی کارگر چٹکی لی تھی۔

''ورنہ کیا......؟'' وہ تڑپ کر بولی۔

''ورنہ یہ کہ......'' میں نے آنکھیں بند رکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''تم ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑجاتیں اور میری نیند کا کباڑا ہوجاتا جبکہ مجھے اس وقت نیند کی اشد ضرورت ہے۔ میرا ایک ایک جوڑ دکھ رہا ہے۔ دو گھنٹے سولوں گا تو طبیعت فریش ہوجائے گی۔''

''سونے تو میں تمہیں ہرگز نہیں دوں گی۔'' وہ ضدی لہجے میں بولی۔

''تم نے کیا سوچ رکھا ہے؟'' میں نے یک بیک آنکھیں کھول دیں۔

''میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں خود سلاؤں گی۔'' وہ ذومعنی انداز میں میرے قریب آتے ہوئے بولی۔

''میں خود سوجاؤں یا تم مجھے سلاؤ، بات تو ایک ہی ہے۔'' میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''بات ایک کیسے ہوسکتی ہے۔'' وہ اپنی ران کو میرے لیے تکیہ بناتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہیں ایسی نیند سلاؤں گی کہ سارے بدن کی تکان اڑن چھو ہوجائے گی......''

میں نے دوبارہ آنکھیں بند کرکے خود کو بینا کے سپرد کردیا۔ وہ بینا تھی۔ مجھ نابینا کو اس نے بڑی مہارت اور حفاظت کے ساتھ سنبھال لیا۔ میں دنیا ومافیہا سے بے خبر ہونے کے لیے ذہنی طور پر رضامند ہوگیا۔

اس نے بڑی مشاقی سے مجھے اپنی آغوش میں سمیٹ رکھا تھا۔ کہنے کو میرا سر اس کی ران کے اوپر رکھا تھا مگر عملاً وہ کسی سایہ دار درخت کے مانند مجھ پر چھائی ہوئی تھی۔ میں اس ضدی حسینہ کی سانسوں کی حدت کو اپنے چہرے پر محسوس کررہا تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں کی مخروطی انگلیوں سے میرے سر کے بالوں سے بڑی فرحت بخش اٹھکیلیاں کررہی تھی۔

بینا نے اپنے گداز بدن کی مہربان تھپکیوں سے مجھے گہری نیند سلادیا تھا۔ اسی پُرسکون اور نشاط انگیز نیند کے دوران میں، میں نے ایک سنسنی خیز خواب دیکھا کہ میں شارو کے ساتھ کسی پُرفضا جنت نظیر مقام پر ہوں۔

ان لمحات میں، میں بھی خود کو جنت ہی میں محسوس کررہا

تھا۔ شارو میرے ساتھ تھی اور خاصی اداس نظر آرہی تھی۔ ہم دونوں آمنے سامنے دو بینچوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمارے سوا اس خوش ادا چمن میں اور کوئی ذی روح موجود نہیں تھا۔ ہم دونوں اتنے نزدیک تھے کہ میں نے شارو کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔ وہ خاموش اور کھوئی کھوئی سی تھی۔ اس وقت میرے ذہن میں یہ بات موجود تھی کہ میرے ایک دشمن لیونارڈو نے شارو کو لیک جیکسن (ٹیکساس) سے اغوا کر کے ہوانا (کیوبا) پہنچا دیا تھا۔ یہ معلومات مجھے ڈیلفینا نے ڈیلس میں فراہم کی تھیں جب پریسٹن ہالو والے بنگلے پر میں تین روز کے لیے اس کا مہمان بنا تھا۔

''تم کہاں گم ہوگئی تھیں......؟'' میں نے شارو کی اداس آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

وہ میرے سینے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''میں تو یہاں رہتی ہوں۔''

اس کے الفاظ میں دنیا جہاں کا کرب سمایا ہوا تھا۔ یہ مجھ سے جدائی کا دکھ تھا۔ شارو کی ایسی حالت نے میرے جگر کو پارہ پارہ کردیا۔

''میری جان! تم میرے دل میں ہر لحہ موجود ہو۔'' میں نے جذبات سے مغلوب آواز میں کہا۔ ''تم میرے لہو میں شامل ہو کر رگ رگ میں اور نس نس میں محو گردش ہو لیکن میں بہت شرمندہ ہوں......''

وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکتے ہوئے عجیب سے لہجے میں مستفسر ہوئی۔ ''کس بات کی شرمندگی علی؟''

میں نے ندامت بھرے لہجے میں کہا۔ ''آئی ایم سوری سویٹ ہارٹ۔ یہ میری غلطی ہے کہ میں تمہارے ساتھ نہیں ہوں۔''

وہ بڑی توانا آواز میں بولی۔ ''پیرو ایستوئی کونتیگو پاراسیئمپرے'' (مگر میں تو ہمیشہ کے لیے تمہارے ساتھ ہوں۔)

''میں جانتا ہوں......!'' میں بس اتنا ہی کہہ سکا۔

وہ یک ٹک بڑی جاذب نگاہ سے مجھے دیکھتی چلی گئی۔ اس کی نظر مجھے اپنے وجود کے آر پار ہوتی محسوس ہورہی تھی۔ بے ساختہ میری زبان پر آگیا۔

''آئے آمور...... پردوں امی۔ نو کیئرو پر در تے۔'' (او مائی ڈارلنگ! مجھے معاف کردو۔ میں تمہیں کھونے کا تصور بھی نہیں کرسکتا)

اس نے اس انداز میں پلکیں جھپکائیں جیسے کہہ رہی ہو...... اٹس اوکے علی۔ میں نے اس کے ہاتھوں کو گرمجوشی سے دباتے ہوئے کہا۔

''اس دنیا میں تم میری سب سے گہری دوست ہو۔''

اس نے اثبات میں گردن ہلائی پھر چونک کر میر... عقب میں دیکھنے لگی۔ یکا یک اس کے چہرے کا رنگ از... تھا۔ میں نے بے اختیار پلٹ کر اپنے پیچھے دیکھا۔ ا... عقب میں مجھے ڈیلفینا نظر آئی۔ وہ تیزی سے ہماری جا... چلی آرہی تھی۔ ڈیلفینا کو دیکھ کر شارو کا حواس باختہ ہو جانا اس امر کی نشان دہی کرتا تھا کہ شارو اس کی طرف سے کوئی خطرہ محسوس کررہی تھی۔ یہ بڑی عجیب صورت حال تھی۔

میں نے گردن گھما کر دوبارہ شارو کی جانب دیکھا مگر اس مرتبہ وہ مجھے نظر نہیں آئی۔ ابھی ایک لحہ پہلے تو وہ میرے سامنے بینچ پر بیٹھی ہوئی تھی، پھر اچانک کہاں غائب ہوگئی۔ میرا دماغ گھوم کر رہ گیا۔ غیر ارادی طور پر میں نے ایک مرتبہ پھر گردن گھما کر ڈیلفینا کی سمت دیکھا۔ حیرت انگیز طور پر وہ بھی میری نگاہ کے منظر سے غائب ہوچکی تھی۔ یا الٰہی ...... یہ ماجرا کیا ہے؟

میں گویا سٹپٹا کر رہ گیا تھا اور اسی سٹپٹاہٹ میں میری آنکھ کھل گئی۔ میں بیڈروم میں اپنے بستر پر اکیلا پڑا تھا۔ کمرے کا اے سی آن تھا مگر میرا پورا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ چند لمحے پہلے نظر آنے والے معنی خیز خواب کا منظر میرے ذہن میں تازہ تھا۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور اسی لمحے دیوار گیر کلاک پر میری نگاہ پڑی اور میں چونک اٹھا۔

وال کلاک دو بجے کا وقت بتارہا تھا۔ میں سحری میں لگ بھگ چار بجے سویا تھا۔ بینا نے پتا نہیں، کون سا طلسم پھونک کر مجھے سلایا تھا کہ میں بے خبر دس گھنٹے تک سوتا رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ شاید وال کلاک کا ٹائم درست نہ ہو۔ میں بے خبری کی اتنی طویل نیند کیسے لے سکتا تھا؟ میں نے اپنے اس خیال کی تصدیق کے لیے سیل فون اٹھا کر چیک کیا تو دیوار گیر گھڑی کا وقت درست نکلا۔ میرا سیل فون بھی یہی وقت بتارہا تھا۔

میں نے بستر چھوڑ دیا اور بیڈروم سے باہر نکل آیا۔ بینا سٹنگ روم میں بیٹھی اپنے سیل فون کے ساتھ مصروف تھی۔ مجھ پر نگاہ پڑی تو بڑی توانا آواز میں بولی۔

''تم اٹھ گئے۔ اب جلدی سے فریش ہوجاؤ۔ میں کھانا گرم کرتی ہوں۔ تمہاری وجہ سے میں بھی بھوکی بیٹھی ہوں۔''

میں واپس اپنے کمرے میں آیا اور واش روم میں گھس گیا۔

☆☆☆

ہم لنچ کے بعد سٹنگ روم ہی میں بیٹھ کر گپ شپ کرنے لگے۔ میں نے شکایتی نظر سے بینا کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

''تم نے مجھے جگایا کیوں نہیں جبکہ تم نے یہ ذمے داری قبول کی تھی۔ میں نے نادیہ کو سی آف کرنے کا وعدہ کیا تھا اور وہ چلی گئی، میں بے خبر سوتا رہ گیا۔''

''مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے یہ ذمے داری اٹھائی تھی اور سمجھ لو کہ میں کافی غیر ذمے دار ثابت ہوئی ہوں۔'' وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

''مگر کیوں؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''اس کا کوئی سبب!''

''سبب نہیں...... بلکہ اسباب۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''میں کوئی مطلبی نہیں ہوں......''

''پوچھنے کا مقصد یہ ہے کہ تم کن اسباب کی بات کر رہی ہو؟''

''دو اسباب ہیں علی!'' وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بتانے لگی۔

''نمبر ایک۔ تم اتنے بے خبر سو رہے تھے کہ تمہیں بے آرام کرنے کو میرا من نہیں ہوا۔ میں جانتی ہوں کہ پچھلی رات تم نے کس مارا ماری میں گزاری ہے۔ تمہیں ایک بھرپور طویل نیند کی اشد ضرورت تھی اس لیے میں نے تمہیں سوتا رہنے دینے کا فیصلہ کرلیا لیکن......'' وہ لحاتی توقف کے بعد سلسلۂ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

''لیکن جب نادیہ کے نکلنے میں آدھا گھنٹا رہ گیا تو میں نے اپنے اس فیصلے کے باوجود بھی نادیہ سے کہا کہ میں تمہیں جگا رہی ہوں مگر اس نے مجھے سختی سے منع کردیا۔ وہ بھی تمہارے آرام کرنے کے حق میں تھی اور...... دوسرا سبب بھی یہی ہے۔''

بات کے اختتام پر وہ نگاہ چرا کر فش ایکوریم کی جانب دیکھنے لگی۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ وہ غلط بیانی سے کام لے رہی تھی۔ اس کی آنکھیں چغلی کھا رہی تھیں اور وہ اس کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ مجھے یقین ہوگیا کہ بینا نے دانستہ مجھے نہیں جگایا تھا تاکہ میں نادیہ کو ''الوداع'' نہ کہہ سکوں۔

اگرچہ بینا نے نگاہ چرا کر فش ایکوریم کی طرف دھیان لگا لیا تھا لیکن میں مسلسل اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ میری نگاہ کی تپش کو محسوس کر کے پلٹی پھر اس کے دل کا چور زبان کے راستے منظر عام پر آگیا۔ بڑے گریزاں لہجے میں بولی۔

''اگر میری بات کا اعتبار نہیں تو نادیہ کو فون کر کے تصدیق کرلو......!''

''ادھر میری طرف دیکھو۔'' میں نے تحکمانہ دلار سے کہا۔

وہ میری جانب متوجہ ہوگئی۔

''تم کتنے عرصے سے میرے ساتھ ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک ہفتے سے زیادہ ہوگیا ہے۔''

''کسی انسان کو سمجھنے کے لیے یہ وقت کافی ہوتا ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں کسی ایسے شخص کے ساتھ چند لحات بھی خوشی سے نہیں گزار سکتا جس پر مجھے اعتبار نہ ہو۔ آیندہ ایسی بات نہیں کرنا۔''

''ٹھیک ہے......'' وہ آہستگی سے بولی۔

''اور اپنے ذہن سے تمام خدشات کو بھی نکال باہر کرو۔'' میں نے تاکیدی انداز میں کہا۔ ''انسان اذیت اور کرب کے لحات میں اتنا بے بس نہیں ہوتا جتنا اندیشے کی کیفیت میں لاچار ہوتا ہے۔ اندیشے اور خدشے انسان کو جیتے جی موت کے منہ میں دھکیل دیتے ہیں۔ ان کے اَن دیکھے جال سے نکلنے کی کوشش کرو۔ صرف یہ بات ذہن میں رکھو کہ حق کے راستے پر چلنا ہے۔''

''ارے یار...... فلسفہ بہت ہوگیا۔'' وہ ایک ادا سے بولی۔ ''کیا خیال ہے، اب تھوڑی تفریح ہوجائے۔''

''تم کیا چاہ رہی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا ارادہ ساحل پر چہل قدمی کا ہے۔'' وہ وال کلاک پر نگاہ ڈالتے ہوئے بولی۔ ''پانچ بج چکے ہیں۔ دھوپ کی تمازت میں کمی آگئی ہوگی۔ سمندری ہواؤں سے لطف اندوز ہونے کو جی چاہ رہا ہے، اگر تمہیں کوئی ایشو نہ ہو تو......!''

''مجھے کوئی ایشو نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ابھی فریش اپ ہوتے وقت میں نے خود پر اچھا خاصا کولون اسپرے کرلیا تھا۔ باہر نکلتے وقت اور کرلوں گا۔ احتیاطاً پرفیوم کی ایک دو بوتلیں ساتھ بھی رکھ لیں گے۔ باقی اللہ مالک ہے۔''

''گاڑی میں چلیں یا پیدل ہی؟'' بینا نے پوچھا۔

''ساحل اس اپارٹمنٹ سے چند قدموں کی دوری پر ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے، گاڑی لے جانا مناسب نہیں ہوگا۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میں پرفیوم کی دو بوتلیں اپنے پرس میں رکھ لیتی ہوں تاکہ بوقت ضرورت کام آسکیں۔ کیا پتا، کب

تمہاری چاہنے والی سے سامنا ہوجائے۔"
"کون میری چاہنے والی؟" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

"ارے یار...... میں اس جرمن کتیا کی بات کررہی ہوں جو تمہاری بو سونگھتے ہوئے ڈیفنس سوسائٹی کی سڑکیں ناپتی پھر رہی ہے۔" اس نے یاددہانی کرانے والے انداز میں کہا۔

"اوہ......!" میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

بینا نے پوچھا۔ "تمہیں بلیک ویگو کا نمبر تو یاد ہے نا؟"

"وہ نمبر بھی کوئی بھولنے کی چیز ہے۔" میں نے کہا۔

"اچھا یہ بتاؤ، میں اس وقت کون سا نمبر استعمال کررہی ہوں؟" وہ میرے چہرے پر نگاہ گاڑتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

مجھے بینا کا سیل نمبر یاد نہیں تھا لہٰذا میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نفی میں گردن ہلادی۔ "نہیں معلوم......"

"بس یہی تو فرق ہے......" وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

"کیسا فرق!" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ "میں سمجھا نہیں؟"

"میں دن رات تمہارے قریب پائی جاتی ہوں۔" وہ شرارت بھرے انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "اور میرا نمبر تمہیں معلوم نہیں اور وہ جرمن کتیا جس جیپ میں سوار ہے اس کا نمبر بخوبی تمہیں یاد ہے۔"

"ٹیٹرا فائیو اتنا آسان نمبر ہے کہ اسے کوئی بھی بہ آسانی یاد رکھ سکتا ہے۔" میں نے جھنجلاہٹ بھرے انداز میں کہا۔ "اگر مجھے چڑانے کا کوٹا ختم ہوگیا ہو تو نکلتے ہیں۔"

"یہ کوٹا تو شاید کبھی ختم نہ ہو۔" وہ میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولی۔

میں نے کہا۔ "تم کبھی ختم نہ ہونے کی بات کررہی ہونا...... میں چاہوں تو ابھی ختم کرسکتا ہوں...... چٹکی بجاتے میں!" اپنی بات کے اختتام پر میں نے چٹکی بجانے کا عملی مظاہرہ بھی کر ڈالا۔

وہ پُراشتیاق نظر سے مجھے گھورتے ہوئے مستفسر ہوئی۔ "وہ کیسے؟"

"طلب اور رسد کی آپس میں بڑی گہری رشتے داری ہے۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "کسی بھی چیز کی مارکیٹ میں اسی وقت تک سپلائی رہتی ہے جب تک مذکورہ چیز کی ڈیمانڈ موجود ہو۔ اگر میں تمہاری ان تیکھی باتوں سے چڑنا چھوڑ دوں گا تو تمہارا یہ حربہ ناکام ہوجائے گا گویا اس "حرکت" کے لیے تمہارے پاس موجود اسٹاک یعنی کوٹا خودبخود ختم ہوجائے گا۔"

"کیا تم ایسا کرپاؤ گے؟"

"کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔"

"کوئی حرج نہیں۔" وہ بے پروائی سے بولی۔ "یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ کون اپنی کوشش میں کامیاب ہوا......"

"بتانا تو سب کچھ وقت ہی نے ہوتا ہے......" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لیکن تمہارے عزائم سے صاف جھلک رہا ہے کہ اس سلسلے میں تمہارے ارادے نیک نہیں ہیں۔"

"اگر میں نیک ارادہ ہوتی تو پھر ایسا چیلنج کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"یہ بھی تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو؟" میں نے گول مول جواب دیا۔

وہ بولی۔ "شاباش! تم فرماں برداری کرتے ہوئے بہت معصوم لگتے ہو۔"

"یہ بحث کسی اور وقت کے لیے چھوڑ دو اور فوراً تیار ہوجاؤ۔ ہمیں سورج ڈھلنے سے پہلے واپس بھی آنا ہے۔"

"او کے۔ میں ابھی ریڈی ہوجاتی ہوں۔" وہ اپنی نشست چھوڑتے ہوئے بولی۔

☆☆☆

ہم ساحلِ سمندر پر پہلو بہ پہلو بیٹھے تھے۔ اس وقت شام کے چھ بج رہے تھے۔ سورج غروب ہونے میں کم وبیش ڈیڑھ گھنٹا باقی تھا۔ سمندر کا یہ حصہ زیادہ رش والا نہیں تھا۔ ہم اپارٹمنٹ سے نکل کر چائنا ٹاؤن کے پہلو سے گزر کر یہاں تک پہنچے تھے۔ یہ واکنگ ڈسٹینس تھا جو ہم نے... بہ مشکل پانچ منٹ میں طے کرلیا تھا۔ بینا سادہ لباس میں خاصی دلکش اور پُرکار... نظر آرہی تھی۔ میں نے کاٹن کی گرے پینٹ پر گہرے رنگ کی چیک دار ہاف سلیو شرٹ پہن رکھی تھی۔ احتیاطاً میں نے آنکھوں پر سن گلاسز بھی لگالیے تھے۔ ایک احتیاط اس کے علاوہ اور بھی کی گئی تھی۔ اپارٹمنٹ چھوڑنے سے پہلے میں نے اپنے لباس کو اچھی طرح اوڈی کولون میں بسا لیا تھا تاکہ کے۔ نائن پولیس ڈاگز کی دستبرد سے محفوظ رہ سکوں۔ یہ سوچنا سراسر حماقت ہوتی کہ جرمن شیفرڈ ڈاگز کی وہ جوڑی تھک ہار کر ایک کونے میں بیٹھ گئی ہوگی۔ جب ڈیلفینا نے کبھی نہ تھکنے کی قسم کھا رکھی تھی اور میری جستجو میں امریکا سے پاکستان آگئی تھی تو پھر میں کیسے یہ سمجھ لیتا کہ اس کے حکم پر حرکت میں آنے والے دو جی ایس ڈی ہمت ہار بیٹھیں گے اور بزدلوں کی طرح میری تلاش سے توبہ کرکے منہ چھپاتے پھریں گے۔

ڈیلفینا کے تصور نے آپوں آپ میرا دھیان شارو کی ...اب موڑ دیا۔ میں اپنی جانِ تمنا کے بارے میں سوچنے لگا۔ ...رو کو مجھ سے بچھڑے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا لیکن ...ی محسوس ہوتا تھا جیسے اس جدائی کو زمانے گزر گئے ہوں۔

"کیا کوئی مجھے بتائے گا کہ ہم یہاں سمندر کی لہریں ...تنے آئے ہیں یا سورج کو ساگر میں غرق ہوتا دیکھنے......؟"

بینا کی آواز نے مجھے چونکا دیا اور میں نے بے ساختہ ...ردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بھی مجھے ہی تک رہی ...ی۔ مجھے اپنی جانب متوجہ پاکر اس نے پوچھا۔

"کہاں گم ہو علی؟"

آج خواب میں، میں نے بھی شارو سے یہی سوال کیا تھا ...ر وہ میرے سینے کی سمت اشارہ کرتے ہوئے بولی تھی، میں تو ...ہاں رہتی ہوں لیکن میں بینا کو یہ جواب نہیں دے سکتا تھا۔ اس ...سے نقصِ امن کا خطرہ پیدا ہوسکتا تھا۔ ایک فوری خیال کے تحت ...یں نے اس کے سر کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں تمہاری کھوپڑی کے اندر گم ہوں۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور پوچھا۔ "کیا تمہیں میری کھوپڑی کے اندر کچھ ملا؟"

"ہنوز تلاش جاری ہے۔" میں نے بے ساختہ کہا۔ "اگر یہاں واقعی کچھ ہوا تو ایک نہ ایک دن میں ضرور کامیاب ہوجاؤں گا۔"

"ہر بات کو مذاق میں ٹالنا تو کوئی تم سے سیکھے۔" وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

"لیکن میں مفت میں کچھ بھی نہیں سکھاتا ہوں۔" میں نے ...بھی ذومعنی لہجے میں کہا۔ "اس کام کی میں فیس بھی لیتا ہوں۔"

"خاصی بھاری فیس......!" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولی۔

"مگر اسٹوڈنٹ کی بساط کے اندر......!" میں نے کہا۔

"لگتا ہے، جرمن شیفرڈز نے تمہارے خیال کو اپنے دل ...و دماغ سے جھٹک دیا ہے۔" وہ گفتگو کے موضوع کو حالاتِ حاضرہ کے رخ پر لاتے ہوئے بولی۔ "اور ڈی ایس پی سکندر کو ...بھی تمہاری تلاش میں خاصی مایوسی ہوئی ہے۔ اس کا دعویٰ تھا کہ آج کا سورج طلوع ہونے سے پہلے وہ تمہیں چھاپ لے گا۔"

"انسان کا دعویٰ بسا اوقات اس کی ذلت اور رسوائی کا سبب بن جاتا ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "سکندر نے جس سورج کے طلوع ہونے سے پہلے ...میری گرفتاری کا دعویٰ کیا تھا وہی سورج اب غروب ہونے کے قریب ہے اور میں مالک کے کرم سے کراچی کی آزاد فضا ...میں سانس لے رہا ہوں۔"

"اپنے دعوے کے غلط ثابت ہونے پر ڈی ایس پی کی پٹی بھی اتر سکتی ہے۔" بینا نے کہا۔ "اس کے چیلے سب انسپکٹرز تو کسی قطار شمار میں ہی نہیں ہیں......"

"صرف پٹی ہی نہیں، پ سے شروع ہونے والی اور بھی بہت سی چیزیں اتر سکتی ہیں۔" میں نے آگ کے گولے سورج چاچو کا دلکش نظارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ڈیلفینا بڑی ظالم دوشیزہ ہے۔ وہ مارتی کم اور دوڑاتی زیادہ ہے۔"

"لگتا ہے، اس دوشیزہ نے تم پر بھی کافی ظلم وستم ڈھائے ہیں؟" وہ ٹٹولنے والی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "تمہاری آنکھوں سے اسی لیے خوف وہراس ٹپک رہا ہے......"

"کوئی ایسے ویسے ظلم وستم۔" میں نے بینا سے تفریح لینے کی غرض سے کہا۔ "تم گھر چلو۔ میں اپنی پیٹھ پر ڈیلفینا کی کاریگری تمہیں دکھاتا ہوں۔ ان انمٹ نشانات کو دیکھ کر تمہیں میری بات کا یقین آجائے گا۔ وہ پریسٹن ہالو میں مجھے اپنے بنگلے پر مہمان بنا کر تین دن اور تین راتیں ہنٹر سے پیٹتی رہی ہے......!"

"رئیلی......؟" اس نے بے اعتباری سے پلکیں جھپکائیں۔

قبل اس کے کہ میں بینا کے "رئیلی" کے جواب میں "آف کورس" کہتا، ساحل کے ایک حصے میں زوردار طمانچے کا شور بلند ہوا۔ میں نے گردن گھما کر اس طرف دیکھا۔ جہاں اس وقت ہم موجود تھے وہاں لوگوں کا زیادہ ہجوم نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ دو درجن افراد ہوں گے۔ ہم سمیت تمام افراد اسی سمت دیکھ رہے تھے جدھر گونج بلند ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا، وہاں دو افراد میں تلخ کلامی ہو رہی تھی۔ ان میں ایک لڑکی اور دوسرا لڑکا تھا۔ دونوں کی عمریں بیس اور پچیس کے درمیان رہی ہوں گی۔ لڑکا بہت غصے میں نظر آتا تھا۔ وہ لڑکی پر چیخ رہا تھا۔

"تمہیں منع کیا تھا ناکہ قیمتی موبائل لے کر گھر سے نہیں نکلا کرو......"

لڑکی کے ہاتھ میں نیا آئی فون دکھائی دے رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ لڑکی جواب میں کچھ کہتی، لڑکے نے ایک اور زناٹے دار تھپڑ اس کے گال پر رسید کیا اور غضب ناک انداز میں بولا۔

"تم گھر چلو، پھر بتاتا ہوں۔ امی تمہارے لیے پریشان ہورہی ہیں اور تم یہاں چہل قدمی کررہی ہو۔ تین موبائل چھنوا چکی ہو اسی پٹی پر پھر بھی سبق حاصل نہیں ہوا۔ تمہیں ذرا سا بھی احساس ہے کہ آج کل اسنیچنگ کتنی عام ہوگئی ہے؟ لاؤ فون مجھے دو۔"

اپنی بات کے اختتام پر لڑکے نے لڑکی کے سیل فون

کی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے کہا۔

”یہ کوئی بہت ہی تپا ہوا بھائی ہے۔“

”اگر تپا ہوا ہے تو سر پر برف کی پٹیاں رکھے۔“ بینا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”یہ کون سا طریقہ ہے، بہن کو ڈانٹنے کا۔ اس بے چاری کو سرعام طمانچہ جڑ دیا......“

ادھر بینا کی بات ختم ہوئی، ادھر اس لڑکی نے کچھ کہنے کے لیے اپنے لبوں کو حرکت دی۔ ”آپ......!“

لڑکی کے الفاظ منہ ہی میں رہ گئے کیونکہ اس لڑکے نے اس کے دوسرے گال پر بھی ایک تھپڑ رسید کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی لڑکے نے جھپٹا مار کر اس کے ہاتھ سے سیل فون چھین لیا اور تیزی سے سروس روڈ کی جانب بڑھ گیا۔

”عجیب جنگلی انسان ہے یہ۔“ بینا نے نفرت بھرے انداز میں خیال آرائی کی۔

”بینا، مجھے یہ کوئی اور ہی چکر لگتا ہے۔“ میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولی۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا؟ تم کس چکر کی بات کر رہے ہو؟“

”وہ کمینہ اس لڑکی کا بھائی نہیں ہو سکتا۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”پھر......؟“ بینا کی حیرت میں الجھن شامل ہو گئی۔

”وہ اسنیچر تھا۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ”اس نے لڑکی کا سیل فون چھیننے کے لیے یہ سارا ڈراما رچایا ہے۔“

اس دوران میں اچھے خاصے لوگ اس لڑکی کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ سب اس لڑکی سے اظہارِ ہمدردی کرتے ہوئے اس کے بھائی کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ چند لمحات تک تو لڑکی کے حواس مختل رہے پھر وہ جھنجلاہٹ آمیز انداز میں بولی۔

”وہ میرا بھائی نہیں تھا......“

”ہائیں......!“ ایک عورت نے حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے لڑکی سے پوچھا۔ ”پھر کون تھا وہ؟“

”مجھے کیا پتا......“ وہ خجالت آمیز لہجے میں بولی۔ ”میں تو اسے جانتی تک نہیں۔“

”اسے جانتی تک نہیں اور اپنا قیمتی موبائل اس کے حوالے کر دیا۔“ ایک دوسری عورت نے سرسراتی ہوئی آواز میں چوٹ کی۔ ”اور وہ بھی تین طمانچے کھا کر......!“

”میں تو چیٹ میں مصروف تھی۔“ وہ بے بسی سے بولی۔ ”مجھے پتا ہی نہیں چلا، وہ منحوس کب میرے سر پر آ پہنچا اور پھر اس نے جس انداز میں مجھ پر چڑھائی کی، میں کچھ سوچ، کچھ بول ہی نہیں سکی۔ اوپر سے اس کے تھپڑوں نے میرے اوسان گم کر دیے تھے۔“

”تم چیٹ میں کھوئی رہیں اور وہ بدمعاش ہاتھ صاف کر کے چلا گیا۔“ عورت نے ترحم آمیز نظر سے اس کی طرف دیکھا پھر مشورہ دینے والے انداز میں بولی۔ ”اب گھر جا کر آرام کرو۔ موبائل کے سوگ کو ڈالو چولہے میں۔ شکر کرو، عزت بچ گئی۔“

یہ سب اتنا اچانک اور غیر متوقع پیش آیا تھا کہ وہاں موجود کسی بھی شخص کو ایک لمحے کے لیے یہ خیال نہیں آیا کہ اس لوفر اسنیچر کو پکڑنے کی کوشش کرنا چاہیے اور جب اس طرف لوگوں کا دھیان گیا تو وہ لڑکا اپنی بائیک پر بیٹھ کر وہاں سے رفوچکر ہو چکا تھا۔ جب میں نے بینا کی توجہ اس جانب دلائی تھی، تب تک وہ خبیث اپنی بائیک پر سوار ہو چکا تھا۔ میرے لیے کسی قسم کی ایفی شینسی دکھانے کا موقع باقی نہیں رہا تھا۔

بینا نے کہا۔ ”میں پولیس کے ایمرجنسی نمبر پر کال کر کے اس واقعے کی اطلاع دیتی ہوں۔“

”ایسی حماقت کرنے کا سوچنا بھی نہیں۔“ میں نے سرزنش کرنے والے انداز میں کہا۔

”تم نے دیکھا نہیں، اس بے چاری لڑکی کے ساتھ سرعام کتنی زیادتی ہوئی ہے......!“

”میں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن ہم اس وقت جس قسم کے حالات سے گزر رہے ہیں اس میں پولیس سے رابطہ کرنے کا مطلب ہے...... آ بیل، مجھے مار...... بلکہ... آ بیل، میرا پیٹ پھاڑ!“

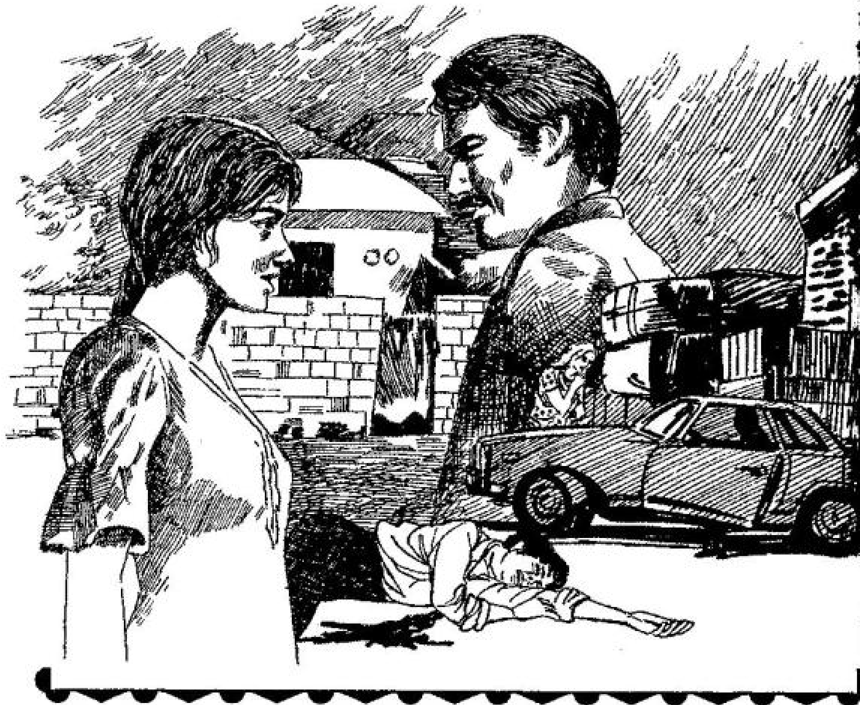
میری بات بینا کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ تشویش بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

ہمارے درمیان گفتگو کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ ایک پریشان حال عورت تیزی سے چلتے ہوئے ہمارے قریب آ گئی۔ اس کے چہرے پر فکرمندی مترشح تھی۔ اس نے بینا کو یکسر نظرانداز کیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے ملتجیانہ لہجے میں بولی۔

”علی! پلیز، میری مدد کرو......“

میرے رگ و پے میں سنسنی سی دوڑ گئی۔

امنگوں، حوصلوں اور آھوں کے بیچ رلاتی، کبھی محبتوں اور چاھتوں کے مدھر گیت سناتی اس ناقابلِ فراموش داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ کریں



قیدی

مہتاب خان

سیانے کہتے ہیں کہ صحبت سے کسی بھی انسان کے کردار کا اندازہ ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ بھی یہ بات جانتا تھا مگر نظرانداز کر دینے کی غلطی نے اس کے چودہ طبق روشن کر دیے... اس نے ایک ایسے زندہ سانپ کو گلے کا ہار بنا لیا تھا جس کا کاٹا پانی نہیں مانگتا تھا۔ اٹل اصول ہے کہ مجرم کی دوستی سے کبھی فلاح نہیں مل سکتی۔

آستین میں سانپ پالنے والے ایک انسان کی سادگی کا قصہ

وہ اس کی زندگی کا خوش قسمت ترین دور تھا۔ چند دن پہلے ہی اس کے ادارے میں اسے ریجنل منیجر کا عہدہ دیا گیا تھا اور آج ہی تو اس کا برسوں پرانا خواب بھی پورا ہو رہا تھا۔ اس نے نئی چمچماتی شاندار کار خریدی تھی اور یہ سب حاصل کرنے کے لیے اس نے بڑی سخت محنت کی تھی۔ وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ والد کی وفات کے بعد گھر میں ماں اور وہ ہی تو رہ گئے تھے۔ قسمت سے اسے اچھی جاب مل گئی تھی لیکن اسے اپنا شہر چھوڑنا پڑا تھا۔ بہرحال اجنبی شہر میں ایڈجسٹ

ہونے میں اسے کچھ عرصہ لگا تھا۔ یہاں آکر اس نے انتھک محنت کی اور آہستہ آہستہ اس کی تمام خواہشات پوری ہوتی گئیں اور آج تو اس کے برسوں پرانے خواب کو بھی تعبیر مل گئی تھی۔ یہ اس کی زندگی کا خوش قسمت ترین دن تھا لیکن کسے خبر تھی کہ زندگی کروٹ بدلے گی اور وہ خوش قسمت دن ڈھلتے ہی رات کی سیاہیاں اس کی زندگی میں در آئیں گی۔

رابیل اپنی زندگی میں آنے والی کٹھنائیوں سے بے خبر اس شام اپنے آفس سے نکلا تھا۔ اس کا رخ اپنی کار کی سمت تھا جو اس نے گزشتہ رات خریدی تھی۔ وہ خوشی سے سرشار ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور کار اسٹارٹ کی۔ اسے اقبال کے شوروم جا کر اسے پک کرنا تھا۔ اقبال اس کا جگری دوست تھا اور آج کل اس کے گھر میں ہی رہائش پذیر تھا۔ یہ کار بھی اقبال نے اپنے شوروم سے اسے دلوائی تھی جہاں وہ جاب کرتا تھا۔ آج ان دونوں کا ارادہ کسی ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے کا تھا اور یہ ٹریٹ اقبال ہی دے رہا تھا۔ کار شوروم جانے والی سڑک پر رواں دواں تھی اور رابیل کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

☆☆☆

جیل کی گاڑی سینٹرل جیل پہنچ گئی تھی اور اس میں سے بھیڑ بکریوں کی طرح لدے مجرموں کو اتارا جا رہا تھا۔ ان میں رابیل بھی شامل تھا۔

”اترو...... جلدی کرو۔“ ایک سپاہی انہیں کہہ رہا تھا۔ وہ ایک ایک کر کے گاڑی سے اتر رہے تھے۔ کچھ ہی دیر میں سب مجرم اتر گئے تھے۔ گاڑی انہیں اتار کر جا چکی تھی اور جیل کا طویل و عریض آہنی گیٹ بند کر دیا گیا تھا۔

”چلو لائن میں بیٹھو۔ دو دو کی ٹولیاں بنالو...... او ہیرو بیٹھ جا۔“ سپاہی نے رابیل سے کہا تو وہ جلدی سے زمین پر بیٹھ گیا۔

”ایک، دو، تین، چار......“ سپاہی انہیں گن رہا تھا۔

”ابے چل اندر ہو کر بیٹھ آگے کھسک۔“ سپاہی نے ایک قیدی کو ٹھوکر ماری جو اکڑوں بیٹھا تھا، اس کے دھکے سے زمین پر گر گیا پھر سنبھل کر بیٹھ گیا۔

”ٹوٹل بیس ہیں سر...... تیرہ کورٹ والے اور سات نئے ہیں۔“ اس نے کچھ دور بیٹھے افسر سے کہا جو اپنے سامنے رکھے رجسٹر پر کچھ اندراج کر رہا تھا۔

رابیل حیران و پریشان ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ قسمت نے اسے کہاں لا پھینکا تھا۔

”چل ہیرو اب تیری باری ہے۔“ سپاہی نے کہا جو شاید رابیل نے نہیں سنا۔

”او بلیو شرٹ ادھر آ۔“ افسر چیخا تو وہ چونکا اور اس کے قریب چلا آیا۔

”نام بتا۔“ افسر نے کہا۔

”رابیل۔“

”پورا نام۔“ افسر نے سخت لہجے میں کہا اور مزید معلومات لکھتا رہا۔

”ادھر سائن کر۔“ افسر نے رجسٹر اس کے سامنے بڑھاتے ہوئے کہا۔

رابیل نے سائن کیا پھر اسے ایک اور سپاہی کے حوالے کر دیا گیا۔ وہ اسے لے کر آگے بڑھا۔

یہ ایک قدرے بڑا ہال نما کمرا تھا۔ جیلر بہت سخت مزاج نظر آتا تھا۔ اس کے سامنے ایک مجرم کھڑا تھا۔ جیلر کے برابر والی کرسی پر غالباً اس کا اسسٹنٹ بیٹھا تھا۔ ”صاحب کو نام بتا اپنا۔“ اسسٹنٹ نے کہا۔

”رابیل...... رابیل احمد۔“ رابیل نے کہا۔

”کون سے کیس میں آیا ہے؟“

وہ خاموش کھڑا رہا۔ ”بول نا سر کیا پوچھ رہے ہیں؟“ اسسٹنٹ نے تیز آواز میں کہا تو وہ چونک گیا۔

”میں بے قصور ہوں، میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔“ رابیل نے کہا۔

”ڈرگز کے کیس میں آیا ہے سر...... نارکوٹک... فرسٹ ٹائم جرم کیا ہے اس نے۔“ اسسٹنٹ نے کہا۔

”سب یہاں پہنچ کر خود کو بے قصور ہی کہتے ہیں۔“ جیلر بڑبڑایا۔ ”تیرہ نمبر میں ڈالو اسے۔“ پھر کچھ دیر ٹھہر کر وہ بولا۔ ”بادشاہ کہاں ہے؟“ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔ اسی وقت ایک پینتالیس پچاس سالہ تنومند گورا چٹا شخص ”آیا صاحب“ کہتا ہوا ہال میں داخل ہوا۔ اس نے چائے کی ٹرے تھامی ہوئی تھی۔ وہ قیدیوں کے مخصوص لباس میں تھا۔ اس نے ٹرے جیلر کے سامنے میز پر رکھی اور ایک طرف باادب کھڑا ہو گیا۔

”سپاہی کے ساتھ جاؤ اور ان سب کو ان کی بیرکوں میں پہنچاؤ...... اور ان سب پر نظر رکھنی ہے۔“ جیلر نے کہا۔

”جی صاحب۔“ بادشاہ نے کہا۔

یہ بادشاہ سے رابیل کی پہلی ملاقات تھی۔ بادشاہ نے آنے والے اس بے حد خوبرو گورے چٹے اور شکل سے تعلیم یافتہ نظر آنے والے لڑکے کو بغور دیکھ رہا تھا جو کہیں سے مجرم نہیں لگتا تھا۔ ”چلو۔“ اس نے کہا تو وہاں موجود سب قیدی اس کے پیچھے چل پڑے۔

بادشاہ بارہ سال سے جیل میں تھا۔ اس طویل عرصے میں کئی مجرموں کے چہرے اس کے سامنے آئے تھے لیکن آج رابیل کو دیکھ کر نہ جانے اسے عجیب سی بے کلی کیوں محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا چہرہ دیکھ کر وہ سوچ رہا تھا کہ یہ ایک گناہ گار کا چہرہ نہیں ہو سکتا۔ اسے یہاں نہیں ہونا چاہیے تھا۔

تیرہ نمبر بیرک قیدیوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ سپاہی نے بیرک کا آہنی سلاخوں والا گیٹ کھولا اور بادشاہ اور قیدیوں سمیت اندر آ گیا۔ ”اے گولی ان قیدیوں کی جگہ بنا۔“ بادشاہ نے ایک نوجوان قیدی سے کہا جو کچھ فاصلے پر اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا تاش کھیل رہا تھا۔ بادشاہ یہ کہہ کر اور ان چار قیدیوں کو وہاں چھوڑ کر چلا گیا۔

”بادشاہ بھائی تو ایسے بول کر چلا گیا جیسے یہ بیرک میرے باپ کی ہے۔“ گولی نے ہنستے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا تو سب ہنسنے لگے۔ ”او بھائی اپنی جگہ خود بنالو۔“ گولی نے ان کی طرف دیکھے بغیر ہانک لگائی اور کھیل میں مگن ہو گیا۔

رابیل کچھ دیر وہاں کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کے ساتھی ادھر ادھر جا کر اپنے لیے جگہ بنا کر بیٹھ گئے تھے۔ وہ بھی تھک ہار کر وہیں دیوار کے سہارے بیٹھ گیا۔ پھر کب دن ڈھلا اور کب رات ہوئی اسے کچھ پتا ہی نہ چلا۔ سارے قیدی آڑھے ترچھے زمین پر سو رہے تھے۔

”اوئے اپنی ٹانگ سنبھال۔“ ایک قیدی نے دوسرے سے کہا۔ ”کتنی بار کہا ہے پھیل کر نہ سویا کر۔“

اسی وقت ایک سپاہی سلاخوں کے قریب آیا اور چلایا۔ ”او بدمعاشو... چپ ہو جاؤ سب......“ کچھ ہی دیر میں وہاں سناٹا چھا گیا۔ کچھ دیر بعد سب بے خبر سو رہے تھے۔

رابیل یونہی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا کہ اس کے قریب لیٹے ایک قیدی نے آنکھیں کھولیں اور کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر کہا۔

”کیا ہوا نئی دلہن نیند نہیں آ رہی تجھے؟...... جیل کی پہلی رات ایسی ہی ہوتی ہے...... نیند نہیں آتی...... کتنی بھی کوشش کر لے آج تجھے نیند نہیں آئے گی......“

وہ خاموش رہا۔ قیدی کروٹ بدل کر سو گیا۔

وہ سر پکڑے بیٹھا تھا۔ کہاں تھا وہ اور کہاں آ گیا تھا اور کس جرم کی سزا بھگت رہا تھا۔ اس نے دیوار سے اپنا سر ٹکا لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

کیسا خوب صورت دن تھا وہ جب سارے اسٹاف کو باس نے کانفرنس ہال میں طلب کیا تھا۔

”مجھے پتا ہے کہ آپ سب سوچ رہے ہوں گے کہ میں نے آپ سب کو اچانک یہاں کیوں طلب کیا ہے۔“ باس نے کہا پھر کچھ دیر ٹھہر کر بولے۔ ”میں آپ سے کچھ باتیں شیئر کرنا چاہتا ہوں۔ ہماری کمپنی کے شیئرز مارکیٹ میں نمبر ون پر پہنچ گئے ہیں۔“ سب نے تالیاں بجا کر اس بات کا خیر مقدم کیا تھا۔ تمام اسٹاف بے حد خوش تھا۔

”اس موقع پر میں خاص طور پر دو ٹیموں کا نام لینا چاہوں گا۔ پہلا نام ہے افتخار عالم اور ان کی ٹیم جس نے اس سال سب سے زیادہ بزنس کیا ہے۔ یہ ہمارے دیرینہ ساتھی ہیں جبکہ دوسرا نام جسے سن کر آپ سب حیران رہ جائیں گے۔ وہ ہے ہمارے اسٹاف میں نیا شامل ہونے والا نوجوان رابیل احمد۔ اس نوجوان نے مجھے بہت حیران اور خوش کیا ہے۔ رابیل احمد اور اس کی ٹیم نے سیکنڈ نمبر پر سب سے زیادہ بزنس کیا ہے۔“

سارا اسٹاف تالیاں بجا رہا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

رابیل خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ وہ کانفرنس ہال سے اپنے کمرے میں گیا تو سب سے پہلا فون اس نے اپنی ماں کو کیا تھا۔

”ہیلو امی...... خوشی کی خبر ہے...... مجھے منیجر بنا دیا ہے باس نے اور امی اب میری تنخواہ بھی دگنی ہو جائے گی۔“

”ماشاء اللہ خدا تجھے ہمیشہ خوش رکھے۔“ ماں نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا تھا۔

”اور امی اب میں اپنا برسوں پرانا خواب بھی پورا کروں گا۔“

”کون سا خواب بیٹا؟“

”اپنی کار خریدنے کا خواب۔“ رابیل نے کہا تو ماں نے کہا۔ ”نہیں بیٹا پہلے مجھے تیری شادی کروانی ہے۔ سدرہ سے تیری منگنی کو دو سال ہو گئے ہیں۔“

”نہیں امی میں پہلے کار لوں گا۔ پھر شادی کے لیے آؤں گا اور آپ دونوں کو یہاں لے آؤں گا۔“

”ٹھیک ہے بیٹا جیسی تیری مرضی، اللہ تجھے بے شمار خوشیوں سے نوازے۔“

”ایک بات اور امی، اقبال میرے پاس آیا تھا۔“

”کون اقبال؟“ ماں نے چونک کر استفسار کیا۔

”چاچا فضل دین کا بیٹا۔“ رابیل نے کہا۔

”وہ تجھے وہاں کیسے ملا۔ اس کا تو کافی عرصے سے کچھ

پتا نہیں ہے۔"

"پتا نہیں امی اس کو میرا ایڈریس کس نے بتایا۔ بہرحال وہ یہاں رہائش کے لیے پریشان تھا۔ یہاں وہ ایک گاڑیوں کے شوروم میں جاب کر رہا ہے۔ میں نے اسے اپنے پاس رکھ لیا ہے۔ وہ ایک مہینے سے میرے ساتھ رہ رہا ہے۔"

"بیٹا اقبال کے بارے میں یہاں الٹی سیدھی باتیں سننے میں آئی تھیں۔ تم احتیاط کرنا فضل دین اپنے اس بیٹے کے لیے پریشان رہتا ہے۔ اس کے متعلق یہاں لوگوں کی رائے اچھی نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے امی میں خیال رکھوں گا۔"

رابیل گھر پہنچا تو اقبال لاؤنج میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔

"آ گیا شہزادے...... گاڑی دیکھنے آج چلنا ہے یا کل؟" اقبال نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

"آج ہی چلیں گے...... میں ذرا چینج کرلوں۔" رابیل نے اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے سرشار لہجے میں کہا۔

"یار میرے فون کا چارج ختم ہوگیا ہے۔ اپنا موبائل دینا ذرا۔" اقبال نے کہا تو رابیل نے فون اسے تھما دیا۔ اقبال اس پر کوئی نمبر پنچ کرنے لگا۔ رابیل اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ وہ اس کا ایسا ہی بے تکلف دوست تھا۔ اس کی شرٹوں سے لے کر اس کی ہر چیز بے تکلف استعمال کرلیا کرتا تھا اور اس سے پوچھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔ موبائل فون تو وہ اکثر اسی کا استعمال کرتا تھا۔ رابیل نے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ اسی دن رابیل نے کار خریدی تھی اور واپسی میں اقبال نے کہا تھا۔ "تیری گاڑی کی خوشی میں کل میں تجھے ٹریٹ دوں گا۔" وہ بے حد خوش تھا۔

اگلے دن رابیل نے اقبال کو اس کے شوروم سے اپنی کار میں بٹھایا تھا۔ پھر وہ ایک ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے گئے تھے۔ ان کی واپسی رات ساڑھے دس بجے ہوئی تھی۔ رابیل ہائی وے پر انتہائی تیز رفتاری سے کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ ایک فخر کا سا احساس اس کے چہرے پر پھیلا ہوا تھا۔ خوشی و سرشاری کی لہروں نے اس کے پورے وجود میں ہلچل سی مچائی ہوئی تھی۔ اسی وقت اس کی نظر بیک ویو مرر پر پڑی تو وہ چونکا۔ پولیس کی ایک موبائل سائرن بجاتی ان کا پیچھا کر رہی تھی۔ پولیس کی گاڑی کا ہوٹر چلا رہا تھا۔ رابیل کے اوسان خطا ہوگئے..... اس نے گاڑی کی اسپیڈ کم کرلی تھی۔

"یار یہ پولیس کی گاڑی ہمارا پیچھا کیوں کر رہی ہے؟"

"تو گاڑی بھگا۔ اسپیڈ تیز کر یار۔" اقبال خوفزدہ انداز میں چیخا۔

"مگر پولیس کی گاڑی ہمارا پیچھا کیوں کر رہی ہے، میری کار کی اسپیڈ تو اپنی حد میں ہی تھی۔" رابیل الجھن آمیز لہجے میں بولا۔

"یہ باتیں چھوڑ تو گاڑی تیز چلا...... جلدی کر۔" وہ پیچھے دیکھتے ہوئے بولا۔

"پاگل ہے کیا تو۔ میں گاڑی روک رہا ہوں۔" رابیل نے کہا۔

"نہیں...... میں کہہ رہا ہوں گاڑی بھگا۔" اقبال نے کہا۔

"ہمیں پوچھنا چاہیے کہ وہ ہمارا پیچھا کیوں کر رہے ہیں آخر۔"

"بحث مت کر یار۔ وہ خوامخواہ وقت ضائع کریں گے اور پیسے بھی بٹوریں گے۔" اقبال نے ہذیانی انداز میں کہا۔

"مگر ہم نے کوئی جرم نہیں کیا تو کیوں ڈریں؟" رابیل نے کہا۔ اسی وقت پولیس کی موبائل ان کی کار کو اوورٹیک کرتے ہوئے اچانک رابیل کے سامنے آ گئی۔ اسے مجبوراً کار روکنا پڑی۔

کار کے رکتے ہی پولیس کی گاڑی سے تین چار پولیس افسر پھرتی سے اترے اور ان کی کار کی طرف دوڑتے ہوئے آئے۔ ایک نے رابیل کو کھینچ کر نکالا اور دوسرے نے اقبال کو۔ رابیل کو باہر نکالتے ہی پولیس افسر نے اس کے ہاتھ پیچھے سے پکڑ لیے تھے جبکہ اقبال مچھلی کی طرح تڑپا اور پولیس کی گرفت سے خود کو چھڑا کر بھاگا۔ کچھ دور جا کر اقبال رکا اور پیچھے پلٹ کر پولیس پر اندھا دھند فائرنگ شروع کردی۔ رابیل اقبال کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ اقبال کے ریوالور سے نکلی ہوئی ایک گولی ایک پولیس افسر کو لگی تھی پھر قریب کھڑے انسپکٹر نے اپنا ریوالور نکال لیا اور اقبال کا نشانہ لے کر فائر کردیا۔ رابیل پر تو جیسے سکتہ سا طاری ہوگیا تھا۔ اس نے اقبال کو گرتے دیکھا تھا۔

لمحوں میں سب کچھ بدل کر رہ گیا تھا۔ رابیل کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر ان سے ایسا کون سا جرم سرزد ہوا تھا جو پولیس نے اس کے دوست پر گولی چلا دی تھی۔

"کامران ایمبولینس بلواؤ۔ ملزم کی گردن پر گولی لگی ہے۔ فوری اسپتال پہنچانا ہے ورنہ مر جائے گا۔" کچھ دیر بعد انسپکٹر نے ایک کانسٹیبل سے کہا تھا۔ رابیل کا حلق خشک ہوگیا تھا۔ اس کا دوست موت و زیست کی کشمکش میں تھا۔

"سجاد تم گاڑی چیک کرو۔" انسپکٹر نے کہا۔

"گاڑی میں کچھ نہیں ہے سر۔" سپاہی نے کہا۔

"ڈکی چیک کی؟" انسپکٹر نے سخت لہجے میں کہا۔

"چل بھائی ڈکی کھول۔" سپاہی نے رابیل سے کہا تو وہ اس کے ساتھ چلا گیا۔ جیسے ہی اس نے ڈکی کھولی یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہاں ایک سوٹ کیس رکھا ہوا تھا۔ یہ وہاں کس نے اور کب رکھا اسے بالکل خبر نہیں تھی۔ وہ ہکا بکا ایک ایک کی شکل دیکھ رہا تھا۔

"ہوں.... تو انفارمیشن پکی تھی۔" انسپکٹر نے کہا۔

سوٹ کیس کھولا گیا تو اس میں سے سفید پاؤڈر کے ڈھیروں پیکٹ برآمد ہوئے تھے۔ ایک پولیس افسر کیمیکل کی کوئی کٹ لے آیا تھا اور اب انہیں ٹیسٹ کیا جا رہا تھا۔ رابیل سکتے کے عالم میں کھڑا یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ انسپکٹر نے رابیل کو گہری نظروں سے تولا پھر ٹیسٹ کرنے والے سے پوچھا۔

"کیا رپورٹ ہے؟"

"ہیروئن ہے سر۔"

انسپکٹر نے رابیل کو دیکھا جو غیر یقینی انداز میں یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ یہ سنتے ہی اس کے قدموں کے نیچے سے زمین نکل گئی تھی۔ اس کے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔

کچھ دیر بعد وہ اسے پولیس اسٹیشن لے آئے تھے۔

"مجرم کو ہینڈل کرنے کے پولیس کے پاس دو طریقے ہوتے ہیں۔" شکل سے خوفناک نظر آنے والے انسپکٹر وسیم نے درشت لہجے میں رابیل سے کہا۔ "تم اپنے آپ بولو گے یا ہم بلوائیں...... یہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

"مجھے نہیں پتا سر...... مجھے کچھ معلوم نہیں...... آپ کس بارے میں بات کر رہے ہیں؟"

"انٹرنیشنل کوالٹی کا اتنا سارا ڈرگز تمہارے پاس سے برآمد ہوا ہے۔ کب سے سپلائی کر رہے ہو تم دونوں؟" انسپکٹر نے سخت لہجے میں کہا۔

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے سر۔ یہ سامان میرا نہیں ہے۔ یہ سوٹ کیس مجھے نہیں پتا میری کار میں کس نے رکھا...... میں تو آفس سے اقبال کو لینے اس کے شوروم گیا تھا اور وہاں سے ہم کھانا کھانے گئے تھے۔ اقبال میرا پرانا پڑوسی ہے۔ اس کے پاس یہاں گھر نہیں تھا اسی لیے میرے ساتھ رہتا ہے...... مم...... میں شروع سے اپنے بارے میں آپ کو بتاتا ہوں...... میرا نام......" رابیل نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

انسپکٹر نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا پھر کہا۔

"تمہارا نام رابیل احمد ہے اور تم فنانس کمپنی میں ریجنل منیجر ہو اور وہ تمہارا دوست اقبال ولد فضل دین شوروم میں سیلز منیجر ہے...... اور کچھ...... ایک سال سے تم دونوں ڈرگز سپلائی کا کام کر رہے ہو۔" انسپکٹر نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں سر، ہم ایسا کوئی کام نہیں کرتے...... یقین کریں مجھے کچھ پتا نہیں۔"

"جاوید ذرا اسے دیکھو...... یہ اتنی آسانی سے منہ نہیں کھولے گا۔" ایک پولیس افسر سے کہتا ہوا انسپکٹر اس کے سامنے سے اٹھ گیا۔

جاوید نامی افسر جو اس کے نزدیک ہی کھڑا تھا، رابیل کے کندھے پر دھپ مارتے ہوئے بولا۔ "چل بھئی ہیرو تجھے ڈرائنگ روم کی سیر کرواتے ہیں۔"

"پلیز سر...... میری بات سنیں......" رابیل چیخا مگر انسپکٹر رکا نہیں کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

اقبال کو اسپتال پہنچا دیا گیا تھا۔ وہ مسلسل بے ہوش تھا۔ اسے آئی سی یو میں رکھا گیا تھا۔ یہ خبر دوسرے دن کے اخبارات میں نمایاں جگہ شائع ہوئی تھی اور ٹی وی چینلز پر بھی دکھائی جا رہی تھی کہ رابیل کو بھاری مقدار میں نشہ آور ڈرگز کے ساتھ گرفتار کرلیا گیا ہے۔

دوسرے دن اسے کورٹ میں پیش کرنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ پولیس اسٹیشن میں اسے بری طرح مارا گیا تھا۔ اس کی حالت بہت غیر تھی۔ اس کی تصویریں اور فنگر پرنٹس لے لیے گئے تھے۔

"کورٹ لے کر جا رہے ہیں، تمہیں کسی سے بات کرنی ہے؟" انچارج نے جب اس سے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"نمبر بتاؤ۔" انچارج نے کہا تو اس نے سدرہ کا موبائل نمبر بتا دیا۔

"سدرہ میری باتیں غور سے سنو۔" رابطہ ہوتے ہی اس نے کہا۔ "میں پولیس اسٹیشن میں ہوں...... مگر میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے...... میں بے گناہ ہوں...... تمہیں ہمت سے کام لینا ہے اور خود کو اور امی کو سنبھالنا ہے...... سن رہی ہو نا تم...... میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔" رابیل نے کہا۔

"تم بھی پریشان نہ ہونا...... میں اور امی وہاں آ رہے ہیں۔" سدرہ نے تشویش زدہ لہجے میں کہا۔ اسی وقت انچارج نے فون اس سے لے لیا اور رابطہ منقطع کردیا۔

اسے عدالت میں پیش کردیا گیا تھا۔ وہ مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا تھا۔

”یور آنر! یہ بڑا سیریس معاملہ ہے۔ ملزم رابیل اور اقبال کا تعلق منشیات کے ایک بین الاقوامی گروہ سے ہے اور اس کے ساتھی نے پولیس پر فائرنگ بھی کی تھی جس کے نتیجے میں ایک پولیس افسر زخمی ہوا ہے۔ اس لیے میں عدالت سے استدعا کرتا ہوں کہ تفتیش کے لیے ملزم کو چودہ دن کے لیے پولیس کے حوالے کیا جائے۔“ وکیل نے کہا تھا۔ یوں عدالت نے اسے چودہ دن کے ریمانڈ پر پولیس کے حوالے کردیا تھا جہاں اذیت کا ایک نیا باب اس کے لیے کھل گیا تھا۔

پولیس اسٹیشن میں اس سے عادی مجرموں جیسا سلوک ہورہا تھا۔ رابیل ایک ذہین نوجوان تھا۔ بچپن سے ہی وہ ہر کلاس میں فرسٹ آیا کرتا تھا۔ اس کی زندگی کا پورا ریکارڈ بے داغ تھا اور یہاں اس کے ساتھ مجرموں سے بدتر سلوک ہورہا تھا۔

☆☆☆

پولیس انسپکٹر چند سپاہیوں اور رابیل کے ساتھ رابیل کے گھر کی تلاشی لینے آئے تھے۔ پورے گھر کا سامان پولیس نے تلپٹ کرکے رکھ دیا تھا۔ اقبال کی ڈائری اس کا لیپ ٹاپ اور باقی کاغذات پولیس نے اپنے قبضے میں لے لیے تھے۔

اگلے دن رابیل کی امی اس کی منگیتر سدرہ اور سدرہ کے والد جو رابیل کے پھوپھا تھے آگئے تھے۔ انہوں نے اس کے لیے شہر کے ایک معروف وکیل کا انتظام کیا تھا۔ وکیل نے رابیل کی ماں اور پھوپھا کو یقین دلایا تھا کہ وہ ایف آئی آر پڑھ کر اور پورا کیس دیکھ کر انہیں بتائے گا کہ رابیل کو ضمانت پر چھڑایا جاسکتا ہے یا نہیں۔ رابیل کی بوڑھی ماں نے وکیل کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے کہ کسی بھی طرح اس کے بیٹے کو پولیس کے چنگل سے چھڑا لائے۔ وکیل نے بھی انہیں تسلی دی تھی۔

آج اسے دس دن ہوگئے تھے لاک اپ میں۔ اذیت ناک دن طویل سے طویل ہوگئے تھے اور بے چین راتیں گزرنے کا نام نہیں لیتی تھیں۔ آج اسے اس کی ماں اور گھر والوں سے ملنے کی اجازت بھی دے دی گئی تھی۔

میلے کچیلے کپڑوں میں چہرے پر بے شمار نیل لیے رابیل ماں کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ بے اختیار آگے بڑھیں۔

”امی!“ وہ لپک کر آگے بڑھا اور ماں سے لپٹ گیا۔ ماں کی آنکھیں آنسو بہارہی تھیں۔

اس نے ماں کے قریب ایک جانب چپ کھڑی سدرہ کو دیکھا اور اس کے قریب آکر دھیمے لہجے میں بولا۔ ”تم یہاں کیوں آئیں؟“ رابیل نے ادھر اُدھر دیکھا۔ پاپا ہی سدرہ کو عجیب انداز میں دیکھ رہے تھے۔ رابیل سے یہ برداشت نہیں ہورہا تھا۔

”ابو اور وکیل صاحب بھی آئے ہیں۔“ وہ دھیمی آواز میں بولی۔

اسی وقت پھوپا ایک اجنبی شخص کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے اور آتے ہی اسے گلے سے لگالیا۔ ”گھبرانا نہیں بیٹا! سب ٹھیک ہوجائے گا۔ احمد انصاری صاحب بہت قابل وکیل ہیں۔ انشاءاللہ تمہاری ضمانت ہوجائے گی۔ بہت جلد تم باہر آجاؤ گے......“ اسی دوران وہ اجنبی شخص آگے بڑھا اور رابیل سے ہاتھ ملایا اور وکالت نامہ سائن کرواکر تسلی دی۔

”پولیس کا کام ہوتا ہے گناہ گار کو پکڑنا اور ہمارا کام ہوتا ہے بے گناہ کو چھڑوانا۔ اب دیکھنا میں کیسے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرتا ہوں۔“ رابیل کچھ نہیں بولا تھا۔ صرف امید بھری نظروں سے اسے دیکھتا رہا تھا۔

پولیس کی چودہ دن ریمانڈ کی مدت پوری ہوچکی تھی۔ رابیل کو کورٹ میں پیش کردیا گیا تھا۔ عدالتی کارروائی کا آغاز ہوگیا تھا۔ وکیل بحث کررہے تھے۔

رابیل کے وکیل نے کہا۔ ”رابیل ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص اور ذمے دار شہری ہے اور ایک مشہور ادارے میں ایک عہدے پر تعینات ہے۔ ملزم کا دوست اقبال ابھی تک بے ہوش ہے اور اس وقت وہ ایک اسپتال میں ایڈمٹ ہے۔ میرے موکل نے یہ کار ایک رات پہلے ملزم اقبال کے شوروم سے خریدی تھی جہاں اقبال جاب کرتا ہے۔ کار کی ڈکی میں منشیات سے بھرے سوٹ کیس سے میرا موکل بالکل لاعلم تھا۔ سوٹ کیس کی وہاں موجودگی پر اقبال ہی کچھ روشنی ڈال سکتا ہے۔ میرا موکل بے گناہ ہے اس نے کچھ نہیں کیا۔ پولیس پر فائرنگ بھی اقبال نے کی تھی۔ اس لیے میری عدالت سے استدعا ہے کہ میرے موکل کی ضمانت منظور کی جائے۔“

”سر! ملزم کے قبضے سے اتنی بھاری مقدار میں منشیات کا ملنا نہایت گھناؤنا جرم ہے جو نہ جانے کتنی انسانی جانوں کو تباہ کرنے میں استعمال ہوتی اور اس کے علاوہ ملزموں کی جانب سے پولیس پر فائرنگ بھی کی گئی تھی جس میں ایک افسر زخمی ہوا ہے۔ یہ کام عادی مجرم ہی کرسکتے ہیں۔ اس لیے میری عدالت سے درخواست ہے کہ ایسے خطرناک مجرم کو اس اسٹیج پر چھوڑ دیا گیا تو اس کے بارسوخ ساتھی عدالت کو گمراہ کرنے کے لیے ہر حربہ آزمائیں گے۔“

”دونوں طرف کے دلائل سننے کے بعد عدالت اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ کیس کے حساس نوعیت کے پیش نظر ملزم رابیل احمد کی ضمانت منظور نہیں کی جاسکتی۔“ جج نے کہا اور اس کی ضمانت نامنظور کردی۔

یہ اس کی زندگی کا بدترین دن تھا۔ اسے جیل بھیج دیا گیا تھا۔ بیرک نمبر تیرہ میں اس کا بسیرا تھا۔

جیل کے شب و روز کا آغاز ہوگیا تھا۔ بادشاہ خان بارہ سال سے جیل میں قید تھا۔ اس سے یہاں باورچی کا کام لیا جارہا تھا۔ قیدیوں کو کھانا بھی وہی بانٹتا تھا۔ وہ ایک قاتل تھا اور چودہ سال قید کی سزا کاٹ رہا تھا۔ رابیل یہاں بہت کم کسی سے بات کرتا تھا اور زیادہ تر خاموش ایک کونے میں بیٹھا رہتا تھا۔ سب قیدی اپنے برتن لے کر جارہے تھے اور بادشاہ سے اپنا کھانا لے رہے تھے۔ رابیل ایک جانب سر جھکائے بیٹھا تھا۔ ایک ضعیف العمر قیدی پانی کی طرح پتلی دال کا کٹورا اور روٹیاں ہاتھ میں لیے اس کے قریب آبیٹھا۔

”تم کھانا لینے نہیں گئے...... جلدی جاؤ ختم ہوجائے گا۔“ بابا نے کہا۔

”مجھ سے اس ہجوم میں نہیں گھسا جائے گا بابا۔“ رابیل نے بے بسی سے کہا۔ ”آپ یہاں کب سے ہیں؟“

”تیرہ سال ہوگئے۔ اب تو یہ بھی بھول گیا کہ کس جرم میں اندر آیا تھا۔“ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔ ”یہاں جس کی کوئی شنوائی نہیں وہ پڑا سڑ رہا ہے۔ کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا بیٹا۔ میرا کوئی باہر نہیں جو میرے لیے مقدمہ لڑے اور مجھے بری کروائے۔ صرف میں ہی نہیں اس جیل میں ایسے لاتعداد قیدی ہیں جو بے گناہ قید ہیں۔ ان کا مقدمہ لڑنے کے لیے کوئی نہیں اسی لیے برسوں سے یہاں ہیں۔“

”او ہیرو!......“ بادشاہ نے رابیل کو آواز لگائی تو وہ چونکا۔ ”کھانا نہیں لینا۔ جلدی برتن لا۔“ وہ اٹھا اور برتن لے کر تیزی سے اس کے قریب گیا تو بادشاہ نے دال اس کے کٹورے میں ڈال دی اور دو روٹیاں اسے تھمادیں۔

پتھر کی طرح سخت روٹی اور پانی جیسی بے مزہ دال اس کے حلق سے نیچے نہیں اتر رہی تھی۔ اس نے ایک دو نوالے زہر مار کیے اور برتن نیچے رکھ دیا۔ گولی جو اسے غور سے دیکھ رہا تھا، اپنے ساتھی سے بولا۔ ”کہاں سے آیا ہے یہ نواب۔ دیکھو تو کیسے منہ بنارہا ہے۔“

رابیل نے گولی کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔ ”اے کیا دیکھتا ہے۔ نخرا کس بات کا ہے۔ یہاں تو یہی دال کھانے کو ملے گی۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ رابیل نے سر جھکالیا۔

کچھ دیر بعد بادشاہ نے دیکھا تو رابیل کا کھانا ایسے ہی رکھا تھا۔ اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ ”کچھ دن یہاں بتائے گا تو خود ہی لائن پر آجائے گا۔“ بادشاہ نے دل میں سوچا۔

ایک مہینا بیت گیا تھا۔ جیل کے ماحول کے مطابق خود کو ڈھالنے میں رابیل کو وقت لگا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ بے گناہ ہے اور جلد ہی جیل سے باہر چلا جائے گا۔ اسی امید پر وہ یہ اذیت بھرے دن کاٹ رہا تھا۔

گولی کا اصل نام سہیل تھا۔ رابیل سے اس کی دوستی ہوگئی تھی۔ اس دن وہ اور گولی بابو بھائی کے ساتھ بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کررہے تھے۔ بابو بھائی نامی گرامی جواری تھا اور شہر میں اس کے کئی اڈے قائم تھے۔ بابو بھائی نے اچانک گولی سے کہا۔ ”تو نے کبیر دادا سے موبائل فون کی بات کی؟“

”ہاں کی تھی، وہ بول رہا تھا کچھ دن میں انتظام کردے گا۔“

”ارے یار! اگر موبائل مل جائے نا تو یہیں سے سٹے کا بزنس اسٹارٹ کردوں، ہم سب کے مسئلے نمٹ جائیں گے۔“

”موبائل یہاں مل سکتا ہے؟“ رابیل نے گولی کو حیرت سے دیکھا۔

”آہستہ بول یار! دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں اور سن بادشاہ سے ہوشیار رہنا۔ جیلر کا مخبر ہے۔ سمجھ گیا نا۔“ گولی نے رازداری سے کہا۔

”او بھائی پیسا ہو تو سب کچھ مل جاتا ہے۔“ بابو نے کہا۔ ”کچھ خریدنا ہو، حوالدار سے کچھ منگوانا ہو، عیش سے رہنا ہو یا ملاقات کا ٹائم بڑھوانا ہو...... پیسا ہی کام آتا ہے۔“

”او بھائی رابیل...... تجھے سنائی نہیں دیتا...... کب سے حوالدار آواز لگا رہا ہے...... تیری ملاقات آئی ہے۔“ ایک قیدی نے آواز لگائی تو وہ چونکا۔

”جا بھئی جا۔“ بابو بھائی نے کہا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کی امی اور سدرہ آئی تھیں۔ ”کیسے ہو رابیل؟“ اس کی ماں نے کہا۔

”آپ لوگ کیسے ہیں؟“

”ہم لوگ ٹھیک ہیں...... تو ہماری فکر نہ کر بیٹا تو بس اپنا خیال رکھ۔“

سدرہ نے دکھ بھری نظروں سے اسے دیکھا جو بہت کمزور نظر آرہا تھا۔

”اقبال کو ہوش آیا؟“ رابیل نے جلدی سے پوچھا۔

”نہیں، وہ ابھی تک آئی سی یو میں ہے کوئی ری کوری

نہیں ہے۔" سدرہ نے کہا۔

اسی وقت وکیل صاحب بھی اندر آ گئے۔

"سر! ضمانت کا کیا ہوا؟" وکیل کے قریب آتے ہی رابیل نے ان سے بے صبری سے پوچھا۔

"اس پیشی پر پھر سے اپیل کروں گا۔ پریشان نہ ہو، کچھ دن اور لگیں گے۔"

"کچھ دن......" اس نے غصے سے مکا سلاخوں پر مارا۔ "اور کتنے دن؟" اس کی آنکھیں برسنے کے لیے تیار تھیں۔

"رابیل! یہ لیگل معاملات ہیں۔ ہمارا عدالتی سسٹم کس قدر سلو چلتا ہے تم تو جانتے ہو، کچھ دن تو لگیں گے۔" وکیل نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"لیکن کتنے دن۔" وہ تیزی سے بولا پھر ماں سے مخاطب ہوا۔

"امی میں پاگل ہو جاؤں گا...... امی میں یہاں نہیں رہ سکتا۔"

"یہ منشیات کا کیس ہے اور پولیس پر گولی بھی چلائی گئی ہے۔ اسی لیے پولیس نے کیس بڑا مضبوط بنایا ہے۔" وکیل نے کہا۔ "یہ مت بھولو کہ یہ سنگین جرائم ہیں، پھر بھی میں کوشش کر رہا ہوں۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا بیٹا بس تھوڑا ہمت سے کام لو۔"

"رابیل ہم سب کوشش کر رہے ہیں۔ تم جلدی باہر آ جاؤ گے۔ پلیز ہمت نہ ہارو۔" سدرہ نے کہا تو رابیل آنکھوں میں در آئے آنسو صاف کرتا اور رخصتی کلمات ادا کیے بغیر تیزی سے مڑا اور وہاں سے چلا گیا۔

سب قیدی بیرکوں سے باہر مختلف کاموں میں مصروف تھے۔ رابیل برآمدے میں بنی سیڑھیوں پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کی ذہنی حالت بڑی ابتر تھی۔ دوپہر ڈھلی اور شام ہو گئی وہ یونہی بیٹھا رہا۔

"چلو...... چلو...... سب اپنی اپنی بیرکوں میں چلو، بندی کا ٹائم ہو گیا ہے۔" بادشاہ نے آواز لگائی تو سب قیدی اپنی اپنی بیرکوں کی جانب بڑھ گئے لیکن رابیل یونہی سیڑھیوں پر بیٹھا رہا۔ اس کا وہاں سے جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ بیرک میں اس کا دم گھٹتا تھا۔

اسی وقت جیلر چند پولیس افسروں کے ساتھ راؤنڈ پر نکلا تھا۔ بادشاہ تیزی سے رابیل کے قریب آیا جو سر جھکائے بیٹھا تھا۔

"اے بھائی! یہاں کیوں بیٹھا ہے۔ اندر چل۔" بادشاہ نے کہا۔

"نہیں جاؤں گا۔" رابیل چلایا۔ "میں نے کوئی جرم نہیں کیا، مجھے کیوں قید کیا گیا ہے؟" رابیل بپھر کر بولا۔

"جیلر صاحب ادھر ہی آ رہے ہیں۔ خاموش رہو۔" بادشاہ نے دبی آواز میں کہا۔

جیلر ان کے قریب آ گیا تھا۔ "بادشاہ کیا ہو رہا ہے یہاں۔ یہ باہر کیوں بیٹھا ہے۔ چلو اندر جاؤ۔" جیلر نے سختی سے کہا تو رابیل اٹھ کھڑا ہوا اور جیلر کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا غصے سے بولا۔

"میں مجرم نہیں ہوں، یہ جیل میرے لیے نہیں ہے۔"

"تم مجرم ہو یا نہیں اس کا فیصلہ عدالت کرے گی ہم نہیں...... یہاں یہ سب نہیں چلے گا۔ جاؤ اندر۔" جیلر دہاڑا۔

رابیل چپ چاپ کھڑا رہا۔

"میں کہہ رہا ہوں جاؤ اندر۔" جیلر پھر چیخا۔

بادشاہ نے ملتجی نظروں سے رابیل کو دیکھا مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔

"رفیق لے جاؤ اسے اور اچھی طرح سبق سکھا دو کہ میری حکم عدولی کی کیا سزا ملتی ہے یہاں۔"

چار سپاہیوں نے اسے قابو کر لیا تھا۔ وہ اسے جیلر کے آفس سے ملحق واقع کمرے میں لے آئے تھے جہاں اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اس پر بے انتہا تشدد کیا گیا تھا۔ مارتے مارتے سپاہی تھک گیا تو اس نے ڈنڈا بادشاہ کو دیتے ہوئے کہا "لے بھائی اب تو مار اسے۔" بادشاہ نے اس کے تلووں پر ڈنڈے برسانے شروع کر دیے۔ وہ چیخ رہا تھا چلا رہا تھا۔ لیکن وہاں اس کی فریاد سننے والا کون تھا۔

"مار اسے۔ اب دیکھتا ہوں تو اپنے پیروں پر چل کر کیسے باہر جاتا ہے۔"

اس کے بعد سپاہی اسے اٹھا کر اس کی بیرک میں ڈال گئے تھے۔ اس کے خوب صورت بال کاٹ دیے گئے تھے۔ اس کا بدن درد سے ٹوٹ رہا تھا۔ وہ شدید زخمی تھا۔ اس کے ساتھی قیدی اس کی آہ و بکا سن رہے تھے مگر اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

دوسرے دن گولی اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔ بادشاہ بھی وہاں موجود تھا رابیل کو دیکھ کر بولا۔ "کیا ہوا رابیل! طبیعت کیسی ہے تمہاری؟"

"کیوں ڈاکٹر کے پاس آنے پر بھی مار پڑتی ہے کیا؟" رابیل نے تلخی سے کہا۔ وہ بادشاہ کو اپنا ہمدرد سمجھتا تھا مگر جب سے بادشاہ نے اسے مارا تھا، وہ اس سے ناراض تھا۔

"رابیل! میری بات سنو۔" بادشاہ نے کہا۔ "یہاں کسی

کو کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم نے کوئی جرم کیا ہے یا نہیں لیکن یہاں تم سے کیسا سلوک ہو یہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ سب کو دوست بناؤ وقت کاٹنے میں آسانی ہوگی۔" بادشاہ اسے سمجھا بجھا کر چلا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ بھی دوا لے کر گولی کے ساتھ اپنی بیرک کی طرف آ رہا تھا جب راستے میں اسے کبیر ملا تھا۔ وہ بیرک نمبر 10 کا قیدی تھا۔ "کیا حال ہے ہیرو؟...... سنا ہے تیرا جیلر سے پھڈا ہوا تھا...... دیکھ بھائی جیل کا شروع کا ٹائم بتا دیتا ہے کہ تیرا آنے والا وقت کیسا ہوگا۔ اگر یہاں تو دب کر رہے گا تو ہر شخص تیرے سر پر چڑھ جائے گا۔ لیکن اگر تو نے اس دن جیسی گرمی دکھا ڈالی نا...... تو ایک دن یہاں کا کنگ بن جائے گا کنگ...... ہم دونوں کی خوب جمنے والی ہے۔ کوئی بھی مسئلہ ہو کبیر کو بولنا۔" وہ سینہ ٹھونک کر بولا۔ "سلطان کا آدمی ہوں سلطان کا۔"

"کبیر بھائی۔" اسی وقت کسی قیدی نے اسے آواز دی تو اس نے کہا۔ "چل پھر ملتے ہیں۔" وہ اس سے ہاتھ ملا کر چلا گیا۔

"یہ سلطان کون ہے؟" رابیل نے گولی سے پوچھا۔

"سلطان اس شہر کا سب سے بڑا ڈان ہے۔ انڈر ورلڈ مافیا کا بے تاج بادشاہ ہے۔ آج کل وہ بھی اسی جیل میں ہے اور یہاں سے اپنا تمام غیر قانونی کاروبار چلا رہا ہے۔ ان لوگوں سے دور ہی رہنا بڑے خطرناک لوگ ہیں۔"

"وہ کس بیرک میں ہے؟" رابیل نے پوچھا۔

"اسے یہاں اسپیشل بیرک دیا گیا ہے جہاں وہ بڑے عیش و آرام سے ہے۔"

رات سب قیدی گہری نیند سو رہے تھے مگر رابیل کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی وہ ہمیشہ کی طرح جاگ رہا تھا اور نیند تو آج گولی کی آنکھوں سے بھی روٹھ گئی تھی۔ اس شام اس کی بیوی پہلی بار اس کی بیٹی سے اسے ملوانے جیل آئی تھی۔ اس کی یہ بیٹی اس کے جیل آنے کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ پہلی بار اپنی اولاد کو دیکھنا اس کے لیے بڑا عجیب تجربہ تھا۔ وہ شدید خواہش کے باوجود اپنی ننھی پری کو گود میں نہیں لے سکا تھا۔ اسے جی بھر کے پیار نہیں کر سکا تھا جیل کی بے رحم سلاخیں ان کے درمیان حائل تھیں۔

"سہیل بھائی سوئے نہیں۔" نہ جانے کب رابیل اس کے قریب آ گیا تھا۔ رابیل کی آواز سے وہ چونکا۔

"نہیں یار نیند نہیں آ رہی۔"

"آج آپ کی ملاقات آئی تھی نا...... میرے ساتھ بھی یہی ہوتا ہے۔ جب بھی امی ملنے آتی ہیں بے کلی اور بے چینی کچھ اور بڑھ جاتی ہے۔ ایک بات بتائیں آپ کیوں اندر آئے ہیں؟" رابیل نے پوچھا۔

"تین سو دو میں...... قتل کیا ہے میں نے۔" گولی نے کہا تو رابیل اچھل پڑا۔

"قتل اور آپ نے۔" اس نے بے یقینی سے اسے دیکھا تھا۔

"ہاں میں نے...... میں ایک مکینک تھا اور طارق روڈ کی ایک دکان پر کام کیا کرتا تھا۔ میری دکان کے قریب فٹ پاتھ پر اکثر ایک صبا نامی لڑکی جو کال گرل تھی اپنے گاہکوں کا انتظار کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ ہماری بات چیت ہونے لگی جو بڑھتے بڑھتے محبت میں بدل گئی۔ صبا دل کی بہت اچھی تھی اور اس گناہ آلود زندگی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی۔

"کچھ عرصے بعد میں نے صبا سے شادی کر لی، ہم دونوں شادی کے بعد بڑی خوش و خرم زندگی گزار رہے تھے۔ ہماری شادی کو ایک ماہ ہوا تھا میں ایک دن صبا کو ایک ہوٹل میں کھانا کھلانے لے گیا تھا۔ وہاں اس کا کوئی پرانا گاہک مل گیا اور اس سے الٹی سیدھی باتیں کرنے لگا۔ میرا تو دماغ گھوم گیا۔ میں نے اسے دھکا دیا تو وہ توازن برقرار نہیں رکھ سکا اور نیچے گر گیا۔ گرتے ہوئے اس کا سر قریب رکھی بھاری بھرکم میز سے ٹکرایا تھا۔ وہ وہیں مر گیا تھا۔ اس کے دماغ میں کوئی اندرونی چوٹ آئی تھی۔ یقین کرنا رابیل میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا صرف اسے صبا سے دور کر رہا تھا۔ مگر غصہ ایک سیکنڈ کا تھا اور سزا سالوں کی ملی ہے دو سال سے اندر ہوں اور ابھی تک تو کیس بھی شروع نہیں ہوا ہے۔" رابیل یہ سن کر گہری سوچ میں غرق ہو گیا تھا یہاں ایسی ان گنت کہانیاں بکھری پڑی تھیں۔ نہ جانے اس کے ساتھ کیا ہوگا۔ رابیل نے سوچا اس کے پورے وجود میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔

سدرہ کے والد واپس جا چکے تھے۔ سدرہ اور رابیل کی ماں وکیل کے آفس آئی تھیں۔ ایک ہفتے بعد رابیل کی پیشی تھی عدالت میں۔ وکیل نے کہا۔

"امید ہے اس پیشی پر رابیل کی ضمانت ہو جائے گی۔"

"تھینک یو وکیل صاحب۔" سدرہ نے کہا۔

"ماں جی آج آپ کو میری بقایا فیس دینی تھی۔" وکیل نے ماں جی سے کہا۔

"اوہ ہاں بیٹا۔" انہوں نے کچھ نوٹ اپنے پرس میں سے نکالے اور وکیل کی جانب بڑھائے جنہیں اس نے تھام لیا۔

"یہ تو کم ہیں۔ پچھلی بار کے بھی تو باقی ہیں۔"
"دو چار دن میں ہم انتظام کرلیں گے وکیل صاحب۔" سدرہ نے کہا۔
"ٹھیک ہے۔" اس نے کہا پھر کچھ دیر ٹھہر کر بولا۔ "آپ لوگ جانتے ہیں کہ یہ کام آسان نہیں ہے۔ تمام ثبوت آپ کے بیٹے کے خلاف ہیں۔" وہ دونوں یہ سن کر پریشان ہوگئی تھیں۔

☆☆☆

جیل میں قیدیوں کو بیرکوں سے نکال کر مختلف کاموں پر لگایا گیا تھا۔ رانبیل کو ابھی عدالت سے سزا نہیں ملی تھی اس لیے اس سے مشقت نہیں لی جارہی تھی، وہ ایک جانب بیٹھا تھا کہ کبیر اس کے قریب آیا اور کہا۔
"تجھے جیل سے باہر نکلنا ہے؟" رانبیل چونکا۔
"کیسے؟" اس نے سوالیہ نظروں سے کبیر کو دیکھا۔
"تجھے سلطان بھائی سے ملواتا ہوں وہ تجھے بتائے گا۔"
"نہیں مجھے نہیں جانا۔" رانبیل کو گولی کی نصیحت یاد آگئی کہ ان جرائم پیشہ افراد سے دور رہنا ہے۔
"ارے چل نا یار...... تیری مرضی ہے تو سلطان بھائی کی بات مان یا نہ مان۔" کبیر نے کہا تو وہ اس کے ساتھ چل پڑا۔
"سپاہی ہمیں سلطان کی بیرک میں جانے دے گا۔" رانبیل نے کہا۔
"ارے یار تو میرے ساتھ ہے تجھے کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ بے فکر رہ۔" کبیر نے قدم آگے بڑھائے۔ بادشاہ نے اسے کبیر کے ساتھ اس اسپیشل بیرک کی طرف جاتے دیکھ لیا تھا جہاں سلطان قید تھا۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اسے اس معصوم چہرے والے نوجوان سے نہ جانے کیوں اتنی انسیت ہوگئی تھی۔ اس کے چہرے میں اسے اپنا چھوٹا بھائی جاوید نظر آتا تھا۔
سلطان کا بیرک بڑا پُرآسائش تھا۔ وہاں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ گھنی، ڈاڑھی اور بڑی بڑی مونچھوں والا فربہ اندام پچاس پچپن سال کا سلطان چہرے سے ہی خطرناک مجرم لگ رہا تھا۔ وہ اور کبیر سلطان کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئے۔
"بھائی یہ رانبیل ہے...... میں نے آپ کو اس کے بارے میں بتایا تھا نا۔" کبیر نے کہا۔
"ہاں...... منشیات کے کیس میں آیا ہے نا یہ۔"
"ہاں بھائی۔"
"ایسے کیس تو بڑے لمبے چلتے ہیں اور ضمانت بھی نہیں ہوتی...... کچھ کھائے گا؟" اس نے رانبیل سے کہا۔
رانبیل نے انکار میں سر ہلا دیا۔ وہ یہ سن کر پریشان ہوگیا تھا۔
"اور پولیس پر گولی بھی تو چلائی ہے...... لمبی سزا ہوگی۔" وہ کچھ دیر بعد بولا تھا۔
"بہرحال پریشان نہیں ہونا۔ تو کبیر کا دوست ہے اس لیے اپنا ہی بچہ ہے۔ میں تجھے جیل سے فرار کرواسکتا ہوں مگر باہر جاکر تجھے میرے لیے کام کرنا ہوگا۔"
"کیا کام؟" رانبیل نے چونک کر کہا۔
"مرڈر، ادھر کا مال ادھر اسلحے کی تقسیم۔ منشیات اور جوئے کا دھندا۔"
"کیا؟" رانبیل تیز آواز میں بولا۔
"ارے کبیر تو نے اسے کچھ نہیں بتایا کیا۔ باہر جاکر اسے ہمارے لیے کیا کرنا ہوگا۔" سلطان نے کبیر کو آنکھیں دکھائیں تو وہ جلدی سے بولا۔
"بھائی یہ آہستہ آہستہ سب کچھ سمجھ جائے گا میں اسے خود سمجھاؤں گا۔ یہ باہر جانے کے لیے کچھ بھی کرے گا۔"
"مجھے جگر والے لڑکے چاہئیں...... سمجھ گیا نا۔" سلطان نے بدمزگی سے کہا۔
"جاؤ اب اور سوچ کر جواب دینا۔" وہ دونوں باہر جانے کے لیے مڑے تو سلطان نے کبیر کو آواز دی۔ "کبیر تو رک ذرا۔"
رانبیل باہر نکل گیا۔ وہ سلطان کی بیرک سے نکلا تو سامنے بادشاہ کھڑا تھا۔
"کیا بات ہوئی سلطان سے؟" بادشاہ نے سخت لہجے میں رانبیل سے پوچھا۔
"کک...... کچھ نہیں۔ بس وہ کہہ رہا تھا کوئی مسئلہ ہو تو بتانا......"
"ان لوگوں سے جتنا دور ہوسکے اتنا دور رہنا۔ بہت کچھ دینے کی بات کرتے ہیں یہ لوگ لیکن آخر میں پولیس کی گولی ملتی ہے یا ایسی ہی کوئی جیل، اس کے علاوہ کچھ نہیں دے پاتے۔"
"مجھے پتا ہے بادشاہ بھائی! آپ بے فکر رہیں۔ وہ تو میں کبیر کے زبردستی کرنے پر یہاں آگیا تھا۔" اس نے بادشاہ کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ "آپ ادھر کب سے ہیں اور آپ نے کیا کیا ہے؟" رانبیل نے کہا تو بادشاہ نے اسے بتانا شروع کیا...... میرا ایک چھوٹا بھائی تھا جاوید جو تمہارا ہم عمر تھا۔ وہ کسی طرح مجرموں کا آلۂ کار بن گیا تھا۔ میں کسی بھی طرح اسے جرائم کی اس دلدل سے نکالنا چاہتا تھا۔ ایک دن اپنے غصے پر قابو نہیں رکھ سکا اور اس اڈے پر پہنچ گیا جاوید اپنے باس کے ساتھ موجود تھا میں کسی بھی طرح بھائی کو اس کے چنگل سے آزاد کروانا چاہتا تھا لیکن میرا فیصلہ غلط تھا میں نے قانون اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ میں وہاں جاتے ہی فائرنگ کردی، اس کا باس مارا گیا تھا۔ اس کے ایک اور ساتھی کو مارنا چاہتا تھا مگر اچانک جاوید سامنے آگیا اور میری ریوالور سے چلی ہوئی گولی میرے بھائی کو چاٹ گئی۔ میرے لیے یہ صدمہ کتنا بڑا تھا، اس کا کوئی اندازہ نہیں کرسکتا۔ یوں دہرے قتل میں مجھے چودہ سال کی سزا ہوئی ہے۔" اس نے دکھ بھرے لہجے میں اپنی داستان سنائی تو رانبیل بھی افسردہ ہوگیا۔
بادشاہ اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو صاف کرتا قدموں سے آگے بڑھ گیا۔ رانبیل حیرت زدہ سا وہیں کھڑا رہا۔ وہ مہربان چہرہ کسی قاتل کا چہرہ ہرگز نہیں لگتا تھا۔ حالات انسان سے کیسے جرائم سرزد کروادیتے ہیں جس کے بارے میں انسان سوچ بھی نہیں سکتا۔ رانبیل نے سوچا۔
اس دن اس کی پیشی تھی۔ جیل کی گاڑی تیار کھڑی تھی۔ اس دن منشیات کے اسمگلر جونی کی بھی پیشی تھی۔ کورٹ جانے والے تمام مجرم گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ رانبیل بڑا پُرامید اور خوش تھا، اس کے وکیل نے اسے یقین دلایا تھا کہ آج اس کی ضمانت پر رہائی ہوجائے گی۔ وہ اپنے سب ساتھیوں سے مل رہا تھا۔
"چلتا ہوں سہیل بھائی۔" رانبیل نے سہیل عرف گولی سے کہا۔
"رہائی مل جائے تو بھول نہ جانا اپنے جیل کے ساتھیوں کو۔" گولی نے کہا۔
"نہیں بھائی آپ لوگوں سے ملنے آتا رہوں گا۔" رانبیل نے ہنستے ہوئے کہا۔
"بادشاہ بھائی دعا کرنا۔" اس نے بادشاہ سے کہا۔
"اپنا خیال رکھنا۔" بادشاہ نے کہا۔
عدالت میں دونوں جانب کے وکیل دلائل دے رہے تھے۔ دلائل سننے کے بعد جج نے کہا۔ "وکیل صفائی اپنے موکل کے حق میں ...... ثبوت اور گواہ پیش کرنے میں ناکام رہے ہیں۔"
رانبیل کے وکیل نے کہا۔ "یور آنر ثبوت اور گواہ پیش کرنے کے لیے مجھے کچھ مہلت درکار ہے۔"
"آپ کو مہلت دی جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ملزم کی ضمانت کی درخواست مسترد کی جاتی ہے۔ ملزم کا ساتھی اقبال کومے میں ہے۔ جب تک وہ بیان دینے کے قابل نہیں ہوجاتا، ملزم کو ضمانت پر رہا نہیں کیا جاسکتا۔" جج کے ان جملوں نے تو جیسے رانبیل کی دنیا ہی اندھیر کردی تھی۔ وہ نہایت افسردہ اور دل گرفتہ تھا جبکہ جونی کو رہا کردیا گیا تھا۔ جیل واپسی کے راستے میں جونی بے حد خوش تھا اور بات بات پر قہقہے لگارہا تھا۔
رانبیل اپنی بیرک میں واپس آگیا تھا اور ایک کونے میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ وہ جب سے کورٹ سے آیا تھا کسی سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ بہت اداس تھا۔ جونی خوشی خوشی اپنا سامان قیدیوں میں بانٹ رہا تھا پھر وہ رانبیل کے قریب آیا۔
"اے رانبیل، یہ کچھ شرٹیں ہیں تیرے کام آئیں گی۔ تجھے تو ابھی بہت عرصے یہاں رہنا پڑے گا۔" اس نے ہنستے ہوئے رانبیل کی طرف شرٹس بڑھائیں تو نہ جانے رانبیل کو کیا ہوا کہ وہ تیزی سے اٹھا اور ایک زوردار گھونسا اس کے منہ پر دے مارا پھر وہ اسے مارتا چلا گیا۔ نہ جانے اسے اتنا غصہ کیوں آیا تھا۔ اس کے ساتھی ان دونوں کے درمیان بیچ بچاؤ کرارہے تھے اور انہیں چھڑانے کی کوشش میں لگے تھے لیکن رانبیل نے کچھ ہی دیر میں اسے دھنک کر رکھ دیا تھا۔
اسی وقت دو تین سپاہی بیرک کا دروازہ کھول کر اندر آگئے اور رانبیل کو پکڑ کر سیدھا جیلر کے پاس لے گئے۔ جیلر نے اسے پندرہ دن کے لیے کال کوٹھری کی سزا سنائی تھی۔ چھ بائی چھ فٹ کے اس اندھیرے سیل میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ وہ چلاتا رہا، روتا رہا اور آہنی گیٹ پر مکے برساتا رہا مگر وہاں سننے والا کوئی نہیں تھا۔ پورے دن میں ایک بار اسے کھانا دیا جاتا تھا، وہ بھی کھانے کی ٹرے اس کے سیل میں ایک کھڑکی سے سرکادی جاتی تھی۔ وہ یہاں کسی ذی روح کو دیکھنے کے لیے ترس گیا تھا۔ قید تنہائی کیا ہوتی ہے، انسان کیسے ٹوٹتا اور بکھرتا ہے یہ اسے اب پتا چل رہا تھا۔ بادشاہ ہی اسے کھانا پہنچانے جاتا تھا اور سیل کے دروازے میں بنی چھوٹی سی کھڑکی سے اسے دیکھا کرتا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر وہ بہت دکھی تھا۔ اس سے برداشت نہیں ہورہا تھا۔
اس دن وہ جیلر صاحب کو چائے دینے ان کے کمرے میں گیا تو بولا۔ "صاحب!" جیلر نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔
"وہ...... رانبیل احمد......" وہ بولا۔
"کیوں کیا ہوا اسے؟" جیلر نے کہا۔
"دس دن ہوگئے اسے کال کوٹھری میں...... اس کی

حالت بہت خراب ہے...... لڑکا مجرم نہیں ہے صاحب...... پڑھا لکھا اور اچھے گھر کا ہے۔‘‘

’’اچھے گھر کا ہے اسی لیے اس پر مار پیٹ کا کوئی کیس نہیں بنایا میں نے۔ یہاں کے کچھ اصول ہیں...... اگر توڑے گا تو سزا ملے گی۔‘‘ جیلر نے کہا۔

’’سر جیل کے ڈسپلن میں اوروں کو بھی تو ڈھیل دی جاتی ہے تو پھر......‘‘

’’بادشاہ۔‘‘ جیلر چیخا۔ ’’یہ ڈھیل میری دی ہوئی نہیں ہے میرے اوپر بھی افسر ہیں مجھے ان کی سننی پڑتی ہے...... اگر میرے ہاتھ میں ہوتا تو......‘‘

’’سوری سر۔‘‘ بادشاہ نے کہا اور جانے کے لیے دروازے کی سمت قدم بڑھا دیے۔

’’سنو۔‘‘ جیلر نے کہا تو وہ رک گیا اور سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔

’’نکالتا ہوں اسے لیکن ذمے داری تمہاری ہوگی۔ آئندہ شکایت کا موقع نہ ملے۔‘‘

’’شکریہ صاحب۔‘‘ بادشاہ خوشی سے کھل اٹھا۔

’’او ہیرو اٹھ اپنے بیرک میں جا۔‘‘ ایک سپاہی نے آہنی گیٹ کا دروازہ کھولا تو روشنی اندر آئی۔ کچھ دیر کے لیے رابیل کی آنکھیں چندھیا گئیں اور اس سے آنکھیں کھولنا مشکل ہو گیا۔ کچھ دیر بعد وہ لڑکھڑاتے قدموں سے چلتا باہر آ گیا۔

’’بادشاہ کو ہر ایک پر رحم آ جاتا ہے۔ ابھی تو تیری سزا بھی پوری نہیں ہوئی تھی۔ اس نے صاحب سے بات کر کے تجھے کال کوٹھری سے نکلوا دیا ہے۔‘‘ سپاہی نے کہا۔

اس کی حالت بڑی ابتر تھی اور قدم من من بھر کے ہو رہے تھے، وہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا بیرک میں آ گیا تھا۔ اس کے ساتھی قیدی اسے ترحم آمیز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

اگلے دن بادشاہ سے اس کی ملاقات ہوئی تو اس نے کہا۔

’’شکریہ بادشاہ بھائی۔‘‘ بادشاہ نے مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔ وہ ایک طرف سر جھکا کے بیٹھا تھا، جب کبیر اس کے قریب آیا اور اس کے پاس بیٹھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

وہ بولا۔ ’’واہ بھائی تیرے تو بڑے چرچے ہو رہے ہیں۔ مجھے دیکھ سات سال کی سزا ہوئی ہے اور تین سال سے اندر ہوں سلطان بھائی کا ہاتھ ہے سر پر مگر اتنے کم ٹائم میں جتنا جلوہ تو نے دکھایا ہے کسی نے نہیں دکھایا۔ کال کوٹھری کی سیر بھی کر آیا۔ بڑا مشہور ہو گیا ہے تو یہاں۔‘‘ وہ قہقہہ لگا کر بولا۔ ’’مجھے بھی ڈالا تھا ان لوگوں نے ایک بار ایک ... لیے...... انسان اندر سے خالی ہو جاتا ہے...... مجھے پتا ... یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ انسان زندہ ہے یا مر گیا...... لیکن ... تو سلطان بھائی نے ایسی گولی فٹ کی کہ کیا بتاؤں یہاں ... ڈاکٹر سے سیٹنگ کر لی تھی اس نے مجھے سرکاری اسپتال ... ایڈمٹ کروا دیا۔‘‘ اس نے رازداری سے کہا۔ ’’میں ... اپنی فیملی سے ملا ماں نے گلے سے لگایا تو جیسے پھر ... ہو گیا...... یہ ماں بھی کیا چیز ہوتی ہے یار۔‘‘ وہ رابیل ... کندھوں پر بازو دراز کیے بیٹھا کہہ رہا تھا۔ ’’سارے ... پریشانیاں ماں سے مل کر دور ہو جاتی ہیں۔‘‘ کچھ دیر ... نے کہا تو رابیل رو پڑا۔ ’’تجھے جانا ہے اسپتال؟ اپنی ... سے ملنا چاہتا ہے؟‘‘ اس نے ہمدردانہ لہجے میں کہا تو ر... نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

’’ٹھیک ہے سلطان بھائی سے کہہ کر میں ابھی ا... کرتا ہوں۔ تو فکر نہ کر۔‘‘

سلطان نے جیل کے ڈاکٹر سے مل کر کوئی ایسا چکر چلا... تھا کہ رابیل کو جیل کے باہر واقع سرکاری اسپتال ... ایڈمٹ کر دیا گیا تھا۔ یہاں اس کی امی اسے ملنے آئی ... ان کے ساتھ سدرہ بھی تھی۔ سدرہ کے والد واپس جا ... تھے۔ وہ اس کا حال دیکھ کر خود پر قابو نہیں رکھ سکی تھیں ... دونوں رونے لگی تھیں۔

بہرحال ماں سے مل کر اور ان کے ہاتھوں سے کھا... کھا کر اس کے اندر ایک نئی امید جاگی تھی۔ سدرہ نے ... اسے بڑا حوصلہ دیا تھا۔ وہ جب جیل آیا اور کبیر سے ملا ... بہت خوش تھا۔

’’آ گیا رابیل مل آیا ماں سے؟‘‘

’’ہاں کبیر تیرا بہت شکریہ یار۔‘‘

’’ارے شکریے کی کیا بات ہے اتنی چھوٹی سی با... تھی۔‘‘ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

بادشاہ نے جیسے ہی رابیل کو دیکھا اس کے قریب ... آیا۔ بادشاہ کو قریب آتا دیکھ کر کبیر چلا گیا۔ وہ اس ... کتراتا تھا۔

’’مل آئے ماں سے۔‘‘ بادشاہ نے عجیب سے ... میں کہا۔ ’’سلطان نے انتظام کیا تھا نا تیرا اسپتال جانے کا‘‘ اس نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

’’بادشاہ بھائی...... وہ...... میں۔‘‘ وہ جھجکتا ہوا بولا۔

’’چپ کر...... اب مجرموں سے دوستی بڑھا رہا ...

... اس نے ڈانٹ پلائی۔

’’نن...... نہیں۔‘‘ رابیل نے کہا۔

’’ان کے گینگ میں شامل ہونا ہے تجھے؟‘‘

’’نہیں بادشاہ بھائی...... وہ...... مجھے امی سے ملنا تھا۔ ...نے ان سے تھوڑی سی مدد لی تھی بس۔‘‘

’’تھوڑے سے ہی شروعات ہوتی ہے...... یہ تیرے ...دار نہیں ہیں جو تجھ پر مہربانی کریں گے۔ یہ کچھ دیتے ...بدلے میں بہت کچھ لیتے بھی ہیں...... بہت قریب سے ...ا ہے میں نے ان کو اور بہت کچھ کھویا بھی ہے۔‘‘ اس نے ...ھرے لہجے میں کہا۔ ’’میں نے اپنا بھائی کھویا ہے۔ ...کے راستے پر تجھے چلتے دیکھا تو مجھے بہت تکلیف ہوئی ...ل...... جیل بڑے بڑوں کو بدل دیتی ہے...... کوشش کر ...ا تو یہاں آیا تھا ویسا ہی باہر جائے۔‘‘ بادشاہ نے کہا اور ...نے کے لیے قدم آگے بڑھا دیے۔

’’بادشاہ بھائی۔‘‘ رابیل نے پکارا مگر وہ نہیں رکا اور ...ں سے چلا گیا۔

رابیل کو جیل میں قید ہوئے چھ ماہ ہو گئے تھے۔ وکیل ... بھاری فیس اور گھر کے دیگر اخراجات منہ پھاڑے ...ڑے تھے۔ گھر کا واحد کفیل رابیل جیل میں تھا۔ پریشان ...ل رابیل کی بوڑھی ماں نے اپنا آبائی مکان فروخت کر دیا ...۔ رابیل کو ملاقات پر جب ماں نے بتایا تو وہ بہت ناراض ...ا تھا۔

☆☆☆

گولی آج کل بہت پریشان تھا۔ دو مہینے سے اس کی ...ی اس سے ملنے نہیں آئی تھی اور اس کا کوئی عزیز یا رشتے ...ار تھا نہیں جو اسے باہر کے حالات بتاتا۔ اس دن اس کا ...ل اس سے ملنے آیا تھا۔

’’سہیل، میں اب تمہارا کیس نہیں لڑ سکتا۔‘‘ وکیل نے ...ل سے کہا۔

’’لیکن کیوں؟‘‘ سہیل نے اچنبھے سے کہا۔

’’پچھلے تین ماہ سے میری فیس نہیں ملی ہے اور تمہاری ...ی بھی غائب ہے۔‘‘

’’کیا کہہ رہے ہو تم؟ دو مہینے سے وہ مجھے بھی ملنے نہیں ...ی۔‘‘ سہیل نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

’’میں نے اپنا بندہ بھیجا تھا تمہارے گھر۔ وہ گھر خالی ...کے اور تمام سامان لے کر کسی شخص کے ساتھ چلی گئی ہے۔ ...وسیوں سے پتا چلا ہے کچھ عرصے سے وہ شخص تمہاری بیوی ... پاس آتا جاتا تھا اور اس نے اپنا موبائل نمبر بھی شاید بدل دیا ہے۔‘‘

’’کیا کہہ رہے ہو بھائی۔ صبا ایسی نہیں ہے۔‘‘ گولی سکتے میں رہ گیا تھا۔

’’بس بہت ہوا، چاہو تو دوسرا وکیل کر لو۔ میں نے تمہاری فائل جیل اتھارٹیز کو دے دی ہے۔ خدا حافظ۔‘‘ یہ کہہ کر وکیل چلا گیا۔ سہیل عرف گولی ہکا بکا وہیں کھڑا رہ گیا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا اور کیوں ہو گیا تھا۔ صبا پر وہ اندھا اعتماد کرتا تھا۔

جب سے وکیل نے یہ سب بتایا تھا گولی کانٹوں پر لوٹ رہا تھا۔ اس کے تن بدن میں جیسے انگارے سے بھر گئے تھے۔ اسے کسی بھی لمحے چین نہیں آ رہا تھا۔ رابیل سے اس کی یہ حالت پوشیدہ نہیں رہی تھی۔ ایک رابیل ہی تھا جس سے گولی اپنے دل کی ہر بات کر لیا کرتا تھا۔ اس لیے اس نے یہ سب بھی اسے بتا دیا تھا۔ کبیر نے اپنے ذرائع سے وکیل کی اس خبر کی تصدیق کر دی تھی کہ صبا کسی اور محلے میں کسی اجنبی شخص کے ساتھ رہ رہی ہے۔ رابیل اسے دلاسا دینے کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا۔ ’’میری بیٹی اس کے پاس ہے۔ رابیل کیا وہ بھی صبا کی طرح زندگی گزارے گی؟ میری غیرت یہ گوارا نہیں کرتی۔ میں کیا کروں کیسے اپنی بیٹی کو بچاؤں؟‘‘ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تھا۔

اور پھر اگلی صبح گولی باتھ روم میں مردہ پایا گیا تھا۔ اس نے خودکشی کر لی تھی۔ اس نے رات کے کسی پہر اپنی کلائیاں کاٹ لی تھیں۔ ایک چھوٹا سا چاقو اس کی لاش کے قریب پڑا پایا گیا تھا۔ وہ چاقو اس نے کب اور کیسے حاصل کیا تھا یہ پتا نہیں چل سکا تھا۔ گولی کی خودکشی نے رابیل کو بھی توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کا دل پھٹا جا رہا تھا۔ مایوسیوں نے اس پر ڈیرے ڈال دیے تھے۔

اس دن اس کی عدالت میں طلبی تھی۔ اس کی امی، سدرہ اور وکیل اسے کمرائے عدالت کے باہر کوریڈور میں مل گئے تھے۔ ان سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔

’’کیا ہوا ہے امی؟‘‘ اسے کسی انہونی بات کا احساس ہو گیا تھا۔

’’ایک بری خبر ہے رابیل۔‘‘ بالآخر وکیل نے اس سے کہا۔

’’اقبال کی آج صبح بے ہوشی کے دوران ہی ڈیتھ ہو گئی ہے۔ وہ پولیس کو کوئی بیان نہیں دے سکا۔ اس لیے تمہارا کیس مزید پیچیدہ ہو گیا ہے۔ اب مجھے نئے سرے سے محنت کرنی ہوگی اور اس کے لیے مجھے مہلت درکار ہے۔

میں عدالت سے اگلی تاریخ لے رہا ہوں تا کہ......"

رابیل کے ..... تو گویا پاؤں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ اس کا ذہن کام کرنا چھوڑ چکا تھا۔ پھر کیسے وہ جیل واپس آیا اسے کچھ پتا نہیں چلا۔

رابیل کا کیس چلتا رہا اور وقت گزرتا رہا۔ دو سال کا طویل عرصہ بیت گیا تھا۔ اس کے وکیل کو اپنی فیس کے علاوہ اس کیس سے اب کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اس دن اس کی پیشی تھی اور اس کا وکیل غائب تھا۔

"آپ کا وکیل کہاں ہے؟" جج نے کہا۔

اسی وقت وکیل کمرائے عدالت میں داخل ہوا۔

"آپ پر الزام ہے کہ آپ اپنے مرحوم ساتھی اقبال کے ساتھ منشیات کی سپلائی میں ملوث تھے۔ آپ کے موبائل فون سے ڈرگ ڈیلرز سے رابطہ کیا جاتا تھا اور آپ کے ساتھی نے پولیس پر فائرنگ کر کے ایک انسپکٹر کو زخمی کیا تھا۔ آپ اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہیں؟" جج نے رابیل سے کہا تو وہ بولا۔

"تھینک یو سر......" کچھ دیر ٹھہر کر اس نے کہا۔ "پچھلے دو سالوں میں پہلی بار آپ نے پوچھا ہے کہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں یا نہیں۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں نے یہ جرم نہیں کیا۔ میں بے گناہ ہوں۔"

"آیندہ پیشی اگلے ماہ کی چوبیس تاریخ کو ہوگی۔" جج نے کہا۔

اس مختصر سی عدالتی کارروائی کے بعد رابیل کو دوبارہ جیل بھیج دیا گیا تھا۔ اگلی پیشی پر جج نے کہا۔ "وکیلِ صفائی ملزم کے حق میں گواہ اور ثبوت پیش کرنے میں ناکام رہے ہیں اور عدالت ان کے دلائل سے مطمئن نہیں ہے۔ اس لیے عدالت اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ مجرم رابیل احمد نے اپنے ساتھی اقبال کے ساتھ مل کر اس جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ منشیات ہماری قوم کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے۔ اس گھناؤنے جرم میں ملوث ہونے کی بنا پر عدالت مجرم رابیل احمد کو......"

"پلیز سر...... پلیز...... خدا کے لیے فیصلہ نہ سنائیں...... میں بے گناہ ہوں...... میں نے یہ جرم نہیں کیا۔" رابیل چلّانے لگا۔ "وکیل صاحب پلیز آپ ہی کچھ کہیے۔" رابیل نے وکیل کو رحم طلب نظروں سے دیکھا۔

نہ جانے وہ کس قسم کا وکیل تھا۔ لگتا تھا وہ پہلے ہی ہار مان چکا ہے مجبوراً وہ اٹھا اور کہا۔ "میری عدالت سے درخواست ہے کہ رابیل احمد ایک شریف نوجوان ہے اور اپنی فیملی کا واحد کفیل ہے۔ اسے کم سے کم سزا دی جائے۔"

"عدالت اس سنگین جرم میں رابیل احمد کو سات قید بامشقت کی سزا سناتی ہے۔" جج نے گویا اس کی فیصلہ سنا دیا تھا۔

رابیل وہیں کٹہرے میں زمین پر بیٹھ گیا اور پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کی ماں نے بھی چلّا چلّا کر رونا شروع کر دیا تھا جسے زارو قطار روتی سدرہ سنبھال رہی تھی۔ رابیل کو جیل پہنچا دیا گیا تھا۔

اسے مجرموں کا مخصوص لباس پہنا دیا گیا تھا۔ اس کی ساری امیدیں ختم ہوگئی تھیں۔ وہ اندر سے جیسے مر گیا تھا۔ مایوسیوں کے گھپ اندھیرے اس کی ساری زندگی پر چھا گئے تھے۔ اس بے رحم فیصلے نے تو جیسے رابیل کو ختم کر ڈالا تھا۔ اس نے خود کو اپنے اندر ہی قید کر لیا تھا۔ ایک عجیب سی گھٹن اور عجیب سی خاموشی اس کے وجود پر چھا گئی تھی۔ اس کی ماں اور سدرہ کئی بار اس سے ملنے آئی تھیں مگر اس نے ان سے ملنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ ہر بار مایوس ہو کر واپس چلی جاتی تھیں۔ بادشاہ نے اس کی خاموشی توڑنے کی بہت کوشش کی لیکن جو انسان زندگی سے رشتہ توڑ کر بیٹھ جائے وہ کوئی اور رشتہ کیسے نبھا سکتا ہے۔ رابیل جیل کے رجسٹر میں صرف ایک نمبر بن کر رہ گیا تھا۔

اس دن کبیر اس کے پاس آیا تھا۔ "سن رابیل! سلطان بھائی نے ہم تین لڑکوں کا جیل سے فرار کا منصوبہ بنایا ہے۔" اس نے نہایت دھیمے لہجے میں رازداری سے کہا۔ "جیل میں جو ٹرک غلہ لے کر آتا ہے اس میں چھپ کر ہم باہر جائیں گے۔ سلطان بھائی نے سب انتظام کر دیا ہے۔ میں اس لیے تم سے ملنے آیا ہوں۔ کل صبح ہم فرار ہو رہے ہیں۔"

"کبیر یار! مجھے بھی ساتھ لے چلو۔" رابیل کے اندر جیسے کسی نے نئی روح پھونک دی تھی۔ وہ جلدی سے بولا۔

"یار تو شریف گھر کا تعلیم یافتہ لڑکا ہے اور پھر ہائی کورٹ میں تیری درخواست بھی لگی ہوئی ہے...... ارے کیا پتا تو سیدھا سیدھا رہا ہو جائے۔"

وہ چلّایا۔ "کچھ نہیں ہوگا...... پچھلے دو سالوں سے میں اپنے آپ سے جھوٹ بول رہا ہوں...... سات سال سات سال کتنے طویل ہوتے ہیں...... اور...... اور میں اس جھوٹی امید میں اپنی زندگی تباہ نہیں کر سکتا...... یا تو...... یہ جیل مجھے مار دے گی یا...... یا میں خود کو ختم کر دوں گا۔"

"اچھا بابا ٹھیک ہے میں سلطان بھائی سے بات کروں گا...... اگر وہ تجھے فرار کروائے گا تو تو باہر جا کر کیا کرے گا؟ سلطان بغیر مطلب کے کسی کی مدد نہیں کرتا۔"

"وہ جو کہے گا میں کروں گا۔" رابیل نے تیزی سے کہا۔

"سلطان بولے گا کسی کو قتل کرنا ہے تو......" رابیل خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

"بول کرے گا؟" کبیر نے کہا۔

"ہاں۔" رابیل نے ٹھوس لہجے میں کہا تو کبیر چونک گیا۔

"چل پھر ٹھیک ہے صبح تیار رہنا۔" کبیر یہ کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔

"سر! سلطان اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ کوئی منصوبہ بنا رہا ہے...... غالباً فرار کا منصوبہ ہے۔ مجھے آج ہی یہ اطلاع ملی ہے۔" بادشاہ نے رازداری سے یہ خبر جیلر کو دی تھی۔

"اسے اپنے منصوبوں پر عمل کرنے دو ہم اپنا فرض نبھائیں گے۔"

جیلر نے کہا تو بادشاہ چونکا۔ "کیا مطلب سر؟"

"اگر کسی نے فرار ہونے کی کوشش کی تو مارے جائیں گے۔" جیلر نے سخت لہجے میں کہا۔

رابیل کے پورے وجود میں سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ ایک ہلچل تھی جس نے اسے بے چین کیے رکھا تھا۔ اس کے اندر خیر و شر کی جنگ جاری تھی۔ یہاں رابیل کے ذمے ان پڑھ قیدیوں کو پڑھانے کی ذمے داری لگائی گئی تھی۔ وہ اس دن کلاس میں نہیں گیا تھا بلکہ بیرک کے باہر مخصوص جگہ بیٹھا کبیر کا انتظار کر رہا تھا۔ جیسے ہی کبیر آیا اور رابیل کو اشارہ دیا وہ اس کے پیچھے چل پڑا۔

سلطان نے جس سپاہی کو قیدیوں کے فرار میں مدد دینے کے لیے تیار کیا تھا، اس نے بڑی رازداری اور ہوشیاری سے یہ کام انجام دے دیا تھا۔ تمام فرار ہونے والے قیدی ٹرک میں غلّے کی بوریوں میں چھپ گئے تھے اور ٹرک جیل سے قیدیوں سمیت روانہ ہو گیا تھا۔

ٹرک تیزی سے اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھا۔ جب قیدیوں کی گنتی ہوئی تھی تو چند قیدیوں کے فرار کے بارے میں علم ہوا تھا اور پورے جیل میں کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ جیلر اعلیٰ افسران سے مسلسل رابطے میں تھا۔ پورے شہر کی ناکا بندی کر دی گئی تھی۔ جلد ہی ٹرک کو ہائی وے پر روک لیا گیا تھا۔

"بادشاہ بھائی۔" بابا نے بادشاہ کو آواز دی جو جیلر کے آفس کی طرف جا رہا تھا۔ وہ رکا۔

"ہاں جلدی بولو جیلر صاحب نے بلایا ہے۔ کچھ قیدی فرار ہو گئے ہیں۔" وہ تیزی سے بولا۔

"آپ کا چہیتا رابیل بھی فرار ہونے والوں میں شامل ہے۔ میں نے خود اسے کبیر کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا تھا۔"

"کیا؟" بادشاہ اچنبھے سے بولا۔ "آخر سلطان نے اسے ورغلا لیا۔ ایک اور شریف انسان جیل سے مجرم بن کر نکلا ہے۔" اس نے سوچا۔ بادشاہ ایک عجیب کیفیت سے گزر رہا تھا۔ اس نے رابیل کو خود پر یقین رکھنا سکھایا تھا۔ وہ کبھی اسے ناامید ہونے نہیں دیتا تھا۔ قدم قدم پر اس کی ڈھارس بندھاتا تھا اور ہر موقع پر اس کے لیے ڈھال بن جاتا تھا۔ لیکن بادشاہ ہار گیا تھا۔ سلطان نے اسے شکست دے دی تھی۔

"سنو بادشاہ! ٹرک پکڑا گیا۔ فرار ہونے والے ایک قیدی کبیر کے پاس اسلحہ بھی تھا۔ انہوں نے فرار ہوتے ہوئے ہمارے دو کانسٹیبلز کو زخمی کیا ہے۔ لیکن جوابی فائرنگ میں تمام قیدی مارے گئے۔ تم یہ معلوم کرو ان کے پاس اسلحہ کہاں سے آیا۔" بادشاہ نے یہ سنا تو اس کے سینے میں کچھ چھنا کے سے ٹوٹ گیا تھا۔ اس نے سر ہلایا اور خاموشی سے باہر نکل گیا۔

وہ بڑا دل گرفتہ تھا۔ یوں لگتا تھا آج پھر دوبارہ اس کا بھائی اس سے بچھڑ گیا تھا۔ وہ سر جھکائے کچن کی سمت جا رہا تھا جب دوبارہ بابا نے اسے آواز دی۔ وہ دوڑتا ہوا بادشاہ کے قریب آیا۔ "بادشاہ بھائی...... رابیل تو اپنی کلاس میں ہے۔ وہ فرار نہیں ہوا...... میں نے خود اسے ابھی دیکھا ہے......"

بادشاہ ٹھٹک گیا اور کچھ دیر اسے غیر یقینی انداز میں دیکھتا رہا پھر کلاس کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ کلاس کے دروازے پر کھڑا وہ دیر تک رابیل کو دیکھتا رہا جو پڑھانے میں مگن تھا۔ اسی وقت رابیل کی نظر بادشاہ پر پڑی جو یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ مسکرایا تو بادشاہ بھی ہنسنے لگا۔ اس دن ہوا کچھ یوں تھا کہ جب وہ کبیر کے ساتھ ٹرک تک پہنچا تو کبیر لپک کر اوپر چڑھ گیا تھا جبکہ رابیل وہیں کھڑا رہا تھا۔ یہ اس کے لیے فیصلے کی گھڑی تھی۔ یا تو وہ ہمیشہ کے لیے مجرم بن جاتا یا بے گناہی کی سزا بھگت کر اپنے وقت پر رہا ہو جاتا۔ خیر و شر کی اس جنگ میں جو اس کے اندر جاری تھی۔ فتح خیر کی ہوئی تھی اور نہ جانے اس کے دل میں کیا آیا تھا کہ وہ واپس مڑا اور اس نے دوڑ لگا دی تھی۔ کبیر اسے آواز دیتا رہا اور کہتا رہا کہ یہ موقع اسے پھر کبھی نہیں ملے گا مگر اس نے کبیر کی کوئی بات نہیں سنی تھی اور کلاس روم میں آ گیا تھا۔

یہ رابیل پر بادشاہ کے بھروسے کی جیت تھی اور ہر اس برائی کی ہار تھی جو رابیل کو ختم کرنا چاہتی تھی۔

تین ماہ بعد ہائی کورٹ میں رابیل کا کیس شروع ہوا تھا۔ رابیل کی ماں نے ایک نئے وکیل کو رابیل کا کیس سونپا تھا۔

''می لارڈ! ٹرائیل کورٹ میں رابیل احمد کے کیس سے جڑے بہت سے ضروری واقعات کو نظر انداز کیا گیا تھا اور پولیس نے صحیح طور پر اس کی انویسٹی گیشن نہیں کی تھی۔ نمبر ایک رابیل کے آفس میں نصب سی سی ٹی وی کیمرے سے لی گئی تصویر جو عدالت کے ریکارڈ میں شامل ہے، اس میں صاف دیکھا جاسکتا ہے کہ اس دن جب میرا موکل آفس سے باہر نکلا اور اپنی گاڑی میں بیٹھا تو اس کے ہاتھ میں کوئی سوٹ کیس نہیں تھا۔ اس کے دفتر سے اقبال کے شوروم کا فاصلہ دس منٹ کی ڈرائیو کا ہے۔ اس تمام راستے میں جگہ جگہ کیمرے نصب ہیں۔ میرا موکل سیدھا شوروم پہنچا تھا جہاں لگے کیمرے میں اسے بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ اقبال نے اسے اپنے روم میں بلالیا تھا اور چائے پینے کے لیے روک لیا تھا۔ اس دوران اقبال کچھ دیر کے لیے اسے چھوڑ کر باہر گیا تھا۔ سب سے اہم وہ تصویر ہے جس میں اقبال کو سوٹ کیس گاڑی کی ڈکی میں رکھتے دیکھا جاسکتا ہے۔ اقبال نے گاڑی کی چابی رابیل سے حاصل کرلی تھی۔ رابیل اس سوٹ کیس سے لاعلم تھا۔'' وکیل کچھ دیر کے لیے رکا۔ جج صاحب نہایت انہماک سے وکیل کے دلائل سن رہے تھے اور ساتھ ساتھ ریکارڈز بھی چیک ہو رہے تھے۔

وکیل نے کہنا شروع کیا۔ ''نمبر دو رابیل کے موبائل فون سے کی گئی کالوں کا تمام ریکارڈ نکلوایا گیا ہے۔ ماہرین کے مطابق وائس اینالیس ریکارڈ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ڈرگز ڈیلرز کو کیے گئے فون رابیل کے فون سے ہی کیے گئے تھے لیکن اس میں سے ایک بھی آواز میرے موکل کی نہیں تھی۔ ہاں اقبال کی ہوسکتی ہے۔'' وکیل چند لمحے رکا پھر کہا۔

''اب میں آتا ہوں اس گیارہ مارچ کی رات ساڑھے دس بجے کے اس واقعے کی طرف جب پولیس نے ایک مخبر کی اطلاع کی بنیاد پر رابیل احمد کی کار کا پیچھا کیا تھا اور اسے روکنے کی کوشش کی تھی۔ یہ واقعہ ہائی وے پر پیش آیا تھا۔ یہ تمام واقعہ بھی سی سی ٹی وی کیمرے کے ریکارڈ میں موجود ہے اور بخوبی دیکھا جاسکتا ہے کہ جب پولیس نے رابیل کی کار کا پیچھا کرنا شروع کیا تھا تو رابیل نے اپنی گاڑی کی اسپیڈ بڑھائی نہیں بلکہ کم کی تھی اور جب پولیس کی گاڑی نے ان کی کار کو اوورٹیک کرکے روکا تو اقبال اتر کر بھاگا تھا نہ کہ رابیل اور یہ سب سے اہم نکتہ ہے جناب والا کہ اقبال اتر کر گاڑی سے بھاگا تھا اس لیے کہ وہ مجرم تھا اور اس [illegible] ریوالور تھا اور اسی نے پولیس پر فائرنگ کی تھی۔ اس [illegible] وہ جانتا تھا کہ کار میں منشیات سے بھرا سوٹ کیس ہے [illegible] کا علم رابیل کو نہیں تھا۔ ورنہ وہ سب سے پہلے گاڑی [illegible] اپنی جان بچاتا۔ اس نے وہاں سے فرار کی کوئی کوشش [illegible] کی تھی۔ مجرم اقبال نے رابیل کو اپنے مذموم مقاصد [illegible] استعمال کیا تھا۔ اس کی گاڑی استعمال کی تھی، اس کا فو[illegible] استعمال کیا تھا اور اس کی سادگی استعمال کی تھی۔ اس [illegible] لارڈ میرا موکل رابیل احمد بے گناہ ہے، اسے رہا [illegible] جائے۔'' وہ ایک نوجوان، پُرجوش اور ذہین وکیل تھا۔ اس کے دلائل اور ثبوت بڑے مضبوط تھے۔ اس نے [illegible] معنوں میں محنت کی تھی۔

کچھ دیر عدالت میں خاموشی چھائی رہی۔ جج صاحب بڑی باریک بینی سے تمام ریکارڈز کی چھان بین کررہے تھے۔ بالآخر وہ بولے۔

''پولیس نے اس کیس کی انویسٹی گیشن صحیح طور پر انجام نہیں دی اور سیشن کورٹ نے بھی بہت سے سنجیدہ معاملات سے صرف نظر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ جانے کتنے بے گناہ قید و بند کی صعوبتیں جھیلنے پر مجبور ہیں۔ وکیل صفائی کے دلائل، گواہوں کے بیانات اور تمام ریکارڈز کی چھان بین کے بعد عدالت اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ ملزم رابیل احمد بے گناہ ہے۔ اس لیے عدالت رابیل احمد کو باعزت بری کرتی ہے۔'' جج صاحب نے کہا تو رابیل احمد وہیں کٹہرے میں بیٹھ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا مگر یہ آنسو خوشی کے آنسو تھے۔ اس کی ماں اور سدرہ بھی اس کے قریب آگئے تھے۔ ماں اس سے لپٹ کر رو رہی تھی۔ ان کے بیٹے نے ناکردہ گناہ کی لمبی سزا بھگتی تھی مگر ان کے یقین اور حوصلے نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا تھا، نہ ہی سدرہ کی ہمت نے جواب دیا تھا۔ ان سب کا یقین اور محنت رنگ لائی تھی اور رابیل رہا ہو گیا تھا۔

کچھ عرصے بعد رابیل نے اپنا آفس دوبارہ جوائن کرلیا تھا۔ بادشاہ کو بھی رہائی مل گئی تھی۔ وہ جیل سے سیدھا رابیل سے ملنے اس کے گھر آیا تھا جہاں رابیل اور سدرہ کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ بادشاہ نے اس کی شادی پر اپنے سارے ارمان نکالے تھے۔ جیل نے اسے کچھ دیا یا نہیں دیا تھا، لیکن ایک بھائی سے ضرور ملوایا تھا، رابیل احمد کی صورت میں۔

''موسیٰ!'' وہ پوری طاقت سے چلّایا۔ ''اپنے رب العالمین سے کہہ مجھے معاف کردے۔''
معافی کا وقت گزر چکا تھا۔ اس نے اللہ کے برگزیدہ نبی کے دل کو جو تکلیف پہنچائی تھی، وہ ہرگز قابلِ معافی نہیں تھی۔ وہ [illegible] میں مزید دھنس گیا۔ اب صرف اس کی آنکھیں نظر آرہی تھیں جو تیزی سے ادھر ادھر گھوم رہی تھیں۔ پھر یہ آنکھیں بھی [illegible] گئیں۔ زمین برابر ہوگئی۔ اب کچھ اور آگے کی زمین کو جنبش ہوئی جہاں اس کا محل کھڑا تھا۔ محل نے بنیادیں چھوڑ دیں۔

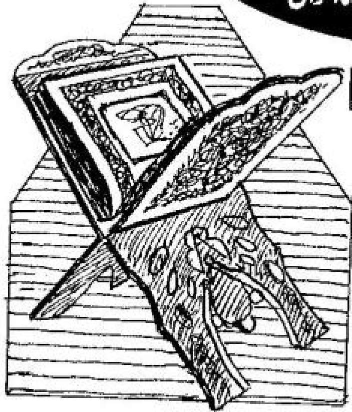
حضرت موسیٰ علیہ السلام

رضوانہ ساجد

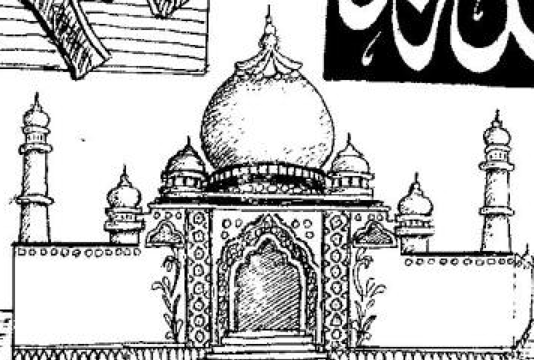
[illegible]ناہت کو خطرہ ہمیشہ سے رہا ہے اور ہمیشہ ہی رہے گا... یہ دور مختلف انبیاء کے آنے کا اور تبلیغی [illegible] کرتے رہنے کا تھا... ان میں مصریوں کے بادشاہ فرعون کا قصہ سرفہرست ہے... حیرت ہے قدرت [illegible] کیسے کیسے نظارے دکھاتی ہے۔ نجومیوں نے ایک انتہائی طاقتور بادشاہ کے لیے نومولود بچے [illegible]کو خطرے کی علامت بناکر اشارہ دے دیا تھا اور انہی اندیشوں میں اس وقت پیدا ہونے والے تمام [illegible] نومولود بچے قتل کردیے گئے ماسوائے ایک کے... جسے اللہ نے فرعون کی ہلاکت کا سبب اور اپنا پیغمبر بناکر دنیا میں اتارا تھا۔ اس دور کی تمام مائیں خوف و دہشت کا شکار تھیں۔ ایسے میں موسیٰ کی ماں کو غیبی آواز آئی ''اس کو دودھ پلا... پھر جب تجھے اس کی جان کا خطرہ ہو تو اسے دریا میں ڈال دے اور کچھ غم اور خوف نہ کر کہ ہم اسے تیرے ہی پاس لوٹائیں گے اور اسے پیغمبروں میں شامل کریں گے۔'' سبحان تیری قدرت، یہ وعدہ پورا ہوا۔

مصر کی سرزمین پر فرعونی سازشیں اور پیغمبر کے معجزات کا احوال

چھٹا حصہ







زمین نے اس کے محل کو اس کے خزانوں سمیت نگل لیا۔

''پھر ہم نے قارون اور اس کے محل کو زمین میں دھنسا دیا۔ پس اس کے لیے کوئی جماعت مددگار ثابت نہیں ہوئی جو خدا کے عذاب سے اسے بچائے اور وہ بے یارومددگار ہی رہ گیا۔ (قصص)

''آخرکار ہم نے قارون کو اور اس کے گھر والوں کو زمین میں دھنسا دیا تو اللہ کے سوا کوئی جماعت اس کی مددگار نہ ہوئی اور نہ وہ خود اپنی مدد آپ کر سکا۔ اور وہی لوگ جو کل اس کے رتبے کی تمنا کیا کرتے تھے، صبح کو کہنے لگے کہ ہائے شامت! اللہ ہی تو اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے رزق فراخ کر دیتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے۔ اگر اللہ ہم پر احسان نہ کرتا تو ہمیں بھی زمین میں دھنسا دیتا۔ کیا دیکھتے نہیں ہو کہ ناشکروں کو کبھی کامیابی نہیں ہوتی۔'' (قصص)

خدا کو عظیم ایلم دکھانا تھا لہٰذا قارون کی عبرت ناک ہلاکت کے بعد بھی فرعون کے دل میں نرمی پیدا نہ ہوئی بلکہ اور زیادہ سختی آ گئی۔ اس نے یہ تو کہا کہ موسیٰ .... واقعی بڑا جادوگر ہے، یہ نہیں کہا کہ یہ جادو نہیں معجزہ ہے کیونکہ یہ کہنے میں اس کی ربوبیت پر حرف آتا تھا۔

اس کے مخبروں نے جب قارون کے زمین میں دھنس جانے کی اطلاع دی تو وہ سکتے میں آ گیا۔ اسے اپنا انجام نظر آنے لگا تھا لیکن خوف زدہ ہونے میں اس کی سبکی تھی۔ اس نے درباریوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''میرے رب ہونے نے مجھے بچا لیا۔ موسیٰ .... کا جادو مجھ پر نہ چل سکا اور قارون اس کا نشانہ بن گیا لیکن یاد رکھو یہ اس کا آخری جادو تھا۔ اس کے بعد وہ کوئی جادو نہ دکھا سکے گا اور میں اسے یہاں سے جانے نہیں دوں گا۔''

ہامان اس کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ اس نے فرعون کی بات کو آگے بڑھایا۔

''خداوند! میں آپ کے باپ کے زمانے سے دربار میں آتا جاتا رہا ہوں۔ میں مصری جادوگروں کے بڑے بڑے کارنامے دیکھ دیکھ کر بوڑھا ہو گیا ہوں لیکن میں نے موسیٰ علیہ السلام سے بڑا جادوگر نہیں دیکھا۔ اگر وہ یہ کہنا چھوڑ دے کہ وہ کسی ان دیکھے خدا کا بھیجا ہوا رسول ہے تو ہمارے لیے بڑے کام کا ہے۔''

''وہ ہمیں خوف زدہ کر کے بادشاہت پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ بس یہی اس کی بھول ہے۔'' ایک اور درباری نے کہا۔

''اب تم لوگ یہ بتاؤ کہ اس پر قابو کیسے پایا جائے؟''

''کچھ دن اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ خود ہی راہِ راست پر آ جائے گا۔''

''مجھے اس سے زیادہ اس کی قوم سے خطرہ ہے۔ قارون کی ہلاکت انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے حالانکہ وہ جادو سے ہلاک ہوا ہے لیکن وہ لوگ اسے معجزہ سمجھیں گے اور موسیٰ .... پر ایمان لے آئیں گے۔ اگر ایسا ہوا تو وہ لاکھوں ہیں۔ مصری قوم پر چڑھ دوڑیں گے۔''

''میری تجویز تو یہ ہے کہ آپ مصریوں کو جمع کر کے ان سے خطاب کریں۔ اس وقت ان کا حوصلہ بڑھانے کی ضرورت ہے ورنہ ان کا جھکاؤ بھی موسیٰ .... کی طرف ہو جائے گا۔''

فرعون کو یہ تجویز پسند آئی۔ اس نے اسی وقت ڈھنڈورچیوں کو حکم دیا کہ تمام مصریوں کو حکم پہنچے کہ کل صبح سورج نکلتے ہی محل کے سامنے میدان میں جمع ہو جائیں۔ انہیں دیوتاؤں کی طرف سے پیغام پہنچایا جائے گا۔

شہر جشن میں خوف اور سوگ کی فضا تھی۔ گھروں کے چولہے ٹھنڈے پڑے تھے۔ عورتیں اور بچے سخت ڈرے ہوئے تھے۔ مرد جگہ جگہ ٹولیاں بنائے کھڑے تھے۔ ہر طرف قارون کی ہلاکت کا ذکر ہو رہا تھا۔

''وہ اگر جادوگر بھی ہے تو اس کی تابعداری کے سوا ہمارے پاس کوئی راستہ نہیں۔''

''یہ کیسا جادوگر ہے کہ ہمارے دیوتاؤں نے بھی چپ سادھ لی ہے۔''

''موسیٰ .... جب چاہتا ہے کوئی نہ کوئی جادو دکھا دیتا ہے۔''

''پہلے اس نے اس بدکار عورت کی زبان بند کی اور پھر قارون اور اس کے محل کو زمین میں دھنسا دیا۔''

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ جو بھی موسیٰ .... کے خلاف آواز اٹھائے گا اس کا یہی حال ہوگا۔''

''فرعون کے محل میں خاموشی ہے۔ فرعون اسے قتل کیوں نہیں کرا دیتا۔ کیا موسیٰ .... نے اس کے بھی ہاتھ پاؤں باندھ دیے ہیں۔''

''خداوند بھی کچھ نہ کچھ سوچ رہے ہوں گے۔''

''برسوں گزر گئے ہیں۔ ہماری جان مشکل میں ہے۔''

''میں تو کہتا ہوں بنی اسرائیل کو جانے دیں۔ ہم اپنے کام خود کر لیں گے۔ ان روز روز کے عذابوں سے تو نجات ملے گی۔''

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ڈھنڈورچیوں کی آوازیں کانوں میں آنے لگیں۔ تمام قبطیوں کو کل صبح محل کے سامنے جمع ہونے کا کہا جا رہا تھا۔

''آخر دیوتاؤں نے ہماری سن لی۔ کل کوئی نہ کوئی فیصلہ ہو ہی جائے گا۔''

کل صبح کیا ہوگا؟ اب گفتگو کا رخ اس طرف مڑ گیا تھا۔

وہ رات مصریوں نے جاگ کر گزاری اور صبح ہوتے ہی میدان میں جمع ہونے کو پہنچ گئے۔

فرعون محل کے جھروکے میں آیا۔ اس کے مصاحب اس کے اردگرد تھے۔ اسے دیکھتے ہی مصری سجدے میں گر گئے لیکن سجدے میں گرنے والوں کی تعداد کم تھی۔ اس تبدیلی کو فرعون نے بھی محسوس کیا۔

اسے اپنے خطاب میں اس تبدیلی کو مدنظر رکھنا تھا۔

''قارون کی ہلاکت کے بعد تو تمہیں یقین آ گیا ہوگا کہ میں ہی تمہارا رب ہوں۔ قارون ایک روز پہلے ہی اپنی بے پناہ دولت کے گھمنڈ میں تلخ کلامی کر کے گیا تھا۔ یہ تک کہہ کر گیا تھا کہ موسیٰ .... پر ایمان لے آئے گا۔ پھر تم نے دیکھا اس کا کیا ہوا۔ موسیٰ .... میں اگر اتنی طاقت ہوتی تو وہ میرے محل کو مسمار کرتا۔ دیوتاؤں نے مجھے بتایا ہے کہ قارون نے مجھ سے گستاخی کی تھی۔ دیوتاؤں نے اسے زمین میں دھنسا دیا اور نام موسیٰ .... کے جادو پر رکھ دیا۔ پس معلوم ہوا جو بھی موسیٰ .... پر ایمان لانے کے بارے میں سوچے گا دیوتا اس کے ساتھ یہی سلوک کریں گے۔

''رہی یہ بات کہ میں نے موسیٰ .... کو قتل کیوں نہیں کرا دیا، یہ بات میرے اختیار سے باہر نہیں تھی لیکن دیوتا اسے زندہ رکھنا چاہتے ہیں کیونکہ وہ زندہ ہوگا تو مجھ پر ایمان لائے گا۔ تم دیکھنا موسیٰ .... بہت جلد اپنی حرکتوں سے باز آ جائے گا اور مجھ پر ایمان لے آئے گا۔ تم لوگ پھر بھی موسیٰ .... پر دباؤ ڈالنے کے لیے اسرائیلیوں پر مظالم کا سلسلہ بڑھا دو۔ تم کسی اسرائیلی کی جان بھی لے لو گے تو تم سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی۔ دیوتا تمہاری حفاظت کے لیے موجود ہیں۔ موسیٰ .... کا جادو بھی بہت جلد دم توڑنے والا ہے۔ وہ کرشمے دکھا دکھا کر تھک گیا لیکن مجھے جھکا نہیں سکا۔''

فرعون تقریر کر کے نیچے اترا۔ باہر میدان میں اس کے نام کے نعرے لگ رہے تھے۔ مصریوں میں نئی زندگی بیدار ہو گئی تھی۔ اب ان کی سمجھ میں آیا تھا کہ قارون کیوں ہلاک ہو گیا۔ جن لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کا فیصلہ کر لیا تھا وہ دل ہی دل میں توبہ کر رہے تھے کہ کہیں ان کا انجام بھی وہی نہ ہو جس سے قارون دوچار ہوا تھا۔

سب سے بڑی خوشی اس بات کی تھی کہ اسرائیلیوں کے ساتھ ناروا سلوک کرنے کی اجازت مل گئی تھی۔

جلد ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس شکایتیں آنے لگیں کہ مصریوں نے اسرائیلیوں کا جینا حرام کر دیا ہے۔ راستے میں جو اسرائیلی جہاں ملتا ہے اسے طرح طرح سے تنگ کیا جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو برا بھلا کہہ کر اسے اکسایا جاتا ہے اور جب وہ کچھ کہتا ہے تو اسے مارا پیٹا جاتا ہے۔ کوئی ان کی فریاد سننے والا نہیں۔ جو اسرائیلی محنت مزدوری کرتے ہیں ان سے وقت سے زیادہ کام لیا جا رہا ہے اور اجرت بھی نہیں دی جاتی۔

اسرائیلیوں کے جو قبائل مصریوں کے علاقے میں تھے، ان کا تو بہت ہی برا حال تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام مصریوں پر واضح کر رہے تھے کہ نشانات کے ظہور کے بعد بھی یہ لوگ نافرمانی اور ہٹ دھرمی سے باز نہیں آئے۔

صبر کی انتہا ہو گئی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہر طریقہ استعمال کر لیا تھا لیکن یہ قوم مخالفت سے باز نہیں آ رہی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اپنی قوم کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ عجیب بے بسی کے عالم میں انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔

''اے ہمارے پروردگار! تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیا کی زندگی میں زینت اور اموال دے رکھا ہے۔ اے پروردگار ان کا یہ مال اس لیے ہے کہ تیرے رستے سے گمراہ کریں۔ اے پروردگار! ان کے اموال کو برباد فرما اور ان کے دلوں کو سخت فرما دے تاکہ ایمان نہ لائیں جب تک کہ عذابِ الیم نہ دیکھ لیں۔''

خدا نے فرمایا۔ ''تمہاری دعا قبول کر لی گئی تو تم ثابت قدم رہنا اور بےعقلوں کے رستے پہ نہ چلنا۔''

یہ عظیم دعا تھی جو اللہ کے ہم کلام حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے دشمن فرعون کے خلاف کی ... اور اللہ کے غضب کو پکارا کیونکہ وہ حق کی اتباع سے تکبر کرتا تھا اور اللہ کے رستے سے روکتا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنی قوم کے گھروں کو مصریوں کے گھروں سے جدا کر کے علا... میں تعمیر کروائیں تاکہ جب کوچ کا حکم ملے تو آسانی سے خفیہ نکل سکیں۔

اس حکم سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اشارہ مل گیا کہ کوچ کا وقت قریب آگیا ہے۔ انہوں نے اسرائیلیوں کو ... کے علاقے میں رہتے تھے اپنے پاس بلالیا۔ مصری یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ خروج کی تیاری کر رہے ہیں۔ ... رہے تھے کہ ہمارے مظالم سے بچنے کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں...... اپنے علاقے میں بلالیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس گئے اور اسے اس کا وعدہ یاد دلایا لیکن اس نے جانے کی اجازت ... حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کی اجازت سے ایک اور اجازت طلب کی۔

”اچھا ہم مصر سے نہیں جاتے۔ ہمیں اتنی اجازت تو دے کہ ہم عیدگاہ کے میدان میں جا کر قربانی کریں اور ... ادا کرسکیں۔“

”میں اس کی اجازت بھی نہیں دوں گا۔ تم اس بہانے سے نکلو گے اور ملک سے باہر چلے جاؤ گے۔“

”دیکھ تو ایسا دل سخت مت کر ورنہ تجھے عذاب کا منہ دیکھنا پڑے گا۔“

”تو اپنا جادو دکھالے۔ میں کسی دھمکی سے ڈرنے والا نہیں۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام دربار سے باہر آئے تو سخت رنجیدہ تھے۔ تمام تیاریاں مکمل ہو گئی تھیں اور عید منانے کی اجا... نہیں مل رہی تھی جبکہ خدا کا حکم یہ تھا کہ عیدگاہ کے میدان میں جمع ہو جاؤ۔

اللہ کے جلال نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آواز دی۔

”اپنا ہاتھ آسمان کی طرف بڑھا تاکہ ملک مصر میں تاریکی چھا جائے۔ ایسی تاریکی جسے ٹٹول سکیں۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا ہاتھ آسمان کی طرف بڑھایا۔ آسمان کو چاروں طرف سے بادلوں نے ڈھانپ ... سورج کی ایک کرن بھی ان بادلوں کو پار نہ کرسکی۔ دن میں رات کا اندھیرا ہو گیا۔ اندھیرا بھی ایسا کہ تین دن تک نہ تو کسی ... کسی کو دیکھا اور نہ کوئی اپنی جگہ سے ہلا۔

جب تین دن اسی عالم میں گزر گئے تو فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بلوایا۔

”تم اگر جانا چاہتے تو جاؤ لیکن اپنے جانوروں کو یہیں چھوڑ جاؤ تاکہ تم اپنے جانوروں کی خاطر واپس آؤ۔“

”ہم اپنے جانوروں کو چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔ ہمیں اپنے خدا کی راہ میں قربانی کرنا ہے لہٰذا چوپائے ہمارے ساتھ جا... گے۔ ان کا ایک کھر بھی ہم اپنے پیچھے نہیں چھوڑ سکتے۔“

”کیا تجھے یہ گمان ہے کہ ہم تیرے پیچھے اسرائیلیوں کے جانور غائب کرادیں گے؟“

”تجھ سے یہ بھی بعید نہیں لیکن اس وقت تو ہمیں قربانی کی جلدی ہے۔ اگر ہم اپنے جانور یہاں چھوڑ گئے تو قربان کیا کریں گے۔“

”میں جانوروں کو لے جانے کی اجازت نہیں دے سکتا اور اب تو میرے سامنے سے چلا جا۔ دوبارہ میرا منہ دیکھ... مت آنا کیونکہ جس دن تو نے میرا منہ دیکھا مارا جائے گا۔“

”اے فرعون! تو ٹھیک کہتا ہے۔ میں پھر تیرا منہ کبھی نہیں دیکھوں گا۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے ادا ہونے والے ان الفاظ کو فوراً قبولیت حاصل ہوئی۔ ایسے اسباب مہیا ہو... کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دوبارہ فرعون کا منہ نہیں دیکھا۔ اللہ کا حکم ہوا۔ ”اے موسیٰ! اب وقت آگیا ہے کہ تم بنی اسرائیل ... مصر سے نکال کر باپ دادا کی سرزمین کی طرف نکل جاؤ۔“ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ حکم فوراً اپنی قوم کے درمیان جا... کردیا۔ نکلنے کے لیے رات کا اندھیرا ضروری تھا لہٰذا رات ہی میں نکلنا تھا۔ اس حال میں نکلنا پڑا کہ مصریوں کو کانوں کان ... نہ ہو۔ اگر حال کھل بھی جاتا تو یہی سمجھا جاتا کہ اسرائیلی شہر سے باہر عیدگاہ کے میدان کی طرف جارہے ہیں۔ وہاں جا... اجازت فرعون پہلے ہی دے چکا تھا۔

توریت کے مطابق نکلنے والے بال بچوں کو چھوڑ کر چھ لاکھ مرد تھے۔ بھیڑ، بکریاں، گائے بیل وغیرہ ان کے ساتھ تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حکم خداوندی کے بموجب خشکی کا راستہ اختیار کرنے سے گریز کیا اور اپنی قوم کو لے کر بحر ... کی راہ پر ہولیے۔ بنی اسرائیل کی عادت تھی کہ سوال بہت کرتے تھے۔ اس عادت کا مظاہرہ انہوں نے اس وقت بھی کیا۔

”تو ہمیں خشکی کے راستے سے کیوں نہیں لے جاتا۔ یہ راستہ نزدیک پڑتا ہے۔ تو ہمیں کیوں تھکا تھکا کے مار دینا چا...

...جو ہمیں سمندر کی راہ پر لے جارہا ہے۔“ ان لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا۔

”میں جو کام بھی کرتا ہوں خدا کے حکم کے مطابق کرتا ہوں۔ مجھ سے یہی کہا گیا ہے کہ میں بحر قلزم کی طرف جاؤں۔ ...ی بہتری اسی میں ہوگی اور اب تم کوئی سوال مت کرنا۔“

اسرائیلی خاموش ہو گئے لیکن آپس میں باتیں کرتے چلے جاتے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مصلحت ہماری سمجھ ...تو آئی نہیں۔ قریب کا راستہ چھوڑ کر دور کا راستہ اختیار کرنا کہاں کی دانش مندی ہے۔

”اب تو ہم موسیٰ....... کے رحم و کرم پر ہیں۔ وہ جس طرف لے جائے ہمیں جانا پڑے گا۔“

”اس سے تو ہم مصر ہی میں اچھے تھے۔“

”جان کا خوف الگ لگا ہوا ہے کہ کہیں فرعون کی فوجیں ہمیں گھیر نہ لیں۔“

”ہم تو جلدی میں کھانے کا سامان بھی ساتھ نہ لے سکے۔“

”ہم مسلح ہو کر ضرور نکلے ہیں لیکن یہ ہتھیار ہم کھا تو نہیں سکتے۔“

”موسیٰ ہمیں نہ جانے کس سے جنگ کرانے لے جارہا ہے جو مسلح ہونے کا حکم دیا تھا۔“

وہ یہ معجزہ دیکھ کر بھی ایسی باتیں کررہے تھے کہ آسمان پر آگ کا ایک ستون ان کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا جو رات کو ...ن بنائے ہوئے تھا اور انہیں راستہ دکھا رہا تھا۔

جب سمندر سامنے آگیا اور تھکن بھی بہت تھی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سب کو حکم دیا کہ کنارے پر ڈیرے ڈال ...یے جائیں کچھ تھکن اترے گی تو آگے چلیں گے۔

بنی اسرائیل کے نکلنے کے بعد ہی فرعون کے پرچہ نویسوں نے اسے اطلاع دے دی کہ بنی اسرائیل فرار ہونے کے ...لیے شہروں سے نکل گئے۔

فرعون اس وقت سو رہا تھا جب اسے یہ اطلاع ملی۔ اس نے آرام کا تکیہ اٹھایا اور گھبراہٹ میں اپنے وزیروں اور ...لاوروں کو جمع کیا۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ وہ لوگ پیدل چلے ہیں۔ تیز رفتار رتھوں پر ان کا تعاقب کر کے سمندر کے کنارے ...کڑا جاسکتا ہے۔

اس نے جلدی جلدی اپنا لشکر اکٹھا کیا۔ اپنا رتھ تیار کروایا۔ اس کے سردار اپنے اپنے رتھوں میں بیٹھ کر اس کے ساتھ ...ہو گئے۔ یہ رتھ دوڑتے ہوئے آگے کی طرف بھاگے۔ اس کا لشکر اس کے پیچھے پیچھے چلا۔

اس کا لشکر کیا تھا، خشکی پر ایک سمندر تھا۔ سولہ لاکھ جنگجو تھے جو سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق گھوڑوں پر دوڑتے چلے ...جا رہے تھے۔

طلوع آفتاب کا وقت تھا کہ گرد کے طوفان نے بنی اسرائیل کو اس طرف دیکھنے پر مجبور کیا۔ ہر طرف شور مچ گیا کہ فرعون ...کی فوجیں تعاقب میں چلی آرہی ہیں۔ بنی اسرائیل میں بھی چھ لاکھ مسلح افراد تھے جو لڑ سکتے تھے لیکن غلامی نے ان کی شجاعت ...ان سے چھین لی تھی۔ فرعون کا خوف ایسا دلوں میں بیٹھ گیا تھا کہ فرعون کی آمد کا سنتے ہی رگوں میں خون جم گیا۔ بجائے اس کے ...کہ اپنے اپنے ہتھیاروں کی طرف لپکتے، حضرت موسیٰ علیہ السلام سے الجھنے لگے۔

”کیا مصر میں قبروں کی جگہ نہیں تھی جو تو مرنے کے لیے ہمیں بیابان میں لے آیا۔ تو نے ہمارے ساتھ یہ کیسی دشمنی کی کہ ...ہمیں مصر سے نکال لایا۔ کیا ہم تجھ سے مصر میں یہ بات نہیں کہتے تھے کہ ہم کو رہنے دے کہ ہم مصریوں کی خدمت کریں۔ ...ہمارے لیے مصریوں کی خدمت کرنا بیابان میں مرنے سے بہتر ہوتا۔“

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ گرد کا طوفان سمٹ گیا۔ فرعون اپنے رتھ پر سوار نظر آیا۔ اس کے جلو میں رتھوں پر سوار اس کے ...سردار تھے۔ ٹڈی دل لشکر ان کے پیچھے تھا۔

اب حال یہ تھا کہ آگے سمندر تھا، پیچھے فرعون کا لشکر اور دائیں بائیں بلند و بالا پہاڑوں نے رستہ گھیرا ہوا تھا۔ کسی طرف ...کوئی راہِ فرار نہیں تھی۔

اللہ کے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو بار بار تسلی دے رہے تھے۔ ”مت گھبراؤ، خدا کا وعدہ سچا ہے۔ اللہ تم کو ...نجات دے گا۔ تم ہی کامیاب ہو گے۔“

فرعون اپنے لشکر کے آنے کے انتظار میں کچھ فاصلے پر رک گیا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اس وقت بنی اسرائیل کے لشکر کے درمیان میں تھے۔ آپؑ فوراً درمیان سے نکلے اور سامنے آگئے۔ حضرت ہارون علیہ السلام اور حضرت یوشع بن نون ...... آپ کے ہمراہ دائیں بائیں تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی جلالی نظریں سمندر کی طرف اٹھائیں، دیکھا کہ سمندر اپنی سخت موجوں میں جوش پر ہے۔

''اسی جگہ کا مجھے حکم ہوا ہے۔'' آپ کی زبانِ اقدس سے یہ جملہ ادا ہوا۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ آپ کس جگہ کا حکم فرما رہے ہیں۔ پروردگار نے اپنے ہم کلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی۔

''اے موسیٰ سمندر پر اپنا عصا ماریئے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا سمندر کے پانی پر مارا اور زبان سے فرمایا۔ ''اے سمندر! اللہ کے حکم سے راستوں میں پھٹ جا۔''

یہ کہتے ہی پانی دونوں جانب سے پھٹ کر دو پہاڑوں کی طرح کھڑا ہو گیا اور بیچ میں راستہ نکل آیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حکم دیا کہ سمندر پار کر جاؤ۔ تمام بنی اسرائیل اپنے جانوروں سمیت اس طرح بھاگنے لگے جیسے خشکی پر بھاگتے ہوں۔ ہر ایک کو یہ سوچ کر جلدی ہو رہی تھی کہ کہیں اس کے پہنچنے سے قبل پانی دوبارہ نہ آجائے۔

فرعون پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا اور بے قرار تھا کہ اس کا لشکر جلد پہنچے تاکہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تعاقب میں اسی راستے کو اختیار کرے۔ فرعون کا لشکر اس کے قریب پہنچا تو فرعون اپنی خدائی کا رعب دکھانے کے لیے ان سے مخاطب ہوا۔

''تم میری کرشمہ سازی دیکھ رہے ہو۔ میں نے بنی اسرائیل کو دھوکا دینے کے لیے پانی میں خشکی کا راستہ بنا دیا۔ بنی اسرائیل میرے فریب میں آگئے ہیں اور انہوں نے اس رستے میں قدم رکھ دیا ہے۔ تم بھی اس راستے سے جاؤ اور انہیں راستے میں گھیر لو۔ چلو میں بھی تمہارے آگے آگے چلتا ہوں تاکہ راستہ بتاتا چلوں۔''

وہ رتھ سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہوا اور گھوڑا دوڑاتا ہوا اس جگہ کے قریب آیا جہاں پانی میں راستہ بنا تھا۔ وہ سمندر کا یہ پُرہیبت نظارہ دیکھ کر مرعوب ہو گیا اور دل میں سوچنے لگا، میں اسے جادو نہیں کہہ سکتا۔ یہ سب کچھ کرنے والی تو پروردگار کی ذات ہی ہو سکتی ہے۔ جس پر ایمان لانے کی دعوت موسیٰ مجھے دیتا رہا تھا۔ وہ ایسا مرعوب ہوا کہ پیچھے ہٹ آیا اور آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی، جب واپس پلٹا تو پھر اس کے غصے نے سر اٹھایا اور سوچنے لگا یہ تو بہت برا ہوگا کہ میں بنی اسرائیل کو پکڑے بغیر واپس چلا جاؤں۔ وہ میرے سامنے سے ہو کر گزرے جا رہے ہیں اور میں دیکھ رہا ہوں۔ میری شان و شوکت میرے لشکر کے سامنے کیا رہ جائے گی۔

اس کی فاسق طبیعت نے اسے برانگیختہ کیا۔ اس کے لشکری بھی آگے بڑھتے ہوئے ڈر رہے تھے۔ اس نے انہیں سختی سے ڈانٹا۔

''تم بھاگنے کی فکر میں ہو۔ دیکھتے نہیں کہ سمندر کیسے اپنا سینہ چیر کر میرے لیے راستہ مہیا کر رہا ہے۔''

اس کی اندرونی کیفیت اس سے بہت مختلف تھی۔ وہ خدائی عذاب کو بہت قریب محسوس کر رہا تھا لیکن اپنی خدائی برتری کو بھی قائم رکھنا چاہتا تھا۔

کبھی آگے بڑھتا تھا، کبھی پیچھے ہٹتا تھا۔ اسی طرح کچھ دیر ہوتا رہا۔ قریب تھا کہ فرعون پیچھے ہٹ آتا اور اس کے ساتھ اس کے لشکری بھی لوٹ آتے لیکن اسی وقت ایک کرشمۂ قدرت ظہور میں آیا جس نے بدبخت فرعون کو بے بس کر دیا۔

حضرت جبرائیلؑ ایک جوان خوب صورت گھوڑی پر نمودار ہوئے۔ وہ گھوڑی فرعون کے گھوڑے کے قریب سے اٹھکیلیاں کرتی ہوئی گزری۔ گھوڑا اس کی طرف دیکھ کر لپکا۔ حضرت جبرائیلؑ نے اپنی گھوڑی کو تیزی سے دوڑایا۔ فرعون کا گھوڑا بھی فرعون کو اپنی پیٹھ پر لادے لادے تیزی سے دوڑا۔ فرعون نے بہت کوشش کی کہ اپنے گھوڑے کو روکے لیکن وہ اس پر قابو نہ پا سکا۔ حضرت جبرائیلؑ اپنی گھوڑی کو لے کر سمندری راستے میں داخل ہو گئے۔ فرعون کا گھوڑا بھی سمندری راستے میں داخل ہو گیا۔

حضرت جبرائیلؑ اور ان کی گھوڑی فرعون کے لشکر کی آنکھوں سے پوشیدہ تھی۔ لشکر تو یہی سمجھ رہا تھا کہ فرعون نے بنی اسرائیل کے تعاقب میں اپنا گھوڑا سمندری راستے پر ڈال دیا ہے۔ اس کے سرداروں اور لشکریوں کی غیرت نے جوش مارا اور وہ بھی اس کی اتباع کرتے ہوئے دوڑتے ہوئے داخل ہو گئے اور آگے ہی آگے بڑھتے گئے۔ ان میں سرداروں کے رتھ بھی تھے اور لشکریوں کے گھوڑے بھی۔

بنی اسرائیل نے پلٹ کر دیکھا تو خوف زدہ ہو گئے۔ وہ پھر چلائے، فرعون کا لشکر ہمیں پکڑ چکا۔

''چپ چاپ چلتے رہو اور خداوند کے نجات کے کام کو دیکھتے رہو جو وہ آج تمہارے لیے کرے گا کیونکہ جن مصریوں کو

تم دیکھ رہے ہو پھر کبھی ابد تک نہ دیکھو گے۔ خداوند تمہاری طرف سے جنگ کرے گا اور تم خاموش رہو گے۔'' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تسلی دی۔ ان لوگوں کی سمجھ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی باتوں کا مطلب نہیں آ رہا تھا لیکن چلتے رہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ان کی وہی حالت تھی جو کنارے پر تھی۔ دائیں بائیں پانی دو پہاڑوں کی طرح کھڑا ہوا تھا۔ آگے سمندر تھا جو انہیں راستہ دیتا جا رہا تھا۔ پیچھے پلٹ کر دیکھتے تو فرعون کا لشکر تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام مطمئن تھے کیونکہ انہیں بتا دیا گیا تھا۔

''تجھے نہ تو تعاقب کرنے والوں سے اندیشہ ہوگا، نہ کسی طرح کا خطرہ۔''

بنی اسرائیل نے اپنی رفتار بڑھا دی تھی لیکن تیز رفتار رتھوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ فاصلہ لحہ بہ لحہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ وہ پیچھے پلٹ پلٹ کر دیکھتے جاتے تھے کہ اچانک کئی اسرائیلی ایک ساتھ چیخے۔

''وہ دیکھو، ان کے رتھوں کے پہیے نکل گئے ہیں۔ وہ لوگ رکنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔''

''خداوند ہماری مدد کر رہا ہے۔ جلد سے جلد کنارے تک پہنچنے کی کوشش کرو۔ ان کو دیکھنے کے لیے رک گئے تو یہ لوگ چلتے ہوئے ہمارے سروں تک پہنچ جائیں گے۔''

خراب ہونے والے رتھوں نے اس طرح راستہ روک لیا تھا کہ پیچھے آنے والے لشکر کو آگے بڑھنے کے لیے جگہ نہیں مل رہی۔ فرعون کی آواز دور تک سنائی دے رہی تھی۔

''اپنے گھوڑے یہیں چھوڑ دو اور اسرائیلیوں کا تعاقب پیدل کرو۔ اگر یہ کنارے تک پہنچ گئے تو ہمارے ہاتھ نہ آسکیں گے۔'' اس کے لشکر نے جگہ بنانے کی کوشش کی۔ گھوڑوں کو لے جا نہیں سکتے تھے۔ رتھوں کو پھلانگتے ہوئے پیدل چلے لیکن کافی وقت ضائع ہو چکا تھا۔ بنی اسرائیل کا ایک ایک فرد دوسرے کنارے پر سلامتی سے پہنچ گیا۔ ان کے جانور بھی کوئی نقصان اٹھائے بغیر پار اتر گئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی۔

''اے موسیٰ اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھا تاکہ پانی مصریوں کے رتھوں اور سواروں پر بہنے لگے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک نظر اپنے لوگوں پر ڈالی کہ تمام لوگ سلامتی سے آگئے ہیں یا نہیں۔ جب یقین آگیا تو انہوں نے خدا کے حکم کے مطابق اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھایا۔ پانی پھر اصل حالت پر آنے لگا۔ یہ دیکھ کر مصری الٹے پاؤں بھاگے۔ ان کی چیخوں سے سمندر گونج رہا تھا۔ فرعون کا لشکر جس طرف بھاگتا تھا، پانی کی دیوار اس کے اوپر گر پڑتی تھی۔ سمندر کی تلاطم خیز موجیں فرعون کو اٹھا رہی تھیں، کبھی غوطہ دے رہی تھیں اور بنی اسرائیل اپنی آنکھوں اور دلوں کو ٹھنڈک پہنچا رہے تھے کہ کیسا عظیم الشان اور مہلک امر پیش آیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا فرمائی تھی۔ ''اے پروردگار ان کے اموال کو برباد فرما اور ان کے دلوں کو سخت فرما جب تک کہ یہ عذاب الیم نے دیکھ لیں۔''

اس دعا کا قبولیت کا منظر سامنے نظر آ رہا تھا۔ فرعون اور اس کا لشکر عذاب الیم سے دوچار تھا اور اس کھلے عذاب کو دیکھ کر پکار رہا تھا۔

''میں اسی وحدہٗ لاشریک ہستی پر ایمان لاتا ہوں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور فرماں برداروں میں سے ہوں۔''

وہ تائب بھی ہوا اور ایمان بھی لایا لیکن اس وقت جب موت سامنے دیکھ لی۔

خدا کی طرف سے جواب آیا۔

''اب یہ کہہ رہا ہے حالانکہ اس سے پہلے جو اقرار کا وقت تھا اس میں انکار اور خلاف ہی کرتا رہا اور درحقیقت تو مفسدوں میں سے تھا۔''

اس موقع پر فرعون کی پکار پر درگاہِ الٰہی کی جانب سے یہ بھی جواب دیا گیا۔

''آج کے دن ہم تیرے جسم کو ان لوگوں کے لیے جو تیرے پیچھے آنے والے ہیں، نجات دیں گے کہ وہ عبرت کا نشان بنے۔''

فرعون کی لاش آج تک محفوظ ہے اور سمندر میں تھوڑی دیر غرق رہنے کی وجہ سے اس کی ناک کو مچھلی نے کھا لیا اور آج مصری عجائب خانے میں تماشائے خاص و عام ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ''جب فرعون نے یہ کہا میں ایمان لایا کہ بے شک اس کے سوا کوئی معبود نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے تو مجھے جبرائیل نے کہا۔ اے محمدؐ! کاش اگر آپ اس وقت دیکھ لیتے میں سمندر کی کیچڑ لے کر اس کے منہ میں ٹھونس رہا تھا کہ کہیں اس پر رحمتِ خداوندی کو جوش نہ آجائے۔''

بنی اسرائیل کو شک ہو گیا تھا کہ فرعون مرا نہیں ہے حتیٰ کہ بعض کہہ بھی اٹھے کہ فرعون مرا نہیں ہے۔ تب اللہ نے سمندر کو

[illegible] کی لاش کو ساحل پر پھینک دے۔ ایک قول ہے کہ پانی کی سطح پر پھینکنے کا حکم دیا اور ایک قول ہے [illegible] [illegible] کسی اونچی بلند جگہ پر پھینکنے کا حکم ہوا۔ بہرصورت وہ اپنے لباس کے ساتھ باہر لایا گیا جس سے اس کو پہچانا جاتا تھا

جب بنی اسرائیل نے فرعون اور دوسرے مصریوں کی لاشوں کو کنارے پر پڑے ہوئے دیکھ لیا تو خدا پر اور موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے۔

ان کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تسبیح پڑھی اور بنی اسرائیل نے پوری طرح ان کا ساتھ [illegible]

حضرت مریم، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہمشیرہ بھی موجود تھیں۔ یہ وہی ہمشیرہ تھیں جو اس وقت دریائے نیل کے کنارے [illegible] تھیں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بچے تھے اور ان کے صندوق کو نیل کا پانی فرعون کے محل کی طرف لے جا رہا تھا۔ انہوں [illegible] فرعون کے لوگوں سے کہا تھا، میں تمہیں ایسے گھر کا پتا بتاتی ہوں جو اس بچے کو دودھ پلائے گا اور اچھی طرح پرورش کرے گا۔ کو [illegible] کی کوششوں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام دوبارہ اپنے گھر آئے تھے اور اپنی ہی ماں کا دودھ پیا تھا۔

یہ اس وقت بہت بوڑھی ہو چکی تھیں۔ انہوں نے دف ہاتھ میں لیا اور جواب میں تسبیح پڑھنے لگیں۔ دوسری عورتیں [illegible] ہاتھوں میں لیے جھومنے لگیں۔

☆☆☆

قرآن عزیز نے اس عظیم واقعے (غرق فرعون) کو مختلف آیات میں مختلف طرح سے بیان کر دیا ہے۔

''اور حکم بھیجا ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کہ رات کو لے نکل میرے بندوں کو البتہ تمہارا پیچھا کریں گے پھر بھیجے فرعون [illegible] شہروں میں نقیب، یہ لوگ جو ہیں سو ایک جماعت ہے تھوڑی سی اور وہ یقیناً ہم سے دل جلے ہوئے ہیں اور ہم سارے ان [illegible] رکھتے ہیں پھر نکال باہر کیا ہم نے ان کو باغوں اور چشموں سے اور خزانوں اور مکانوں سے۔ اسی طرح اور ہاتھ لگا دیں ہم [illegible] چیزیں بنی اسرائیل کے پھر پیچھے پڑے ان کے سورج نکلنے کے وقت پھر جب مقابل ہوئیں دونوں فوجیں کہنے لگے موسیٰ کے لوگ [illegible] تو پکڑے گئے۔ کہا ہرگز نہیں، میرے ساتھ میرا رب ہے، وہ مجھ کو راہ بتائے گا۔ پھر حکم بھیجا ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کہ مار [illegible] سے دریا کو پھر دریا پھٹ گیا تو ہو گئی ہر ایک پھانک جیسے بڑا پہاڑ اور بس پہنچا دیا ہم نے ان دوسروں [illegible]۔ اس چیز میں ایک نشانی [illegible] اور نہیں تھے بہت لوگ ان میں ماننے والے اور تیرا رب ہی زبردست رحم والا ہے۔'' (سورۃ شعرا)

''بالآخر ہم نے انہیں سزا دی یعنی اس جرم کی پاداش میں کہ ہماری نشانی جھٹلائیں اور ان کی طرف سے غافل ر[illegible] انہیں سمندر میں غرق کر دیا اور جس قوم کو کمزور حقیر خیال کرتے تھے اسی ملک کے تمام پورب کا اور اس کے مغربی حصوں کا [illegible] ہماری بخشی ہوئی برکت سے مالا مال ہے وارث کر دیا اور اس طرح (اے پیغمبر) تیرے پروردگار کا فرمان پسندیدہ [illegible] اسرائیل کے حق میں پورا ہوا کہ ہمت و ثبات کے ساتھ جمے رہے تھے اور فرعون اور اس کا گروہ جو کچھ بناتا رہا تھا اور [illegible] (عمارتوں کی) بلندیاں اٹھائی تھیں وہ سب درہم برہم کر دیں۔'' (الاعراف)

''اور ہم بنی اسرائیل کو سمندر سے گزار لے گئے۔ پھر فرعون اور اس کے لشکر ظلم اور زیادتی کی غرض سے ان کے پیچھے [illegible] کہ جب فرعون ڈوبنے لگا تو بول اٹھا، میں نے مان لیا کہ خداوند حقیقی، اس کے سوا کوئی نہیں ہے جس پر بنی اسرائیل ایمان لا[illegible] میں بھی سر اطاعت جھکا دینے والوں میں سے ہوں (جواب دیا گیا) اب ایمان لاتا ہے حالانکہ اس سے پہلے تک تو نافرمانی [illegible] اور فساد والوں میں سے تھا۔ اب تو ہم صرف تیری لاش ہی کو بچائیں گے تاکہ تو بعد کی نسلوں کے لیے نشانِ عبرت بنے۔''

''ہم ان سے پہلے فرعون کی قوم کو اسی آزمائش میں ڈال چکے ہیں۔ ان کے پاس ایک نہایت شریف رسول آیا [illegible] نے کہا اللہ کے بندوں کو میرے حوالے کر دو۔ میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔ اللہ کے مقابلے میں سر[illegible] کرو۔ میں تمہارے لیے صریح سند پیش کرتا ہوں اور اپنے رب اور تمہارے رب کی پناہ لے چکا ہوں اس سے کہ تم مجھ [illegible] آور ہو۔ اگر تم میری بات نہیں مانتے تو مجھ پر ہاتھ ڈالنے سے باز رہو۔ آخر کار اس نے اپنے رب کو پکارا کہ یہ لوگ مجر[illegible] (جواب دیا گیا) تو راتوں رات میرے بندوں کو لے کر چل پڑ۔ تم لوگوں کا پیچھا کیا جائے گا۔ سمندر کو اس کے حال [illegible] چھوڑ دے۔ یہ سارا لشکر غرق ہونے والا ہے۔ کتنے ہی باغ اور چشمے اور کھیت اور شاندار محل تھے جو وہ چھوڑ گئے۔ کتنے [illegible] کے سروسامان جن میں وہ مزے کر رہے تھے ان کے پیچھے دھرے رہ گئے۔ یہ ہوا ان کا انجام اور ہم نے دوسروں کو ان [illegible] کا وارث بنا دیا پھر نہ آسمان رویا اور نہ زمین اور ذرا سی مہلت بھی ان کو نہ دی گئی۔ اس طرح بنی اسرائیل کو ہم نے سخت [illegible]

[illegible]عذاب، فرعون سے نجات دی جو حد سے گزر جانے والوں میں فی الواقع بڑے اونچے درجے کا آدمی تھا۔''

جب بنی اسرائیل خوب جشن منا چکے اور یہ خطرہ بھی نہیں رہا کہ کوئی ان کے تعاقب کے لیے آئے گا تو وہ حضرت موسیٰ [illegible]السلام کی طرف متوجہ ہوئے۔

''تو ہمارا مالک اور ہم تیرے چاکر ہیں۔ تو ہمیں جس طرف ہانکے گا، ہم ہانکے جائیں گے۔ بتا اب کس طرف چلنا [illegible]؟'' ابھی انہوں نے تازہ تازہ معجزہ دیکھا تھا۔ فرعون اور اس کے لشکر کو ڈوبتے ہوئے دیکھا تھا لہٰذا ایمان تازہ تھے۔ [illegible]رت موسیٰ علیہ السلام کے حکم کے برخلاف کچھ کرنے کو تیار نہیں تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں تین دن تک یہیں ٹھہرے رہنے کو کہا کہ اللہ کی عبادت خوب کر لو۔ پھر جو اللہ حکم دے [illegible]ی کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا۔

بنی اسرائیل نے خیمے گاڑ کر تین دن کے لیے عارضی بستی بنا لی۔

بحر قلزم سے اٹھنے والی تند و تیز موجیں انہیں وہ سب کچھ یاد دلا رہی تھیں جو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ یہ سب [illegible]انہیں ڈراؤنا خواب معلوم ہو رہا تھا۔ یہ سوچ سوچ کر ان کے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے کہ اگر ان کی موجودگی میں سمندر [illegible] اصل حالت میں آ گیا ہوتا تو کیا ہوتا۔ یہ سوچتے ہی وہ سجدے میں گر پڑے اور اس خدا کو پکارنے لگے جس نے انہیں [illegible]ون سے نجات دی۔

انہی میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہیں اس بے کیف عبادت میں لطف نہیں آ رہا تھا۔ وہ ان بتوں کو یاد کر رہے تھے جن [illegible]پوجا وہ مصر میں کیا کرتے تھے اور اب اپنے ساتھ نہیں لا سکے تھے۔

جب تین دن کی مدت گزر گئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام انہیں لے کر بحر قلزم سے آگے بڑھے۔ ابھی تک ان کے پاس [illegible]ے کا پانی بھی تھا اور سمندر سے مس ہو کر آنے والی ٹھنڈی ہوائیں بھی میسر تھیں لیکن جب انہوں نے ''شور'' کے بیابان میں [illegible]م رکھا تو گرم ہوا نے ان کا استقبال کیا۔

یہ عرب کی سرزمین تھی جو قلزم کے مشرق میں واقع ہے۔ یہ لق و دق بے آب و گیاہ میدان سے شروع ہوتی ہے۔ یہ [illegible]م اس وقت اسی میدان میں سفر کر رہی تھی۔ تین دن تک انہیں پانی کا کوئی چشمہ نہ ملا۔ گرمی کی شدت سے دم لبوں پر آ رہا [illegible]۔ پیروں کے نیچے زمین جل رہی تھی۔ کچھ دور چل کر ایک مقام ''مارہ'' میں آئے۔ یہاں انہیں ایک چشمہ دکھائی دیا۔ وہ [illegible]ب اس طرف بھاگے اور چوپایوں کی طرح پانی میں منہ ڈال دیے لیکن فوراً اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ پانی اتنا کڑوا تھا کہ منہ [illegible]یں رکھا جاتا تھا۔

وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے شکایت کرنے لگے۔ ''ہم اس پانی سے ہونٹ بھی تر نہیں کر سکتے۔ تو ہمیں کہاں لے آیا [illegible]ہ میٹھا پانی تک نصیب نہیں۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدا سے فریاد کی۔ خداوند نے انہیں ایک پیڑ دکھایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدا کے [illegible]م کے مطابق جب اس پیڑ کو پانی میں ڈالا تو پانی میٹھا ہو گیا۔

بنی اسرائیل اور ان کے جانوروں نے خوب سیر ہو کر پانی پی لیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو ہدایت کی کہ اگر تم دل لگا کر اپنے خدا کی بات سنو اور وہی کام کرو جو اس کی نظر [illegible]یں بھلا ہے تو ایسی بہت سی نعمتیں تمہیں ملتی رہیں گی۔

توریت کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام ''شور'' کے بیابان سے نکل کر ''ایلیم'' میں آئے۔ پھر وہ یہاں سے روانہ ہو کر [illegible]ب مصر سے نکلنے کے بعد دوسرے مہینے کی پندرھویں تاریخ کو ''سین'' کے بیابان میں جو ''ایلیم'' اور سینا کے درمیان میں تھا، پہنچے۔

جب وہ ایلیم میں تھے تو وہاں پانی کے بارہ چشمے اور کھجور کے ستر درخت تھے جن کے قریب بنی اسرائیل نے خیمے [illegible]لیے تھے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں چلنے کا حکم دیا تو بادلِ ناخواستہ چل دیے کہ شاید وہ اس سے بہتر سرزمین کی [illegible]ف لے جا رہے ہیں لیکن جب انہوں نے ''ایلیم'' اور ''سینا'' کے درمیان میں پڑاؤ کرنے کا حکم دیا تو پوری قوم بڑبڑانے [illegible]ی۔ یہاں شدید گرمی تھی اور دور دور تک سبزے کا نشان نہیں تھا۔

اس جلد باز قوم نے خیمے کھولنے اور لگانے سے انکار کر دیا۔

''یہاں تو نہ سبزہ ہے اور نہ پانی۔ ہم تو تڑپ تڑپ کر مر جائیں گے۔''

یوشع بن نون ان کے سامنے آئے اور انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

''کیا تم دیکھتے ہوئے نہیں آ رہے ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں معجزے دکھا رہا ہے۔ اللہ پر بھروسا رکھو۔''

''ہم معجزے کے انتظار میں کب تک پیاسے بیٹھیں گے۔ موسیٰ سے کہو ہمیں کہیں اور لے کر جائے۔''

''اگر خدا نے یہاں ٹھہرنے کا حکم دیا ہے تو اس کی کوئی وجہ ہوگی۔''

''ہمیں اس سے غرض نہیں۔''

وہ سب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خیمے کے سامنے جمع ہو گئے اور استدعا کرنے لگے۔ ''خدا سے کہو ہمارے لیے یہاں نہریں جاری کرے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی ان سے وہی سب کچھ کہا جو یوشع بن نون کہہ چکے تھے لیکن وہ صبر کرنے کو تیار نہیں تھے۔

''اللہ کا حکم آنے تک صبر کرو۔''

''اب ہم سے صبر نہیں ہوتا۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اسی وقت وحی نازل ہوئی۔

''اپنا عصا زمین پر مار دو۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تعمیل ارشاد کی تو فوراً بارہ چشمے جاری ہو گئے۔ یہ بنی اسرائیل کے لیے بارہ جدا جدا چشمے تھے تاکہ آپس میں جھگڑا نہ کریں۔ ہر قبیلے کا جدا چشمہ ہو۔

بنی اسرائیل کا حال تو یہ تھا کہ جب کوئی نعمت ملتی تھی تو خوشی سے ناچنے لگتے تھے اور جلد ہی اس نعمت سے دل بھر جاتا تو پھر بڑبڑانے لگتے تھے۔

پانی کے ایک نہیں بارہ چشمے مل گئے تو یہ جماعت ایک مرتبہ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے پاس پہنچ گئی۔

''کاش کہ ہم خداوند کے ہاتھ سے ملک مصر میں جب ہی مار دیے جاتے جب ہم گوشت کی ہانڈیوں کے پاس بیٹھ کر دل بھر کر روٹی کھاتے تھے۔ تم تو ہم کو اس بیابان میں اسی لیے لے آئے ہو کہ ہمیں بھوکا مار دو۔ زندہ رہنے کے لیے صرف پانی ہی تو کافی نہیں۔ پانی کا تو انتظام ہو گیا لیکن ہمیں بھوک لگے گی تو ہم کھائیں گے کہاں سے؟ اب ہمیں بھوک لگی ہے۔ اپنے خدا سے کہو ہمارے لیے کھانے کا انتظام کرے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رب العالمین کی بارگاہ میں دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''موسیٰ! تمہاری دعا قبول ہوئی۔ پریشان نہ ہو ہم غیب سے سب انتظام کیے دیتے ہیں۔''

جب رات بیت گئی اور صبح ہوئی، بنی اسرائیل خیموں سے باہر آئے تو دیکھا کہ زمین اور درختوں پر جگہ جگہ سپید اولے کے دانوں کی طرح شبنم کی صورت میں آسمان سے کوئی چیز برس کر گری ہوئی ہے۔ انہوں نے ڈرتے ڈرتے کھایا تو نہایت شیریں حلوے کے مانند تھی۔ وہ آپس میں کہنے لگے...... ''من'' کیونکہ وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا ہے اور دن میں تیز ہوا چلی۔ یہ ہوا غول کے غول بٹیروں کو اڑا کر لے آئی۔ ہوا کے زور سے یہ بٹیریں زمین پر گر گئیں۔ بنی اسرائیل نے انہیں بہ آسانی پکڑ لیا۔ یہ سلویٰ تھا۔

خدائے تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معرفت بنی اسرائیل کو یہ تنبیہ کر دی تھی کہ وہ اپنی ضرورت کے مطابق من وسلویٰ کو کام میں لائیں۔ ہر شخص اتنے ہی آدمیوں کے لیے جمع کرے جتنے اس کے ڈیرے میں ہوں۔ دوسرے دن کے لیے ذخیرہ نہ کریں۔ ہم ان کو روزانہ یہ نعمت دیتے رہیں گے۔

جب کھانے پینے سے فراغت ہو گئی تو اب بنی اسرائیل نے ایک اور مطالبہ شروع کر دیا کہ گرمی کی شدت، سایہ دار درختوں اور مکانوں کی راحت میسر نہ ہونے کی وجہ سے ہم سب پریشان ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ یہ تپش اور بے آرامی ہماری زندگی کا ہی خاتمہ کر دے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اس قوم کے نخرے اٹھاتے چلے آ رہے تھے۔ قوم کے اس مطالبے پر انہیں حیرانی تو ضرور ہوئی تھی کہ میری قوم اتنی سست اور کاہل ہو گئی ہے کہ اسے دھوپ برداشت کرنے کی عادت نہیں۔

یہ قوم مصر میں رہتے ہوئے مصریوں کے مظالم برداشت کرتی رہی تھی لیکن اب انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ

السلام ان کی ہر بات مانتے چلے آ رہے ہیں تو انہوں نے یہ مطالبہ بھی کر ڈالا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام ان پر پھر بھی برہم نہیں ہوئے اور بارگاہِ ایزدی میں دعا گو ہوئے۔

''الٰہی جب تو نے ان پر بڑے انعامات اور فضل وکرم کی بارش کی ہے تو اس تکلیف سے بھی ان کو نجات عطا فرما۔'' یہ دعا سنی گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے آسمان پر بادلوں کے پرے کے پرے بنی اسرائیل پر سایہ فگن ہو گئے۔ بنی اسرائیل جہاں بھی جاتے، بادلوں کا یہ سائبان ان کے ساتھ ساتھ چلتا۔

بنی اسرائیل اس شان سے یہاں قیام پذیر تھے کہ صبح صبح ''من'' گندم کے بدلے مل جانا اور شام کو پرندے گوشت کا کام دیتے۔ پانی کا انتظام بھی خوب ہو گیا۔ یہ خدا کی طرف سے عظیم نعمتیں تھیں لیکن ان لوگوں نے ان کا حق ادا نہیں کیا جیسا کہ حق ادا کرنا تھا اور نہ ان کا شکر ادا کیا اور نہ ان کے بدلے خدا کی عبادت کی۔ ان نعمتوں سے تنگ دل ہو گئے اور اکتاہٹ میں پڑ گئے اور سب جمع ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچ گئے۔

''ہم کو اس من وسلویٰ کی ضرورت نہیں۔ اپنے خدا سے دعا کرو کہ وہ ہمارے لیے زمین سے کھیرا، ککڑی، مسور، لہسن، پیاز جیسی چیزیں اگائے تاکہ ہم خوب کھائیں۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کے کسی مطالبے پر ایسا غصہ کبھی نہ آیا تھا جیسا اس وقت آیا۔ انہوں نے غضب کی نگاہ اپنی قوم پر ڈالی اور فرمایا۔

''تم بھی کس قدر احمق ہو کہ ایک عمدہ اور بہترین غذا کو چھوڑ کر معمولی قسم کی چیزوں کے طلب گار بنے ہو اگر تم کو واقعی یہ نعمتیں نہیں بھاتیں اور جن چیزوں کا تم نام لے رہے ہو، ان ہی کے لیے اصرار کرتے ہو تو درگاہِ الٰہی سے ان کو نشانات کی طرح طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جاؤ کسی بستی اور شہر میں چلے جاؤ۔ وہاں ہر جگہ یہ چیزیں تمہیں وافر مل جائیں گی۔''

''اور جب تم نے کہا.. ''موسیٰ ہم ایک کھانے پر صبر نہیں کر سکتے، پس اپنے پروردگار سے ہمارے لیے دعا کر کہ وہ زمین سے باقلا، ککڑی، لہسن، مسور اور پیاز جیسی چیزیں اگائے۔ موسیٰ نے کہا کیا تم بہتر اور عمدہ چیز کے بدلے میں معمولی چیز کے خواہش مند ہو۔ کسی شہر میں جا کر قیام کرو بلاشبہ وہاں سب کچھ مل جائے گا جس کے تم طلب گار ہو۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم کو بار بار ڈرا رہے تھے کہ سرکشی اختیار نہ کرو۔ بار بار کی فرمائشوں سے گریز کرو۔ ہم بیت المقدس کے لیے نکلے ہیں، وہاں پہنچنے تک ہمیں بہت سے مصائب کا سامنا کرنا ہوگا۔ ثابت قدمی اور صبر کا مظاہرہ کرتے رہو۔ ناشکری اختیار مت کرو۔ اللہ کے عذاب سے ڈرو جس کا تم مصر میں رہ کر مشاہدہ کرتے رہے ہو۔ ان کی قوم نے وعدہ کیا کہ اب وہ کوئی فرمائش نہیں کریں گے۔

اس کے بعد بنی اسرائیل کی ساری جماعت سین کے بیابان سے چلی اور خداوند کے حکم کے مطابق سفر کرتی ہوئی ایک مقام ''رفیدیم'' میں آ کر ڈیرا کیا۔

یہاں پہنچتے ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم ان سے پھر جھگڑنے لگی۔ یہاں بھی یہی مسئلہ تھا کہ پینے کے لیے صاف پانی نہیں تھا۔ بنی اسرائیل تقاضا کر رہے تھے کہ ہمیں پینے کے لیے پانی دیا جائے۔ وہ بار بار مصر کو یاد کرتے تھے اور ناشکری اختیار کرتے تھے۔

''موسیٰ! تو ہمیں کس بیابان میں لے آیا۔ یہاں پانی تک میسر نہیں۔ کیا ہم مصر میں بُرے تھے جو اب بیابان کی خاک چھانتے پھر رہے ہیں۔ یہاں تو نہ ہمارے چوپائے زندہ رہیں گے نہ ہمارے بچے۔''

لاکھوں مرد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے گرد جمع ہو گئے اور بھول گئے کہ انہوں نے کس طرح فرعون سے انہیں نجات دلوائی۔ جہاں ٹھہرے وہاں پانی کے چشمے جاری کیے۔ انہی کی دعا سے من وسلویٰ اترا جس کو وہ اب تک استعمال کر رہے تھے۔ ابر کا سایہ ان کے سروں پر چلتا تھا۔ وہ یہ سب بھول گئے اور اس طرح باتیں کرنے لگے جیسے ان کا پیغمبر انہیں بھول گیا ہو۔ وہ ان نعمتوں پر شکر نہیں بھیجتے تھے۔ مصر کی زندگی کو یاد کرتے تھے اور یہاں تک کہہ گزرے کہ خدا اب ہمارے ساتھ ہے بھی یا پیچھے کہیں رہ گیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فریاد کی۔ ''خداوندا! میں ان لوگوں کا کیا علاج کروں۔ یہ تو بغاوت پر اتر آئے ہیں اور مجھے سنگسار کرنے کو تیار ہیں۔''

خداوند نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا۔ ''لوگوں کے آگے ہو کر چل اور بنی اسرائیل کے بزرگوں میں سے چند کو اپنے

ساتھ لے لے اور جس لاٹھی سے تو نے دریا پر مارا تھا، اسے ساتھ لیتا جا۔ دیکھ...... میں تیرے آگے جاکر ''حورب'' کی چٹان پر کھڑا رہوں گا اور تو اس چٹان پر مارنا تو اس میں سے پانی نکلے گا کہ یہ لوگ پئیں گے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام خیمہ اجتماع سے باہر آئے اور بنی اسرائیل سے کہا کہ اپنے چند بزرگ میرے ساتھ کر دو کہ میں تمہارے لیے پانی کا انتظام کروں۔

''یہ بزرگ کیا کنواں کھود کر پانی نکالیں گے جو انہیں تُو اپنے ساتھ لیے جا رہا ہے۔''

''تم اپنی باتیں اپنے پاس رکھو۔ میرے خدا نے جیسا کہا ہے میں ویسا ہی کر رہا ہوں۔''

''تم کسی کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔ ہمیں تو پانی چاہیے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چند بزرگوں کا انتخاب کیا اور ''حورب'' پہاڑ کی طرف چلے۔ یہ پہاڑ بھی دھوپ کی شدت سے سرخی مائل ہو گیا تھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ اگر اس میں پانی ہوگا بھی تو خشک ہو گیا ہوگا۔

وہ بزرگ بھی تو بنی اسرائیل ہی کے تھے۔ جب انہیں پہاڑ پر چڑھنا پڑا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سمجھانے لگے کہ پہاڑ پر چڑھنا فضول ہے۔ یہاں پانی کے کوئی آثار نہیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم دوبارہ ''ایلیم'' چلے جائیں جہاں ہمارے لیے پانی کے بارہ چشمے تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کی طرف خشمگیں نظروں سے دیکھا اور ایک چٹان پر جا کر رک گئے۔ انداز ایسا تھا جیسے کسی کی باتیں سن رہے ہوں۔ پھر آپ نے اپنا عصا ایک چٹان پر مارا۔ چٹان کا سینہ فراخ ہو گیا جس سے پانی جاری ہو گیا۔

عبدالوہاب النجار نے قصص الانبیا میں لکھا ہے کہ پانی کے وہ چشمے جن کا ذکر بنی اسرائیل کے واقعات میں آیا ہے، بحر احمر کے مشرقی بیابان میں سوگز سے زیادہ دور نہیں اور اب بھی ''عیون موسیٰ'' (موسیٰ کے چشمے) کے نام سے مشہور ہیں۔ ان چشموں کا پانی اب کافی حد تک سوکھ گیا ہے اور بعض کے تو آثار بھی قریب قریب معدوم ہو گئے ہیں اور کہیں کہیں ان چشموں پر اب کھجور کے باغات نظر آتے ہیں۔

قرآن عزیز کے ذکر کردہ واقعات میں کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عصا مار کر پانی حاصل کرنے کا واقعہ صرف ایک مرتبہ پیش نہیں آیا بلکہ مختلف مقامات پر متعدد مرتبہ پیش آیا ہے۔

☆☆☆

عمالیق ایک قدیم اور غارت گر خانہ بدوش قوم تھی۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ ان کا ذکر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں آیا۔

بنیادی طور پر یہ عمالیق بحیرۂ مردار کے جنوب مشرق میں آباد تھے لیکن وہ صحرائے سینا میں رفیدیم سے مصر کی سرحد تک بھی آباد تھے۔

ان عمالیقیوں نے جب دیکھا کہ بنی اسرائیل رفیدیم میں آباد ہونے کے لیے پہنچے ہیں تو انہیں خطرہ ہوا کہ یہ یہاں مستقل قیام کر لیں گے۔ اس کے علاوہ انہیں یہ لالچ بھی ہوا کہ ان لوگوں پر اگر لوٹ مار کی جائے تو بہت سا مال ہاتھ آ سکتا ہے تو وہ وحشی جوق در جوق نکلے اور بنی اسرائیل پر ٹوٹ پڑے۔

بنی اسرائیل عورتوں اور بچوں کے علاوہ چھ لاکھ کی تعداد میں تھے اور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ عمالیقیوں کے حملے کی اطلاع ملتے ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے خلیفہ یوشع بن نون کو بلایا۔

''عمالیقیوں نے حملہ کر دیا ہے۔ ابھی وہ ہماری آبادی کے ایک سرے پر ہیں۔ بنی اسرائیل اگر انہیں روک نہ سکے تو وہ آگے بڑھیں گے اور لوٹ مار کا بازار گرم کر دیں گے۔ میری قوم مدتوں غلام رہی ہے۔ ان میں شجاعانہ صلاحیت نہیں رہی ہے۔ مجھے ڈر ہے عمالیقی غالب نہ آ جائیں۔ تو ایسا کر کہ ہماری طرف کے کچھ آدمی چن کر لے جا اور عمالیقیوں سے لڑ۔ میں خدا کی لاٹھی ہاتھ میں لے کر پہاڑ پر کھڑا رہوں گا تاکہ جنگ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں اور خدا سے مدد طلب کروں۔''

(جاری ہے)

ماخذات

قصص القرآن، مولانا محمد حفظ الرحمٰن۔ قصص الانبیاء، ابن کثیر۔ توریت...... ارض القرآن، سلیمان ندوی۔ ترجمان القرآن، ابو الکلام آزاد۔ انبیائے قرآن، جمیل احمد۔

ایک دن سب کو اس عالم فانی سے چلے جانا ہے لیکن جانے والوں کے کام ان کی یاد زندہ رکھتے ہیں...... مرحوم مصنفین کی یادگار تحریروں کو خراج تحسین

سسپنس کلاسک

مقبول اور ناقابل فراموش کہانیوں کا انتخاب

سسپنس کا ایک نیا سلسلہ

آخری کیل

اثر نعمانی

جتنی عقل کسی ڈگری کو پانے کے لیے صرف کی جاتی ہے شاید اس سے کہیں زیادہ محنت کسی بھی مجرم کو جرم کے ارتکاب کرنے اور اس کے مضر اثرات سے بچنے کے لیے کرنا پڑتی ہوگی... کیونکہ انہی اثرات میں تو اس کے لیے زندگی کے ثمرات پوشیدہ ہوتے ہیں جو اگر مثبت نکلے تو واہ، واہ اور اگر منفی نکلے تو زندگی بازی ہار بھی جاتی ہے مگر... وہ تو یہ بازی جیت کر بھی ہار گیا تھا کیونکہ عقل کی تھوڑی سی کوتاہی اس کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئی۔

مغربی ماحول میں بھائی کی بھائی سے محبت کا انوکھا انداز



ہوٹل کا کمرا بہت تنگ اور چھوٹا تھا۔ مجھے گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ ممکن ہے اس کی وجہ کمرے کی تنگی ہو یا پھر اس خطرناک مہم کا احساس ہو جس میں گورمن فلپ سمیت ہم تین آدمیوں کو حصہ لینا تھا۔ مجھے پہلی نگاہ میں ہی فلپ پسند نہیں آیا تھا اور ممکن تھا کہ میں کسی تاسف کے اظہار کے بغیر کمرے سے نکل جاتا لیکن جب میں نے کول کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا دیا۔ اس انداز سے جیسے اسے معلوم ہو کہ اس وقت میں کیا سوچ رہا ہوں اور یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ہم دونوں بھائیوں کے درمیان بارہا ایسا ہو چکا تھا کہ کول نے اپنی ذہانت سے میرے خیالات کا اندازہ کر لیا تھا۔ حالانکہ وہ مجھ سے پانچ سال چھوٹا تھا اور اس اعتبار سے مجھے اس کے مقابلے میں زیادہ ہوشیار، تجربہ کار اور زیادہ عقلمند ہونا چاہیے تھا لیکن عملاً ایسا نہیں تھا۔ کول بچپن سے ہی میرے مقابلے میں زیادہ ذہین تھا اور عام طور پر ہمارے ہر کام یا ہر شرارت میں سب کا لیڈر وہی بنتا تھا۔ ماں کے انتقال کے بعد راہنمائی کا کام مستقل طور پر اس نے سنبھال لیا اور مجھے اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں ہوا تھا۔ یہ بات بھی نہیں کہ میں بالکل ہی عقل سے کورا واقع ہوا ہوں لیکن کول کی بات ہی اور تھی۔ وہ بہت خاص قسم کا نوجوان تھا جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ اس کے آنے سے پہلے میں کئی مرتبہ جیل کی سیر کر چکا تھا۔ لیکن اس کے آنے کے بعد سے اب تک کوئی ایسا حادثہ نہیں ہوا اور پھر ہماری زندگی بھی پہلے سے کچھ زیادہ بہتر ہو گئی تھی۔

کول ہمیشہ بڑے بڑے مواقع کی تلاش میں رہتا تھا۔ وہ ہمیشہ بڑا ہاتھ مارنا چاہتا تھا۔ اس کے برخلاف میں ایک معمولی سا چور تھا۔ میرا خیال ہے کہ شاید میں چور بھی نہ ہوتا لیکن مجھے زندگی میں ہنگامہ خیزی پسند تھی۔ دوسرے الفاظ میں اگر میں کسی نئے قصبے میں منتقل ہوتا تھا تو کام تلاش کرنے میں وقت لگتا تھا جبکہ مجھے روپے کی بہت ضرورت رہا کرتی تھی لیکن کول کام کرنا قطعی پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ تو لمبا ہاتھ مارنا اور عیش سے زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ ممکن تھا کہ اگر میں اس کی طرح ذہین اور خوبصورت ہوتا تو مجھے بھی وہی راحتیں حاصل ہوتیں جو کول کو حاصل تھیں لیکن میں بہت محتاط وست رو تھا اور اسی لیے چھوٹی موٹی چوریوں پر اکتفا کر لیا کرتا تھا اور جب بھی اس کا موقع نہ ملتا تو پھر میں کوئی ملازمت کر لیتا۔ کچھ دن کام کرتا اور پھر کہیں اور چل دیتا۔ یہ سب ماں کے مرنے سے پہلے اور کول کے میرے ساتھ مل کر کام کرنے سے پہلے کی باتیں تھیں۔

فلپ اپنے منصوبے کی تفصیلات کوئی دسویں بار بیان کر رہا تھا مگر میں کچھ زیادہ توجہ سے نہیں سن رہا تھا۔

فلپ ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ مجھ سے عمر میں پندرہ یا بیس سال بڑا لیکن اس کے باوجود اس کے قیمتی لباس کے نیچے جو جسم چھپا ہوا تھا وہ مضبوط، تندرست و توانا تھا۔ پہلی مرتبہ دیکھنے پر اس میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی تھی۔ وہ ایک عام سا آدمی معلوم ہوتا تھا لیکن جب کوئی اس کی آنکھوں کو دیکھتا جن کے پپوٹے بھاری ہونے کی وجہ سے وہ تقریباً نیم وا دکھائی دیتی تھیں، تب اسے اندازہ ہوتا کہ فلپ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ فلپ نے ہمارے ایک واقف کار سے ذکر کیا تھا کہ اسے دو اچھے آدمیوں کی ضرورت ہے۔ اس نے فلپ سے ہمارا تعارف کرا دیا اور اس کے بعد حالات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ اب کل ہم ایک اتنی بڑی مہم سر کرنے جا رہے تھے کہ میں نے اور کول نے ابھی تک کبھی اتنے بڑے کام میں ہاتھ نہیں ڈالا تھا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ رقم جتنی زیادہ ہوگی، خطرہ بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا۔

فلپ کے بقول اس نے جو دولت حاصل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا، وہ بہت زیادہ تھی۔ کتنی رقم تھی، یہ اس نے نہیں بتایا لیکن وہ ہماری خدمات کے عوض ہم میں سے ہر ایک کو پچیس پچیس ہزار ڈالر دینے پر آمادہ تھا۔ ہم اس رقم پر راضی ہو گئے۔ فلپ نے کہا کہ چونکہ ہم نے اس اسکیم میں کوئی مالی حصہ نہیں لیا، اس لیے وہ ہمیں اس سے زیادہ نہیں دے سکتا اور ہم پر اس کا حق اس لیے بھی تھا کہ پلان اس نے سوچا تھا۔ تفصیلات اس نے طے کی تھیں اور انہیں بروئے کار لانے کے لیے جو رقم درکار تھی، وہ بھی اس نے لگائی تھی۔ اگر صرف میرا معاملہ ہوتا تو میں اس کام کو ہاتھ بھی نہیں لگاتا لیکن کول مدت سے کسی ایسے ہی سنہری موقع کی تلاش میں تھا اس لیے وہ فوراً تیار ہو گیا اور جب وہ کسی کام میں شریک ہوتا تو میری شرکت بھی لازمی ہو جاتی تھی۔

''تم میری بات توجہ سے نہیں سن رہے ہو کیرن۔'' فلپ نے مجھے مخاطب کیا۔

''میں سن رہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''سمجھ بھی رہے ہو؟'' اس نے پھر پوچھا اور اس کی یہ بات مجھے ناگوار گزری۔ گویا وہ مجھے بالکل ہی احمق خیال کر رہا تھا۔

''مجھے سمجھنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں تمہارے ساتھ ہوں گا اور میرا کام صرف تمہاری ہدایت کی پابندی ہے۔ اگر میں نے کوئی غلطی بھی کی تو تم اس غلطی کو درست کرنے کے لیے موجود ہو گے۔''

فلپ نے مجھے گھور کر دیکھا مگر کچھ بولا نہیں۔ میری

بات کا جواب دینے کے بجائے اس نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

''اوکے۔ اب تم دونوں اپنے کمرے میں جاؤ لیکن آج کی رات نہ تم کسی لڑکی سے کوئی بات کرو گے اور نہ کسی بار میں جاؤ گے، نہ شراب پیو گے۔''

اس سے پہلے کہ میں اور کول اپنی جگہ سے حرکت کرتے، کسی نے دروازے پر ایک مخصوص انداز میں دستک دی۔ فلپ نے دروازہ کھول دیا۔ دستک دینے والی ایک لڑکی تھی جس کا قد چھوٹا اور سرخ بال درمیان سے مانگ کی صورت میں بنے ہوئے اس کے کندھوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں بڑی اور دہانہ خوبصورت تھا۔ اس نے بہت چست لباس پہن رکھا تھا جس نے اس کے جسم کے تمام نشیب و فراز چھپانے کے بجائے کچھ اور نمایاں کر دیے تھے۔

''معلوم نہیں وہ لڑکی کون ہے اور اس کا فلپ کے پلان سے کیا تعلق ہے۔'' کول نے کہا۔

ہم اپنے کمرے میں آ گئے۔ میں نے کول کو سمجھانے کی کوشش کی کہ میں فلپ کو پسند نہیں کرتا اور یہ کہ ہمیں اس کے کسی پلان میں شامل نہیں ہونا چاہیے مگر کول پر پچیس ہزار ڈالرز حاصل کرنے کی دھن سوار تھی۔ اس کے علاوہ اس نے بتایا کہ وہ یہ بھی جاننا چاہتا ہے کہ بڑے مجرم کس طرح کام کرتے ہیں۔ اس نے مجھے ہدایت کی کہ میں فلپ کی ایک ایک حرکت پر نگاہ رکھوں، اس سے معلوماتی سوالات پوچھوں اور اس کے جوابات کو ذہن نشین کر لوں۔

میرے ذہن میں ایک سوال چبھ رہا تھا جسے آخرکار میں نے پوچھ ہی لیا۔

''اگر فلپ اتنا ہی بڑا اور تجربہ کار مجرم ہے تو پھر اس قدر گمنام کیوں ہے؟ ہم نے اب تک اس کا نام کیوں نہیں سنا؟ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اسے یہاں کوئی بھی نہیں جانتا اور نہ ہی وہ کسی سے واقف معلوم ہوتا ہے۔ میں نے اس کے سامنے کئی آدمیوں اور مقامات کے نام لیے لیکن وہ کسی کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکا کہ ان میں سے کسی کو جانتا ہے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ یہ شخص ہمارے لیے منحوس ثابت ہوگا۔''

''کچھ بھی سہی۔'' کول نے کندھے اچکائے۔ ''وہ ایک کامیاب مجرم ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس قدر پراسرار بنائے رکھتا ہے اور کسی ایک مقام پر جم کر نہیں رہتا۔ اسی وجہ سے کسی کو اس کے متعلق کچھ علم نہیں ہے لیکن اس بات سے ہمیں کیا فرق پڑتا ہے۔''

''ممکن ہے نہ پڑتا ہو۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن ہمیں اپنی حفاظت کی طرف سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔''

کول مسکرایا اور اس نے اپنے بیگ سے اعشاریہ تین آٹھ... کا ایک ریوالور نکالا۔

''جب ہم بعد میں اپنے حصے کی وصولیابی کے لیے جمع ہوں گے تو یہ ریوالور میری پیٹی میں لگا ہوگا۔'' وہ بولا۔ ''کیا یہ ہماری حفاظت کی کافی ضمانت نہیں ہے؟''

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔'' میں نے ریوالور کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

اگلے دن جب میں فلپ کے پاس پہنچا تو دوپہر کا ایک بج رہا تھا۔ فلپ اپنی کار میں بیٹھا تھا۔ اس نے سیاہ سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر مصنوعی ڈاڑھی مونچھیں لگی ہوئی تھیں۔ اس میک اپ نے اس کے حلیے کو نمایاں کر دیا تھا۔ میں نے سر پر لمبے بالوں کی ایک وگ پہن رکھی تھی۔ اس حلیے میں، میں خود کو بالکل احمق محسوس کر رہا تھا۔

''کیا کول نے ٹرک کا انتظام کر لیا؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

''ہاں، آج صبح وہ ایک ٹرک کہیں سے اڑا لایا ہے۔''

''چلو یہ کام تو ہوا۔ اب اسے صرف اتنا ہی کرنا ہے کہ صحیح وقت پر صحیح مقام تک پہنچ جائے۔''

بیس منٹ بعد اس نے شہر کے قلب میں ایک موڑ پر کار روک لی۔ وہ سرخ بالوں والی لڑکی وہاں کھڑی تھی۔

''سب کچھ ٹھیک ہے؟'' فلپ نے پوچھا۔

''بالکل۔'' لڑکی نے جواب دیا۔

ہم نے اپنی کار وہیں چھوڑ دی۔ لڑکی اس کار میں بیٹھی اور اپنے پیچھے قیمتی سینٹ کی خوشبو کی ایک لہر چھوڑ گئی۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ لڑکی بھی اس اسکیم میں شامل ہے۔'' میں نے کہا۔

''کوئی تو ایسا فرد ہونا چاہیے تھا جو ہماری چرائی ہوئی کاروں کو ادھر اُدھر چھوڑ سکے۔'' فلپ نے بتایا۔ ''ہم اپنی کار یہاں نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ ایسی صورت میں خطرہ تھا کہ کوئی پولیس مین اسے دیکھ لیتا۔ اب وہ لڑکی کار کو ائرپورٹ کے پارکنگ پلاٹ پر بے شمار کھڑی ہوئی کاروں کے درمیان کہیں کھڑی کر دے گی اور وہاں سے کوئی دوسری کار حاصل کرے گی۔ تمہاری کار کول کے پاس ہوگی۔ پھر تمہارے خیال میں ہم کیا یہاں تک کسی خچر پر سوار ہو کر پہنچتے؟''

''میں نے اس پہلو سے غور نہیں کیا تھا۔'' میں بولا۔

''قدرتی بات ہے۔'' فلپ کا جواب تھا۔

ہم وہاں سے جنوب کی طرف پیدل روانہ ہوئے اور ایک موڑ گھوم کر اس سڑک پر آ گئے جو جوہری بازار سے صرف ایک بلاک کے فاصلے پر تھی۔ اس بازار میں سڑک کے ....

دونوں جانب ہر عمارت کی ہر دکان اور ہر آفس ایسے لوگوں نے لیے ہوئے تھے جو جواہرات کا ہول سیل کاروبار کرتے تھے۔ گراؤنڈ فلور پر نسبتاً چھوٹی دکانیں تھیں اور ان پرانی عمارتوں کی بالائی منزلیں زیادہ تر دفاتر پر مشتمل تھیں جن میں چھوٹے بڑے جوہری کاروبار کرتے تھے۔ کبھی کسی نے اس بازار کے اعداد و شمار جاننے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن اندازے کے مطابق اس چھوٹے سے بازار میں صرف ہیروں کے کاروبار میں لاکھوں کروڑوں ڈالرز سالانہ کی الٹ پھیر ہوتی تھی۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان میں سے کسی بھی جوہری کو لوٹنا بہت آسان بات ہے لیکن عملاً یہ بات اتنی آسان نہیں تھی۔ بیشتر جوہری اپنے دفتروں کے دروازے بند رکھتے تھے اور صرف ان لوگوں کو اندر آنے کی اجازت دیتے تھے جنہیں وہ جانتے ہوں یا جن کے پاس اپنی شناخت کے ضروری کاغذات موجود ہوں۔ اس کے علاوہ ایک بات جو ہر آفس کے ساتھ مشترک تھی، وہ ایک برقی الارم سسٹم تھا۔ بٹن کو دباتے ہی پولیس چند منٹ میں موقع پر پہنچ کر پورے بازار کی ناکا بندی کر سکتی تھی اور اس بازار کے اردگرد کی سڑکیں ایسی تھیں جن سے پولیس کو ناکا بندی کرنے میں بڑی آسانی رہتی تھی۔ سوائے اس کے کہ کبھی کسی اِکا دُکا جوہری کو گھر آتے جاتے لوٹ لیا گیا ہو۔ اس علاقے میں کبھی کوئی بڑی واردات کامیابی سے انجام تک نہیں پہنچی تھی۔

فلپ ایک پرانی سی عمارت میں داخل ہوا۔ میں اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ وہ دوسری منزل پر ایک چھوٹے سے دفتر کے سامنے رک گیا جس پر وان میلڈن جوہری کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اس نے اندرونی آفس کا دروازہ کھولا۔ کمرا بالکل خالی تھا۔ البتہ فرش پر گتے کا بنا ہوا ایک بڑا سا ڈبا رکھا تھا۔ مجھے اس نے دروازہ بند کرنے کی ہدایت کی۔ میں نے تعمیل کرتے ہوئے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ فلپ نے اس دفتر کا تذکرہ کیا تھا مگر ہم میں سے کسی کو وہاں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ عمارت کے دوسرے لوگ اس کے علاوہ ہم میں سے کسی اور کے صورت آشنا ہوں۔ اس دفتر کو کرائے پر لینے میں اس کی خاصی رقم خرچ ہوئی ہوگی۔

ہمیں وہاں پہنچے مشکل سے پانچ منٹ ہوئے ہوں گے کہ ہم نے دفتر کا بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ فلپ نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

''بالکل صحیح وقت پر پہنچے۔'' اس نے آنے والوں سے کہا۔ ''کیا میں تمہارے شناختی کارڈ دیکھ سکتا ہوں؟''

ایک ہاتھ کھڑکی میں نظر آیا جس میں شناختی کارڈ ... ہوا تھا۔ فلپ نے اثبات میں سر ہلایا اور دروازہ کھول دیا۔ دو باوردی آدمی اندر داخل ہوئے۔ ان کی یونیفارم گہرے رنگ کی تھی۔ ان کی چھوٹی آستینوں کی قمیصوں ... بائیں کندھے پر کانٹی نینٹل سیکیورٹی سروس کے نشانات اور ... عبارت تحریر تھی۔ کمر میں چمک دار پیٹیاں جن میں ریوالور ... لگے تھے۔ سینے پر بیج اور سر پر آگے جھکی ہوئی ٹوپیاں جنہوں نے ان کے انداز میں ایک حاکمانہ شان پیدا کر دی تھی۔ ایک شخص کے ہاتھ میں کلپ بورڈ تھا جس پر بہت سے کاغذات لگے تھے۔

ان کے اندر آتے ہی میں نے پچھلے آدمی کی پشت سے ریوالور کی نال لگا دی۔ اسے یہ بتانے کی ضرورت پیش نہیں آئی کہ یہ کیا شے ہے۔ اس کے ہاتھ خود بخود اوپر کی جانب اٹھ گئے اور اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت نمایاں تھی۔ پہلے آدمی نے یہ سب کچھ دیکھا اور اپنا ریوالور نکالنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ فلپ نے اس کی گردن پر ایک زوردار ہاتھ رسید کیا اور وہ بے ہوش ہو کر فرش پر لڑھک گیا۔ کلپ بورڈ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔ فلپ نے فرش پر رکھے ہوئے گتے کے ڈبے کو کھولا، اس میں سے دستانے نکال کر پہنے۔ بے ہوش گارڈ کا ریوالور نکال کر میری طرف اچھال دیا۔ اس کے ہاتھ پشت کی جانب لے جا کر باندھ دیے۔ اس کے منہ پر ایک چوڑا سا ٹیپ لگا دیا۔ پھر اس کے پیر بھی رسی سے باندھ کر پشت کی جانب موڑتے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ جکڑ دیے۔ پھر اسے گھسیٹ کر کمرے میں رکھی ہوئی ایک بڑی الماری میں بند کر دیا۔

میں دوسرے آدمی کو زد میں لیے کھڑا تھا۔ فلپ نے اس کی پیٹی سے ریوالور نکالا۔ اس کی تمام گولیاں نکال کر فرش پر ڈال دیں اور ریوالور دوبارہ اس کی پیٹی میں لگا دیا پھر وہ اس سے مخاطب ہوا۔

''آہن پوش ٹرک پر ایک تیسرا آدمی بھی تو ہوتا ہے۔'' اس آدمی نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''میں اور تم دونوں نیچے چل رہے ہیں۔'' فلپ نے اس سے کہا۔ ''میں تمہارے پیچھے رہوں گا۔ تم یا کوئی اور میرا ریوالور نہیں دیکھ سکو گے لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم ایک لمحے کے لیے بھی اس کی زد سے باہر نہیں ہو گے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم تیسرے گارڈ کو بتاؤ کہ تمہیں اس کی مدد کی ضرورت ہے۔ تم اس کے لیے کیا عذر پیش کرتے ہو، مجھے اس سے غرض نہیں لیکن اس گارڈ کو تمہارے ساتھ اس کمرے میں آنا چاہیے۔ اگر کوئی بھی غلط بات کی تو میں تم دونوں کو شوٹ

کر دوں گا اور یہاں میرا دوست تمہارے ساتھی کو ختم کر دے گا۔ البتہ اگر تم نے تعاون کیا تو تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور تم اپنے دوستوں کو اس دلچسپ تجربے کے بارے میں بتانے کے لیے زندہ رہو گے۔ میری بات سمجھ گئے؟''

اس آدمی نے اثبات میں سر ہلایا۔ فلپ نے اپنا ایک ہاتھ جیب میں ڈال دیا۔

''تب پھر آگے آگے چلو۔''

وہ دونوں آفس سے نکل گئے۔ میں کھڑکی کے پاس آکر کھڑا ہو گیا اور نیچے دیکھنے لگا۔ آہن پوش ٹرک ایک کار کے قریب کھڑا تھا اور تیسرا گارڈ اس کے پچھلے دروازے کے سامنے موجود تھا۔ فلپ کا پلان ابھی تک کامیابی سے چل رہا تھا مگر ابھی یہ دیکھنا باقی تھا کہ آیا وہ آخر تک کامیاب رہتا ہے یا نہیں۔ دو منٹ کے بعد میں نے دیکھا کہ تیسرے گارڈ نے عمارت کے صدر دروازے کی جانب دیکھا اور پھر سیڑھیوں کی جانب چلنے لگا۔ مجھے معلوم نہیں کہ دوسرے گارڈ نے اس سے کیا بہانہ بنایا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ جب ہماری یہ کارروائی ختم ہو جائے گی تو اس تیسرے گارڈ سے ضرور باز پرس کی جائے گی کیونکہ سیکیورٹی کمپنی کا واضح حکم ہوتا ہے کہ ٹرک کو کسی حالت میں بغیر کسی گارڈ کے نہیں رہنا چاہیے۔ میں کھڑکی سے ہٹ کر دروازے کے قریب آگیا اور دروازے کے قریب دیوار سے چپک کر انتظار کرنے لگا۔ ریوالور میرے ہاتھ میں تیار تھا۔

پہلے دونوں گارڈ اندر داخل ہوئے۔ فلپ ان کے پیچھے تھا۔ تیسرا گارڈ منہ ہی منہ میں گالیاں بک رہا تھا۔ فلپ نے انہیں حکم دیا کہ وہ اپنی پیٹیاں کھول کر فرش پر ڈال دیں۔ پھر اس نے ان کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جو پہلے گارڈ کے ساتھ کیا تھا اور انہیں باندھ کر پہلے گارڈ کے ساتھ ہی الماری میں ٹھونس دیا۔ الماری میں ٹھونسنے سے پہلے اس نے ان کے شناختی کاغذات، سینے پر لگے ہوئے بیج اور ٹرک کی چابیاں وغیرہ نکال لی تھیں۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ ایک مرتبہ پھر گتے کے ڈبے کی جانب متوجہ ہوا اور اس میں سے دو بالکل ویسی ہی وردیاں نکالیں جیسی وہ گارڈ پہنے ہوئے تھے۔ میں نے اور فلپ نے وہ وردیاں پہن لیں اور اپنے کپڑے اور ریوالور اسی ڈبے میں رکھ دیے۔ ہم نے گارڈز کی پیٹیاں بھی کمر میں کس لیں۔ فلپ نے دوسرے گارڈ کی پیٹی سے خالی ریوالور نکال کر ایک طرف پھینک دیا اور میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اسے وہ ریوالور دے دیا جو اس نے پہلے گارڈ کی پیٹی سے نکالا تھا۔ ہم نے اپنے سینوں پر بیج لگا لیے اور شناختی کاغذات آپس میں تقسیم کر لیے۔ یہ شناختی کارڈ سرکاری نوعیت کے تھے جن پر سرکاری مہروں کے علاوہ متعلقہ شخص کا فوٹو بھی لگا ہوا تھا لیکن فوٹو کوئی بہت اچھے اور نمایاں اترے ہوئے نہیں تھے۔ سرسری نظر میں انہیں کوئی بھی شناخت نہیں کر سکتا تھا۔

فلپ نے اپنی ڈاڑھی مونچھیں بھی اتار کر ڈبے میں رکھ دیں۔ میں نے دھوپ کا چشمہ اور بالوں کی وگ اتار دی اور یہ بھی ڈبے میں ڈال دی۔ یہاں سے اب ہمارا حلیہ نمایاں تھا اور کوئی بھی شخص ہمیں ہماری اصلی صورت میں دیکھ سکتا تھا اور یاد رکھ سکتا تھا لیکن چونکہ ہم دونوں میں سے کسی کا بھی ریکارڈ اس شہر کے پولیس ہیڈ کوارٹر میں موجود نہیں تھا، اس لیے خطرے کی کوئی خاص بات نہیں تھی۔ فلپ نے فون کا تار توڑ دیا اور کمرے میں ایک آخری نگاہ ڈالی۔ اس سے پہلے وہ اپنے دستانے پہنے ہوئے ہاتھوں سے ہر اس جگہ کو صاف کر چکا تھا جہاں ہمارے ہاتھ لگے تھے یا جہاں انگلیوں کے نشانات ہونے کا امکان تھا۔ میں نے گارڈ کے خالی ریوالور کو اچھی طرح صاف کر کے ایک کونے میں پھینک دیا۔ اس کے بعد ہم کمرے سے باہر آگئے۔

میں آگے آگے اس ڈبے کو اس طرح اٹھائے ہوئے تھا جیسے اس میں کوئی بہت ہی قیمتی چیز رکھی ہو۔ فلپ میرے پیچھے گارڈ کا کلپ بورڈ ہاتھ میں دبائے چل رہا تھا۔ اس کا ہاتھ ریوالور پر تھا جیسے وہ میری حفاظت کر رہا ہو۔ ہمیں باہر ہال میں یا سیڑھیوں پر کوئی نہیں ملا۔ ہم سڑک پر آئے۔ فلپ نے آہن پوش ٹرک کھول کر وہ گتے کا ڈبا اس کے اندر رکھ دیا۔ پھر اگلی سیٹ پر بیٹھ کر ڈرائیونگ وہیل سنبھال لیا۔ پہلا مرحلہ طے ہو چکا تھا۔ ہم نے آہن پوش ٹرک حاصل کر لیا تھا اور کسی بھی عام آدمی کے نزدیک ہم محض سیکیورٹی گارڈ تھے جو کوئی قیمتی چیز لیے جا رہے تھے اور یہ بات اس علاقے کے لیے کوئی انوکھی نہیں تھی۔ ممکن ہے کسی نے یہ نوٹ کیا ہو کہ اب بجائے تین کے صرف دو گارڈ ٹرک میں سوار تھے اور یہ کہ پہلے والے گارڈز سے کچھ مختلف نظر آ رہے تھے لیکن ایسا اتفاق سو میں سے ایک فیصد بھی ممکن نہیں تھا۔

''سیکیورٹی گارڈ ہمارے لیے زیادہ پریشان کن بھی ثابت ہو سکتے تھے۔'' میں نے فلپ سے کہا۔

''لیکن مجھے یقین تھا کہ ایسا نہیں ہوگا۔'' فلپ نے ٹرک اسٹارٹ کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''اور اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ کسی چیز کی حفاظت نہیں کر رہے تھے۔ وہ اس لیے بھیجے گئے تھے کہ ایک جوہری وان میلڈن سے ہیروں کا پارسل وصول کر کے اس کے خریدار تک پہنچا دیں۔ ٹرک بالکل خالی تھا، اس میں کوئی قیمتی شے نہیں تھی پھر آخر وہ کس بات کے

لیے لڑنے کی کوشش کرتے اور اپنی زندگی خطرے میں ڈالتے؟ کیا تم ان حالات میں مزاحمت کرنا پسند کرتے؟''

''شاید نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''لیکن لوگوں کے ردِعمل کا پہلے سے اندازہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔''

''لوگوں کا نہیں حالات کا اندازہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ ان کے بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کی جاسکتی۔'' فلپ نے کہا۔ ''جہاں تک لوگوں کا تعلق ہے تو اگر تم نے انسانی فطرت کا گہرا مطالعہ کیا ہے تو بیشتر صحیح اندازہ لگاسکتے ہو کہ خاص حالات میں کوئی شخص یا اشخاص کیا طرزِعمل اختیار کریں گے اور لوگوں کو جاننا ہی طاقت حاصل کرنے کا راز ہے۔ اسی ایک بنیاد پر انسان کی تقدیر بنتی اور بگڑتی ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جو حکومتوں کو طاقتور بناتی ہے یا ان کا تختہ الٹ دیتی ہے۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔

''ابھی تک ہمارا ہر کام وقت کی پابندی سے انجام پارہا ہے۔'' وہ بولا۔ ''اگر تمہارا بھائی اپنے حصے کا فرض......''

''تمہیں اس کے بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''میں جانتا ہوں لیکن میں نے ابھی تمہیں بتایا کہ حالات کے بارے میں کوئی پیش گوئی کرنا مشکل ہے۔ ہوسکتا ہے کوئی ایسی صورتِ حال پیدا ہوجائے جو اس کے کنٹرول سے باہر ہو اور اس بنا پر وہ اپنا کام سرانجام نہ دے سکے۔ اگر ایسا ہوا تو اسے معلوم ہے کہ اس کی اطلاع ہمیں کس طرح دے سکتا ہے اور اس صورت میں ہمیں آج اپنا منصوبہ ملتوی کرنا پڑے گا ہم آہن پوش ٹرک کو کہیں سنسان جگہ چھوڑ کر واپس آجائیں گے اور کوئی دوسرا پلان بنائیں گے۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس سلسلے میں اب تک جو روپیا تم نے خرچ کیا ہے، اس سے ہاتھ دھولو گے۔ مثلاً آفس کو کرائے پر لینا، وردیاں بنوانا اور کول کو وہ ٹریلر کرائے پر لے کر دینا جس کے ذریعے وہ اپنا کام کرے گا وغیرہ وغیرہ۔''

''خرچ تمہارے اندازے سے بھی کہیں زیادہ ہوا ہے۔'' فلپ نے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔ ''لیکن دس سے لے کر بیس سال تک کی سزا پانے کے مقابلے میں یہ کہیں زیادہ بہتر ہے کہ اس روپے کی قربانی دے دی جائے۔ کامیابی کا راز ہی یہ ہے کہ آدمی اپنے نقصان کو برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کرے اور دوبارہ زیادہ مستعدی کے ساتھ کوشش کرے۔ اس جدوجہد کا نتیجہ آخرکار تمہارے حق میں نکلے گا اور جب کبھی ایسا ہوا تو تمہارے تمام نقصانات کی تلافی ہوجائے گی۔ دولت کو کبھی کوئی پرابلم نہیں بننا چاہیے۔ اگر تقدیر سے ہار بھی گئے تب بھی یہ امید باقی رہتی ہے کہ کبھی نہ کبھی جیت بھی ہوگی لیکن اگر تم پکڑے گئے اور لمبی مدت کے لیے جیل بھیج دیے گئے، تب وہ زمانہ جو جیل میں بسر ہوگا کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ کوئی بھی احمق آدمی چوری کرسکتا ہے۔ قید خانے ایسے لوگوں سے بھرے ہوئے ہیں جبکہ ہونا یہ چاہیے کہ آدمی چوری کرے اور پکڑا نہ جائے۔ چنانچہ میں نے اپنے لیے یہ اصول بنا رکھا ہے اور سختی سے اس پر کاربند ہوں کہ جب تک تمہیں مکمل یقین نہ ہو کہ تم چوری کرکے بچ نکلو گے، اس وقت تک کبھی چوری کی کوشش بھی مت کرو۔''

میں چونکہ ان احمقوں میں سے ایک تھا جو جیل کی سیر کرچکے ہیں اس لیے مجھے فلپ کی باتوں سے اتفاق کرنا پڑا۔ اس نے ٹرک کو ایک ایسی سڑک پر موڑ دیا جس پر ون وے ٹریفک تھا اور چلتے ہوئے ٹریفک کے ہجوم میں شامل ہوگیا۔ اچانک ٹرک میں لگا ہوا ریڈیو جو اب تک محض مختلف قسم کے اعداد و شمار نشر کررہا تھا، اچانک اس سے آواز بلند ہوئی۔

''کے ایم اڑتالیس۔ ڈسپیچر سے مخاطب ہے۔''

''میں ڈسپیچر بات کررہا ہوں۔'' دوسری آواز آئی۔

''ہمارا آہن پوش ٹرک کے ایم اڑتالیس ٹریفک میں پھنس گیا ہے۔ کسی احمق آدمی نے ایک ٹریکٹر ٹریلر کو سڑک کے بالکل درمیان میں کھڑا کرکے راستہ بند کردیا ہے۔ اپنے موکل کو اطلاع دے دو کہ ہمیں پہنچنے میں تاخیر ہوجائے گی۔''

''ٹھیک ہے، ہم اطلاع کردیں گے۔'' دوسری آواز نے جواب دیا۔

میں نے فلپ کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

''کیا یہ اسی آہن پوش ٹرک کا ذکر تھا جس کے بجائے ہم جارہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔'' فلپ نے اثبات میں جواب دیا۔ ''تمہارے بھائی نے اپنا کام بڑی خوبی سے انجام دیا ہے۔''

''لیکن اگر ڈسپیچر نے موکل کو اطلاع کردی تب؟''

''اس کی فکر مت کرو۔''

لیکن اس کے یہ کہنے سے میری پریشانی دور نہ ہوسکی۔ میری ہتھیلیاں پسینے میں بھیگ گئیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ خدا جانے ہم کس مصیبت میں پھنسنے جارہے ہیں۔ فلپ نے ٹرک کو ایک سائڈ اسٹریٹ میں موڑ لیا۔ میں نے پتلون سے اپنی ہتھیلیوں کو رگڑ کر پسینا خشک کیا۔ فلپ نے ٹرک

ایک موڑ پر روک لیا۔

''ہم اپنی منزل پر آگئے ہیں۔ چلو نیچے اترو۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

ہم ٹرک سے اتر کر تنگ فٹ پاتھ پر آگئے۔ ہمارے دائیں جانب چند قدم کے فاصلے پر ایک بینک کا دروازہ تھا۔ ایک باوردی گارڈ دروازے کے پیچھے کھڑا تھا۔ فلپ اسے دیکھ کر مسکرایا۔ دروازے کے قریب ہی ایک اور دروازہ تھا جو کہ بند تھا۔ یہ دروازہ بینک اور دوسرے دفاتر کے لیے مال لانے لے جانے میں استعمال ہوتا تھا۔ فلپ نے دروازے کے پاس دیوار میں لگا ہوا بٹن دبایا۔ دروازہ کھل گیا۔ جس بوڑھے گارڈ نے دروازہ کھولا تھا، اس نے فلپ پر اور مجھ پر ایک گہری نگاہ ڈالی۔

''تم وہ لوگ تو نہیں ہو جو عموماً آتے رہتے ہو۔'' اس نے کہا۔

فلپ نے مسکراتے ہوئے اپنے داہنے ہاتھ کی پہلی انگلی اور انگوٹھے کو ایک ریوالور کی شکل دیتے ہوئے جواب دیا۔

''ہم ڈاکو ہیں......ڈزڈز۔'' بوڑھا گارڈ بھی ہنسنے لگا۔

''مذاق مت کرو۔'' وہ بولا۔ ''یہ بتاؤ کہ ان لوگوں کے نہ آنے کی کیا وجہ ہے؟''

فلپ نے اپنا شناختی کارڈ دکھایا۔ اتنی تیزی سے کہ گارڈ اس پر بنے ہوئے سرکاری نشانات کو دیکھ لے مگر فوٹو کو دیکھنے کا موقع نہ پاسکے۔

''جو ٹرک ہمیشہ آتا تھا، وہ اچانک خراب ہوگیا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اس لیے اس کی جگہ ہنگامی طور پر ہمیں دوسری جگہ سے طلب کیا گیا ہے۔ کمپنی جانتی ہے کہ بینک کے حکام وقت پر مال اٹھوا دینا چاہتے ہیں۔ خاص طور سے ایسی قیمتی چیز...... اور ذرا سی بھی دیر ہوجائے تو ناراض ہونے لگتے ہیں۔ ہمیں اتنی جلدی میں طلب کیا گیا ہے کہ اس عجلت میں تیسرا گارڈ بھی نہیں دیا گیا۔ میں اس کی شکایت کروں گا۔ یونین کے کنٹریکٹ میں صاف طور پر تحریر ہے کہ ایک ٹرک پر تین گارڈ جائیں گے لیکن ہمیں مجبور کیا گیا کہ ہم صرف دو آدمیوں سے کام چلائیں۔''

''اچھا، اچھا۔ میرے سامنے اپنا دکھڑا رونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' بوڑھے گارڈ نے کہا۔ ''میری اپنی پریشانیاں کم نہیں ہیں۔ بس تم جلدی سے مال اٹھا کر لے جاؤ۔''

''کیا ہمارے انسپکٹر نے اسے چیک کرلیا ہے؟'' فلپ نے پوچھا۔ ''جب تک انسپکٹر چیک کرکے اپنی مہر نہ لگادے، میں کسی کاغذ پر دستخط کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔''

''ہاں، وہ تم سے پہلے آچکا ہے۔ اس لیے ہر چیز کا معائنہ کرکے، شمار کرکے تھیلوں کو سربمہر کردیا ہے۔ تمہیں صرف اتنا کرنا ہے کہ ان تھیلوں کو اٹھا کر ٹرک میں رکھو اور روانہ ہوجاؤ۔''

''پھر تو کوئی پرابلم ہی نہیں ہے۔'' فلپ نے کہا۔

ہم گارڈ کے پیچھے ایک چھوٹے ہال سے گزرتے ہوئے بینک کے بڑے والٹ روم میں داخل ہوئے۔ ہمارے اندر قدم رکھتے ہی بینک والٹ کا آہنی سلاخوں والا دروازہ بند ہوگیا اور میں اس وقت یہی سوچ کر تعجب کررہا تھا کہ کمپنی کے ڈسپیچر نے بینک والوں کو یہ اطلاع کیوں نہیں دی کہ ان کا ٹرک کچھ تاخیر سے پہنچے گا۔ اگر ہماری موجودگی میں ڈسپیچر کی یہ کال آئی تو ہماری شامت بھی آنے میں کوئی کسر نہیں تھی اور یہ خیال اتنا پریشان کن تھا کہ والٹ کے اندر ایئرکنڈیشنر لگے ہونے کے باوجود مجھے پسینا آرہا تھا۔

''دروازہ کھولو۔'' بوڑھے گارڈ نے کہا۔

ایک دوسرا باوردی گارڈ جس کا سر گنجا اور توند ضرورت سے زیادہ باہر نکلی ہوئی تھی، دوسرے سلاخوں دار دروازے کے سامنے نمودار ہوا اور قفل کھول دیا۔ ہم اندر داخل ہوئے۔ مجھے اس سے پہلے کسی بینک والٹ میں داخل ہونے کا موقع نہیں ملا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اس کی ایک ایک تفصیل کو دیکھوں اور ذہن میں رکھنے کی کوشش کروں شاید آئندہ کبھی کام آئے لیکن ظاہر ہے کہ میں خود کو کوئی سیاح بھی ظاہر نہیں کرسکتا تھا اس لیے ادھر ادھر دیکھنے کے بجائے اس گوشے کی طرف دیکھنے لگا جہاں پانچ تھیلے رکھے تھے۔

''وہ رہا مال۔'' بوڑھے گارڈ نے کہا۔

فلپ تھیلوں کے پاس جاکر جھکا اور ان کی مہریں دیکھنے لگا۔

''کیا تمہیں ہم پر اعتبار نہیں ہے؟'' گارڈ نے پوچھا۔

''جب مجھے کوئی چیز وصول کرکے دستخط کرنا پڑیں تو میں اپنے باپ پر بھی اعتبار نہیں کرتا۔'' فلپ نے خوشگوار لہجے میں جواب دیا۔ ''اگر میں یہ تھیلے لے جاؤں اور ان میں سے کوئی مہر ڈھیلی یا ٹوٹی ہوئی نکلے تو کمپنی والے تو میرا گلا دبادیں گے۔''

''ٹھیک کہتے ہو۔ میں تمہیں موردِ الزام نہیں ٹھہراتا۔ محتاط رہنا ہمیشہ اچھا ہوتا ہے۔'' گارڈ نے تائید کی۔

''سب مہریں درست ہیں۔'' فلپ کھڑا ہوگیا اور

کلپ بورڈ اٹھایا۔ ایک رسید احتیاط سے پُر کی، اس پر دستخط کیے اور پھاڑ کر گارڈ کے حوالے کر دی۔

''کیا یہ رسید تمہارے منیجر کو مطمئن کرنے کے لیے کافی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''بہت کافی ہے۔'' گارڈ مسکرایا۔

فلپ نے مجھے اشارہ کیا۔ میں نے تھیلے اٹھا کر وہیں پڑی ہوئی ایک ٹرالی پر رکھے اور ٹرالی کو چلاتا ہوا بینک والٹ سے باہر نکل آیا۔

اور پھر چند منٹ کے اندر ہم وہ تھیلے ٹرک میں رکھ کر وہاں سے روانہ ہو چکے تھے۔ میرا دل ابھی تک زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

''شکر ہے۔'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ ''آخر ہم کامیاب ہو گئے۔''

''میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔''

مجھے یاد آیا کہ کول نے کہا تھا کہ میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں، چنانچہ میں نے سوال کیا۔

''لیکن ابھی تک یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ تمہیں اتنا یقین کیوں تھا؟''

فلپ نے ٹرک کو مین روڈ پر موڑ دیا اور اس کی رفتار تیز کر دی۔

''پریشان ہونے کی تو کوئی بات ہی نہیں تھی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''بینک والے ایک آہن پوش ٹرک کے منتظر تھے اور ٹرک پہنچ گیا۔ پھر آخر وہ ہم پر شبہ کیوں کرتے۔ ہم مقررہ یونیفارم پہنے ہوئے تھے، ہمارے پاس شناختی کارڈ تھے اور یہ کہ ہم جانتے تھے کہ کمپنی کا انسپکٹر پہلے ہی وہاں پہنچ کر مال کی جانچ پڑتال کر چکا ہے اور تھیلوں کو مہریں لگا چکا ہے۔ پھر اس سے بھی زیادہ ہمارے پاس وہ اصلی رسید تھی جو ہم نے اسے وصولیابی کے بعد دی اور گارڈ کا فرض صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ مال دے کر رسید وصول کر لے۔ اس کے بعد وہ ہر ذمے داری سے بری الذمہ ہو جاتا ہے۔ اسے اس طرح سے سمجھو کہ ایسا کونسا مجرم ہو سکتا ہے جو تمہیں سرکاری فارم پر مال وصول کرنے کی رسید دے سکتا ہے۔ کم سے کم وہ لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ کسی مجرم کے ہاتھ سرکاری فارم نہیں لگ سکتا۔''

''اچھا۔ دوسری بات یہ کہ ڈسپیچر نے اس دوسرے ٹرک سے کال وصول کی تھی، وہ بینک کو اطلاع......''

''میں نے تم سے کہہ دیا کہ اس بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' فلپ نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

اور تب اچانک میری سمجھ میں آ گیا کہ اس بارے میں اس کے اطمینان کی کیا وجہ ہے۔ بلاشبہ ڈسپیچر بھی اس منصوبے میں فلپ کا شریک کار تھا۔ یہی وہ بنیادی وجہ تھی کہ فلپ ایک آہن پوش ٹرک پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو سکا۔ پھر مقررہ وردیاں، رسید کس طرح بھری جاتی ہے، اس کا طریقہ، کمپنی کا پورا طریقۂ کار وغیرہ سب کچھ اسے ڈسپیچر کی زبانی ہی معلوم ہوا ہوگا۔ میں حیرت سے سوچ رہا تھا کہ معلوم نہیں ڈسپیچر کو بلانے کے لیے فلپ نے کتنی رقم خرچ کی ہوگی، یا یہ کہ اس کا کتنا حصہ رکھا ہوگا۔ اگر ڈسپیچر ہوشیار ہوگا تو اس نے اس خیال سے کہ کہیں بعد میں منصوبہ ناکام ہو جائے اور اسے رقم نہ مل سکے، اپنا حصہ پہلے ہی رکھوا لیا ہوگا۔ پھر یہ کہ اسے ذاتی طور پر کوئی ایسا خطرہ بھی نہیں تھا۔ اگر وہ کہہ دے کہ اس نے بینک کو ٹرک کے دیر سے پہنچنے کی اطلاع کر دی تھی تو کون اسے جھٹلا سکتا ہے جبکہ اس نے یہ کال ریکارڈ پر لانے کے لیے بینک کے فون کا نمبر بھی ڈائل کر دیا ہوگا اور جب اس طرف سے کسی نے ریسیور اٹھایا ہوگا تو کریڈل پر ہاتھ مار کر کنکشن کاٹ دیا ہوگا اور پھر ڈیڈ فون میں جو دل میں آئے کہتا رہا ہوگا۔ سننے والے یہ سمجھیں گے کہ وہ بینک سے بات کر رہا ہے اور بعد میں اس کی گواہی بھی دیں گے۔ ممکن ہے اس پر شبہ پھر بھی کیا جائے لیکن اس کے خلاف قانونی طور پر کچھ ثابت نہیں کیا جا سکے گا۔

میں فلپ کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اس پر اعتبار بھی نہیں کرتا تھا لیکن اس کے باوجود مجھے اس کی ذہانت کا اعتراف کرنا پڑا۔ ابھی کول کو کوئی ایسا منصوبہ بنانے کے لیے ایک طویل مدت اور تجربے کی ضرورت تھی۔

اس نے ٹرک ایک سڑک پر موڑ لیا۔ کچھ دور تک گیا اور ایک مرتبہ پھر ٹرک دوسری سڑک پر لے آیا۔ ہمیں بینک سے روانہ ہوئے پانچ منٹ ہو چکے تھے۔ ہم شہر کے ایک ایسے حصے سے گزر رہے تھے جس کی سڑکیں بہت تنگ اور عمارتیں بہت شکستہ تھیں۔ اس علاقے کے لیے ترقیاتی اسکیم منظور ہو چکی تھی۔ چنانچہ تمام مکینوں سے عمارتیں خرید لی گئی تھیں اور اب اس بات کا انتظار تھا کہ انہیں مسمار کر کے دوبارہ نئے پلان کے مطابق تعمیر کیا جائے۔ چنانچہ سارا علاقہ غیر آباد تھا۔ فلپ نے اچانک ٹرک روک لیا۔

''دروازہ کھولو۔'' اس نے مجھے اشارے سے کہا۔

میں نیچے اترا۔ وہ دروازہ جس کی طرف اس نے اشارہ کیا تھا، بہت بڑا اور کشادہ تھا اور اس قسم کا تھا کہ جو

دائیں بائیں کھلنے کے بجائے اوپر کی جانب کھلتا تھا۔ میں نے جھک کر اسے اٹھایا۔ فلپ ٹرک اس دروازے سے گزار کر اندر لے گیا۔ میں نے دروازہ بند کر دیا اور چاروں طرف دیکھا۔ یہ ایک بہت بڑا سا ہال معلوم ہوتا تھا جو اس عمارت کے مکین گودام کے طور پر استعمال کرتے تھے یا پھر گیراج کے طور پر۔ اندر گہری تاریکی تھی اس لیے فلپ نے ٹرک کی ہیڈ لائٹس جلا رکھی تھیں۔ سیمنٹ کا فرش خاک آلودہ ہو رہا تھا۔ میں یہاں پہلے کبھی نہیں آیا تھا اور فلپ نے مجھے یہ جگہ دکھانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔ کول البتہ یہ مقام دیکھ چکا تھا اور وہ غالباً اس لیے کہ اسے ٹریفک جام کرنے کے بعد بہرحال اپنے کام سے فارغ ہو کر یہیں پہنچنا تھا۔

اچانک باہر سے کسی کار کے ہارن کی آواز آئی۔ فلپ نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا اور پھر مجھے دروازہ دوبارہ اٹھانے کی ہدایت کی۔ میں نے دروازہ کھولا تو ایک گہرے رنگ کی مرسیڈیز کار اندر داخل ہوئی جسے وہ لڑکی چلا رہی تھی۔ میں نے دروازہ پھر نیچے گرا دیا۔ میں سوچ رہا تھا پتا نہیں کول کہاں رہ گیا۔ وہ اب تک کیوں نہیں آیا۔ پلان یہ تھا کہ وہ اپنا کام ختم کر کے...... ٹریلر کو وہیں چھوڑ کر جہاں اس نے ٹریفک جام کیا تھا، اپنی کار میں اس جگہ آ جائے تاکہ یہاں ہم اپنا اپنا حصہ وصول کریں اور فلپ سے رخصت ہو کر چلے جائیں۔

لڑکی کار سے اتری۔ اس کی ڈکی کھولی اور اس میں سے دو بڑے سوٹ کیس نکالے۔ فلپ ٹرک کے پچھلے حصے میں چڑھ گیا اور وہ کینوس کے تھیلے جو ہم بینک سے لائے تھے، نکال نکال کر باہر ڈالنے لگا۔ اگر ان تھیلوں کو منہ کی جانب سے کھولا جاتا تو اس کے لیے سیل توڑنا پڑتی جو ایک موٹے سے تار میں لگی ہوئی تھی لیکن چونکہ ہمارے پاس کوئی تار کاٹنے والا کٹر نہیں تھا اس لیے فلپ نے چاقو لے کر تھیلے درمیان سے کاٹ دیے۔ پہلے تھیلے سے کسی قسم کے سرکاری کاغذات برآمد ہوئے جو بنڈلوں کی شکل میں بندھے ہوئے تھے۔ فلپ نے ان کا معائنہ شروع کیا۔ ان میں سے کچھ چھانٹ کر ایک طرف پھینک دیے اور کچھ کو لکڑی کی ایک بنچ پر رکھ دیا۔ اس تھیلے سے فرصت پا کر اس نے دوسرا تھیلا کاٹا اور اس کے اندر سے اس قدر نوٹوں کی گڈیاں فرش پر گر پڑیں جتنی میں نے اپنی زندگی میں آج تک نہیں دیکھی تھیں۔ اس نے مجھے اشارہ کیا کہ ان نوٹوں کو اٹھا کر لکڑی کی ایک دوسری بنچ پر رکھ دو۔ باقی کے تھیلوں میں سے دو میں کرنسی نوٹ اور ایک میں کاغذات برآمد ہوئے۔ فلپ نے ان میں سے بیشتر کاغذات اٹھا کر بنچ پر رکھ دیے۔

ابھی ہم اس کام سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ ہم نے ایک دستک کی آواز سنی۔ فلپ کا ریوالور مجھ سے پہلے اس کے ہاتھ میں آ چکا تھا مگر جب دروازہ کھلا اور کول اندر داخل ہوا تو میں نے اپنا ریوالور واپس جیب میں رکھ لیا۔ کول نے مسکرا کر لڑکی کی طرف دیکھا۔

''کیا حال ہے ڈارلنگ...... کار حاصل کرنے میں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟''

اس کے بعد کول کی نظریں بنچ پر رکھے ہوئے نوٹوں پر پڑیں، وہ مسکرایا اور فلپ سے مخاطب ہوا۔

''میں نے اپنی کار باہر چھوڑ دی ہے۔ تم ہمیں ہمارا حصہ دے دو تاکہ ہم یہاں سے رخصت ہو جائیں۔''

فلپ نے ابھی تک اپنا ریوالور ہولسٹر میں واپس نہیں

ناقد

''تم نے تخلیق کے نام پر ایک سطر نہ لکھی، نہ کوئی شعر پھر تمہیں نامور ادیبوں کی تحریروں پر تنقید کرنے کا کیا حق ہے؟'' ایک ابھرتے ہوئے مصنف نے ناقد پر قدرے برہم ہوتے ہوئے کہا۔

''تنقید کرنے کے لیے ادیب یا شاعر ہونا ضروری نہیں۔'' ناقد نے اطمینان سے کہا۔ ''انڈا مرغی تخلیق کرتی ہے۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ آپ نے کبھی انڈا نہیں دیا ہوگا۔ لیکن آپ یقیناً انڈے کے بارے میں مرغی سے زیادہ جانتے ہیں۔''

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

محبت

محبت کی حد وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں پر اختیار کی حد ختم ہوتی ہے۔ محبت کسی فلسفے یا مذہب کی محتاج نہیں۔ تکلیف کی زیادتی محبت کی کمی کا باعث بن جاتی ہے۔ محبت اپنی گہرائیوں سے ہمیشہ بے خبر رہتی ہے جب تک کہ اسے جدائی کے لمحے بیدار نہیں کرتے۔ محبت اس دریا کے مانند ہے کہ اگر بارش بھی نہ ہو تو پانی کم نہیں ہوتا۔ محبت انمول ہوتی ہے اس کا کوئی مول نہیں ہوتا اگر بکتی ہو تب۔ محبت ایسا کھیل ہے جس میں عقل ہار جاتی ہے۔ محبت ایسی پیاری چیز ہے جو انسان کو مشکل ترین کاموں کے لیے مجبور کرتی ہے اگر یہ نہ ہوتی تو دنیا میں بالعموم قربانی کی راہ مسدود ہو جاتی۔

مرسلہ۔ محمد الیاس، بلوچستان

رکھا تھا۔ اب اس ریوالور کی نال نے مجھے اور کول کو اپنی زد میں لے لیا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ بولا۔ ''تم لوگوں کو کچھ بھی نہیں ملے گا۔ اس لیے نہیں کہ مجھے پچاس ہزار ڈالرز زیادہ حاصل کرنے کا لالچ ہے۔ کیونکہ میرے لیے یہ رقم کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتی لیکن میں یہ پسند نہیں کرتا کہ اپنے پیچھے ایسے لوگ چھوڑ جاؤں جو مجھے بعد میں شناخت کرسکیں یا میری کسی اسکیم کے بارے میں لوگوں کو کچھ بتاسکیں۔''

میں بہت دیر سے اس حقیقت کو سمجھ پایا کہ آخر ہم میں سے کسی نے کیوں فلپ کا نام نہیں سنا تھا یا کوئی کیوں اسے نہیں جانتا تھا۔ اس نے بلاتکلف ریوالور کا ٹریگر دبا دیا۔ گھوڑا اپنے مقام پر گرا لیکن ایک کلک کی آواز کے علاوہ اور کچھ نہ ہوا۔ فلپ نے چونک کر میری طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں دفعتاً حیرت کے تاثرات ظاہر ہوئے اور وہ سمجھ گیا کہ میں ریوالور کے ساتھ کیا حرکت کرچکا ہوں۔

اس وقت جبکہ فلپ تیسرے گارڈ کو اوپر لانے گیا ہوا تھا، میں نے پہلے گارڈ کا ریوالور خالی کردیا تھا (جو اس نے مجھے پکڑا دیا تھا) پھر جب وہ واپس آیا اور اس نے ریوالور واپس مانگا تو میں نے وہ خالی ریوالور اسے دے دیا۔ وہ یہی سمجھتا رہا کہ ریوالور بھرا ہوا ہوگا، اسے ریوالور چیک کرنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی۔ بیشک وہ مجھے احمق خیال کرتا تھا لیکن اتنا بیوقوف بھی نہیں جانتا تھا کہ میں ایک خطرناک مہم پر جاتے ہوئے اس کا ریوالور خالی کردوں گا۔ لیکن یہ بات ممکن ہے اس کے لیے اہم ہو مگر میرے لیے اہم نہیں تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر کوئی بات بگڑ گئی اور فلپ نے گولیوں کا کھیل شروع کردیا تو میں اس کے کسی ایسے کھیل میں حصے دار بننا نہیں چاہتا تھا اور نہ ہی اسے کسی کو قتل کرنے کی اجازت دے سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے جو گولیاں نکالی تھیں، اس میں میری کسی پیش بینی کو دخل نہیں تھا۔ بلکہ یہ محض میرا خوف تھا کہ میں کسی قتل کی واردات میں ملوث ہونا نہیں چاہتا تھا۔ میں ایک معمولی چور تھا، قاتل نہیں تھا۔

لیکن کول ایسا نہیں تھا۔ جب اس نے دیکھ لیا کہ فلپ کا ریوالور خالی ہے تو جلدی سے اپنا ریوالور نکال کر بلاتامل اسے گولی ماردی۔ مرتے وقت بھی فلپ کی آنکھوں میں حیرت کے تاثرات تھے۔ کول کے ریوالور کی آواز اس بند جگہ میں اس قدر گونجی کہ میرے کان بج اٹھے اور میرے کان سن ہی تھے جس کی وجہ سے میں اس کی ہلکی سی آواز کو نہ سن سکا جو لڑکی کے ریوالور سے پیدا ہوئی تھی۔ اس لڑکی نے اپنے چھوٹے سے ریوالور سے کول کی پشت میں گولی ماردی تھی۔ کول گولی کھا کر گرا مگر گرنے سے پہلے گھوما اور لڑکی کو بھی نشانہ بنادیا۔ لڑکی کے منہ سے ایک دبی ہوئی چیخ نکلی اور وہ فرش پر ڈھیر ہوگئی۔

میں جلدی سے آگے بڑھا۔ کول کے قریب دوزانو ہوکر بیٹھ گیا اس کا سر اٹھایا۔ کرب واذیت اس کے چہرے سے نمایاں تھی اور اس کی گردن اکڑی ہوئی تھی۔ چہرہ ایک دم سفید پڑ گیا تھا۔

''ہمت کرو کول۔'' میں نے کہا۔ ''تم ضرور بچ جاؤ گے۔ میں ابھی تمہیں کسی ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہوں۔''

''اب کوئی امید نہیں۔'' کول جیسے سرگوشی میں بولا۔ ''میں محسوس کررہا ہوں کہ میرا آخری وقت آپہنچا ہے۔''

''نہیں کول نہیں۔ تمہیں زندہ رہنا ہے۔''

''وہ سونے کی کان۔'' اس نے کہا۔ ''اب ہم اسے کبھی حاصل نہیں کرسکیں گے۔''

''ہم نے اسے پالیا ہے۔'' میں چلّایا۔ ''اتنی بڑی دولت کے حصے دار اب صرف تم اور میں رہ گئے ہیں۔''

''اب وہ سب تمہاری ہے۔'' کول نے کھانستے ہوئے کہا۔

''مجھے ایسی دولت نہیں چاہیے۔''

''پاگل۔'' وہ مسکرایا۔ ''تم ہمیشہ سے تھوڑے پاگل تھوڑے احمق رہے ہو۔''

اور یہ کہہ کر وہ مرگیا۔ میرے بازوؤں میں اس نے دم توڑ دیا۔ میں ایک ایسی کھوئی کھوئی سی حالت محسوس کررہا تھا جیسے میرا سب کچھ لٹ گیا ہو۔ کچھ دیر کے بعد جب میری حالت سنبھلی تو میں کول کی کار اندر لایا۔ اسے بڑی نرمی سے اٹھا کر اگلی سیٹ پر بٹھادیا۔ سیٹ کی بیلٹ اس کی کمر کے گرد کس دی اور شانوں کے بند بھی کس دیے۔ اب وہ اس طرح نظر آرہا تھا جیسے کوئی شخص سو رہا ہو۔ اس کے بعد میں نے وہ سوٹ کیس اٹھائے جو لڑکی نے کار سے نکالے تھے اور ان میں وہ نوٹوں کی گڈیاں بھردیں جو بنچ پر رکھی ہوئی تھیں۔ نوٹ اس قدر زیادہ تھے کہ دونوں بڑے سوٹ کیس بھرنے کے بعد بھی بہت سی گڈیاں باقی رہ گئیں۔ ان نوٹوں میں بیس ڈالرز کے پچاس ڈالر کے اور سو ڈالر کے نوٹ شامل تھے اور سب کے سب استعمال شدہ۔ پچاس کے نوٹوں کی ایک گڈی اٹھا کر میں نے اپنی جیب میں رکھ لی۔ باقی نوٹ کاغذات

کے ساتھ وہیں چھوڑ دیے اس کے بعد میں نے اپنا رومال نکالا اور ٹرک کے اندر گھس کر وہ تمام مقامات صاف کردیے جہاں میرا ہاتھ لگا تھا یا جہاں میرا ہاتھ لگ سکتا تھا۔ پھر اس ریوالور کو بھی صاف کردیا جو کول کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔ میں نے اسے ہی نہیں، اس کی گولیوں کو بھی صاف کردیا اور پھر میں نے وہ ریوالور فلپ کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ پولیس اب اس کی اور لڑکی کی لاش کے معمے کو حل کرنے میں اپنی پوری عمر کھپا سکتی تھی۔

پھر جب یہ سارے کام ہوگئے تو میں نے فلپ کی دی ہوئی وردی اتار کر اپنے کپڑے پہن لیے جو ابھی تک اس گتے کے ڈبے میں رکھے تھے جو ہم نے ٹرک میں رکھا تھا۔ پھر جس طرح فلپ نے اس دفتر سے روانہ ہوتے وقت کیا تھا میں نے بھی روانگی سے قبل پورے کمرے پر ایک نظر ڈالی یہاں تک کہ مجھے اطمینان ہوگیا کہ اب اس جگہ میری یا کول کی موجودگی کا کوئی ثبوت باقی نہیں رہ گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ابھی چند لمحہ قبل یہ سب زندہ تھے لیکن پھر ایک دم تقدیر نے اپنی نیرنگی دکھائی اور انہوں نے ایک دوسرے کو قتل کردیا۔ کس کے لیے؟ صرف دولت کے لیے۔ اس سونے کی کان کے لیے جسے حاصل کرنے کے لیے ہر شخص اپنے اپنے طور پر تگ ودو کرتا رہتا ہے۔

میں نے اگلی سیٹ پر بیٹھ کر ڈرائیونگ وہیل سنبھالا اور کار کو باہر نکال لایا۔ شہر کی جانب روانہ ہوتے ہوئے میں نے راستے میں ایک جگہ رک کر ایک ایسے پبلک فون سے جس کے آس پاس کوئی نظر نہیں آرہا تھا، پولیس کو فون کیا اور پھر جس شخص نے دوسری طرف سے جواب دیا، اسے بتایا کہ وہ جوہری بازار کی فلاں عمارت کے فلاں آفس کو چیک کرے اور پھر شہر کے اس خالی علاقے میں اس گودام کو بھی۔ اسے وہاں بہت سی کام کی چیزیں مل جائیں گی اور یہ کہہ کر کوئی دوسری بات کیے بغیر ریسیور رکھ دیا۔

ایک گھنٹا پندرہ منٹ کے بعد میں ایک ایسے چھوٹے سے قصبے میں تھا جو شہر سے تقریباً ساٹھ میل کے فاصلے پر تھا۔ یہاں میں نے ایک ایسے گورکن اور تجہیز وتکفین کا انتظام کرنے والے کے بارے میں سنا تھا جو بڑی خاموشی سے لاشوں کو ٹھکانے لگا دیا کرتا تھا اور اگر آپ کے پاس کافی رقم ہو تو وہ ڈاکٹر کا فرضی سرٹیفکیٹ بھی حاصل کرسکتا تھا جس سے معلوم ہو کہ متوفی اپنی قدرتی موت مرا ہے اور مجھے اس وقت ایسے ہی ...سرٹیفکیٹ کی ضرورت تھی۔ اس کام کے لیے مجھے پچاس ڈالر کے اس بنڈل سے بھی زیادہ رقم خرچ کرنا پڑی اور گورکن نے مجھے یقین دلایا کہ وہ ڈاکٹر سے یہ ...سرٹیفکیٹ حاصل کرلے گا کہ کول نے نمونیہ سے انتقال کیا ہے۔ میں نے سوٹ کیس سے ایک اور بنڈل نکالا جو اس مقصد کے لیے اس گورکن کو دیا گیا کہ وہ کول کے لیے ایک سادہ سا... تابوت تیار کردے۔

پھر جب یہ تابوت تیار ہوگیا تو میں نے گورکن کو کمرے سے باہر بھیج دیا اور خود تابوت کے پاس پندرہ منٹ صرف کیے۔ گورکن یہ سمجھ رہا ہوگا کہ میں تنہائی میں اپنے بھائی کے لیے دعا کرنا چاہتا ہوں۔ پھر اس نے مجھے اس کی بھی اجازت دے دی کہ میں اپنے ہاتھ سے تابوت میں کیلیں ٹھونک کر اسے ہمیشہ کے لیے بند کردوں۔ میں نے کول کی تدفین کے بجائے تابوت سمیت اس کی لاش جلائے جانے اور پھر اس کی راکھ کو دفن کرنے کو ترجیح دی۔ گورکن سے بھی میرا یہی معاہدہ ہوا تھا۔ آخری رسومات کی ادائیگی کے بعد تابوت کو گورکن کے اس بڑے آتش دان میں رکھ دیا گیا جہاں وہ کچھ ہی دیر میں جل کر راکھ ہوجانے والا تھا اور جب آتش دان کا آہنی دروازہ بند کردیا گیا تو میں کمرے سے باہر نکل آیا۔

میں آہستہ قدموں سے اپنی کار کی طرف چلا۔ رات تاریک اور سنسان تھی۔ اب وقت آگیا تھا کہ میں ملک کے اس حصے کو چھوڑ کر کہیں اور چلا جاؤں۔ کول کو بھولنے کی کوشش کروں اور ایک مرتبہ پھر میری زندگی وہی رخ اختیار کرلے جو کول کی آمد سے پہلے تھی۔ میں نے ان نوٹوں کو گنا جو باقی رہ گئے تھے۔ یہ تین سو ڈالر تھے۔ جبکہ گزشتہ صبح میری جیب میں صرف چالیس ڈالر تھے اور مجھ جیسے آدمی کے لیے یہ رقم بھی کافی تھی۔ میں مطمئن تھا۔

کول بھی یقیناً مطمئن ہوگا کیونکہ میں نے دونوں سوٹ کیسوں کے تمام نوٹ اس کے تابوت میں منتقل کردیے تھے اور اب تک وہ تمام نوٹ جو یقیناً دس لاکھ ڈالرز سے بھی کہیں زیادہ ہوں گے، اس کی لاش کے ساتھ جل کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے راکھ ہوچکے ہوں گے۔ کول میرا بھائی تھا اور میں کسی کو یہاں تک کہ موت کو بھی اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا تھا کہ وہ مجھے میرے بھائی کی آخری خواہش پوری کرنے سے روک دے۔ کول ہمیشہ سے سونے کی کان کا متلاشی اور خواہشمند تھا۔ مجھے خوشی تھی کہ جب وہ اپنے آخری سفر پر روانہ ہوا تو اس کے چاروں طرف ایک سونے کی کان لاکھوں ڈالرز کے نوٹوں کی شکل میں موجود تھی۔

پرائے آسمان پر اونچی پرواز اڑنے والے پرندوں کی کم ظرفی،
بغاوت اور گھمنڈ کی عبرت اثر داستان

کفارہ

اسما قادری

جب انسان کاتبِ تقدیر کے فیصلوں سے آگے چلنے کی کوشش کرتا ہے تو اکثر منہ کے بل گرتا ہے... اور صحیح یا غلط کی اصل حقیقت اس ٹھوکر کے بعد ہی سامنے آتی ہے کہ اس تکلیف سے اس نے کچھ سیکھا بھی ہے یا نہیں اور اسی پس منظر میں اس دوشیزہ کی زندگی نے جس طرح کروٹ لی اس نے ہر ایک کو حیران کردیا... وہ پوری کائنات کو محض اپنی ذہانت کی بنیاد پر مٹھی میں بند کرلینے کا زعم لیے جی رہی تھی کہ اچانک اس ایک پل نے اسے زندوں میں چھوڑا نہ مردوں میں... کیونکہ صرف غلطیوں کے ادراک اور اعتراف سے ہی انسان منصف نہیں بن جاتا بلکہ اسے ازالے کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور اس ضمن میں اس کا حق ادا کرنے کا حوصلہ اس میں ہرگز نہ تھا مگر خدا کی لاٹھی کمزور یا باہمت کو کب دیکھتی ہے، وہ تو بس انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے اسے زمانے بھر کے سامنے عبرت کا نشان بنا دیتی ہے۔ ایسا ہی اس کے ساتھ بھی ہوا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ قدرت گناہ سے بڑی سزا کبھی نہیں دیتی... لہٰذا جب اس کی سزا کا پیمانہ پورا ہوا تو اچانک جیسے حبس زدہ موسم میں کھل کر برسات ہوگئی جس میں ہر چیز نکھر کر سامنے آگئی... اگر کوئی سمجھے تو قدرت قدم قدم پر ہر انسان کے ساتھ ہے بس اسے سمجھنے کا احساس چاہیے ہوتا ہے۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' اس کے سامنے بیٹھی سخت چہرے والی عورت نے درشتی سے اس سے پوچھا تو وہ جواب میں ٹکر ٹکر اس کی صورت تکتی رہی۔ اسے شاید خود بھی یاد نہیں تھا کہ اس کا نام کیا ہے۔ نام تو انسان کی شناخت ہوتا ہے اور اب اس کی کوئی شناخت نہیں تھی کیونکہ اسے یہی سمجھایا اور ذہن نشین کروایا گیا تھا کہ اسے اپنے ماضی کو بھلانا ہوگا اور نام بھی تو ماضی میں ہی رکھا گیا تھا پھر وہ کیسے اپنے لبوں پر اپنا نام لے کر آتی۔

''گونگی ہو، بول نہیں سکتیں؟'' اسے خاموشی سے دیکھتا پا کر سوال کرنے والی عورت نے جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں



اسے ٹوکا۔ جواب میں وہ صرف نفی میں سرہلا کر رہ گئی۔ ”تو پھر بولتی کیوں نہیں ہو؟ اپنا نام بتاؤ۔“ سوال کرنے والی کے لہجے کی سختی اور جھنجلاہٹ میں مزید اضافہ ہوگیا۔

”اینہ......“ اس نے بے ساختہ ہی ذہن میں آنے والا پہلا نام اسے بتا کر اپنی جان چھڑوائی۔

”باپ کا نام؟“ عورت نے اپنے سامنے موجود رجسٹر میں اس کا بتایا ہوا نام لکھتے ہوئے دوسرا سوال داغا۔

”نہیں بتا سکتی۔“ اس بار اس نے بیک وقت بے بسی اور صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

”گھر سے بھاگ کر آئی ہو؟“ عورت نے خشمگیں نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ساتھ ہی بغور اس کے چہرے کا جائزہ لینے لگی۔ اپنا نام اینہ بتانے والی اس لڑکی کے نقوش بہت نازک اور رنگت اجلی تھی۔ اس اجلی رنگت ہی کی وجہ سے اس کے رخساروں پر چھپے انگلیوں کے نشانات کے ساتھ ساتھ آنسوؤں کے نشانات بھی نمایاں ہو رہے تھے۔ وہ جب دارالامان کے گیٹ سے اندر داخل ہوئی تھی تو زارو قطار رو رہی تھی۔ اس کے بعد ان کے آفس کے باہر پڑی بینچ پر بیٹھ کر بھی بہت دیر تک روتی رہی تھی۔ آج انہیں بہت سے ضروری کام نمٹانے تھے اس لیے اچانک وارد ہونے والی اس لڑکی سے فوری ملاقات نہیں کرسکی تھیں البتہ اپنی ایک مددگار کے ذریعے ضرور معلوم کروالیا تھا کہ لڑکی پناہ کی نیت سے یہاں آئی ہے۔ چنانچہ انہیں اسے انتظار کروانے میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ وہ برسوں سے اس دارالامان کا انتظام چلا رہی تھیں اور آئے دن یہاں لڑکیاں اور خواتین پناہ کے لیے آتی ہی رہتی تھیں۔ ان خواتین کی عبرت ناک اور دردناک کہانیاں ان کے لیے معمول کا حصہ بن گئی تھیں۔ انہوں نے اپنی ملازمت کے عرصے میں اتنی کہانیاں سنی تھیں کہ اب کوئی کہانی نئی نہیں لگتی تھی۔ اس لڑکی کی کہانی سے بھی انہیں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اور محض کاغذی کارروائی مکمل کرنے کے لیے اس سے سوال جواب کررہی تھیں۔

”نن...... نہیں۔“ اس نے یوں گھبرا کر ان کے سوال کا جواب دیا جیسے کسی نے اس کی پیٹھ پر کوڑا رسید کردیا ہو۔

”پھر یہاں کیوں آئی ہو؟“ اس کی کیفیت سے بے نیاز انہوں نے اسی سخت لہجے میں سوال کیا۔

”قسمت لے آئی ہے۔“ اس نے جھکے سر سے دھیمی آواز میں ان کے سوال کا جواب دیا۔

”پڑھی لکھی ہو؟“ انہوں نے اس سے دریافت کیا۔

”تھوڑا بہت۔“ اس نے جھجک کر جواب دیا اور پہلو بدلا۔ اس کے جسم کا ہر جوڑ دکھ رہا تھا۔ ذہنی اور جسمانی اذیتوں نے مل کر اسے ادھ موا کردیا تھا اور وہ شدت سے خواہش مند تھی کہ اسے کوئی ایسا گوشہ میسر آجائے جہاں وہ اپنے درماندہ وجود کے ساتھ ساری دنیا سے منہ موڑ کر پڑ جائے اور اپنی بدنصیبی پر آنسو بہا سکے۔

”ٹھیک ہے۔ تم یہاں پناہ کے لیے آئی ہو اور آنے والوں کو پلٹا دینا اس دارالامان کے اصول کے خلاف ہے اس لیے میں تمہاری یہاں رہائش کا بندوبست کردیتی ہوں۔ اپنے بارے میں بتانے کا جب تمہارا جی چاہے بتا دینا۔“ انہوں نے اس کے جوابات سے سمجھ لیا کہ فی الحال وہ اپنے بارے میں کچھ بھی بتانے پر رضامند نہیں ہے۔ انہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ تجربے نے انہیں بتا دیا تھا کہ یہاں آنے والیاں جلد یا بدیر اپنے بارے میں سب بیان کردیتی تھیں کہ انسان کی فطرت ہے، وہ اپنے دکھ دوسروں کے ساتھ بانٹ کر اپنے دل پر سے ان کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہے۔

”رضیہ! اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔“ انہوں نے انٹرویو کا سلسلہ موقوف کرکے ملازمہ کو آواز دی تو وہ کسی جن کی طرح فوراً حاضر ہوگئی۔

”آؤ بی بی!“ معمولی ملازمہ کا لہجہ بھی منتظمہ ہی کی طرح سخت تھا۔ خود کو اینہ کے نام سے متعارف کروانے والی اپنے شل ہوتے حواس اور جسم کو مجتمع کرکے اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی لیکن یکدم ہی اسے بہت زور کا چکر آگیا اور ساتھ ہی اس نے زوردار ابکائی بھی لی۔

”ارے ارے...... باہر لے جاؤ اسے۔ سارا آفس گندا کردے گی۔“ میڈم صاحبہ بدک کر اپنی کرسی سے کھڑی ہوگئیں۔

”باہر چلو۔“ رضیہ نے سختی سے اس کا بازو پکڑ کر اسے کھینچا تو وہ بہ مشکل اپنے لڑکھڑاتے قدموں کو سنبھال کر اس کے ساتھ گھسٹتی چلی گئی۔

”پتا نہیں کہاں کہاں سے منہ کالا کرکے یہاں آجاتی ہیں۔ میرا بس چلے تو میں ایسی لڑکیوں کو گولی ماردوں۔“ پیچھے منتظمہ بڑبڑا رہی تھی اور اسے لگ رہا تھا کہ کوئی اس کی سماعتوں میں کھولتا ہوا تیل انڈیل رہا ہے لیکن عجب مقام بے بسی تھا کہ وہ اپنی صفائی میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔

☆☆☆

”مونا گڑیا! دیکھو کون آیا ہے۔“ وہ الماری میں رکھی اپنی گڑیوں کو نئی ترتیب میں رکھ رہی تھی جب پاپا نے اسے آواز دی۔ اس نے ان کی آواز پر پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں پاپا کے ساتھ تیس سال سے کچھ اوپر کی ایک عورت بنی سنوری کھڑی تھی۔ اس عورت کے پہلو میں

ریا اسی کی عمر کی ایک بچی کھڑی تھی جس کے چہرے کے ثرات کچھ خاص خوشگوار نہیں تھے۔ مونا نے حیرت سے اس ی عورت اور بچی کو دیکھا۔ آج پاپا معمول سے کافی تاخیر ساتھ گھر واپس آئے تھے اور اب اپنے ساتھ ان اجنبی انوں کو لیے کھڑے تھے۔

”انہیں سلام تو کرو گڑیا۔“ اسے حیرت سے خاموش کھڑا کر پاپا نے اسے ٹوکا تو اس نے فوراً ہی خاتون کو سلام کیا اور آگے بڑھ کر اپنی ہم عمر بچی کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ ھایا۔ بچی نے جواباً اس کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔

”عروبہ بیٹا بہن سے ہاتھ ملاؤ۔“ خاتون نے نیچی واز میں لڑکی کو تنبیہ کرنے والے انداز میں ٹوکا تو اس نے ہار ہاتھ بڑھا کر مونا کا ہاتھ تھام لیا۔ اگلے ہی لمحے مونا کے ں سے ہلکی سی سسکاری نکل گئی۔ عروبہ نے مصافحہ کرتے ئے بہت سختی سے اس کا ہاتھ دبایا تھا۔

”سوری۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنی نازک ہو۔“ معذرت کرتے ہوئے بھی عروبہ کا انداز استہزائیہ تھا۔ اس کی ی سنوری ماں نے گھبرا کر بہزاد احمد کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی ازمہ کی طرف متوجہ تھے جو ابھی ابھی وہاں آئی تھی اور انہیں بارکباد دینے کے ساتھ ساتھ مستقبل کے لیے مزید خوشیوں کی دعا دے رہی تھی۔ انہوں نے ساتھ کھڑی بیٹی کے پہلو یں ہلکی سی چٹکی لی اور مسکرا کر مونا کے گال تھپکے جواب ان لوگوں کو بھول بھال کر بوا کی طرف متوجہ تھی۔ بوا، بہزاد احمد کو شادی کی مبارکباد دے رہی تھیں۔ نو سال کی مونا کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ باپ اس کے لیے سوتیلی ماں لے آیا ہے۔ وہ پٹا کر دو قدم پیچھے ہٹی۔ اس کی اپنی ماں سال بھر قبل بچے کی پیدائش کے وقت اپنی جان سے چلی گئی تھی۔ مونا کے بعد اس کے ساتھ نہ جانے کیا پیچیدگی ہوگئی تھی کہ دوبار مزید امید سے ہونے کے باوجود زندہ بچے کو جنم نہیں دے سکی اور تیسری بار میں بچے کے ساتھ خود بھی ملک عدم سدھار گئی۔ بیوی کے مرنے کے کچھ عرصے بعد ہی لوگوں نے بہزاد احمد کو دوسری شادی کا مشورہ دینا شروع کردیا تھا اور اب سال بھر بعد جبکہ مونا ماں کی جدائی کے صدمے سے سنبھلنے لگی تھی، بہزاد احمد اس کے لیے نئی ماں لے کر آگئے تھے۔

”یہ آپ کی ممی اور بہن ہیں گڑیا۔ اب آپ کو پاپا کے آفس جانے کے بعد گھر میں اکیلا نہیں رہنا پڑے گا۔ ممی آپ کا خیال رکھیں گی اور بہن کے ساتھ آپ مزے سے کھیلنا کودنا۔“ بہزاد احمد، بوا سے فارغ ہو کر اب اس سے مخاطب تھے۔ مونا کے لیے کسی اور عورت کو اپنی ماں کی جگہ دینا آسان نہیں تھا چنانچہ باپ کی بات کو توجہ سے سنے بغیر منہ موڑ کر کمرے کے دوسرے دروازے سے باہر نکلتی چلی گئی۔

”میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا بہزاد میاں کہ بچی کو پہلے سے بتا دیں۔“

”سمجھ جائے گی بوا، میری بیٹی بہت سمجھدار ہے۔“ اپنے پیچھے اس نے بوا اور بہزاد کا مکالمہ سنا اور سر جھٹک کر وہاں سے آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

”تمہاری ہمت کیسے ہوئی میری ڈولز کو ہاتھ لگانے کی؟“ مونا نے گلابی فراک میں ملبوس نازک سی باربی کو عروبہ کے ہاتھ سے جھپٹا اور الماری میں سجی دوسری گڑیوں کے ساتھ رکھنے کے بعد اس کی طرف تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے باز پرس کی۔

”میں تو صرف انہیں دیکھ رہی تھی۔“ عروبہ بھی اپنے اس طرح پکڑے جانے پر کچھ شرمندہ تھی اس لیے گڑبڑا کر صفائی پیش کی۔

”تمہیں کسی نے اتنی تمیز نہیں سکھائی کہ کسی کی چیز لینے سے پہلے اس سے پرمیشن لینی چاہیے۔“ مونا اس کے گڑبڑانے پر اور بھی شیر ہوگئی اور دروازے سے اندر داخل ہوتی اس کی ماں سلیمہ کو دیکھ لینے کے باوجود اس سے کوئی رعایت نہیں کی۔

”کیا ہوا بیٹا! کیا کیا ہے عروبہ نے؟“ سلیمہ گھبرا کر اس کے قریب آئیں۔ بہزاد احمد نے انہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کی اچھی پرورش کے لیے ان سے شادی کررہے ہیں اور انہیں اپنے گھر میں ان کی بیٹی کو رکھنے کی اجازت صرف اس صورت میں ہی دیں گے کہ وہ دونوں بیٹیوں کے درمیان توازن قائم رکھیں اور مونا کو ان سے کوئی شکایت نہ ہو۔ سلیمہ پڑھی لکھی خاتون تھیں جو ایک پرائیویٹ اسکول میں ٹیچنگ کرتی تھیں۔ بہزاد احمد کے کہے الفاظ کا مفہوم انہوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا اور وہ جانتی تھیں کہ ”توازن“ قائم رکھنے کی بات تو ایسے ہی کہی گئی ہے۔ درحقیقت انہیں اپنے اور اپنی بیٹی کے قدم بہزاد احمد کے گھر میں جمائے رکھنے کے لیے مونا کی خوشنودی درکار ہوگی۔ عروبہ کے والد سے ان کی طلاق ہوئے تین سال ہوچکے تھے اور تین سال کا یہ عرصہ انہوں نے جس طرح میکے میں گزارا تھا، یہ ان کا دل ہی جانتا تھا۔ ماں باپ فوت ہوچکے تھے اور تینوں بھائی شادی شدہ تھے۔ بھابیاں کسی طور عروبہ اور ان کا وجود اپنے گھر میں برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھیں حالانکہ وہ اپنی ملازمت سے اتنا تو کما ہی لیتی تھیں کہ اپنے اور بچی کے ذاتی اخراجات پورے کرسکیں۔ بھائیوں کے گھر سے وہ صرف

روٹی کھاتی تھیں جو کھلانا ان کے اچھی آمدنی والی بھائیوں کے لیے بالکل بھی مشکل نہیں تھا لیکن مسئلہ رزق کا نہیں، دل کی تنگی کا تھا۔ اپنی ملازمت کی مصروفیت کے باوجود وہ باورچی خانے کے کاموں کے علاوہ گھر کے دیگر کاموں میں بھی بھابیوں کا ہاتھ بٹاتی رہتی تھیں پھر بھی ان کے ماتھوں کی شکنیں دور نہ ہوتی تھیں۔ سب سے بڑھ کر انہیں عروبہ سے شکایتیں تھیں۔ سلیمہ بچی پر اچھی خاصی روک ٹوک رکھتی تھیں اور اسے سمجھاتی بھی رہتی تھیں لیکن تھی تو بہرحال وہ بچی ہی جس سے کوئی نہ کوئی غلطی ہو ہی جاتی تھی اور کچھ نہیں تو اپنے کسی کزن کا کوئی کھلونا دیکھ کر ہی اس کا ننھا سا دل ہمک جاتا تھا اور وہاں کسی کو برداشت نہیں تھا کہ عروبہ کسی شے کو نظر بھر کر بھی دیکھے۔ اپنی مجبوری کی وجہ سے سلیمہ کسی نہ کسی طرح میکے میں وقت کاٹ رہی تھیں لیکن یہ وقت کاٹنا اس وقت اور بھی دوبھر ہوگیا جب ایک معمولی سی غلطی پر انہیں اسکول کی ملازمت سے نکال دیا گیا۔ انہوں نے دوسری نوکری تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن انہیں جلد ہی اندازہ ہوگیا کہ چند ہی برسوں میں حالات بہت تبدیل ہوچکے ہیں اور پرائیویٹ اسکول کی ٹیچر کے لیے بھی معیار بدل چکا ہے۔

ان کے پاس ڈگری تو تھی لیکن وہ چٹک مٹک، اسمارٹنس اور منہ بگاڑ کر انگریزی بولنے کی ادا کہاں سے لاتیں جو اچھے کہلانے والے اسکولوں کے معیار کا ایک حصہ بن چکی تھی۔ پرانی ملازمت تو یوں چل رہی تھی کہ وہ شادی سے بھی پہلے سے اس اسکول میں پڑھا رہی تھیں۔ انہیں احساس ہوا کہ انہیں ملازمت سے نکالنے کے لیے بہانہ بھی اس لیے تلاش کیا گیا کہ وہ بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ اپنی وضع قطع نہیں بدل سکی تھیں۔ وہ کہاں سے کنواری لڑکیوں کی سی وہ بے فکری لاتیں کہ اپنے لیے برانڈڈ اور ماڈرن ملبوسات خرید سکتیں۔ میک اپ کا استعمال کرتیں اور زلفیں لہرا لہرا کر اسٹائل دکھاتیں۔ عام سے اسکولوں میں ان چیزوں کی اتنی زیادہ ڈیمانڈ نہیں تھی لیکن وہاں مشاہرے نہایت نامعقول تھے۔ اتنے معمولی مشاہرے سے وہ اپنا اور اپنی بیٹی کا خرچہ کیسے نکال پاتیں۔ اسی کشمکش کے عالم میں انہوں نے ملازمت کی تلاش کا سلسلہ جاری رکھا ہوا تھا کہ ان کی پرانی سہیلی طیبہ ان سے ملنے چلی آئی۔ انہوں نے سہیلی کے سامنے اپنے سارے دکھ اور مسائل کھول کر رکھ دیے۔ سہیلی نے ان سے ہمدردی کے بول بھی بولے اور تسلی تشفی بھی دی۔ ساتھ ہی یہ مشورہ بھی دے ڈالا کہ وہ بھائیوں کے گھر بیٹھی رہنے کے بجائے دوسری شادی کرلیں۔ اس طرح ان کے معاشی مسائل بھی حل ہوجاتے اور عروبہ کو بھی باپ کا پیار مل جاتا۔ سلیمہ کو بہزاد کے بارے میں بھی طیبہ نے ہی آگاہ [illegible]

''بہزاد بھائی بہت اچھی عادت کے مالک ہیں۔ [illegible] کی صرف ایک ہی بیٹی ہے۔ وہ بہت خوشی سے عروبہ کو [illegible] ساتھ رکھنے پر راضی ہوجائیں گے۔'' طیبہ نے دوسری شا[illegible] کے حق میں دلائل دیتے ہوئے اسے بہزاد کی خوبیوں [illegible] آگاہ کیا تھا اور بہزاد واقعی اس حد تک ضرور قابلِ تعر[illegible] ثابت ہوئے تھے کہ انہوں نے عروبہ کے اخراجات اور د[illegible] ذمے داریاں اٹھانے کی خوشی سے ہامی بھرلی تھی لیکن شر[illegible] وہی تھی کہ مونا کو خوش رکھا جائے۔ تین سال میکے میں [illegible] حیثیت کے ساتھ گزارنے والی سلیمہ کو اب جا کر اپنے گھر کا سکون اور استحقاق حاصل ہوا تھا چنانچہ انہوں نے بہزاد کی شرط کو بھولنے کی غلطی نہیں کی اور مستعدی ہوکر مونا اور عروبہ [illegible] درمیان آگئیں۔

''اسے مینرز سکھائیں کہ کسی کی چیز کو بغیر پوچھے ہاتھ نہیں لگاتے۔'' مونا نے بدتمیزی سے انہیں جواب دیا۔

''کیوں عروبہ! تم نے بغیر پرمیشن مونا کی چیزوں کو ہاتھ کیوں لگایا۔'' سلیمہ فوراً ہی بیٹی کو سرزنش کرنے لگیں۔

''آپ ہی نے تو کہا تھا مما کہ یہ میرا بھی گھر ہے اور مونا میری سسٹر ہے تو سسٹرز تو ایک دوسرے سے اپنی چیزیں شیئرز کرتی ہیں نا جیسے کل پاپا میرے لیے چاکلیٹس لائے تھے تو آپ نے مجھے مونا سے شیئر کرنے کو کہا تھا۔'' عروبہ کے پاس بھی اپنے عمل کے حق میں دلیل تھی۔

''وہ تمہارے پاپا نہیں ہیں...... وہ صرف میرے پاپا ہیں۔'' مونا چیخی۔

''تو پھر یہ بھی تمہاری مما نہیں ہیں، صرف میری مما ہیں۔'' عروبہ نے بھی دوبدو جواب دیا۔

''اونہوں...... عروبہ! جھگڑا مت کرو بیٹا! میں تم دونوں کی مما ہوں۔'' سلیمہ کو باہر بہزاد کی گاڑی رکنے کی آواز آگئی تھی چنانچہ انہوں نے جلد یہ جھگڑا نمٹانے کی کوشش کی۔

''نہیں، جب یہ اپنے پاپا کو مجھ سے شیئر نہیں کرے گی تو میں بھی اپنی مما کو اس سے شیئر نہیں کروں گی۔'' عروبہ بچی تھی، ماں کی مصلحتوں کو کیا سمجھتی، ضدی پن سے بولی۔ سلیمہ کے پاس اسے مزید سمجھانے کی مہلت نہیں تھی، انہیں اور کچھ سجھائی نہیں دیا تو ایک تھپڑ زور سے بچی کے منہ پر جڑ دیا۔

''ارے بھئی کیا ہوا، کیوں بچی کو مار رہی ہو؟'' اندر داخل ہوتے بہزاد نے یہ منظر دیکھا تو انہیں ٹوکا۔

''بہت بدتمیزی کرنے لگی ہے۔ اسے تنبیہ کرنا ضروری تھا۔'' سلیمہ نے خفت سے جواب دیا اور آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ سے بریف کیس لے لیا۔

''بچی ہے، نرمی سے سمجھانے کی کوشش کیا کرو۔'' [illegible]اد نے انہیں نصیحت کی اور پھر خود سے آچمٹنے والی مونا کی [illegible] متوجہ ہوگئے۔ اس نے سلیمہ سے ان کی شادی پر سخت [illegible]ل کا اظہار کیا تھا لیکن پھر ان کے سمجھانے بجھانے پر کسی [illegible]تک سمجھوتا کرنے کے لیے تیار ہوگئی تھی۔ اس کی دلی [illegible]یت کو سمجھتے ہوئے وہ آج کل اسے پہلے سے بھی زیادہ [illegible]جہ دے رہے تھے اس لیے ان کے پاس فرصت نہیں تھی کہ [illegible] تک رخسار پر ہاتھ رکھے کھڑی اپنی سوتیلی بیٹی کی طرف [illegible] پاتے جس کی آنکھوں میں حسرت بھی تھی اور ساتھ ہی [illegible]وں کی لپک بھی۔ مونا بھی سب سے بے نیاز باپ کے [illegible] لاڈ کر رہی تھی۔

اس واقعے کا ردِعمل اگلے دن سامنے آیا۔ مونا کی [illegible]ری گڑیاں اس حال میں پائی گئیں کہ ان کے ہاتھ منہ اور [illegible]ڑے کالی روشنائی میں نہائے ہوئے تھے۔ مونا نے اس کا [illegible]ام عروبہ پر لگانا چاہا لیکن اس روز عروبہ اسکول سے آتے [illegible] اپنے ماموں کے گھر چلی گئی تھی۔ وہ اپنے پہلے والے [illegible]کول میں ہی پڑھ رہی تھی اور اس کی چھٹی مونا سے پہلے [illegible]جاتی تھی۔ صبح اسکول جاتے ہوئے اس نے سلیمہ سے وعدہ [illegible]لیا تھا کہ وہ اسکول سے آنے کے بعد اسے ماموں کے گھر [illegible] جائیں گی۔ بات بہزاد کے سامنے ہوئی تھی اس لیے [illegible]ہوں نے بھی اجازت دے دی اور مونا کے سلسلے میں بے فکر [illegible]ہنے کو کہا کہ ایک دن کے لیے بوا بھی اس کا خیال رکھ سکتی [illegible]یں۔ آخر سال بھر سے بھی تو وہی اسے دیکھ رہی تھیں۔ سلیمہ [illegible]ر عروبہ کو بہزاد دفتر سے واپسی میں اپنے ساتھ گھر لیتے [illegible]ے آئے تو وہاں ایک فضیحتا کھڑا ہوا تھا اور مونا نے رو رو کر [illegible] آنکھیں سجالی تھیں۔ وہ چیخ چیخ کر اپنی گڑیاؤں کی بربادی [illegible] الزام عروبہ پر لگاتی رہی لیکن اس نے تسلیم نہیں کیا۔ اس [illegible]ے پاس دلیل تھی کہ وہ سارا دن گھر پر ہی نہیں تھی تو یہ کام [illegible]یسے کرتی۔ بہزاد نے خود اپنی آنکھوں سے الماری میں لڑھکی [illegible]ی روشنائی کی بوتل اور ایک دوسرے پر گری گڑیاں [illegible]ھیں تو عروبہ کے حق میں فیصلہ دیا۔ انہیں معلوم تھا کہ مونا [illegible]ڑا بے پروا مزاج کی بچی ہے اور یقیناً اس نے ہی روشنائی [illegible]ی بوتل الماری میں کھلی رکھ دی تھی جو بعد میں کسی وجہ سے [illegible]ھک گئی اور اس کی گڑیاؤں کو خراب کرنے کا سبب بنی۔ [illegible]یمہ کو البتہ شبہ تھا کہ عروبہ کا اس میں ہاتھ ہوسکتا ہے۔ بے [illegible] اسکول سے آکر اس نے گھر پر بہت تھوڑا ہی وقت گزارا [illegible] لیکن اس کارروائی کے لیے چند منٹ ہی کافی تھے۔ بہرحال انہوں نے عروبہ سے کچھ نہیں کہا اور جس بات پر پردہ پڑ گیا تھا اس پر پردہ ہی پڑے رہنا مناسب سمجھا البتہ مونا کی دلجوئی میں انہوں نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اور اسی وقت اسے اپنے ساتھ قریبی مارکیٹ لے جا کر ڈھیروں نئی گڑیاں دلا لائیں۔ ان کے اس طرزِعمل پر جہاں بہزاد خوش ہوئے، وہیں مونا نے بھی اپنے دل میں انہیں تھوڑی سی جگہ دے دی۔ البتہ عروبہ پر جو گزری وہ وہی جانتی تھی۔ ماموؤں کے گھر میں وہ صرف باپ سے محروم تھی لیکن اس گھر میں آکر تو اسے لگتا تھا کہ اس کی ماں بھی اس سے چھن گئی ہے۔ دوسری طرف سلیمہ مطمئن تھیں کہ وہ آہستہ آہستہ اس گھر میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہو رہی ہیں۔ گھر میں اپنی جگہ بنانے کی صورت میں ہی وہ عروبہ کے لیے بھی جگہ بنا سکتی تھیں، یوں بھی مونا کے رویے کے علاوہ اس کے لیے یہاں کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ بہزاد اس کے بہت زیادہ لاڈ نہیں اٹھاتے تھے تو انہوں نے کبھی اس کے ساتھ بدسلوکی بھی نہیں کی تھی۔ وہ اس کے تمام اخراجات نہایت خوش دلی سے پورے کر رہے تھے اور مونا کے ساتھ ساتھ اس کے لیے بھی وقتاً فوقتاً چھوٹے موٹے تحائف لاتے رہتے تھے۔ بہزاد خوش حال آدمی تھے اور ان کے ساتھ رہتے ہوئے سلیمہ زندگی میں پہلی بار بے فکری کے دن دیکھ رہی تھیں۔ اس سے پہلے میکے میں اور پھر پہلے شوہر کے گھر انہوں نے بہت تنگی بندھی زندگی گزاری تھی اس لیے اب یہ خوشحالی انہیں اچھی لگ رہی تھی۔ کوئی روک ٹوک کرنے والا بھی نہیں تھا اور گھریلو کام کاج میں ہاتھ بٹانے کے لیے بوا موجود تھیں۔ بہزاد کا مزاج بھی اچھا تھا۔ سلیمہ زندگی میں پہلی بار ایسی خوشحالی، فراغت اور محبت دیکھ رہی تھیں اور بیٹی کی خاطر ان سب چیزوں سے محروم ہونے کے لیے تیار نہیں تھیں اس لیے اسے لگام ڈال کر رکھنے کے ساتھ ساتھ اس کی جگہ بنانے کے لیے بھی جوڑ توڑ میں لگی رہتی تھیں۔ مونا کو خوش رکھنا بھی اسی جوڑ توڑ کا ایک حصہ تھا۔

☆☆☆

''کھانا کیوں نہیں کھایا تم نے بی بی؟'' وہ اپنے آپ میں گم، دنیا و مافیہا سے بے خبر بیٹھی تھی کہ سخت نسوانی آواز نے اسے مخاطب کیا۔ اس نے نظر اٹھا کر آواز کی سمت دیکھا۔ سادہ سے لان کے سوٹ میں، بالوں کو جوڑے کی شکل میں باندھے دارالامان کی منتظمہ میڈم نیازی اپنے ازلی سخت تاثرات کے ساتھ اس کے سامنے کھڑی تھیں۔

''میں نے پوچھا ہے کہ کھانا کیوں نہیں کھایا تم نے؟'' اسے ٹکر ٹکر اپنی جانب دیکھتا پا کر انہوں نے اپنا سوال دہرایا۔

''نہیں کھایا جاتا۔'' اس نے بے بسی سے اپنے سامنے

رکھے کھانے کے برتنوں کو دیکھا۔ چپاتیاں ٹھنڈی ہو کر سوکھنے لگی تھیں جبکہ بکرے کے گوشت کا شوربا... بھی ٹھنڈا ہو گیا تھا اور اس پر چکنائی کی ہلکی سی تہ جم گئی تھی۔ اسے جب یہ کھانا ملا تھا تو بالکل گرم اور تازہ تھا لیکن آنتوں میں ڈیرا ڈالی بھوک کے باوجود اس سے کچھ بھی کھایا ہی نہیں گیا۔ تین دن ہو چکے تھے اسے اس دارالامان میں آئے ہوئے لیکن ہر کھانے کے وقت ملنے والے مناسب ترین کھانے کے باوجود اس نے ان تین دنوں میں گنتی کے چند لقمے ہی کھائے تھے۔ کم خوراکی کے باعث اس کی جسمانی کمزوری بے حد بڑھ گئی تھی لیکن پھر بھی کچھ کھایا ہی نہیں جاتا تھا۔

''بغیر کھائے کیسے زندہ رہو گی؟ اپنا نہیں تو اپنے اندر سانس لیتی دوسری جان کا ہی خیال کرو۔'' میڈم نیازی کا لہجہ اب بھی سخت ہی تھا۔ حقیقتاً ان تین دنوں میں اس نے انہیں اس لہجے کے علاوہ کسی اور لہجے میں بولتے ہوئے سنا ہی نہیں تھا۔ یہ شاید ان کا مستقل لب ولہجہ تھا جس سے دارالامان میں مقیم تقریباً تمام عورتیں شکوہ کناں رہتی تھیں لیکن اسی لب ولہجے نے انہیں قابو میں بھی رکھا ہوا تھا اور ہر عورت کو نہ چاہتے ہوئے بھی وہاں رائج اصول وقواعد کی پابندی کرنی پڑتی تھی۔

اس نے ان تین دنوں میں میڈم نیازی کے بارے میں دو طرح کی آراء سنی تھیں۔ ایک گروہ وہ تھا جو ان کی سختی سے نہایت خفا نظر آتا تھا جبکہ دوسرے گروہ کا خیال تھا کہ بظاہر سخت مزاج ہونے کے باوجود میڈم نیازی کا دل بہت اچھا ہے اور وہ نہایت نیک نیتی اور ایمانداری سے اپنے فرائض انجام دیتی ہیں۔ اس نے ان دونوں آراء پر ذرا بھی غور نہیں کیا تھا۔ اسے میڈم نیازی کے مزاج سے زیادہ اپنے حالات پر غور کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی لیکن اب جبکہ وہ اس کے سامنے کھڑی تھیں تو وہ انہیں نظرانداز بھی نہیں کر سکتی تھی اور اس وقت تو وہ اس سے بہت ہی نازک موضوع پر بات کر رہی تھیں۔ ان کی بات سن کر اس نے اپنے اندر اضطراب کی لہر سی اٹھتی محسوس کی اور ساتھ ہی اس زندگی کو محسوس کرنے کی کوشش کرنے لگی جو اس کے وجود میں سانس لے رہی تھی۔ اس کی وحشت اور سوا ہونے لگی۔

''انسانی جان کا بڑا حق ہوتا ہے، خاص کر ماں کی ذات پر۔ چاہا، ان چاہا جب بچہ کوکھ میں آجائے تو اس کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اپنے گناہ، غلطیوں یا دکھوں کی سزا اس بے گناہ اور بے قصور کو دینا کسی طرح ٹھیک نہیں ہوتا۔ یہ تو جرم کے بعد ایک اور جرم اور گناہ کے بعد ایک اور گناہ کرنے والی بات ہوتی ہے۔ مجھے تمہیں جو سمجھانا تھا میں نے سمجھا دیا، آگے تمہاری مرضی ہے کہ تم کیا کرتی ہو۔ یہاں کی انتظامیہ کی طرف سے البتہ کسی قسم کی کوتاہی نہیں ہوگی۔ تمہارا لیڈی ڈاکٹر سے چیک اپ بھی کروایا جائے گا اور وہ جو دوائیں، وٹامنز تجویز کرے گی، وہ بھی فراہم کر دی جائیں گی۔'' وہ اسے کیا کیا بتا رہی تھیں لیکن اس کا ذہن تو جرم، گناہ اور قصور جیسے الفاظ میں ہی اٹک گیا تھا۔ شاید وہ ٹھیک کہہ رہی تھیں، وہ جن حالات سے گزر رہی تھی وہ کسی جرم، گناہ یا قصور کی ہی تو ہو سکتے تھے۔

''کھانا کھا لو۔ کھائے بغیر جیا نہیں جا سکتا اور بھوکا رہ کر مرنا بھی آسان نہیں ہوتا۔'' اسے بالکل خاموش دیکھ کر انہوں نے ایک بار پھر اسے نصیحت کی اور قدم آگے بڑھا دیے۔ وہ سر جھکائے ان کے جاتے ہوئے قدموں کی آواز سن رہی تھی کہ وہ رک کر دوبارہ اس کی طرف پلٹیں۔

''سنو! اگر تمہارے ساتھ کسی نے زیادتی کی ہے تو اس بارے میں مجھے بتا سکتی ہو۔ ہم ایسی کئی این جی اوز سے رابطے میں رہتے ہیں جو مظلوم خواتین کے حق میں آواز اٹھاتی ہیں۔ ایسا ہے تو بتاؤ، ہم اس شخص کو عدالت میں گھسیٹ لیں گے۔''

یہ پہلی مرتبہ تھا کہ وہ اس کے بارے میں اس انداز سے سوچنے کی زحمت کر رہی تھیں لیکن وہ اس بار بھی کوئی جواب نہیں دے سکی۔ اس سوال پر جانے کس کس کے چہرے تھے جو اس کے ذہن میں گڈمڈ ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ تو ابھی تک اس بات کا یقین ہی نہیں کر سکی تھی کہ اصل میں اس کے ساتھ ہوا کیا ہے؟ ان کے سوالوں کے جواب بھلا کیسے دیتی۔ انہوں نے اس بار بھی اسے خاموش پایا تو مایوس سی ہو کر وہاں سے ہٹ گئیں۔ اس لڑکی نے تین دن گزر جانے کے باوجود ابھی تک اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا اور ایسا ان کے اندازوں کے برعکس ہوا تھا۔

☆☆☆

''دونوں بچیاں پڑھائی میں اچھی ہیں لیکن دونوں آپس میں بہت زیادہ لڑتی ہیں۔ ان کی آپس کی لڑائی کی وجہ سے کلاس ڈسٹرب ہوتی ہے اور ٹیچرز کو بھی پریشانی کا سامنا ہوتا ہے۔ کیا گھر میں بھی دونوں بہنوں کا ایک دوسرے کے ساتھ یہی بی ہیویئر ہوتا ہے؟''

بہزاد احمد اور سلیمہ اسکول سے لیٹر ملنے پر پرنسپل سے ملاقات کے لیے پہنچے تھے اور اب ان کے سامنے بیٹھے مونا اور عروبہ کی شکایت سن رہے تھے۔ نیا تعلیمی سیشن شروع ہونے پر بہزاد احمد نے عروبہ کو بھی مونا کے اسکول میں داخل کروا دیا تھا۔ مونا والا اسکول زیادہ اچھے معیار کا تھا اور بہزاد

کا خیال تھا کہ جب دونوں بچیوں کی ذمے داری ان پر ہے تو ان کا فرض بنتا ہے کہ دونوں کو ایک سا معیارِ زندگی مہیا کریں۔ سلیمہ ان کی اس سوچ پر بہت خوش ہوئی تھیں اور قدرتی طور پر انہیں عروبہ کا پہلے سے زیادہ اچھے اسکول میں داخل ہونا اچھا لگا تھا البتہ انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ مونا اس بات سے خوش نہیں ہے۔ اسے خوش رکھنے کے لیے انہوں نے اس پر اپنی توجہ اور عنایتوں کو مزید بڑھا دیا تھا اور اس چکر میں اکثر عروبہ کو نظرانداز بھی کر جاتی تھیں لیکن چونکہ وہ یہ سب عروبہ ہی کی خاطر کر رہی تھیں اس لیے انہیں اس بات کا زیادہ احساس نہیں تھا۔ نہ ہی وہ اس کے اندر پلتے حاسدانہ جذبات کو پوری سنجیدگی سے لے رہی تھیں۔ یوں بھی یہ جذبات دوطرفہ تھے۔ مونا جس نے کافی حد تک انہیں قبول کر لیا تھا، عروبہ کے ساتھ سمجھوتا نہیں کر پا رہی تھی اور شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اسکول میں بھی ایک دوسرے سے لڑتی رہتی تھیں۔

''بچے تو آپس میں لڑتے ہی ہیں میڈم! اگر ٹیچرز انہیں وارن کریں تو وہ سمجھ لیں گی۔'' بہزاد احمد نے پرنسپل کی شکایت کا جواب دینے میں پہل کی۔

''لڑنے اور ہر وقت لڑنے میں فرق ہوتا ہے مسٹر بہزاد۔ عروبہ اور مونا ٹیچرز کی کئی بار کی وارننگ کے باوجود اپنی روش پر قائم ہیں۔ ایک بار انہیں میرے سامنے بھی پیش کیا جا چکا ہے لیکن دونوں نے میرے سمجھانے کا کوئی اثر نہیں لیا اس لیے مجبوراً میں نے آپ دونوں کو کال کیا ہے کہ اس مسئلے کا کوئی حل نکالا جا سکے۔'' پرنسپل نے انہیں صورت حال کی سنگینی سے آگاہ کرتے ہوئے مزید بتایا۔ ''دونوں بچیوں کی لڑائی صرف ان کی ذات تک محدود نہیں رہتی ہے۔ دونوں نے اپنی اپنی فرینڈز کا گروپ بنا رکھا ہے اور پورا گروپ لڑائی میں انوالو ہو جاتا ہے۔ بچے گھروں میں جا کر بھی کلاس کی ساری باتیں بتاتے ہیں۔ ہمیں دوسرے پیرنٹس کی طرف سے بھی کمپلینز آ رہی ہیں۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ ہمارے لیے کتنا سیریس میٹر ہے۔'' پرنسپل کے انکشافات نے ان دونوں میاں بیوی کے چھکے اڑا دیے۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ مونا یا عروبہ میں سے کسی نے بھی ان جھگڑوں کی خبر گھر میں نہیں ہونے دی تھی۔ شاید اس لیے کہ بہزاد اور سلیمہ دونوں ہی اپنے اپنے طور پر اپنی بیٹیوں کو سمجھاتے رہتے تھے اور کسی نے بھی شکایت کرنے پر اپنی بیٹی کی حمایت نہیں کی تھی۔

''میری تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا میڈم! آپ میرے سارے حالات سے واقف ہیں۔ میں دونوں بچیوں میں مساوات و انصاف قائم رکھنا چاہتا ہوں اسی لیے دونوں کو ایک ہی اسکول میں ایڈمیشن کروایا ہے۔ آپ کوشش کریں کہ دونوں کسی طرح یہیں ایڈجسٹ کر جائیں۔ دوسری صورت میں، میں کسی ایک کا اسکول چینج کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔'' سلیمہ اس موضوع پر کوئی بھی بات کرنے سے خود کو قاصر پا رہی تھیں اور مسلسل بہزاد احمد ہی پرنسپل سے بات کر رہے تھے۔ مونا کیونکہ شروع ہی سے اس اسکول میں پڑھتی تھی اس لیے پرنسپل ان سے اور ان کے حالات سے اچھی طرح واقف تھیں۔ اب بھی فوراً ہی بولیں۔

''اوہ نو مسٹر بہزاد! اتنے سخت ری ایکشن کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے پاس ایک دوسرا حل ہے، پہلے اسے آزما لیتے ہیں پھر نتیجہ دیکھیں گے۔''

''وہ کیا میڈم؟'' بہزاد احمد اور سلیمہ ہمہ تن گوش ہو گئے۔

''میں دونوں بچیوں کو الگ الگ سیکشن میں کر دیتی ہوں۔ اس طرح ان کا سامنا کم سے کم ہوگا اور لڑائیوں کو کنٹرول میں رکھنا آسان ہو جائے گا بس میں اس سلسلے میں آپ سے پرمیشن لینا چاہ رہی تھی کیونکہ آپ نے ہی عروبہ کو مونا کے سیکشن میں ایڈمٹ کرنے پر زور دیا تھا۔''

''آپ سیکشن تبدیل کر دیں میڈم! بچیوں کی بھلائی اسی میں ہے تو ہمیں یہ کرنا ہی پڑے گا۔'' اس بار سلیمہ نے بہزاد سے پہلے جواب دینے میں جلدی کی۔ بہزاد کے پاس بھی ان سے اتفاق کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس معاملے کو نمٹا کر وہ لوگ گھر واپس آئے تو سلیمہ بہت متفکر تھیں۔ بہزاد نے ان سے کچھ نہیں کہا تھا پھر بھی انہیں لگا تھا کہ بہزاد کا موڈ آف ہے۔ اپنی اس پریشانی میں انہوں نے عروبہ کے اسکول سے واپس آنے پر تنہائی میں اس سے بہت سختی کے ساتھ بازپرس کی۔

''میری کوئی غلطی نہیں ہے مما۔ مونا میرے ساتھ بہت بدتمیزی کرتی ہے اور سب کے سامنے الٹا سیدھا بولتی رہتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ میں پتا نہیں کہاں سے اس کے گھر میں گھس گئی ہوں اور زبردستی اس کی چیزوں کو استعمال کرتی ہوں۔ وہ مجھے چور، ندیدی اور پتا نہیں کیا کیا کہتی رہتی ہے تو کیا میں چپ رہوں؟ میں بھی اس کی باتوں کا جواب دیتی ہوں۔'' عروبہ نے روہانسی ہو کر انہیں بتایا۔

''ہاں، چپ رہا کرو کیونکہ چپ رہنے میں ہی تمہاری اور میری عافیت ہے۔ کیا تم مونا کو ناراض کر کے واپس اپنے ماموؤں کے گھر جانا چاہتی ہو؟ کیا تم خوش نہیں ہو کہ شہر کے

سب سے اچھے اسکول میں پڑھ رہی ہو؟ تمہارے پاس کھانے اور پہننے کے لیے سب کچھ موجود ہے اور اس سب کے لیے تمہاری ماں کو نوکری کرنے اور دھکے کھانے نہیں پڑتے۔ اتنے عرصے بعد جا کر تو مجھے سکھ کے دن دیکھنے نصیب ہوئے ہیں لیکن شاید یہ تمہارے اندر موجود تمہارے باپ کا خون ہے جو مجھے خوش نہیں دیکھنا چاہتا۔ مجھ پر رحم کرو عروبہ اور یہ سارے جھگڑے ختم کر دو ورنہ میں تمہیں یہاں سے تمہارے ماموں کے گھر بھیج دوں گی۔ تم وہاں میرے بغیر رہو گی تو تمہارا دماغ ٹھیک ہو جائے گا۔'' سلیمہ اس کی بات کو اچھی طرح سمجھنے کے بجائے چیخ پڑیں تو وہ سہم گئی۔ اسے اتنی سی عمر میں ماں کی اور باتیں تو اتنی سمجھ نہیں آئی تھیں لیکن اکیلے ماموں کے گھر بھیج دینے والی دھمکی نے لرزا دیا تھا۔ وہ ماں کے بغیر کہیں نہیں رہ سکتی تھی چنانچہ گھبرا کر رونے لگی۔

''میری بات کو سمجھو بیٹا! مجھے معلوم ہے کہ ابھی تم بہت چھوٹی ہو لیکن جن بچوں کے حالات تمہارے جیسے ہوں، انہیں اپنی عمر سے پہلے بڑا ہونا پڑتا ہے۔ تمہیں اس بات کو سمجھنا ہوگا کہ یہ اصل میں مونا کا گھر ہے اور ہم ماں بیٹی اسے خوش رکھے بغیر یہاں نہیں رہ سکتے۔ یہاں سب کتنا اچھا ہے تو ایک مونا کے رویے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تم اپنی کوشش سے اسے بھی اپنی دوست بنا سکتی ہو۔ اگر دوست نہیں بنانا چاہتیں تو یوں کھل کر دشمنی بھی نہیں کرو۔ وہ اگر تم سے بدتمیزی کرتی ہے تو بدلہ لینے کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں۔ تم اس سے اچھی بچی بن کر دکھاؤ۔ ایگزامز میں اس سے زیادہ مارکس لیا کرو۔ اپنے پاپا کا خیال رکھا کرو، مونا کچھ کہے تو چپ رہا کرو۔ آہستہ آہستہ پاپا کو خود پتا چل جائے گا کہ اصل میں بدتمیز بچی مونا ہے اور تم ایک بہت اچھی بچی ہو۔ پھر وہ تم سے بھی پیار کیا کریں گے، بس تم اپنی مما کی بات مانو اور تھوڑے صبر اور برداشت سے کام لو۔'' سلیمہ کو بیٹی کے آنسوؤں نے تکلیف دی تو وہ اسے خود سے چمٹا کر دھیمی آواز میں سمجھانے لگیں۔ ان کے پڑھائے اسباق میں خود غرضی بھی تھی اور زندگی کی تلخ سچائیاں بھی۔ اس چھوٹی سی بچی کے لیے صحیح اور غلط کا فیصلہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس نے پورا سبق جوں کا توں اپنے ذہن میں اتار لیا۔

☆☆☆

بہزاد احمد بہت پریشان تھے۔ آج پھر انہیں پرنسپل نے کال کیا تھا۔ یہ کال انہیں اپنے آفس میں ملی تھی اور وہ وہاں سے سیدھے اسکول چلے گئے تھے اس لیے سلیمہ ان کے ساتھ نہیں تھیں۔

''جی میڈم! اب کیا پرابلم ہو گئی؟ اب تو بچیاں الگ الگ سیکشن میں ہیں۔ ویسے بھی میں نوٹ کر رہا ہوں کہ اب ان کی آپس کی لڑائیاں بہت کم ہو گئی ہیں اور وہ پہلے کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ مس بی ہیو نہیں کرتی ہیں۔'' پرنسپل کے کچھ بولنے سے پہلے ہی انہوں نے خود بولنا شروع کر دیا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ بچیوں میں یہ چینج میں نے بھی فیل کیا ہے...... اسپیشلی عروبہ بہت کوآپریٹ کر رہی ہے۔ مونا اگر اسے کچھ الٹا سیدھا بول بھی دے تو وہ ری ایکٹ نہیں کرتی اس لیے بات وہیں ختم ہو جاتی ہے۔'' پرنسپل نے ان سے اتفاق کیا۔

''اس میں اس کی مدر کا بہت رول ہے۔ ایکچولی وہ ایک سمجھدار خاتون ہیں اور عروبہ کو سمجھاتی رہتی ہیں۔ پیار وہ مونا سے بھی بہت کرتی ہیں لیکن آپ ان کی پوزیشن سمجھ سکتی ہیں کہ وہ مونا سے زیادہ سختی سے پیش نہیں آسکتیں۔ میں بھی مصروف رہتا ہوں اس لیے مونا کو بہت زیادہ وقت نہیں دے پاتا۔ بہرحال مجھے امید ہے کہ مونا کا رویہ آہستہ آہستہ بہتر ہو جائے گا۔'' بہزاد احمد کو اعتراف کرنا پڑا۔

''آئی ایم سوری مسٹر بہزاد...... لیکن میں آپ کو یہ بتانے پر مجبور ہوں کہ مونا کا رویہ بہتر ہونے کے بجائے اس میں دوسری خامیاں بھی سامنے آنے لگی ہیں۔ پچھلے ہفتے ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ مونا کے ساتھ بیٹھی بچی کا مارکر سیٹ غائب ہو گیا اور بعد میں مونا کے بیگ میں پایا گیا۔ مونا نے لاعلمی کا اظہار کیا اور کہا کہ اسے نہیں معلوم یہ سیٹ اس کے بیگ میں کیسے پہنچا۔ ٹیچر نے سوچا کہ ساتھ بیٹھے ہونے کی وجہ سے شاید غلطی سے ایسا ہو گیا ہوگا اس لیے بات آئی گئی کر دی لیکن آج پھر ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا۔ مونا کی کلاس کی ایک بچی رمشا کو اس کے کسی انکل نے کینیڈا سے ایک بہت ہی خوب صورت اور یونیک سا شارپنر لا کر دیا تھا۔ رمشا نے وہ شارپنر سب ٹیچرز اور کلاس فیلوز کو دکھایا۔ سب نے اسے پسند کیا لیکن آج رمشا کا شارپنر اس کے بیگ سے غائب ہو گیا۔ پوری کلاس کے بچوں کے بیگز چیک کیے گئے تو وہ شارپنر مونا کے بیگ سے نکلا۔ مونا نے آج بھی یہی کہا کہ اسے نہیں معلوم شارپنر کیسے اس کے بیگ میں آیا لیکن ہم دوسری بار ایسے کسی واقعے کو برداشت کر سکتے ہیں اور نہ ہی اتفاق کے کھاتے میں ڈال سکتے ہیں۔ رمشا، مونا سے بالکل الگ سیٹ پر بیٹھتی ہے اس لیے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ شارپنر غلطی سے اس کے بیگ میں چلا گیا ہو۔'' پرنسپل انہیں بتا رہی تھیں اور انہیں یاد آ رہا تھا کہ پرسوں اسکول سے واپسی میں مونا اپنی کسی کلاس

[فیل]و کے شارپنر کی تعریف کرتے ہوئے ان سے بھی ویسے ہی شارپنر کی فرمائش کرتی رہی تھی۔ انہوں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ چھٹی کے دن اسے مارکیٹ لے جائیں گے تاکہ وہ اپنی پسند کے شارپنر سمیت جو چاہے خرید سکے۔ پھر پتا نہیں کیوں مونا نے ایسی حرکت کر ڈالی تھی۔ کیا اسے ان کے وعدے پر اعتبار نہیں رہا تھا؟

''مونا ہماری بہت اچھی اسٹوڈنٹ ہے۔ اپنی ممی کی ڈیتھ کے بعد وہ تھوڑی خاموش ضرور رہنے لگی تھی اور پڑھائی پر بھی تھوڑا بہت اثر پڑا تھا لیکن اس نے ایسی کوئی حرکت کبھی نہیں کی تھی۔ میں دوسروں کے معاملات میں انٹرفیئر کرنا مناسب تو نہیں سمجھتی لیکن مونا کی بھلائی کے لیے آپ سے کہنے پر مجبور ہوں کہ پلیز اس پر توجہ دیجیے۔ مجھے لگتا ہے کہ دوسری شادی کرنے سے آپ کی توجہ بٹ گئی ہے اور بچی احساسِ محرومی کا شکار ہو کر ایسی حرکات کر رہی ہے۔''

''بلیو می میڈم! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میری سیکنڈ وائف ایک نہایت شریف اور سمجھدار خاتون ہیں۔ انہوں نے کبھی مجھے مونا کی طرف سے غافل کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ وہ خود بھی مونا کا بہت خیال رکھتی ہیں۔ مونا خود بھی اب ان کے ساتھ ایڈجسٹ کر چکی ہے۔'' انہیں لگا کہ پرنسپل در پردہ سلیمہ پر الزام رکھنے کی کوشش کر رہی ہیں اس لیے فوراً اس کی صفائی پیش کی۔

''اگر وہ واقعی ایسی ہیں تو یہ بہت خوشی کی بات ہے لیکن آپ مونا کی تبدیلیوں کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ کچھ تو ایسا ہے جو بچی کو اس طرح بی ہیو کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔ میں کہنا نہیں چاہتی لیکن آپ غور کیجیے۔ بعض اوقات خواتین ایسی چالیں چلتی ہیں کہ مردوں کے لیے سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔'' پرنسپل نے ان کے کان میں خطرے کی گھنٹی بجائی اور پھر مزید بولیں۔

''آپ جانتے ہیں کہ شہر میں ہمارے اسکول کی ساکھ ایسے ہی نہیں بن گئی ہے۔ ہم تعلیم کے علاوہ بھی ہر چیز پر دھیان رکھتے ہیں۔ مونا کے منفی رویے ہمارے اسکول کی ساکھ کو متاثر کر سکتے ہیں۔ پیرنٹس کو اس طرح کی حرکات کرنے والی بچی کے ساتھ اپنے بچوں کو پڑھوانے پر اعتراض ہو سکتا ہے۔ ایسی صورت میں ہمارے پاس مونا کو اسکول سے ٹرمینیٹ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوگا اور اگر ایسا ہوا تو مجھے ذاتی طور پر بھی اس پر افسوس ہوگا اس لیے بہتر ہے کہ مونا کو اسی اسٹیج پر سنبھال لیا جائے۔'' پرنسپل کے لہجے میں ہمدردی تھی۔ بہزاد احمد خود کو زمین میں گڑتا محسوس کرنے لگے۔ انہیں اپنی زندگی میں کسی کی دخل اندازی پسند نہیں تھی

پھر بھی وہ پرنسپل کی باتیں سننے پر مجبور ہو گئے تھے۔ دوسرے انہیں مونا کی حرکت پر افسوس تھا۔ اپنی بیٹی پر چوری کا الزام سننا ان کے لیے بہت تکلیف دہ ثابت ہوا تھا۔ پرنسپل کو انہوں نے پتا نہیں کیسے وعدوں اور یقین دہانیوں سے نمٹایا اور خود بجھے دل سے گھر واپس آ گئے۔ گھر آ کر انہوں نے سلیمہ کو پورے واقعے سے آگاہ کر دیا۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ نہیں بتائیں گے تب بھی عروبہ کی زبانی انہیں علم ہو جائے گا۔ سلیمہ نے پوری توجہ سے ان کی بات سنی اور پھر ہمدردی سے بولیں۔

''آپ اتنی ٹینشن مت لیں۔ کبھی کبھی بچے ایسی نادانیاں کر جاتے ہیں۔ آپ ایسا کیجیے گا کہ مونا کے اسکول سے واپس آنے پر اسے مارکیٹ سے اس کی بہت ساری پسندیدہ چیزیں دلا کر لے آئیے گا پھر ہم دونوں مل کر اسے سمجھائیں گے کہ جب ہم اسے سب کچھ پرووائڈ کر سکتے ہیں تو اسے کسی غلط حرکت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' سلیمہ نے انہیں ایک اچھا مشورہ دیا جس پر انہوں نے عمل بھی کر ڈالا لیکن عجیب بات یہ تھی کہ سمجھانے کے عمل کے دوران مونا نے ایک بار بھی اعتراف نہیں کیا کہ اس نے رمشا کا شارپنر چرایا تھا۔ وہ مسلسل یہی کہتی رہی کہ اسے نہیں معلوم اس کے بیگ میں وہ شارپنر کہاں سے آیا۔ جسے معلوم تھا وہ بے نیازی اپنا ہوم ورک کرتی رہی۔ اتنا مزہ تو مونا کو دوبدو جواب دے کر بھی نہیں آتا تھا جتنا آج اس کی بے بسی پر آ رہا تھا۔ وہی تو تھی جس نے پریے ٹائم میں مونا کے خلاف چپکے سے یہ کارروائی کی تھی اور نتیجتاً مونا اسکول بھر میں بدنام ہو گئی تھی۔ اس کی ماں نے اسے مونا سے کھل کر دشمنی نہ کرنے اور بدلہ لینے کے دوسرے طریقے اپنانے کی نصیحت کی تھی۔ اس نے اس نصیحت کو اپنے حساب سے سمجھا تھا اور اب اپنے حساب سے ہی دشمنی نبھا رہی تھی۔

☆☆☆

گلابی رنگت، سیاہ چمکیلی آنکھیں، چھوٹی سی ناک، نازک سے لب اور سیاہ ریشمی بال...... اس کی نگاہیں اپنی گود میں لیٹی بچی کے ایک ایک نقش کو ٹٹول رہی تھیں۔ وہ بہت نازک تھی لیکن اس کی لمبی لمبی انگلیاں اور ہاتھ پیر دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ بڑی ہو کر وہ اچھے قد و قامت کی مالک ہوگی لیکن سب کچھ اتنا اچھا ہونے کے باوجود اس کے نصیب اچھے نہیں تھے۔ کم از کم اس کی ماں کا اس کے بارے میں یہی خیال تھا اور اسی خیال کے باعث اس کی آنکھوں کے کٹورے آنسوؤں سے بھرے ہوئے تھے۔ دارالامان میں پیدا ہونے والی بچی

کے بارے میں یہ اندازہ لگا کر اس نے ایسی کوئی غلط بات نہیں سوچی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ بن باپ کے بچوں کی زندگی کیسی ہوتی ہے اور اس کی بچی تو اتنی بدنصیب تھی کہ اس کے پاس اپنے باپ کا نام بھی موجود نہیں تھا۔ وہ بے بس تھی کہ اس کی ولدیت کے خانے میں کوئی نام نہیں لکھ سکتی تھی اور جانتی تھی کہ یہ خالی خانہ اس بچی کے لیے ہمیشہ ایک گالی سے پُر کیا جاتا رہے گا۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ اس بچی کو دنیا میں ہی لے کر نہیں آتی لیکن وہ اپنے اندر اتنی ہمت نہیں پیدا کرسکی تھی کہ اپنے اندر سانس لیتی زندگی کو آنکھ کھولنے سے قبل اپنے وجود کے اندر ہی ختم کردیتی۔ قصوروار کون تھا اور کون نہیں، اس بحث میں ایک بے گناہ بچی کو تو سزائے موت نہیں دی جاسکتی تھی لیکن سزا تو شاید اسے بھگتنی ہی تھی۔ وہ بڑی ہو کر دنیا کے جن رویوں کا سامنا کرتی وہ اس کے لیے سزا ہی تو ہوتے لیکن وہ اس سلسلے میں بے بس تھی۔ اس کے پاس اختیار ہی نہیں تھا کہ وہ اسے اس صورتِ حال سے بچا پاتی اور اپنی یہ بے اختیاری اسے بے تحاشا رلا رہی تھی۔

''امینہ!'' اپنی ہچکیوں کے درمیان اس نے ایک دوسری آواز سنی تو اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ میڈم نیازی تھیں جن کا چہرہ حسبِ معمول سپاٹ تھا لیکن وہ ان کی آنکھوں کی افسردگی پڑھ سکتی تھی۔ دارالامان میں قیام کے عرصے میں وہ میڈم نیازی سے اچھی طرح واقف ہوگئی تھی۔ بظاہر وہ سخت مزاج نظر آتی تھیں لیکن حقیقتاً ان کے سینے میں ایک ہمدرد دل تھا۔ بس بات اتنی تھی کہ وہ ایک اصول پسند اور نظم وضبط کی پابندی کرنے والی خاتون تھیں جنہیں دوسروں کو بھی اسی طرزِ زندگی پر چلانے کے لیے سختی سے کام لینا پڑتا تھا۔ بھانت بھانت کے لوگوں سے نمٹنے کے لیے یہ رویّہ ضروری بھی تھا۔ کہنے کو دارالامان میں مقیم خواتین مظلوم و بے کس تھیں لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ عورتیں فرشتہ ہوں۔ جس نے جو ظلم وزیادتی سہی تھی وہ اپنی جگہ لیکن انسان کی ایک فطرت بھی ہوتی ہے اور یہاں ضدی، سرکش، ہٹیلی، جھگڑالو، چغل خور، لگائی لترئی...... ہر قسم کی عورتیں تھیں جو آئے دن کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا کرکے رکھتی تھیں۔ میڈم نیازی ان عورتوں اور ان کے کھڑے کیے گئے مسائل سے نمٹنے کا ہنر اچھی طرح جانتی تھیں۔ وہ ایک غیرشادی شدہ خاتون تھیں جنہوں نے اپنی زندگی اس دارالامان کے لیے وقف کردی تھی۔ اپنے گھر والوں سے ملاقات کے لیے بھی وہ مہینے میں صرف ایک بار جایا کرتی تھیں۔ امینہ کی اچانک طبیعت خراب ہوئی اور اسے اسپتال پہنچایا گیا تو وہ معمول کے مطابق گھر والوں سے ماہانہ ملاقات کے لیے گئی ہوئی تھیں لیکن شاید [illegible] نے انہیں اطلاع دے دی تھی اس لیے خلافِ معمول [illegible] ڈھلنے سے قبل ہی واپس آگئی تھیں۔

''کیسی طبیعت ہے تمہاری؟ ڈاکٹر نے تمہیں ایک [illegible] بعد کی ڈیٹ دی تھی ورنہ میں آج گھر نہیں جاتی۔'' انہوں نے اس کے آنسوؤں پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور اس کے سامنے [illegible] کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔ کیس نارمل تھا اور وہ جلدی فار[illegible] بھی ہوگئی تھی اس لیے سرکاری اسپتال کی ڈاکٹر نے اسے [illegible] گھنٹوں بعد ہی چھٹی دے دی تھی۔ وہاں دوسری اور بہت [illegible] ضرورت مند مریضوں کا رش لگا ہوا تھا جن کی خاطر اسے چھٹی دے دینا ہی مناسب سمجھا گیا تھا۔

''بچی خوبصورت ہے اور کافی حد تک تم سے مل رہی ہے۔ تم نے اس کا کیا نام سوچا ہے؟'' اس نے میڈم نیازی کی پچھلی باتوں کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ خود کو سنبھالنے میں مصروف تھی اور وہ بھی اسے سنبھلنے کا موقع دینے کے لیے بچی کی طرف متوجہ ہوگئی تھیں۔

''اگر تم نے اس کا کوئی نام نہ سوچا ہو تو میں اس کا نام رکھ دوں؟'' اس بار انہوں نے اس کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔ اس نے سر ہلا کر گویا بچی کا نام رکھنے کی اجازت دی۔ اسے ڈھنگ مارتی دوسری سوچوں سے ہی کب فرصت ملی تھی جو وہ بچی کا نام سوچ پاتی۔

''اس کا نام نور فاطمہ رکھتے ہیں۔ اس کا چہرہ اتنا روشن ہے کہ اس کے لیے نور کے سوا کوئی اور نام بھائی ہی نہیں دے رہا۔'' میڈم نیازی نے فیصلہ سنایا۔ آج پہلی بار تھا کہ وہ اس طرح کی گفتگو کررہی تھیں ورنہ تو وہ بڑی خشک مزاج اور لیے دیے رہنے والی خاتون تصور کی جاتی تھیں۔

''بہت اچھا نام سوچا ہے آپ نے میڈم! میں نے بھی اسے دیکھتے ہی روشنی پکارا تھا۔'' کوئلوں سے بھری انگیٹھی لیے کمرے میں داخل ہونے والی رضیہ نے ان کی تائید کی۔ یہ سردیوں کے دن تھے اور وہ سرِشام ہی زچہ وبچہ کو سردی کے اثر سے محفوظ رکھنے کے لیے انگیٹھی میں کوئلے دہکا کر لے آئی تھی۔ وہ تجربہ کار عورت تھی اور جانتی تھی کہ کب کیا کرنا ہے۔ وہ اسپتال بھی ساتھ گئی تھی اور وہی تھی جس نے دارالامان میں مقیم دوسری خواتین کو زیادہ دیر تک اس کمرے میں ٹکنے نہیں دیا تھا۔ زچہ کو آرام کرنے کا موقع فراہم کرنے کے بہانے رضیہ نے اسے طرح طرح کے کچوکے لگاتے ہوئے جملوں سے بچا لیا تھا۔ وہ عورتیں بہانے بہانے سے بچی کی بدنصیبی اور اس کے بن باپ کے ہونے کا ذکر کررہی تھیں۔ ان میں

1987ء سے خدمت میں مصروف

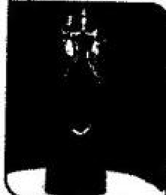
LEUCODERMA-VITILIGO

تمام جلدی بیماریوں کا موثر اور بے ضرر علاج

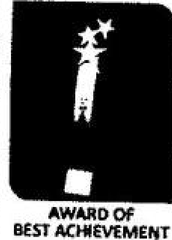
STEROIDS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMEN

ڈاکٹر اجمل زیدی ماہر برص کے دورۂ پاکستان کا مستقل پروگرام

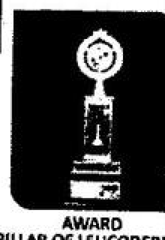




ASIAN EXCELLENC
PERFORMANCE AW



AWARD OF
BEST ACHIEVEMENT



AWARD
PILLAR OF LEUCODERM

اسلام آباد
9-اپریل تا 30 مئی
9-اگست تا 30 ستمبر
9-دسمبر تا 30 جنوری
مستقل پتہ
مکان نمبر 62، اسٹریٹ نمبر 20، سیکٹر G-8/1
سرینا چوک (خیلجی چوک)، اسلام آباد
فون (051)32331725
موبائل: 0300-8566188

لاہور
14-فروری تا 27 فروری
14-جون تا 27 جون
14-اکتوبر تا 27-اکتوبر
قیام
گلف سینٹر
آفس نمبر 16
فیروزپور روڈ مزنگ چونگی
نزد الائیڈ بینک لاہور
موبائل نمبر 0300-8566188

پشاور
یکم فروری تا 11 فروری
یکم جون تا 11 جون
یکم اکتوبر تا 11-اکتوبر
قیام
ہوٹل امین
جی ٹی روڈ نزد ہشتنگری چوک پشاور شہر
موبائل: 0300-8566188

ملتان
28 مارچ تا 6-اپریل
28 جولائی تا 6-اگست
28 نومبر تا 7 دسمبر
قیام
ہوٹل سلور سینڈ
ریلوے روڈ نزد چوک عزیز ہوٹل ملتان
فون: (061) 4518061-62
4582803 (0300-8566188)

کراچی
13-مارچ تا 27 مارچ
13-جولائی تا 27 جولائی
13-نومبر تا 27 نومبر
قیام
نورجہاں سینٹر
آفس 706، 7 فلور شاہراہ فیصل
نرسری اسٹاپ بینک
الفلاح اور ایم سی بی
موبائل 0300-8566188

سے کچھ کو سچ مچ بچی سے ہمدردی تھی لیکن زیادہ تر زخموں پر نمک پاشی کر کے لطف اٹھانے والوں میں سے تھیں اسی لیے رضیہ نے انہیں چلتا کیا تھا۔

''بس تو طے ہوگیا اس بچی کا نام نور فاطمہ ہے۔ رضیہ! تم کچھ دن تک امینہ کے کمرے میں ہی سویا کرنا۔ ابھی اسے کمزوری ہے۔ راتوں کو اٹھ کر بچی کو سنبھالنے میں پریشانی ہوگی۔'' میڈم نیازی نے رضیہ کی تائید کو بچی کے نام پر مہر جانا اور اسے مزید ہدایات دینے لگیں۔

''آپ فکر نہ کریں میڈم۔ میں پورا خیال رکھوں گی۔'' عرصے سے ان کے ساتھ موجود رضیہ کو ان کے مزاج کے سارے رنگوں سے آگاہی تھی چنانچہ اس نے سمجھ لیا تھا کہ امینہ کے سلسلے میں انہوں نے اپنی پچھلی رائے تبدیل کر لی تھی اور اسے گھر سے بھاگی ہوئی کرپٹ لڑکی کی جگہ مظلوم تسلیم کر لیا تھا اسی لیے اس کے ساتھ نرمی سے پیش آ رہی تھیں۔

☆☆☆

''چائے پی لیں پاپا!'' عروبہ نے چھوٹی سی ٹرے میں رکھی چائے کی پیالی قرینے سے بہزاد احمد کے سامنے میز پر رکھی۔ آج چھٹی کا دن تھا۔ وہ صبح آٹھ بجے ناشتا کر چکے تھے لیکن دفتر میں کئی بار چائے کے دور چلنے کی وجہ سے انہیں زیادہ چائے پینے کی عادت تھی اور چھٹی والے دن گھر پر بھی وہ وقتاً فوقتاً چائے کی فرمائش کرتے رہتے تھے۔ اس وقت بھی انہوں نے سلیمہ سے چائے کی فرمائش کی تھی اور عروبہ ان کی فرمائشی چائے لیے ان کے سامنے موجود تھی۔

''تھینک یو بیٹا!'' انہوں نے اخبار سے ذرا کی ذرا نظر ہٹا کر فرمانبرداری سے کھڑی عروبہ کو مسکرا کر دیکھا۔ وہ ان کی سوتیلی بیٹی تھی لیکن آہستہ آہستہ ان کے دل میں اپنی جگہ بناتی جا رہی تھی۔ ایسا اس نے اپنی فرمانبرداری اور خدمت گزاری سے کیا تھا۔ وہ ان کے چھوٹے موٹے کام خوشی خوشی دوڑ کر کیا کرتی تھی۔ انہیں پانی پلانا، ان کے جوتے پالش کرنا، دفتر سے واپس آنے پر آرام دہ چپلیں پیش کرنا......

ایسے کتنے ہی چھوٹے چھوٹے کام تھے جو وہ ان کے منع کرنے کے باوجود بھی خوش دلی سے کرتی تھی۔ ایسے میں ان کے دل میں اس کے لیے جگہ نہ بنتی تو اور کیا ہوتا۔ ان کی اپنی بیٹی مونا کا رویہ اس کے برعکس تھا۔ وہ اپنے آپ میں ہی مگن رہتی تھی۔ ان کے پاس اس کی آمد صرف اپنے لاڈ اٹھوانے اور فرمائشیں پوری کروانے کے سلسلے میں ہی ہوتی تھی۔ اصل میں اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے اس کے اتنے زیادہ لاڈ اٹھائے گئے تھے کہ اسے خود دوسروں کا خیال رکھنے کی بالکل

بھی عادت نہیں رہی تھی۔ بہزاد جانتے تھے کہ یہ مونا کی ان کی غلطی تھی اس لیے اس کے رویّے کے خلاف کبھی ان کے دل میں شکایت بھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اسکول میں ... والے واقعات کے بعد تو وہ اس کا اور بھی زیادہ خیال ر... لگے تھے اور اس کے منہ سے بات نکلنے سے پہلے ہی پو... کر دیتے تھے۔ اگرچہ مونا نے کبھی چوری کے اس الزا... قبول نہیں کیا تھا لیکن انہوں نے بھی اس بات پر شکر کر لیا تھا کہ دوبارہ کبھی ایسی صورتِ حال پیش نہیں آئی تھی۔

''آپ کو کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں ہے پاپا؟'' ان کے سامنے کھڑی عروبہ ان سے پوچھ رہی تھی۔

''نو تھینکس بیٹا! آپ جاؤ اپنی چھٹی انجوائے کرو۔'' انہوں نے اسے شفقت سے جواب دیا۔

''مجھے پڑھنا ہے پاپا۔ آپ دیکھیے گا اس سال میں پورے اسکول میں ٹاپ کروں گی۔'' عروبہ نے انہیں اپنے عزائم سے آگاہ کیا۔ وہ پڑھنے میں بہت اچھی تھی۔ اچھی مونا بھی تھی اور اپنی کلاس میں پوزیشن لیتی تھی لیکن عروبہ کے مارکس اس سے بھی زیادہ ہوتے تھے۔

''ویری گڈ بیٹا! ایسے ہی محنت سے پڑھو۔ آپ دونوں بہنوں کو ڈاکٹر بنانا میرا اور آپ کی مما کا خواب ہے۔'' بہزاد احمد نے اس کی ہمت افزائی کی۔

''میں ضرور آپ کو ڈاکٹر بن کر دکھاؤں گی۔'' عروبہ نے انہیں یقین دلایا۔

''مجھے خوشی ہوگی۔ اچھا یہ بتاؤ آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟'' بہزاد احمد نے اس سے پوچھا۔ وہ مونا کو جو کچھ دلاتے تھے، وہ عروبہ کے لیے بھی ضرور لاتے تھے لیکن پھر بھی اس سے اس کی ضروریات کے بارے میں پوچھنا نہیں بھولتے تھے۔

''نو تھینکس پاپا! میرے پاس تو پہلے ہی اتنی ڈھیر ساری چیزیں ہیں۔'' عروبہ نے انہیں جواب دیا تو انہوں نے مسکراتے ہوئے اسے وہاں سے جانے کی اجازت دے دی لیکن وہ یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکے کہ اگر عروبہ کی جگہ مونا ہوتی تو ہرگز یہ جواب نہیں دیتی اور لازماً اسے اپنی کوئی نہ کوئی فرمائش یاد آ جاتی۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ رویّے کا یہ فرق تربیت کے فرق کی وجہ سے ہے۔ سلیمہ، عروبہ کو سمجھاتی رہتی تھیں کہ اسے بہزاد کے دل میں اپنی جگہ بنانے کے لیے کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے۔ انہوں نے اسے یہ بات بھی اچھی طرح سمجھا رکھی تھی کہ بہزاد احمد کے سامنے مونا کی طرح فرمائشیں کرنے سے گریز کرے اور جو کچھ چاہیے ہو ان سے

کہے۔ بہزاد احمد انہیں بھی اچھی خاصی رقم دیتے تھے اور کبھی اس رقم کے بارے میں حساب کتاب نہیں کیا تھا اس لیے سلیمہ اپنی بیٹی کی فرمائشیں آسانی سے پوری کر سکتی تھیں۔ وہ عروبہ کے لیے لائی جانے والی ہر شے کو اس کے ننھیال والوں یا اپنی کسی سہیلی کا تحفہ قرار دیتی تھیں۔ وہ اس گھر میں اپنی بیٹی کو ہر طرح کے عیش کروا رہی تھیں لیکن بہزاد احمد پر ظاہر نہیں ہونے دیتی تھیں۔ ان کے نزدیک عروبہ ایک فرمانبردار، خدمت گزار اور قناعت پسند بچی تھی جس سے وہ اپنی بیٹی جتنی محبت نہ کرنے کے باوجود، بیٹی جتنی ہی سہولیات فراہم کرتے تھے۔ انہیں لگتا تھا کہ جواب میں سلیمہ کا بھی یہی طرزِ عمل ہے۔ انہوں نے کبھی بہزاد احمد کے سامنے تو کیا، پیچھے بھی مونا کے ساتھ کوئی بدسلوکی یا سختی نہیں کی تھی ورنہ مونا ضرور ان سے شکایت کرتی۔

وہ دیکھتے تھے کہ دونوں بچیوں کے درمیان کوئی مسئلہ ہونے پر سلیمہ مونا کی ہی حمایت کرتی تھیں۔ دیگر معاملات میں بھی انہوں نے کبھی مونا پر سختی نہیں کی تھی۔ اس کا ہر کام اپنے ہاتھ سے کر کے دیتی تھیں اور خود بھی اس سے کوئی کام نہیں لیتی تھیں جبکہ عروبہ اپنے جوتوں کی پالش اور یونیفارم کی استری جیسے کام خود ہی کرتی تھی۔ وہ کچن میں بھی کبھی کبھی ماں کا ہاتھ بٹاتی ہوئی نظر آتی تھی۔ بہزاد احمد نے اس کا کمرا ہمیشہ بہت سلیقے سے سمٹا ہوا دیکھا تھا جبکہ مونا کا کمرا ماسی کے روزانہ صفائی کرنے کے باوجود بکھرا بکھرا ہی نظر آتا تھا۔ وہ سمجھتے تھے ایسا مونا کے لاابالی پن کی وجہ سے ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ سلیمہ، تربیت میں انصاف سے کام نہیں لے رہی ہیں۔ وہ عروبہ کو ہر وہ گُن سکھا رہی تھیں جو ایک سمجھدار ماں اپنی بیٹی کو سکھاتی ہے جبکہ مونا کو انہوں نے کسی خودرو جھاڑی کی طرح بڑھنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ اس کے معاملے میں وہ اسے ہر ذمے داری سے آزاد رکھ کر اور اس کی بے جا حمایت کر کے خود کو سرخرو کر لیا کرتی تھیں۔

دیکھنے والے صحیح کہتے تھے کہ سوتیلی ماں نے بچی کو کتنے عیش و آرام میں رکھا ہوا ہے۔ سوتیلا پن دکھانا تو دور کی بات، کبھی اسے پھولوں کی چھڑی تک سے نہیں مارتیں۔ اسے اپنی سگی بیٹی پر بھی ترجیح دی جاتی ہے۔ اصل حقیقت کیا ہے، وہ خود سلیمہ جانتی تھیں اور بیٹی کو بھی کافی حد تک انہوں نے اپنی حکمتِ عملی سمجھا دی تھی جب ہی تو وہ ماں سے بالا ہی بالا خود بھی بہت سی چالیں چل جاتی تھی۔ جیسا کہ اس وقت اس نے مونا کو لان میں کھیلتے ہوئے دیکھا تو جلدی سے اپنا خراب ہو جانے والا فونٹین پین لے کر مونا کے کمرے میں گھس گئی

اور اس کے پین سے اپنا پین بدل ڈالا۔ بہزاد احمد کی انصاف پسندی کی وجہ سے دونوں کے پاس عموماً ایک جیسی ہی چیزیں موجود ہوتی تھیں اور عروبہ حسبِ ضرورت، موقع دیکھ کر اپنی خراب ہو جانے والی چیزیں مونا کی چیزوں سے بدل ڈالتی تھی۔ اس طرح اسے دو فائدے حاصل ہوتے تھے۔ اول تو یہ کہ خود اس کے پاس ہمیشہ بہترین حالت والی چیز موجود رہتی تھی، دوسرے بہزاد احمد پر یہ تاثر قائم ہو جاتا تھا کہ مونا، عروبہ کے مقابلے میں بہت بے پروا ہے جب ہی تو اس کی چیزیں جلدی خراب ہو جاتی ہیں۔ وہ کبھی کبھی بیٹی کو اس بات پر ٹوک بھی دیتے تھے لیکن وہ اتنی بے نیاز طبیعت کی مالک تھی کہ حیران ہونے کے سوا کچھ سوچ ہی نہیں پاتی تھی۔ کم از کم اسے عروبہ پر کبھی کوئی شک نہیں ہوا تھا۔ جن کو سب کچھ فراوانی سے حاصل ہو جائے، وہ ایسی باتوں پر غور کرنے کے عادی ہوتے بھی نہیں ہیں۔ وہ ہر خراب شے کے بدلے میں باپ سے نئی شے منگوا لیتی تھی اور عروبہ کو بھی خود بخود وہ سب مل جاتا تھا۔ اس طرح وہ دہرے فائدے میں رہتی تھی۔ اول سب کچھ مل بھی جاتا، دوم بہزاد احمد اس کی تعریف کرتے کہ وہ مونا کے مقابلے میں اپنی ہر شے کو کتنا سنبھال کر رکھتی ہے۔ اپنی کامیابیوں پر خوش عروبہ اور اس کی ماں کو اندازہ نہیں تھا کہ جب وقت اپنی چال چلتا ہے تو انسان کی چلی چالیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔

☆☆☆

''آؤ امینہ بیٹھو! رضیہ بتا رہی تھی کہ تم کسی کام سے مجھ سے ملنا چاہتی ہو۔ خیریت...... نور تو ٹھیک ہے نا۔ زیادہ تنگ تو نہیں کرتی؟'' میڈم نیازی نے اپنے دفتر میں اس کا سواگت کیا اور ہمدردی سے پوچھنے لگیں۔

''نور فاطمہ بالکل ٹھیک ہے میڈم۔ مجھ سے زیادہ رضیہ آپا اس کا خیال رکھتی ہیں اس لیے مجھے اس کے سلسلے میں کوئی پریشانی نہیں ہے۔ میں آپ کے پاس ایک دوسرے کام سے آئی ہوں۔''

''اچھا...... وہ کیا؟'' میڈم نیازی نے اس کے جواب پر تجسس سے پوچھا تو وہ ذرا سا جھجکی اور پھر نظریں جھکا کر بولنا شروع ہوئی۔

''میں نور کے مستقبل کے بارے میں سوچ رہی ہوں میڈم! میں اس کی ذات پر کوئی تبصرہ پسند نہیں کرتی لیکن میرے دل میں ایک خیال ہے کہ جب اللہ نے اسے مجھے دیا ہے تو مجھ پر اس کی ذمے داری بھی عائد ہوتی ہے۔ وہ بچی بے گناہ اور بے قصور ہے لیکن اسے ساری زندگی کسی اور کے

کیے کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ میں اس کے بارے میں دوسری خواتین کے تبصرے سنتی ہوں تو میرا دل خون کے آنسو رونے لگتا ہے۔ ابھی نور دودھ پیتی بچی ہے۔ اسے کچھ معلوم نہیں کہ لوگ اس کے بارے میں کیا کیا کہتے ہیں لیکن جب وہ بڑی ہوگی تو آہستہ آہستہ ہر بات کا مطلب سمجھنے لگے گی۔ اس وقت اسے جو اذیت پہنچے گی میں اسے اس اذیت سے نجات دلانا چاہتی ہوں اور اس کے لیے مجھے آپ کی مدد چاہیے۔"

"یہ سب باتیں تو میرے ذہن میں بھی ہیں اور اس کے لیے میرے پاس ایک حل بھی ہے لیکن میں نے تم سے بھی اس لیے ذکر نہیں کیا کہ تمہیں تکلیف ہوگی۔" میڈم نیازی اس کی باتیں سن کر پُرخیال لہجے میں بولیں تو وہ چونک گئی۔

"کیسا حل میڈم...... پلیز آپ مجھے بتائیں۔"

"بات یہ ہے امینہ......" میڈم نیازی نے ذرا سا رک کر اپنا گلا کھنکھارا اور سامنے رکھے گلاس سے دو گھونٹ پانی پیا۔ وہ بے تابی سے ان کی طرف دیکھتی رہی۔ انہوں نے گلاس رکھ کر سلسلۂ کلام دوبارہ جوڑا۔

"ہمارا ادارہ بنیادی طور پر خواتین کے لیے قائم کیا گیا ہے لیکن خواتین کی وجہ سے یہاں ان کے بچے بھی آ ہی جاتے ہیں۔ جس سے ایک طرف ہمارے بجٹ پر بوجھ بڑھتا ہے تو دوسری طرف انتظامی امور چلانے میں بھی مشکلات پیش آتی ہیں۔ مائیں الگ اپنے بچوں کے مستقبل کی طرف سے پریشان رہتی ہیں۔ ان مسائل کے حل کے لیے ہم ماں کی اجازت سے بچے کو ایسے بے اولاد جوڑوں کے سپرد کر دیتے ہیں جو ان کی بہترین پرورش کرسکیں۔ بچے گود لینے کے خواہش مند جوڑوں کی بڑی تعداد نومولود بچوں کو گود لینا پسند کرتی ہے۔ اگر تم کہو تو میں نور فاطمہ کے لیے ایسا کوئی بندوبست کرسکتی ہوں۔"

"نہیں میڈم! بالکل نہیں۔ اس بچی کے پاس صرف ماں ہی تو ہے۔ میں اسے ماں کے پیار سے بھی محروم کر دینے کا فیصلہ کیسے کرسکتی ہوں۔ میں تو اس کے لیے کچھ اور سوچ رہی ہوں۔"

"وہ کیا؟" میڈم نیازی اس کے جواب پر حیران ہوئیں۔

"میں چاہتی ہوں کہ نور فاطمہ کے سمجھدار ہونے سے پہلے میں اسے اس جگہ سے لے جاؤں لیکن اس مقصد کے لیے مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہوگی۔ آپ مجھے کسی جگہ ملازمت دلوا دیں، میں چند سال ملازمت کر کے تھوڑی سی رقم جمع کرلوں گی تو نور کو یہاں سے کہیں اور لے جاؤں گی۔ یہاں رہ کر تو میں اسے کوئی جھوٹی کہانی بھی نہیں سنا سکتی۔ سناؤں گی بھی تو یہاں کی عورتیں اسے شک وشبے میں ڈال دیں... لیے بہتر ہے کہ میں اسے یہاں سے لے جاؤں لیکن... چند سال جب تک نور اسکول جانے کے لائق نہیں ہو جاتی... میں اپنے پیروں پر کھڑی نہیں ہو جاتی، مجھے اس ادارے کی امان چاہیے ہوگی۔ یہاں رضیہ آپا ہیں جو میری غیر... میں نور کا خیال رکھ سکتی ہیں۔" اس نے انہیں اپنے پر... سے آگاہ کیا۔

"تم جو کچھ سوچ رہی ہو وہ بہت مشکل ہے امینہ!... جوان ہو۔ ایک چھوٹی سی بچی کو لے کر تنہا کہاں رہ سکتی... معاشرہ تمہیں جینے نہیں دے گا پھر تم جاب کیا کرو گی۔ تم اپنے بارے میں شاید یہی بتایا تھا کہ تم زیادہ پڑھی لکھی... ہو۔ ایسی صورت میں تو تمہیں نوکری بھی نہیں ملے گی۔" ... نیازی نے اسے حالات کے سرد وگرم سے آگاہ کیا۔

"میں نے انٹر کیا ہوا ہے میڈم۔ آگے بھی پڑھ رہی تھی... کہ میرے ساتھ یہ حادثہ پیش آ گیا۔ میری اسکولنگ بہت... شاندار ہوئی ہے۔ میں بہت اچھی انگریزی لکھنا اور بولنا جانتی... ہوں۔ مجھے کمپیوٹر کا استعمال بھی بہت اچھی طرح آتا ہے اس... لیے میرا خیال ہے کہ اگر آپ کوشش کریں تو مجھے کوئی منا... جاب مل سکتی ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میرے پاس میرے ک... بھی قسم کے ڈاکیومنٹس موجود نہیں ہیں اگر آپ اس سلسلے میں... میری مدد کریں تو میں اپنی زندگی کو نئے سرے سے شروع کر کے نور فاطمہ کے لیے بہتری کی راہ نکال سکتی ہوں۔" اس نے پہلی بار انہیں اپنے بارے میں کچھ سچائیوں سے آگاہ کیا۔

"تم اپنے گھر والوں سے ملنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں امینہ! ہوسکتا ہے وہ لوگ تمہارے لیے کوئی گنجائش نکال لیں۔" میڈم نیازی کو اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کسی اچھے خاندان کی لڑکی ہے اس لیے اسے مشورہ دیا۔

"نہیں، میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ مجھے جو کچھ کرنا ہے خود ہی کرنا ہے۔ بس آپ میری مدد کا وعدہ کریں۔" اس نے قطعیت سے ان کا مشورہ رد کرتے ہوئے اپنا مطالبہ دہرایا تو وہ سوچ میں پڑ گئیں۔

"ٹھیک ہے۔ میں دیکھتی ہوں کہ میں تمہارے لیے کیا کرسکتی ہوں۔ میرے تعلقات ہیں لیکن بہرحال تمہارے لیے ڈاکیومنٹس تیار کروانے میں کافی وقت لگ سکتا ہے۔ اس عرصے میں، میں تمہارے لیے یہ کرسکتی ہوں کہ تمہیں چند ا... گھروں کے بچوں کی ٹیوشنز دلوا دوں لیکن اس سے پہلے میں... خود تمہاری قابلیت کو جانچوں گی پھر کسی سے بات کروں گی۔"

"میں تیار ہوں میڈم۔ آپ ابھی میرا امتحان لے...

ہیں۔" اس نے اعتماد سے جواب دیا۔ میڈم نیازی اس کے اعتماد سے متاثر ہوئیں لیکن وہ ایسے ہی مطمئن ہو جانے والی خاتون نہیں تھیں۔ انہوں نے اس کا ٹھیک ٹھاک قسم کا امتحان لے ڈالا اور یہ دیکھ کر بہت متاثر ہوئیں کہ اس نے ان کے طویل سوال نامے کے ہر سوال کا جواب بالکل درست دیا تھا۔ اس کی انگریزی شاندار اور لکھائی بہت خوب صورت تھی۔ وہ اپنے دعوے کے مطابق سچ مچ اچھی خاصی لائق لڑکی تھی۔

"ویری گڈ امینہ! تم نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ میں فوری طور پر تمہارے لیے ٹیوشنز کا بندوبست کرتی ہوں۔ ڈاکیومنٹس وغیرہ بھی بنوانے کی کوشش کروں گی۔ میری خواہش ہے کہ تم آگے بھی تعلیم حاصل کرو تاکہ نور فاطمہ کے لیے سچ مچ اچھے مستقبل کا انتظام کرسکو لیکن یہاں سے جانے کا فیصلہ تم بعد میں سوچ سمجھ کر کرنا کیونکہ میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ باہر کی دنیا میں تنہا عورت کا جینا بہت مشکل ہوتا ہے۔ تمہاری اور نور کی زندگی بہت سی پریشانیوں میں گھر جائے گی۔" انہوں نے اسے اچھی امیدوں کے ساتھ ساتھ اپنے خدشات سے بھی آگاہ کیا۔

"میں نے اس پر اچھی طرح سوچ لیا ہے میڈم۔ میں نور کو کسی بورڈنگ اسکول میں داخل کروا دوں گی اور خود کسی ویمن ہاسٹل میں رہ لوں گی۔ اس طرح کم از کم ہمیں تحفظ تو مل ہی جائے گا لیکن مجھے معلوم ہے کہ بورڈنگ اسکول بہت مہنگے ہوتے ہیں اسی لیے میں چند سال یہاں رہ کر کچھ رقم جمع کرنا چاہتی ہوں۔ جب مجھے اچھی جاب مل جائے گی اور میں یہ سب افورڈ کرسکوں گی تب ہی نور کو یہاں سے لے کر جاؤں گی۔" وہ واقعی اس مسئلے پر اچھی طرح سوچ چکی تھی۔ میڈم نیازی اس کا پورا منصوبہ سن کر خفیف سا مسکرائیں اور بولیں۔

"اللہ کرے تم اپنے مقصد میں کامیاب رہو۔ مجھ سے تمہارے سلسلے میں جو ہوسکا وہ ضرور کروں گی۔ سب سے پہلے تو مجھے اوپر والوں سے اجازت لینی ہوگی کیونکہ ان کی طرف سے ادارے میں رہنے والی خواتین کو اس طرح باہر بھیجنے کی اجازت نہیں ہوتی۔" وہ دل سے اس کا ساتھ دینے کی خواہش مند تھیں۔ وہ عورتوں کی اس قسم میں سے تھیں جو زندگی میں سمجھوتے کرنے کے بجائے اپنے زور بازو پر زندگی گزارنا پسند کرتی ہیں۔ معمولی شکل وصورت کی وجہ سے ان کی شادی نہیں ہوسکی تھی بلکہ یوں کہنا مناسب تھا کہ انہوں نے سمجھوتے کی شادی کے بجائے اپنی شرائط پر زندگی گزارنے کو ترجیح دی تھی اور خوش تھیں کہ اپنا گھر نہ بنا کر بھی بہت سی بے گھر خواتین کے سر پر سائبان بنی ہوئی ہیں۔ کہنے کو وہ ملازمت کر رہی تھیں لیکن ایسی جگہ کی ملازمت کو جہاں قدم قدم پر چیلنجز تھے، ایمانداری ودیانت داری سے نبھانا جہاد سے کم نہیں تھا اور وہ بہت کامیابی سے یہ جہاد کر رہی تھیں۔

☆☆☆

"یہ دیکھیں پھپھو! میں نے آپ کے لیے یہ قمیص کاڑھی ہے۔ آپ نے بتایا تھا نا کہ بلیو کلر آپ کا فیورٹ ہے تو میں نے مما سے کہہ کر بلیو کلر کا کپڑا منگوالیا تھا۔" عروبہ نے سلور کلابتو سے کاڑھی گئی سندھی بوٹیوں والی قمیص شازیہ کے سامنے رکھی۔ ایک تو انہیں نیلا رنگ پسند تھا، دوسرے اس پر سلور کڑھائی بھی بہت بھلی لگ رہی تھی۔ انہوں نے قمیص ہاتھ میں لے کر بے ساختہ ہی "ماشاء اللہ" کے الفاظ ادا کیے۔ وہ بہزاد احمد کی چھوٹی بہن تھیں جو شادی کے فوراً بعد لندن چلی گئی تھیں۔ ان کی اور بہزاد احمد کی پہلی شادی ساتھ ہی ہوئی تھی۔ شادی کے بعد وہ ایک دفعہ مونا کی ماں کی زندگی میں پاکستان آئی تھیں۔ ان کا دوسرا چکر بہزاد احمد کی سلیمہ سے شادی کے تقریباً تین چار سال بعد لگا تھا اور اب وہ تیسری بار اس وقت پاکستان آئی تھیں جب مونا اور عروبہ دونوں انٹر کے امتحانات دے کر فارغ تھیں۔ پہلے جب وہ پاکستان آئی تھیں تو سلیمہ نے ان کی بہت آؤ بھگت کی تھی اور وہ جو تشویش میں مبتلا تھیں کہ سوتیلی ماں پتا نہیں مونا کے ساتھ کیسا سلوک کرتی ہوگی، جاتے وقت بہت مطمئن ہو کر گئی تھیں۔ دوبارہ آمد تک کے درمیانی برسوں میں ان کا بھائی بھاوج سے فون پر رابطہ رہا تھا۔ وہ مونا سے بھی کبھی کبھار تنہائی میں بات کر کے اطمینان کرلیتی تھیں کہ سوتیلی ماں اس پر کوئی ظلم تو نہیں کر رہی ہے۔ سلیمہ کا رویہ مونا کے ساتھ اتنا اچھا تھا کہ وہ ان کی شکایت کر ہی نہیں سکتی تھی بلکہ گزرتے برسوں میں اس کی عروبہ کے ساتھ بھی پہلے کی طرح چپقلش نہیں رہی تھی لیکن وہ بے تکلفی اور محبت بھی نہیں تھی جو سگی بہنوں میں ہوتی ہے۔ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ دل ہی دل میں ایک دوسرے سے حسد ضرور رکھتی تھیں۔ مونا کو بہزاد احمد کا عروبہ پر عنایتیں کرنا اور اپنی برابری سے نوازنا اچھا نہیں لگتا تھا تو عروبہ ماں کے مونا کے ساتھ ترجیحی سلوک کو بہت محسوس کرتی تھی۔ بہرحال یہ سب اندرونی معاملات تھے جن پر شازیہ کی گہرائی میں جا کر نظر نہیں پڑی تھی اور انہوں نے مجموعی طور پر بھائی کے گھر کے ماحول کو پُرسکون ہی پایا تھا اور اس کا سہرا وہ سلیمہ کے سر باندھنے پر مجبور تھیں کہ اگر وہ اتنے اچھے طریقے سے گھر کو نہ سنبھالتیں تو آج بھائی کی زندگی اتنی پُرسکون اور مطمئن نہ ہوتی۔ سلیمہ کی خیال داری کے بدلے میں وہ ان کی بیٹی عروبہ

کے ساتھ بھی شفقت سے پیش آتی تھیں لیکن فطری طور پر انہیں اپنی سگی بھتیجی مونا سے زیادہ محبت تھی۔ یہ بات سلیمہ اور عروبہ بھی سمجھتی تھیں اس لیے اس باران کی آمد پر دونوں ماں بیٹی نے ان کا دل جیتنے کے لیے اپنی جان لڑادی تھی اور کمال یہ تھا کہ وہ سب اتنی تکنیک سے کرتی تھیں کہ کبھی شازیہ کو اس پر ڈرامے کا گمان بھی نہیں ہوا تھا۔ اس وقت بھی وہ عروبہ کا پیش کیا ہوا سوٹ دیکھ کر خوش ہوگئیں اور نفیس سی کڑھائی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

''بیٹا! کیا سچ مچ یہ اتنی پیاری کڑھائی تم نے خود کی ہے؟''

''بالکل پھپو۔ میٹرک کے بعد میں نے ایک سینٹر سے سلائی کڑھائی کا شارٹ کورس کیا تھا۔ مما کہتی ہیں پڑھنا لکھنا اپنی جگہ لیکن لڑکیوں کو یہ سارے ہنر بھی آنے چاہئیں۔'' عروبہ نے ان کے سوال کا تفصیلی جواب دیا تو وہ سن کر خوش ہوگئیں اور بولیں۔

''تمہاری مما بالکل ٹھیک کہتی ہیں ۔ مونا نے بھی تمہارے ساتھ اس کورس میں ایڈمیشن لیا تھا یا نہیں؟''

''نہیں پھپو! اصل میں اسے ان سب چیزوں سے بالکل بھی انٹرسٹ نہیں ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ تو کچن میں بہت مشکل سے جاتی ہے جبکہ مجھے تو مما نے بہت ساری ڈشز بنانا بھی سکھا دی ہیں۔ کل آپ نے میرے ہاتھ کی بریانی کھائی تھی نا؟ آج میں آپ کو بلیک فاریسٹ کیک بنا کر کھلاؤں گی۔ صبح ہی میں نے ایک شو میں اس کی ریسپی دیکھی ہے۔'' وہ ان کے سوال کا جواب دے کر بڑے جوش سے انہیں اپنے اگلے پروگرام سے آگاہ کررہی تھی۔ اس کی باتیں سن کر شازیہ کے ماتھے پر ایک پُرتفکر سی سلوٹ پڑ گئی۔ وہ جب سے آئی تھیں خود بھی نوٹ کررہی تھیں کہ مونا کو ان سب چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ بہت زیادہ اپنی ذات میں مگن رہنے والی لڑکی تھی جوان کے پاس بھی زیادہ دیر نہیں بیٹھتی تھی اور زیادہ وقت اپنے کمرے میں ہی گزارتی تھی۔

''ارے بھئی کیا باتیں ہورہی ہیں پھوپی بھتیجی میں؟'' اسی وقت سلیمہ کمرے میں داخل ہوئیں تو شازیہ کی توجہ ان کی طرف مبذول ہوگئی۔ سلیمہ کے ہاتھ میں ایک قمیص اور سوئی دھاگا موجود تھا جسے لیے ہوئے وہ ایک کرسی پر براجمان ہوگئیں۔

''کچھ خاص باتیں نہیں ہورہیں، عروبہ مجھے یہ قمیص دکھا رہی تھی۔ بہت خوب صورت اور صفائی سے کڑھائی کی ہے بچی نے۔ میرا تو دل خوش ہوگیا دیکھ کر۔'' شازیہ نے عروبہ کی تعریف کی۔

''بس اسے شوق ہے کچھ نہ کچھ سیکھنے کا۔ میں بھی منع نہیں کرتی کہ لڑکی ذات ہے۔ جتنی سلیقہ مند ہو اچھا ہو گا'' سلیمہ مسکرائیں اور دانت سے دھاگا توڑ کر دوبارہ اس میں ... لگانے لگیں۔

''آپ کیا کررہی ہیں؟'' شازیہ نے ان کی مصروفیت کی بابت دریافت کیا۔

''مونا کی قمیص پر بٹن ٹانک رہی ہوں۔ کل درزی سے لینے گئی تو پتا چلا قمیص تو سل گئی ہے لیکن بٹن نہیں لگے۔ میں نے سوچا دوبارہ کہاں چکر لگاؤں گی اس لیے قمیص لے آئی کہ گھر پر خود ہی ٹانک دوں گی۔'' انہوں نے بتایا۔

''بٹن تو مونا خود بھی ٹانک سکتی ہے۔'' شازیہ بے ساختہ ہی بول اٹھیں۔

''مونا......'' سلیمہ آہستہ سے ہنسیں۔ ''اسے تو شاید سوئی میں دھاگا بھی ڈالنا نہیں آتا ہوگا۔''

''یہ تو غلط بات ہے بھابی! لڑکیوں کو یہ چھوٹے موٹے کام تو آنے چاہئیں۔ پلیز! آپ برا مت مانیے گا لیکن میں کہنے پر مجبور ہوں کہ آپ نے عروبہ کو تو ہر فن سکھایا ہے لیکن مونا بالکل کوری ہے۔ آخر یہ فرق کیوں......؟'' شازیہ خود کو سوال کرنے سے نہیں روک سکیں۔

''اس میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے شازیہ۔ میں نے مونا سے بھی کہا تھا کہ وہ اپنی پسند کے کسی کورس میں ایڈمیشن لے لے لیکن وہ راضی نہیں ہوئی۔ تم میری پوزیشن سمجھ سکتی ہو۔ میں کسی بھی کام کے لیے اسے ایک حد سے زیادہ فورس نہیں کرسکتی ورنہ فوراً ہی مجھ پر یہ الزام لگ جائے گا کہ میں سوتیلی ماں ہوں اس لیے بچی پر ظلم کرتی ہوں۔ پھر سچ بولوں تو مونا ہے بھی اتنی نازک کہ مجھے اس پر کوئی بوجھ ڈالنا اچھا نہیں لگتا۔ بہزاد نے شروع سے اسے بہت نازونعم میں رکھا تھا، اگر میں اس پر کسی معاملے میں سختی کرتی تو وہ سہہ نہیں پاتی اس لیے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اسے اس کی مرضی کے مطابق رہنے دوں۔ بعد میں اپنی مرضی سے جو چاہے گی سیکھ لے گی۔ ابھی تو پڑھائی میں مصروف ہے اور یہ اچھی بات ہے کہ وہ پڑھنے میں اچھی ہے۔ اب بھی بہت دل لگا کر اپنے میڈیکل میں ایڈمیشن کے لیے انٹری ٹیسٹ کی تیاری کررہی ہے۔'' سلیمہ نے اپنی بھرپور صفائی پیش کی جس پر شازیہ کو قائل ہونا پڑا لیکن اتنا ضرور بولیں۔

''پڑھنے میں تو عروبہ بھی اچھی ہے بلکہ شاید مونا سے زیادہ ہی اچھی ہے۔ پڑھائی کو جواز بنا کر لڑکی کا پھوہڑ رہ جانا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔''

''تم اتنی ٹینشن مت لو۔ مونا کو عقل آئے گی تو وہ سب سیکھ لے گی۔ ابھی وہ جو کررہی ہے وہی مناسب ہے۔ تم یہ بات تو سمجھ سکتی ہو نا کہ ہر بچے کی اپنی اپنی صلاحیت اور استعداد ہوتی ہے۔ بعض بچے ہر میدان میں خود کو منوا لیتے ہیں اور بعض بس کسی ایک میدان میں ہی کامیاب رہتے ہیں۔ میں شکر ادا کرتی ہوں کہ مونا کو تعلیم میں دلچسپی ہے اور انشاء اللہ وہ میڈیکل کے لیے کوالیفائی کرلے گی۔ اگر اس معاملے میں وہ عروبہ سے پیچھے رہ جاتی تو مجھے بہزاد کے سامنے شرمندگی ہوتی اور دنیا کو بھی باتیں بنانے کا موقع ملتا۔ اس طرح کا فرق بہت نمایاں ہوجاتا ہے۔ باقی باتیں تو ایسی ہیں کہ گھر کے باہر کسی کو پتا بھی نہیں چلتیں اور بعد میں لڑکیاں خود ہی مینیج کرلیتی ہیں۔'' سلیمہ نے اس بار بھی اتنا مدلل جواب دیا کہ شازیہ کو قائل ہونا پڑا اور انہوں نے اپنے دل میں تسلیم کیا کہ واقعی سلیمہ ایک اچھی سوتیلی ماں ہیں جنہوں نے ان کی بھتیجی کے مستقبل کی بالکل صحیح منصوبہ بندی کی ہے۔

☆☆☆

میڈم نیازی کی مدد سے اسے تین اچھے گھرانوں میں ٹیوشنز مل گئی تھیں۔ ایک گھر میں صرف ایک بچی کو پڑھانا تھا۔ دوسرے میں حد نہیں تھی اور تیسرے میں دو بہن بھائی۔ سب بچے اچھے اسکولوں میں پڑھتے تھے اور ان کے والدین اتنی استطاعت رکھتے تھے کہ بھاری ٹیوشن فیس ادا کرسکیں اس لیے اسے ٹیوشنز سے ہی ٹھیک ٹھاک پیسے ملنے لگے تھے اور اس نے میڈم نیازی کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے فی الحال کوئی مستقل جاب کرنے کا فیصلہ ترک کرکے مزید آگے پڑھنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ یوں بھی ابھی اس کے ڈاکیومنٹس بن کر نہیں آئے تھے اور ان کے بغیر وہ کوئی اچھی ملازمت بالکل بھی حاصل نہیں کرسکتی تھی۔ وہ ایک لائق طالبہ رہی تھی اور ٹیوشن پڑھانے میں وہ اپنی اس لیاقت کو ثابت بھی کررہی تھی اس لیے تمام والدین اس کی طرف سے مطمئن تھے۔ وہ بھی مطمئن تھی کہ نور فاطمہ کے مستقبل کے لیے کچھ کر پارہی ہے اور ساتھ ہی اسے بچی کے لیے بھی وقت مل رہا ہے۔ میڈم نیازی سے اس نے بی اے پارٹ ون کی کتابیں بھی منگوالی تھیں اور ان کے مشورے سے ایسے مضامین کا انتخاب کیا تھا جن میں اسے میڈم سے مدد مل سکتی تھی۔ اسے امید تھی کہ بی اے کے رجسٹریشن فارم جانے تک اس کے ڈاکیومنٹس کا مسئلہ حل ہوجائے گا اور وہ اسی سال امتحان دینے میں کامیاب ہوجائے گی اسی لیے حسبِ عادت بہت شدومد سے پڑھائی کررہی تھی۔ دارالامان میں رہنے والی دوسری عورتیں اس کی ان مصروفیات سے متاثر بھی ہوتیں اور باتیں بھی بناتیں لیکن اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔

درحقیقت اس کے پاس اتنی فرصت ہی نہیں تھی کہ وہ باتوں پر توجہ دے سکتی۔ وہ اپنی اور نور فاطمہ کی بہتر زندگی کے لیے جدوجہد کا آغاز کرچکی تھی اور اتنا بہرحال جانتی تھی کہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے اس پر نگاہ مرکوز رکھنی ضروری ہوتی ہے۔ ثانوی باتوں میں الجھنے سے اصل مقصد کا حصول مشکل ہوجاتا ہے۔ میڈم نیازی اس کے اس رویے کو سراہتی بھی تھیں اور اس کی حوصلہ افزائی بھی کرتی رہتی تھیں۔ اس کے ساتھ ان کا یہ امتیازی سلوک بہت سوں کو حسد میں بھی مبتلا کردیتا تھا۔ نہایت سخت گیر منتظمہ ہوتے ہوئے انہوں نے اسے جو سہولیات فراہم کی تھیں وہ دوسروں کی نگاہ میں کھٹکتی تھیں لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ میڈم نیازی نے اسے بالکل کھلی چھوٹ دے دی ہو۔ اس پر آنے جانے کے اوقات کی پابندی کرنا لازم تھا۔ اسے کھانا بھی وہی کھانا ہوتا تھا جو دارالامان میں مقیم دوسری عورتیں کھاتی تھیں۔ اسے ایسا لباس بھی پہننے کی اجازت نہیں تھی جو دارالامان میں رہنے والی دوسری خواتین کو مہیا نہیں تھا۔ اس کے میک اپ کرکے باہر جانے پر بھی پابندی تھی۔ میڈم نیازی نے اسے صاف بتا دیا تھا کہ انہوں نے اسے باہر جاکر کمانے کی اجازت صرف اس لیے دی ہے کہ وہ اپنا اور نور فاطمہ کا مستقبل سنوار سکے لہٰذا اس بات کی کوئی گنجائش نہیں کہ وہ اپنی کمائی تعیشات میں خرچ کرے اور ادارے کی دیگر خواتین میں ہیجان برپا ہو۔ اس کے اپنے ذہن میں بھی ایسا کوئی خیال نہیں تھا اس لیے اسے میڈم نیازی کی شرائط پر کوئی اعتراض نہیں ہوا تھا۔ وہ سادہ سے لباس میں اپنے گرد بڑی سی چادر لپیٹ کر مقررہ وقت پر جاتی اور مخصوص وقت پر واپس آجاتی۔ آج بھی ایسا ہی ہوا تھا اور وہ رات کے کھانے کے بعد نور فاطمہ کو سلا کر اپنی کتابوں میں مصروف ہوگئی تھی کہ دروازے پر کھٹکا ہوا۔ اس نے دیکھا کہ دارالامان میں مقیم جمیلہ نامی جواں سالہ عورت دروازے میں کھڑی ہے۔

''میں اندر آجاؤں؟'' جمیلہ نے اس سے پوچھا۔ یہاں عورتیں مشترکہ کمروں میں رہتی تھیں لیکن اسے میڈم نیازی کی مہربانی سے یہ چھوٹا سا اسٹور نما کمرا سب سے الگ دے دیا گیا تھا تاکہ وہ سکون سے اپنی پڑھائی کرسکے۔

''آجائیں۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی اسے جمیلہ کو اندر آنے کی اجازت دینی پڑی۔

''پڑھ رہی تھیں؟'' جمیلہ اس کے قریب آبیٹھی اور اس کے سامنے کھلی کتاب دیکھ کر پوچھا۔ اس نے صرف

اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

''بہت محنتی لڑکی ہو تم۔ لگتا ہے کسی اچھے خاندان سے تعلق ہے۔'' جمیلہ نے تبصرہ کیا جس پر وہ خاموش ہی رہی۔ اسے اپنی ذات پر کوئی بھی بات کرنے میں بالکل بھی دلچسپی نہیں تھی۔

''رضیہ آپا بتا رہی تھیں کہ تم اپنا اور نور کا مستقبل سنوارنے کے لیے اتنی محنت کر رہی ہو لیکن یہ بڑا مشکل کام ہے بھئی۔ تم اکیلی لڑکی بھلا کتنا کر سکو گی۔'' جمیلہ نے اس سے ہمدردی جتائی۔

''اللہ مالک ہے۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''اللہ تو مالک ہے لیکن یہ جو اللہ کے بندے ہیں یہ اکیلی عورت کو جینے نہیں دیتے۔ تم نے کبھی بتایا نہیں لیکن کسی کے ظلم کا تو نتیجہ ہے کہ آج تم یہاں ہو۔ یہاں آنے سے پہلے یقیناً تم کسی گھر میں رہتی ہو گی۔ خود ہی سوچو کہ جب تمہارے پاس ایک گھر کی چار دیواری تھی تو تمہارے ساتھ اتنا برا ہو گیا جب تنہا باہر نکلو گی تو کیا ہو گا۔'' جمیلہ جیسے اسے ڈرانے پر تلی ہوئی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ان سب باتوں کا آخر مقصد کیا ہے اور جمیلہ اسے کیا سمجھانا چاہتی ہے۔

''کتنی سوہنی ہو تم۔ رب نے بڑی فرصت سے بنایا ہے اور تم اپنا یہ ڈھیر سارا حسن مشقت کی بھٹی میں جلا کر خاک کرنے کا فیصلہ کر چکی ہو۔ میری مانو تو اپنے اس فیصلے پر غور کر لو۔'' جمیلہ نے اسے مشورہ دیا۔

''میں کیا کروں؟'' بے ساختہ ہی اس کے لبوں پر سوال پھسل گیا۔

''پہلے تو تم میری یہ بات سمجھ لو کہ تم کتنی ہی لائق فائق کیوں نہ ہو جاؤ اور کچھ بھی کیوں نہ کر لو، جب یہاں سے نکل کر باہر کی دنیا میں جاؤ گی تو باہر بیٹھے بھیڑیے تمہیں ہڑپ کرنے کو تیار ہوں گے اور تم بہت کوشش کر کے بھی خود کو ان سے نہیں بچا سکو گی۔''

''پھر......؟'' دوسری بار بھی اس نے بے ساختگی میں ہی سوال کیا۔

''تو پھر بہتر یہ ہے کہ جب لٹنا ہی ٹھہرا تو اپنی شرائط پر لٹو، کم از کم تمہیں یہ فائدہ تو ہو کہ تمہیں اس لٹنے کی اچھی قیمت مل سکے۔'' جمیلہ اسے کوئی اور ہی راہ دکھا رہی تھی۔

''اور مجھے یہ اچھی قیمت کون دلوائے گا؟'' اپنے غصے کو اندر ہی اندر دباتے ہوئے اس نے جمیلہ سے پوچھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس پر کوئی اہم انکشاف ہونے والا ہے۔

''میں اور کون؟ میرے بڑے اونچے لوگوں سے تعلقات ہیں۔ یہاں کی جو بھی لڑکی نوٹ کمانا چاہتی ہے، میں اس کی مدد کرتی ہوں۔ تمہارے حالات کو دیکھ کر مجھے تم پر ترس آ گیا اور سوچا کہ تم کہاں چند ٹکے کمانے کے لیے ساری جوانی رولتی رہو گی۔ اتنی خوب صورت ہو، اپنی خوب صورتی کے دام کھرے کرو۔ راستہ میں دکھاؤں گی۔'' وہ نیچی آواز میں اسے جو کچھ سمجھا رہی تھی، اسے سمجھ کر اسے اس عورت سے گھن آ رہی تھی لیکن مزید جاننے کی خواہش میں خود پر ضبط کیے رہی۔

''مگر یہاں تو میڈم نیازی کی بڑی سختی ہے۔ وہ ساری عورتوں پر بڑا کنٹرول رکھتی ہیں۔'' اس نے جیسے اپنی الجھن کا اظہار کیا۔ جمیلہ قہقہہ مار کر ہنس دی اور بولی۔

''اس کی تم فکر مت کرو۔ میڈم کی نظروں سے بچنا ہمیں خوب آتا ہے۔ وہ کتنی بھی سخت سہی لیکن ہیں تو انسان نا۔ چوبیس گھنٹے کی نگرانی کرنا تو ان کے بس میں نہیں ہے۔''

''پھر بھی...... تم یہ سب کیسے کر لیتی ہو؟ وہ تو آنے جانے کے اوقات پر بھی کڑی نظر رکھتی ہیں۔'' اس نے جمیلہ کو ٹٹولا۔

''پہلے تم میرے ساتھ کام کرنے کی ہامی تو بھرو پھر تمہیں ہمارے طریقے کا بھی پتا چل جائے گا۔'' جمیلہ نے اسے اپنا راز نہیں دیا۔

''مجھے ڈر لگتا ہے۔'' اس نے جان بوجھ کر جھجک کا مظاہرہ کیا۔

''ارے ڈر کیسا؟ میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔'' جمیلہ نے اسے حوصلہ دیا۔

''میں...... سوچوں گی۔'' اس نے تذبذب کا مظاہرہ کرتے ہوئے جمیلہ کو جواب دیا۔

''چلو جیسی تمہاری مرضی۔ اچھی طرح سوچ کر جواب دینا۔ میں تو بس اتنا کہوں گی کہ میری مان کر تم عیش کرو گی عیش۔'' جمیلہ جاتے جاتے بھی اسے لالچ دے کر گئی۔ اس نے جمیلہ کی بات ڈھنگ سے سنی بھی نہیں۔ وہ کسی بہت گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

☆☆☆

بہزاد احمد شازیہ کی خواہش سن کر حیران رہ گئے۔ انہیں اپنی بہن سے یہ توقع نہیں تھی جب ہی تو فوراً کوئی جواب نہ دے سکے۔

''آپ چپ کیوں ہیں بھائی؟'' شازیہ نے ان کی خاموشی پر انہیں ٹوکا۔

''اصل میں تمہاری خواہش میری توقع کے بالکل برخلاف ہے۔ مجھے بالکل بھی امید نہیں تھی کہ تم مونا کو چھوڑ کر

عروبہ کے لیے سوال کرو گی۔'' انہوں نے اپنے دل کی بات بہن سے کہہ دینے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔

''عروبہ بھی تو آپ ہی کی بیٹی ہے بھائی۔ میں نے آپ کو دونوں بچیوں کے درمیان کبھی فرق کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔'' شازیہ کی بات پر بہزاد احمد گڑبڑا گئے اور بولے۔

''وہ تو ٹھیک ہے۔ سلیمہ نے جس خوبی سے میرے گھر اور بچی کو سنبھالا، میرا بھی فرض بنتا تھا کہ میں اس کی بیٹی کو باپ کا پیار دوں لیکن تمہارا معاملہ تو مختلف ہے۔ تمہاری سگی بھتیجی تو مونا ہی ہے اور تم نے ہمیشہ مونا ہی سے زیادہ پیار کیا ہے۔ ایسے میں، میں کیسے توقع کر سکتا تھا کہ تم عروبہ کو مونا پر ترجیح دو گی۔'' بہزاد احمد بے شک اچھے آدمی تھے لیکن فطری طور پر انہیں اپنی سگی بیٹی سے زیادہ پیار تھا اور ان کے دل میں یہی چاہ تھی کہ ان کی بہن اپنے قابل اور خوش شکل بیٹے کے لیے مونا کا ہاتھ مانگتی لیکن اس نے عروبہ کے لیے دست سوال دراز کر کے انہیں بری طرح مایوس کر دیا تھا۔

''آپ کی بات اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ مونا واقعی مجھے بہت پیاری ہے۔ اپنا خون ہونے کی وجہ سے میں قدرتی طور پر اس سے بہت پیار کرتی ہوں لیکن عروبہ نے بھی اپنی من موہنی اداؤں سے میرے دل میں اپنی جگہ بنالی ہے۔ وہ بہت محبت کرنے والی بچی ہے۔ اس کے رویے سے ذرہ بھر یہ احساس نہیں ہوتا کہ میں اس کی سگی پھوپی نہیں ہوں۔ سلیمہ بھابی نے اس کی بہت عمدہ تربیت کی ہے۔ بچی کو بالکل اس خاندان کا حصہ بنا دیا ہے۔ ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ وہ گھریلو امور میں بھی طاق ہے جبکہ مونا...... معاف کیجیے گا بھائی جان! آپ نے مونا کو اپنے لاڈ پیار میں کسی لائق نہیں رہنے دیا۔ وہ بہت نازک مزاج ہے اور اتنی نازک مزاج لڑکی کا لندن میں گزارہ نہیں ہو سکتا۔ وہاں لائف بہت ٹف ہے۔ یہاں کی طرح عورتیں گھر میں بیٹھ کر عیش نہیں کر سکتیں۔ وہاں عورت کو بھی کمانے کے لیے باہر نکلنا پڑتا ہے اور گھر بھی سنبھالنا ہوتا ہے۔ یہاں کی طرح وہاں گھر میں ملازم رکھنا آسان نہیں ہوتا۔ میں نے عباس کے لیے مونا کا انتخاب نہ کر کے ایک طرح سے اس کا بھلا ہی کیا ہے۔ یہاں آپ اس کے لیے ایسی ویل آف فیملی میں رشتہ ڈھونڈ سکتے ہیں جہاں نوکر چاکر گھر کا نظام چلاتے ہوں۔ میرے ہاں تو ایسا ممکن ہی نہیں ہے۔ میں نے بہت سمجھ کر آپ سے عباس کے لیے عروبہ کا ہاتھ مانگا ہے۔ اس میں ٹیلنٹ ہے، وہ وہاں کی ٹف لائف میں ایڈجسٹ کر جائے گی اور مجھے بھی یہ اطمینان رہے گا کہ میں بیٹے کے لیے اپنے بھائی کے گھر سے ہی لڑکی لائی ہوں۔ عروبہ سگی نہ سہی پر آپ کی بیٹی تو ہے نا۔'' شازیہ اتنی دلیل سے گفتگو کر رہی تھیں کہ بہزاد احمد انہیں غلط قرار نہیں دے سکتے تھے لیکن ان کے دل میں ملال ضرور تھا جو شکوہ بن کر ان کی زبان پر آ گیا اور اپنی ازدواجی زندگی میں انہوں نے پہلی بار سلیمہ کے خلاف کوئی بات کہی۔ وہ یاسیت سے بولے۔

''یہ تو سلیمہ کی غلطی ہوئی نا۔ اس نے سگی اور سوتیلی بیٹی کی تربیت میں فرق کیوں رکھا۔''

''آپ بالکل غلط سوچ رہے ہیں۔ تربیت کا یہ فرق بھابی کی غلطی نہیں، مجبوری تھی۔'' شازیہ نے فوراً ان کی تردید کی اور مزید بولیں۔ ''بھابی نے مونا کو حتی الامکان ماں کا پیار دیا ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور بوا نے بھی گواہی دی ہے کہ بہت سے معاملات میں وہ مونا کو عروبہ پر فوقیت دیتی ہیں لیکن یہ ان کی مجبوری تھی کہ وہ مونا پر سختی نہیں کر سکتی تھیں۔ ورنہ ان پر روایتی سوتیلی ماں ہونے کا الزام لگ جاتا۔ ایک عورت ہونے کے ناتے میں ان کے احساسات کو سمجھ سکتی ہوں اور میرا خیال ہے کہ ان کے اس رویے میں کچھ نہ کچھ غلطی آپ کی ہے۔ آپ نے انہیں کبھی یہ مان دیا ہی نہیں ہو گا کہ وہ مونا کے ساتھ سگی ماں جیسا برتاؤ کر پاتیں اور اس سے پیار کے ساتھ ساتھ سختی سے بھی پیش آ پاتیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ آپ مونا کے معاملے میں بہت حساس ہیں اور اس کی ہر بات پوری کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ آپ کی دیکھا دیکھی بھابی نے بھی یہی رویہ اختیار کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مونا بس اپنی ذات میں گم رہنے والی اور اپنے آپ کو ہی اہمیت دینے والی شخصیت بن کر رہ گئی ہے۔ میں بے شک اس سے بہت محبت کرتی ہوں لیکن مجھے اپنے بیٹے سے بھی تو محبت ہے اس لیے میں نے اس کے لیے وہی منتخب کیا جو بہترین تھا۔'' سلیمہ کی صفائی دیتے دیتے شازیہ اچھی خاصی صاف گوئی کا مظاہرہ کر گئیں۔ بہزاد احمد کے پاس اب کچھ بھی کہنے کی گنجائش نہیں تھی اس لیے تھکن زدہ لہجے میں اتنا ہی بولے۔

''تمہارے بیٹے کے لیے انکار کا میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ میرے لیے اس کی ہر خوبی سے بڑھ کر یہ اہم ہے کہ وہ تمہارا بیٹا ہے لیکن عروبہ کے لیے حتمی فیصلہ سلیمہ ہی کر سکتی ہے۔ ابھی تو اسے اپنا کیریئر بنانا ہے۔ وہ پڑھائی کو بہت زیادہ سیریس لینے والی بچی ہے۔''

''مجھے بھی شادی کی جلدی نہیں ہے۔ عباس کو اسٹیبلش ہونا ہے۔ فی الحال میں یہاں سے منگنی کر کے جاؤں گی۔

شادی مناسب وقت آنے پر کرلیں۔" وہ سب کچھ سوچ کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ بہزاد احمد بس ان کی صورت دیکھ کر رہ گئے۔

☆☆☆

"کچھ کچھ شک مجھے بھی تھا لیکن کبھی کھل کر ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی اس لیے میں کچھ کر بھی نہیں سکی۔ اچھا ہوا کہ تم نے مجھے یہ سب بتادیا۔ اس سے کم از کم میرے سامنے ایک نام تو آ گیا ہے۔ میں اس جمیلہ کی بچی سے اچھی طرح نمٹ لوں گی۔" اس نے اگلے ہی دن میڈم نیازی سے ملاقات کرکے انہیں جمیلہ سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کردیا تھا اور ان کا یہ جوابی تبصرہ اس کی دی ہوئی اطلاع پر ہی تھا۔

"میرا خیال ہے میڈم، آپ جمیلہ کو ڈائریکٹ مت چھیڑیں۔ آپ اس سے کچھ کہیں گی تو وہ صاف مکر جائے گی۔ آپ کو اسے ثبوت کے ساتھ پکڑنا چاہیے تاکہ واضح ہوجائے کہ یہاں اس کے ساتھ اور کون کون انوالو ہے۔" اس نے میڈم نیازی کو مشورہ دیا۔

"ثبوت حاصل کرنا اتنا آسان نہیں ہوگا۔" وہ متفکر ہوگئیں۔

"میں اس کام میں آپ کی مدد کرسکتی ہوں۔ میں جمیلہ کو تاثر دوں گی کہ مجھے اس کی آفر پسند آئی ہے اور جب وہ مجھے اپنے ساتھ شامل کرلے گی تو مجھے معلوم ہوجائے گا کہ اس کے ساتھ اور کون کون شامل ہے۔ یقیناً یہاں کی انتظامیہ میں سے بھی کچھ لوگ اس کے مددگار ہوں گے۔ تب ہی تو وہ یہ سارا سیٹ اپ چلا رہی ہے۔" اس نے انہیں تجویز دی۔

"تجویز تو تم نے اچھی بتائی ہے لیکن سوچ لو کہ اس میں بہت رسک ہے۔ تم کسی مشکل میں بھی پڑسکتی ہو۔" میڈم نیازی نے اسے سمجھایا۔

"میں سمجھتی ہوں میڈم لیکن یہاں سے گندگی کو صاف کرنے میں آپ کی مدد کرکے مجھے خوشی ہوگی۔ اس دارالامان نے مجھے میری زندگی کے بہت کڑے وقت میں پناہ دی ہے۔ اس کا مجھ پر حق ہے اور میں چاہتی ہوں کہ میرے بعد جو بھی مصیبت زدہ عورت یہاں آئے، اسے بالکل صاف ستھرا ماحول ملے۔ میں آپ کے احسان کا بدلہ دینے کے لیے بھی یہ رسک لینے کو تیار ہوں۔ آپ اتنی دیانت اور محنت سے یہ جاب کررہی ہیں لیکن جمیلہ جیسی عورتوں کی وجہ سے آپ کی نیک نامی پر بھی حرف آتا ہوگا۔ بہتر ہے کہ ایسے عناصر کا قصہ ہی تمام کردیا جائے۔" وہ بہت پُرعزم تھی۔

"مجھے تمہارے خیالات جان کر خوشی ہوئی امینہ لیکن میں تمہیں یہی مشورہ دوں گی کہ جو کچھ کرنا بہت سوچ سمجھ کر اور پوری ہوشیاری سے کرنا۔ ایسے لوگ بہت خطرناک ہوتے ہیں۔"

"میں اس بات کو سمجھتی ہوں میڈم، بس مجھے آپ کی اجازت کی ضرورت تھی۔"

"میری طرف سے اجازت ہے لیکن تم مجھے پوری طرح باخبر رکھنا اور خود کو غیر ضروری خطرات میں مت ڈالنا۔" انہوں نے اسے ہدایات دیں۔

"ٹھیک ہے میڈم! فی الحال تو آپ مجھے اجازت دیں۔ میرا ٹیوشنز کے لیے نکلنے کا وقت ہوگیا ہے۔" اس نے میڈم نیازی سے اجازت چاہی۔ اسے بس میں جانا پڑتا تھا اس لیے اچھا خاصا وقت لگ جاتا تھا۔ دو گھروں میں ٹیوشن پڑھا کر جب وہ تیسرے گھر میں پہنچتی تھی تو شام ہونے لگتی تھی، اچھی بات یہ تھی کہ تینوں گھر شہر کے ایک ہی علاقے میں تھے اور وہ پیدل ہی ایک گھر سے دوسرے گھر تک چلی جاتی تھی۔ آج بھی وہ دونوں گھر نمٹا کر تیسرے گھر میں پہنچی تو وہاں ٹیوشن پڑھنے والی واحد بچی سونیا پڑھنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

"میں آج چھٹی کروں گی مس۔ میرے ماما بہت دن بعد ملنے آئے ہیں۔ آج میں ان کے ساتھ اپنا ٹائم اسپینڈ کروں گی۔" اس نے اسے فیصلہ سنایا۔

"لیکن اپنا ہوم ورک تو کرلو۔" بچی کے کہنے پر اسے پڑھائے بغیر لوٹنے کے لیے وہ تذبذب کا شکار تھی۔

"رہنے دیں مس امینہ! آج یہ آپ کی بالکل نہیں سنے گی۔ اپنے ماموں کی دیوانی ہے لیکن وہ بہت مشکل سے اپنی شکل دکھاتا ہے اس لیے اس کی موجودگی میں فل ٹائم انجوائے کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ہوم ورک میں بعد میں، اس کے ماموں کے جانے کے بعد کروالوں گی۔"

سونیا کی ممی ہنستی ہوئی وہاں چلی آئیں اور اسے مشکل سے نکالا۔ اب بھلا اسے کیا اعتراض ہوتا۔ اسے بھی نور فاطمہ کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کا موقع مل جاتا چنانچہ سونیا اور اس کی ممی کو اللہ حافظ کہہ کر وہاں سے روانہ ہوگئی۔ سونیا کے گھر کے گیٹ سے نکلتے ہوئے اسے خبر نہیں تھی کہ کسی کی حیران نظریں اس کے وجود پر ٹکی ہوئی ہیں۔

☆☆☆

"اُف مما! یقین نہیں آتا کہ میری عباس سے انگیجمنٹ ہوگئی ہے۔ کتنی شاندار پرسنالٹی ہے نا عباس کی۔ میں اس کے ساتھ لندن چلی جاؤں گی تو کتنا مزہ آئے گا۔ میں نے سوچ لیا ہے کہ میں گائنی میں اسپیشلائزیشن کروں گی۔ وہاں کی ڈگری کی تو بات ہی الگ ہے۔ آپ دیکھیے گا، میں کتنی بڑی ڈاکٹر بنوں گی اور میرے کتنے ٹھاٹ باٹ ہوں گے۔

میں آپ کو بھی اپنے پاس بلوالوں گی پھر ہم ماں بیٹی مل کر عیش کریں گے۔" کامدار فیروزی میکسی پہنے نفاست سے کیے گئے میک اپ اور خوب صورت جیولری کے ساتھ عروبہ بے حد پیاری لگ رہی تھی اور اپنی انگلی میں موجود ڈائمنڈ رنگ کو دیکھتے ہوئے مسلسل سلیمہ سے اپنی خوشی کا اظہار کررہی تھی۔ اپنا بنا سنورا روپ اسے اتنا اچھا لگ رہا تھا کہ تقریب کا اختتام ہوجانے کے باوجود اس نے ابھی تک اپنا لباس تبدیل نہیں کیا تھا۔

"یہ سب میری حکمتِ عملی کی وجہ سے ہے بیٹا جی۔ میں نے تمہیں یہ مقام دلانے کے لیے بہت جدوجہد کی ہے۔ اگر میں نے سمجھداری سے کام نہ لیا ہوتا تو آج شازیہ بیگم اپنی سگی بھتیجی کی جگہ تمہیں اپنے بیٹے کے لیے منتخب نہیں کرتیں۔ تم کتنا چڑتی تھیں کہ میں مونا کو تم سے زیادہ اہمیت دیتی ہوں اور اس پر اتنی سختی نہیں کرتی جتنی تم پر کرتی ہوں۔ دیکھ لو میری سختی کا آج تمہیں ہی فائدہ ہوا ہے۔ میں بھی خوش ہوں کہ میرے اتنے سالوں کی محنت رائگاں نہیں گئی اور تمہارا عباس جیسے ہینڈسم لڑکے سے رشتہ طے ہوگیا ہے۔ اب تم آرام سے اپنی پڑھائی کرو، آگے بھی ایک روشن مستقبل تمہارا منتظر ہے۔" سلیمہ نے اسے خود سے لگا کر پیار کرتے ہوئے کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی اور بولی۔

"سچ مچ مما! آپ بہت جینئس ہیں۔ مجھے تو یہ سوچ سوچ کر ہی خوشی ہورہی ہے کہ میں فیوچر میں کتنا اونچا مقام حاصل کرنے والی ہوں اور مونا بے چاری زیادہ سے زیادہ ایم بی بی ایس ہی کرسکے گی۔"

"اس کے باپ کے پاس بہت پیسا ہے، وہ اسے اپنے خرچے پر اسپیشلائزیشن کے لیے بھیج سکتے ہیں۔" سلیمہ نے منہ بنا کر کہا۔

"تو آپ کس لیے ہیں۔ آپ وہ وقت آنے سے پہلے ہی مونا کی کہیں شادی کروا دیجیے گا۔ وہ بھی کسی ایسی فیملی میں جہاں اسے سانس لینے کا موقع ہی نہ مل سکے۔ سسرال کے جھمیلوں میں پڑے گی تو ساری ڈاکٹری بھول جائے گی۔" آج عروبہ کی ہنسی نہیں رک رہی تھی۔

"ہاں، ایسا ہی کچھ کرنا پڑے گا۔ اسے اپنی بیٹی کی برابری تو بہرحال میں نہیں کرنے دوں گی۔ اس کے پاس پہلے ہی بہت کچھ ہے۔ بہزاد کی تمام پراپرٹی کی بھی شرعاً اور قانوناً وہی حق دار ہے اس لیے اتنا تو تمہارا حق بنتا ہے کہ تمہیں اس سے اچھا لائف پارٹنر ملے اور تم اس سے بہتر پوزیشن پر رہو۔" سلیمہ کے دل میں بھی سوتیلی بیٹی کے خلاف جذبات تھے۔ ماں بیٹی دونوں کو بہزاد کی مہربانیوں سے زیادہ یہ بات یاد رہی تھی کہ ان کی اس گھر میں ثانوی حیثیت تھی اور ہر چیز پر ان سے زیادہ مونا کا حق تھا۔ اپنی اس گفتگو میں مگن انہیں احساس بھی نہیں ہوسکا تھا کہ کب مونا کمرے کے دروازے تک آئی اور اس نے ان کی ساری گفتگو سن لی بلکہ وہ اب بھی کھڑی سب سن رہی تھی، عروبہ کہہ رہی تھی۔

"ڈونٹ وری مما۔ آپ دیکھیے گا میں مونا سے کتنی اچھی لائف گزاروں گی۔ پاپا ایسے ہی اسے اپنی ساری پراپرٹی نہیں دے دیں گے۔ میں اس میں سے بھی اپنا حصہ نکلوا ہی لوں گی۔ آپ کو پتا ہے نا کہ مجھے پاپا سے اپنے کام نکلوانا کتنی اچھی طرح آتا ہے۔ پاپا بے شک محبت مونا سے زیادہ کرتے ہیں لیکن لائک تو وہ بھی مجھے ہی زیادہ کرتے ہیں۔ ابھی تو مجھے اور مونا کو چند سال اور ساتھ رہنا ہے۔ جیسے

تقسیم نہیں ضرب

اشفاق احمد کا مطالعہ و مشاہدہ بہت گہرا تھا۔ وہ ماحول اور انسانوں کا بغور مشاہدہ کرتے تھے اور چھوٹی چھوٹی باتیں نوٹ کرلیتے تھے۔ ایک بار وہ باغ میں اپنے نوعمر بیٹے کے ساتھ بیٹھے تھے۔ بچہ کھیل رہا تھا، باغ کے مالی نے دیکھا تو نزدیک آیا اور پوچھا۔ "بابو جی یہ آپ کا بچہ ہے؟"

"جی ہاں۔" انہوں نے کہا۔

"اللہ رکھے بہت پیارا بچہ ہے، ایسے بچوں سے تو ہر بندہ پیار کرتا ہے۔"

اشفاق صاحب نے پوچھا۔ "آپ کے ماشاءاللہ کتنے بچے ہیں؟"

"جی میرے دس بچے ہیں۔"

اشفاق صاحب حیرت سے بولے۔ "کمال ہے، آپ اتنے بہت سارے بچوں میں اپنا پیار کیسے تقسیم کرسکتے ہو؟"

مالی نے جواب دیا۔ "بابو جی پیار کو تقسیم نہیں کرتے۔ اس کو ضرب دیا کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ تو چلا گیا مگر اشفاق صاحب بیٹھے سوچتے رہے کہ ایک اَن پڑھ مالی کتنی بڑی بات کہہ گیا ہے۔

مرسلہ: تفسیر عباس بابر، اوکاڑہ

میں نے اسے اسکول میں چور بنادیا تھا' ایسے ہی آگے بھی اس کے ساتھ بہت کچھ کرسکتی ہوں، بس آپ دیکھتی رہیں۔''

عروبہ کے لہجے میں گہرا اعتماد تھا۔سب سنتی مونا کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ دل چاہا کہ ابھی ان ماں بیٹی کے سامنے جاکھڑی ہو اور انہیں اتنی باتیں سنائے کہ پورا گھر جمع ہوجائے لیکن پھر فوراً ہی اسے احساس ہوگیا کہ ایسا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ وہ دونوں جو اتنے سالوں سے سب کو بےوقوف بناتی آرہی ہیں' اب بھی بات کو اپنے حق میں کرلیں گی۔ وہ الٹا اسی پر الزام لگاسکتی تھیں کہ وہ عروبہ کی منگنی عباس سے ہوجانے کے باعث، حسد کی وجہ سے ان پر جھوٹا الزام لگا رہی ہے اور یقیناً دوسرے لوگ اس... الزام پر یقین بھی کرلیتے اس لیے ایسی کوئی حماقت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ فوراً وہاں سے ہٹ گئی اور اپنے کمرے میں آکر سوچنے لگی کہ اسے ان ماں بیٹی کو ان ہی کے سکوں میں ادائیگی کرنی ہوگی۔ وہ دونوں آج تک اسے احمق بناتی رہی تھیں لیکن اسے انہیں بتانا ہوگا کہ وہ اتنی احمق بھی نہیں تھی۔ آج کا دن ویسے ہی اس کے لیے بہت بھاری تھا۔ عباس کی عروبہ سے منگنی اس کے لیے ایک بڑا صدمہ ثابت ہوئی تھی۔ عباس کی شاندار پرسنالٹی نے اس کے دل پر بھی اثر کیا تھا۔ وہ کبھی کبھار اس سے فون پر بھی بات کرلیتی تھی اور نیٹ پر بھی وہ دونوں رابطے میں رہتے تھے اس لیے اسے پتا تھا کہ پھپو اس بار عباس کا رشتہ طے کرنے کی نیت سے یہاں آرہی ہیں۔ قدرتی طور پر اس کا خیال تھا کہ پھپو کا انتخاب وہ خود ہوگی لیکن انہوں نے عروبہ کو منتخب کرکے اسے شدید مایوس کیا تھا۔ وہ عباس سے بھی شکوہ نہیں کرسکی تھی کہ اس نے کبھی اس سے اس طرح کی کوئی بات نہیں کی تھی، بس وہ خود ہی امید باندھ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک طرف اس کی وہ امید ٹوٹی تھی تو دوسری طرف سوتیلی ماں پر کیا جانے والا بھروسا بھی ٹوٹ گیا تھا۔ سلیمہ کے برتاؤ کی وجہ سے وہ ان پر اعتماد کرنے لگی تھی اور انہیں اپنی ماں کی جگہ قبول کرلیا تھا لیکن آج اسے پتا چلا تھا کہ وہ صرف عروبہ کی ماں تھیں جو اپنی بیٹی کی جگہ بنانے کے لیے اس کی ماں بننے کا ناٹک کرتی رہی تھیں۔ عباس کو نہ پاسکنے کا دکھ تو وہ شاید کسی نہ کسی طرح سہہ ہی جاتی لیکن سلیمہ کے دھوکے کو سہنے کے لیے بالکل بھی تیار نہیں تھی۔

☆☆☆

''مجھے معلوم تھا کہ تم میری بات ضرور مانو گی۔ تم شکل ہی سے عقل مند لڑکی لگتی ہو۔ اب دیکھنا میں تمہیں کیسے عیش کرواتی ہوں۔ تھوڑے سے عرصے میں اتنا کمالوگی کہ یہ ٹیوشنیں ویوشنیں پڑھانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔'' اس نے جمیلہ کو اپنی آمادگی سے آگاہ کیا تو وہ خوش ہوگئی اور اسے سہانے خواب دکھانے لگی۔

''بس تم پر بھروسا کررہی ہوں، خیال رہے کہ پھنسوا مت دینا۔ اگر میڈم نیازی کو پتا چل گیا تو وہ مجھے اور میری بچی کو یہاں سے دھکے دے کر نکال دیں گی۔ بڑی سخت عورت ہیں وہ۔'' اس نے جمیلہ کے سامنے خدشات کا اظہار کیا۔

''ارے نہیں پھنسو گی۔ ہمارا انتظام پکا ہے۔ اتنے عرصے سے میں یہ کام کررہی ہوں۔ آج تک تم نے یہاں کسی کو پھنستے دیکھا ہے۔'' جمیلہ نے بےفکری سے قہقہہ لگایا۔

''تم پر بھروسا کرنے کا دل تو چاہتا ہے لیکن میڈم نیازی سے ڈر بھی لگتا ہے۔ یہاں ان کا اتنا کنٹرول ہے۔ سارا اسٹاف ان کا وفادار ہے، کہیں کسی نے شکایت کردی تو......'' وہ اپنے انداز سے ایسا ظاہر کررہی تھی جیسے بہت سہمی ہوئی ہو۔

''فکر نہ کرو۔ ہمیں وفاداروں میں سے غدار پیدا کرنے کا ہنر آتا ہے۔ تم کوئی پہلی لڑکی تھوڑی ہو جو یہ کام کروگی۔ سلمٰی، زاہدہ، شبنم یہ سب بھی تو ہیں۔ تم نے آج تک ان کے بارے میں کسی سے کچھ سنا؟ ہم رازداری کا پورا خیال رکھتے ہیں۔'' جمیلہ نے اسے تسلی دینے کے لیے اپنے ساتھ شامل دوسری عورتوں کے نام بتائے۔

''وہ جو چوکیدار گیٹ پر نائٹ ڈیوٹی دیتا ہے، وہ تو بڑا کڑک آدمی ہے۔ اس کی نظروں سے بچ کر تو کوئی مکھی بھی یہاں سے باہر نہیں نکل سکتی پھر کوئی عورت کیسے نکل سکتی ہے؟'' وہ بڑے سلیقے سے جمیلہ سے سارے راز اگلوا رہی تھی۔

''وہ......'' جمیلہ ہنسی۔ ''وہ تو اپنا خاص بندہ ہے۔ فی لڑکی ٹھیک ٹھاک کمیشن لیتا ہے لیکن اتنی صفائی سے لڑکیوں کو اندر باہر کرتا ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوپاتی۔ میں بھی احتیاط کرتی ہوں اور ایک وقت میں دو سے زیادہ لڑکیوں کو باہر نہیں بھیجتی کہ کسی کو کمی محسوس ہو۔''

''لیکن رضیہ آپا تو روزانہ رات کو ہر کمرے کا راؤنڈ لگاتی ہیں۔ انہیں پتا نہیں چلتا کیا کہ کوئی عورت غائب ہے؟'' اس نے حیرانی کا اظہار کیا۔

''اس بڈھی کو چکمہ دینا ہمیں اچھی طرح آتا ہے۔ ہم جتنی بھی اس کام میں شریک ہیں، سب ایک ہی کمرے میں رہتی ہیں۔ رضیہ راؤنڈ مارنے آتی ہے تو جانے والی کی جگہ تکیے رکھ کر چادر اوڑھا دیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ آج وہ جلدی سوگئی ہے۔ یا پھر اس کے باتھ روم جانے کا بہانہ

کردیتے ہیں۔ رضیہ آسانی سے بدھو بن جاتی ہے۔'' جمیلہ اسے ہر طرح سے اطمینان دلا رہی تھی۔

''لیکن میں کیسے جاسکوں گی؟ ایک تو میں اکیلے کمرے میں رہتی ہوں پھر میرے ساتھ چھوٹی بچی بھی ہوتی ہے۔ وہ نیند سے اٹھ کر روئی تو سب کو پتا چل جائے گا۔'' اس نے ایک اور خدشہ ظاہر کیا۔

''اس مسئلے کا حل بھی میں نے سوچ لیا ہے۔ تم میڈم سے کہہ کر ہمارے کمرے میں شفٹ ہوجاؤ۔ ہم لوگ سب سنبھال لیں گے۔ بچی کا کیا ہے، اسے تھوڑی سی نیند کی دوا پلادی تو رات بھر بےخبر سوتی رہے گی۔'' جمیلہ کا منصوبہ پوری طرح تیار تھا۔ اس نے دل ہی دل میں اس شاطر عورت کو برا بھلا کہا جو اپنے فائدے کے لیے معصوم بچی کو بھی بخشنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

''میں میڈم سے بات کروں گی۔'' اس نے بجھے ہوئے لہجے میں جمیلہ سے کہا۔

''جلدی بات کرلینا۔ میں نے تمہارے لیے بڑے اونچے کسٹمرز ڈھونڈ رکھے ہیں۔ تم اتنی خوب صورت ہو، تھوڑی سی محنت کروگی تو اپنے کسٹمرز سے طے شدہ ریٹ کے علاوہ بھی مال نکلوا سکتی ہو۔''

''میڈم سے تو میں آج ہی بات کرلوں گی۔ ویسے بھی رضیہ آپا کہہ رہی تھیں کہ ایک اسٹور کی ضرورت ہے۔ میڈم شاید میرے کمرے کو ہی اسٹور بنادیں۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ تم جس دن ہمارے والے کمرے میں شفٹ ہوئیں، سمجھو اسی دن سے تمہارا بزنس اسٹارٹ ہوجائے گا۔ اچھا ہے کہ جلدی جلدی مال پانی بنالو۔'' جمیلہ اسے مسلسل لالچ دے رہی تھی۔ اس نے بھی جمیلہ پر یہی ظاہر کیا کہ وہ لالچ کے اس جال میں پھنس چکی ہے۔ میڈم نیازی اس منصوبے میں اس کے ساتھ تھیں، چنانچہ سب کچھ تیزی سے ہوتا چلا گیا اور وہ وقت آگیا جب وہ جمیلہ کے خیال کے مطابق اس کے تلاش کردہ کسٹمر کے ساتھ روانہ ہونے والی تھی۔

''مجھے ڈر لگ رہا ہے جمیلہ۔ میں اکیلی باہر نہیں جاسکتی۔ تم میرے ساتھ چلنا۔'' اس نے نور فاطمہ کو فیڈر دے کر سلایا اور جمیلہ سے بولی۔ جمیلہ کو اس نے اطمینان دلادیا تھا کہ وہ بچی کو دودھ میں اس کی دی ہوئی دوا ملا کر پلا چکی ہے۔

''ڈرنے کی کیا بات ہے۔'' جمیلہ حسبِ عادت زور سے ہنسی۔ اس کی ساتھیوں نے بھی اس کا ساتھ دیا لیکن پھر ان میں سے شبنم نامی عورت بولی۔

''پہلی بار ہے نا اس لیے ہول آرہے ہیں۔ آہستہ آہستہ پکی ہوجائے گی۔''

''ہاں، یہ تو ہے۔ چلو ٹھیک ہے، آج میں تمہارے ساتھ چلوں گی اور تمہیں باہر گاڑی میں بٹھا کر واپس آجاؤں گی۔'' جمیلہ نے اس سے کہا۔ پھر مخصوص وقت پر وہ اسے اپنے ساتھ لے کر نکلی۔ اس وقت سب عورتیں اپنے اپنے کمروں میں ہوتی تھیں اس لیے کسی کو کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔ وہ دونوں گیٹ پر پہنچیں تو چوکیدار نے ٹارچ کی روشنی ڈال کر ان کے چہرے دیکھے اور پھر خاموشی سے گیٹ کھول دیا۔

''میں اسے چھوڑ کر ابھی واپس آتی ہوں۔'' جمیلہ نے باہر نکلتے نکلتے چوکیدار کو بتایا اور اسے اپنے ساتھ لیے ہوئے گیٹ کے دائیں جانب چل دی۔ وہاں ایک سرخ رنگ کی چمچماتی ہوئی مرسیڈیز کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک ادھیڑ عمر سا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں کی سرخی بتا رہی تھی کہ وہ پیے ہوئے ہے۔

''اتنی دیر کردی...... میں دس منٹ سے یہاں کھڑا ہوں۔'' جمیلہ کو دیکھ کر اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں سیٹھ صاحب۔ مال بھی تو ہیرے جیسا لائی ہوں۔'' جمیلہ نے جواب دیا اور اسے کھینچ کر سیٹھ کے سامنے کیا۔ اس نے اپنی نشیلی آنکھوں سے اسے دیکھا اور پسندیدگی کے انداز میں سرہلایا۔

''چل اینہ بیٹھ جا اندر۔ سیٹھ صاحب تجھے خود واپس گیٹ پر چھوڑ جائیں گے۔ چوکیدار اپنا ہی بندہ ہے، وہ تجھے خاموشی سے اندر لے لے گا۔'' جمیلہ نے اسے سیٹھ کے کھولے ہوئے گاڑی کے دروازے کی طرف دھکیلا تو وہ تھوڑا سا گھبرا گئی۔ پروگرام کے مطابق میڈم نیازی کا کچھ پتا ہی نہیں تھا لیکن اسی لمحے وہاں بہت سی روشنیاں جل اٹھیں۔ یہ پولیس والوں کے ہاتھوں میں موجود ٹارچیں تھیں۔ وہ انہیں بہت خاموشی سے گھیر چکے تھے۔

''خبردار...... کوئی بھاگنے کی کوشش نہ کرے ورنہ گولی ماردیں گے۔'' کڑک دار آواز میں جاری کیے گئے اس حکم پر اس نے اطمینان کی سانس لی اور جمیلہ کا ہاتھ جھٹک کر پیچھے ہٹ گئی۔

''جمیلہ کے ساتھ دھوکا...... تجھے اس کی سخت سزا بھگتنی پڑے گی۔'' جمیلہ کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی اور وہ سانپ کی طرح پھنکاری لیکن اسے زیادہ بات کرنے کا موقع نہیں ملا اور ایک لیڈی پولیس کانسٹیبل نے اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی لگا کر اسے آگے کی طرف دھکیلا۔ اندھیرے میں سے کہیں سے میڈم

نیازی بھی برآمد ہوئیں اور انہوں نے اسے گلے لگا لیا۔

”تھینک یو سو مچ امینہ! تمہارے تعاون سے آج میں اپنے ادارے سے یہ گند صاف کرنے میں کامیاب ہوگئی ہوں۔“ ان کے لہجے میں اس کے لیے ستائش تھی لیکن اسے جانے کیا ہوا کہ ڈھیروں آنسو بہاتی چلی گئی۔

☆☆☆

مونا اور عروبہ دونوں نے شروع ہی سے طے کر رکھا تھا کہ وہ کراچی کے کسی میڈیکل کالج میں ایڈمیشن لیں گی۔ بہزاد اور سلیمہ نے ان کی اس خواہش کا احترام کیا اور یوں دونوں بہنیں کراچی چلی آئیں۔ بہزاد کو بچیوں کے آرام اور سہولت کا بہت خیال تھا اس لیے انہوں نے بجائے انہیں ہاسٹل میں داخل کروانے کے، دو کمروں کا ایک چھوٹا سا فلیٹ خرید کر وہاں منتقل کر دیا۔ برسوں کی وفادار ملازمہ بوا ان کے ساتھ تھیں۔ بچے نہ ہونے کے جرم میں طلاق کی سزا پانے والی بوا کا آگے پیچھے کوئی نہیں تھا اس لیے انہیں حیدرآباد چھوڑ کر کراچی آنے پر کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔

مونا اور عروبہ نے فلیٹ کے ایک ایک کمرے پر قبضہ جمایا تو بوا نے لاؤنج میں اپنا ڈیرا ڈال لیا۔ ان کے ہوتے دونوں کو گھر کے کسی کام کی مطلق فکر نہیں تھی۔ کھانا پکانا، صفائی ستھرائی سے لے کر ان کے کپڑے استری کرنے تک بوا ہر کام خود انجام دیتیں۔ پچپن سال سے اوپر ہونے کے باوجود وہ بہت چست اور پھرتیلی تھیں۔ پھر سلیمہ نے انہیں ہدایت بھی کی تھی کہ بچیوں کی پڑھائی بہت سخت اور محنت طلب ہے اس لیے ان کے آرام کا ہر ممکن خیال رکھیں، اس لیے بھی بوا ہر کام خود سمیٹ لیتی تھیں۔

یہاں آنے کے بعد عروبہ نے بھی اپنے سگھڑاپے کے جوہر دکھانا چھوڑ دیے تھے اور پوری تندہی سے پڑھائی میں جت گئی تھی۔ جو تھوڑا بہت وقت بچتا، وہ عباس سے بات چیت میں گزار دیتی۔ نیٹ نے رابطوں کو بہت آسان بنا دیا تھا۔ مونا بھی پہلے کی طرح کبھی کبھی عباس سے بات کر لیتی تھی۔ اس نے اپنے کسی رویّے سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ اسے اپنے بجائے عروبہ سے عباس کا رشتہ جڑنے پر کسی قسم کا رنج ہے۔ اس نے سلیمہ اور عروبہ کے درمیان جو گفتگو سنی تھی، اس پر بھی کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا بلکہ پہلے کی نسبت اس کا رویّہ عروبہ سے اچھا ہو گیا تھا۔ بچپن کے لڑائی جھگڑے تو بڑے ہونے کے بعد ویسے بھی ختم ہو چکے تھے لیکن تکلف کی ایک دیوار سی تھی جو مونا کے مثبت انداز کی وجہ سے آہستہ آہستہ گرتی جا رہی تھی۔ عروبہ نے بھی اس کے اس انداز کو قبول کر لیا تھا۔ اپنے تمام اہم مقاصد میں کامیاب ہونے کے بعد اسے مونا سے محاذ آرائی کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔

اس کے دل میں واحد دراڑ جائداد کے حوالے سے تھی کہ بہزاد احمد کی اصل وارث تو مونا ہی ہوگی لیکن اسے امید تھی کہ اب تک جس طرح وہ بہزاد احمد کا دل جیتتی آئی ہے اور اس نے انہیں جتنی مساوات سے کام لیتے ہوئے دیکھا ہے، تو وہ جائداد میں حصہ دیتے ہوئے بھی اسے یکسر نظرانداز نہیں کریں گے۔ وہ اچھے رزلٹس لا کر انعامات کی صورت میں بھی ان سے بہت کچھ لے سکتی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ فرسٹ پروف امتیازی نمبروں سے پاس کرے گی اور اس کامیابی پر بہزاد احمد سے گاڑی کی فرمائش کرے گی۔ پیچھے اس کی فرمائش پوری کروانے کے لیے سلیمہ بھی موجود ہوتیں، چنانچہ وہ ہمیشہ سے زیادہ محنت اور دل جمعی سے پڑھ رہی تھی۔

محنت مونا بھی کرتی تھی اور اچھے نمبروں سے ہی پاس ہوتی تھی لیکن عروبہ ذہانت میں اس سے دو قدم آگے ہی تھی اس لیے اس کا رزلٹ مونا کے مقابلے میں زیادہ اچھا ہوتا تھا۔ مونا جو عروبہ اور سلیمہ کا کردار کھل جانے کے بعد بہت بے دلی سے پڑھائی کر رہی تھی، ہر وقت عروبہ کو نیچا دکھانے کی ترکیب سوچتی رہتی تھی۔ اس کام کے لیے اس کے پاس وقت کی کمی نہیں تھی۔ انہیں پانچ سال ابھی یہیں رہنا تھا۔ عروبہ اور عباس کی شادی کے بارے میں طے پا چکا تھا کہ عروبہ کی پڑھائی مکمل ہونے کے بعد ہی انجام پائے گی چنانچہ مونا بہت خاموشی سے ان امکانات کا جائزہ لیتی رہی جن کے ذریعے وہ عروبہ کو یکدم ہی خاک چاٹنے پر مجبور کر دے۔ چند ماہ گزرنے کے بعد ہی اسے احساس ہو گیا کہ عروبہ کا حسن ساتھ پڑھنے والے لڑکوں کو اس کی طرف شدت سے متوجہ کرتا ہے۔ اس سے قبل وہ دونوں کبھی مخلوط تعلیمی ادارے میں نہیں پڑھی تھیں اس لیے اس قسم کی صورتِ حال کا سامنا بھی نہیں ہوا تھا۔ یہاں تو ایسا لگتا تھا کہ کلاس کا ہر لڑکا عروبہ سے دوستی کرنے کا خواہش مند ہو۔ وہ کلاس کی سب سے زیادہ ذہین اور حسین طالبہ تھی اس لیے اس کے دیوانوں کی تعداد بھی اسی حساب سے تھی۔ عروبہ اس صورتِ حال سے بھی بہت خوبی سے نمٹ رہی تھی۔ وہ لڑکوں کے ساتھ نہ تو بہت بے تکلفی کا مظاہرہ کرتی تھی اور نہ ہی انہیں یکسر نظرانداز کر رکھا تھا۔ اس نے اپنی منگنی کی خبر بھی سب کو کر رکھی تھی اس لیے بھی متوالوں کو اندازہ تھا کہ یہاں ان کی دال نہیں گل سکے گی۔

پھر بھی ان متوالوں میں سے ایک ایسا تھا جو کسی صورت پیچھے ہٹنے کو تیار نظر نہیں آتا تھا۔ وہ صاف کہتا تھا منگنی ہوئی ہے کوئی

شادی تو نہیں جو توڑی نہ جا سکے۔ میرے پاس ابھی بہت وقت ہے۔ میں ایک نہ ایک دن عروبہ کا دل جیت ہی لوں گا۔

اس متوالے کا نام اطہر تھا۔ وہ امیر خاندان کا تھوڑا ضدی اور بگڑا ہوا لڑکا تھا۔ مونا نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اسے منتخب کر لیا۔ اب وہ جب بھی عباس سے بات کرتی تو اسے اطہر کی دیوانگی کا بھی کوئی قصہ غیر محسوس انداز میں سنا ڈالتی۔ عباس ان قصوں کو سن کر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کرتا تھا لیکن مونا جانتی تھی کہ قطرہ قطرہ پانی گرتا رہا تو پتھر میں سوراخ ہو ہی جائے گا۔ دوسری طرف اس نے اطہر سے بھی دوستی کر لی تھی لیکن یہ دوستی ذرا خفیہ قسم کی تھی۔ اس نے اطہر سے کہا تھا۔

”میں عروبہ کے لیے تمہارے جذبات کی قدر کرتی ہوں اور سمجھتی ہوں کہ وہ خوش نصیب ہے جو تم اسے اتنی شدت سے چاہتے ہو لیکن ساتھ ہی مجھے اس کی بے وقوفی پر بھی افسوس ہوتا ہے کہ وہ کم عمری میں والدین کی پسند سے کی گئی منگنی کی خاطر تمہیں نظرانداز کر رہی ہے۔ میرے خیال میں اگر تم مستقل مزاجی سے کوشش کرتے رہو تو ایک دن اس کا دل جیت ہی لو گے۔ اس سلسلے میں، میں بھی تمہاری مدد کروں گی لیکن چپکے سے ورنہ عروبہ ناراض ہو جائے گی کہ میں اس کی بہن ہو کر تمہارا ساتھ کیوں دے رہی ہوں۔“ اطہر اس کے اس تعاون پر کھل اٹھا تھا اور اسے یقین دلایا تھا کہ وہ کبھی عروبہ کو احساس نہیں ہونے دے گا کہ مونا اس کی دوست بن چکی ہے۔ اس دوستی کا ہی کمال تھا کہ جب عروبہ اپنی سالگرہ والے دن کالج پہنچی تو ایک حیرت اس کی منتظر تھی۔ پوری کلاس گلاب کے پھولوں سے سجی ہوئی تھی اور میز پر کوئی پانچ فٹ اونچا اہرام کی شکل کا کیک سجا ہوا تھا۔

ساتھی طلبہ نے اس کی آمد پر تالیاں بجا کر اس کا استقبال کیا اور پھر اطہر علی نے سالگرہ کی مبارک باد دیتے ہوئے اس سے کیک کاٹنے کی درخواست کی۔ ان کی پہلی کلاس لینے والی مسز ترمذی بھی اس وقت وہاں پہنچ چکی تھیں۔ ان کی موجودگی میں عروبہ کوئی احتجاج نہیں کر سکی اور چھری پکڑ کر بادلِ ناخواستہ کیک کاٹا۔ کیک اتنا بڑا تھا کہ ان کی پوری کلاس نے دل بھر کر کھایا پھر بھی بہت سا بچ گیا اور پورے کالج میں بٹتا رہا۔ اس روز کئی لوگوں نے اسے روک کر سالگرہ کی مبارکباد دی اور ساتھ ہی اطہر کی دریادلی کو بھی سراہا کہ اس نے عروبہ کی سالگرہ کے لیے اتنا بڑا اور شاندار کیک بنوایا تھا۔ عروبہ کو خود بھی اندازہ تھا کہ اس قسم کا کیک بنوانے کے لیے اطہر علی نے ہزاروں روپے خرچ کیے ہوں گے چنانچہ گھر جانے سے پہلے آخرکار اس سے الجھ ہی پڑی۔

”تمہیں کیا ضرورت پڑی تھی اتنا کنگ سائز کیک بنوانے کی؟ خوامخواہ سارے کالج میں شہرت ہو گئی ہے۔ لوگ پتا نہیں کیا کیا گمان کر رہے ہوں گے۔“

”تمہاری سالگرہ تھی، میں معمولی کیک کیسے بنواتا۔ یوں بھی مجھے معلوم ہے کہ تم میرا کوئی تحفہ قبول نہیں کرو گی اس لیے کیک ہی شاندار سا بنوا دیا۔ رہی لوگوں کے گمان کی بات تو تمہارا اس سے کیا جاتا ہے۔ تم تو جس کے نام کی انگوٹھی پہنے ہوئے ہو اسی کی وفادار رہو گی۔ لوگوں کے گمان پر ہی خوش ہونے دو۔ تمہارا اور میرا نام ایک ساتھ لیا جا رہا ہے، یہ سن کر مجھے کتنا اچھا لگ رہا ہے تم اندازہ نہیں کر سکتیں۔“ اطہر نے اس کے اعتراض کا جو جواب دیا تھا، وہ اسے سن کر تلملا گئی تھی لیکن زیادہ کچھ کہنے کے بجائے صرف ”شٹ اپ“ کہہ کر وہاں سے ہٹ گئی۔

مونا اس صورتِ حال پر بہت خوش تھی بلکہ کسی حد تک اس کی ذمے دار بھی تھی کہ اسی نے اطہر کو عروبہ کی سالگرہ کے دن سے مطلع کر کے اس کے ساتھ یہ ساری منصوبہ بندی کی تھی۔ اس روز گھر آ کر بھی عروبہ کا موڈ تھوڑا سا خراب رہا تھا۔ مونا نے اسے تسلی دی اور بولی۔

”وہ عاشقی کا کھیل کھیل رہا ہے تو تمہیں ٹینشن لینے کی کیا ضرورت ہے۔ تم اپنی راہ پر چلتی رہو، ایک دن خود ہی تمہارا پیچھا چھوڑ دے گا۔“ عروبہ کو اس کا یہ مشورہ درست لگا اور وہ اپنا موڈ ٹھیک کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

”سب باتوں کو چھوڑو، یہ بتاؤ کہ عباس نے تمہیں برتھ ڈے وش کیا یا نہیں؟“ مونا نے بظاہر اس کا موڈ مزید بہتر کرنے کے لیے اس سے پوچھا۔

”اس نے تو رات بارہ بجتے ہی مجھے وش کر دیا تھا۔ نیٹ پر اتنے خوب صورت برتھ ڈے کارڈز بنا کر مجھے سینڈ کیے ہیں کہ بتا نہیں سکتی بلکہ آؤ تمہیں دکھاتی ہوں۔“ عروبہ جوش میں اسے اپنے اسمارٹ فون پر عباس کے وائس ایپ میسیجز وغیرہ دکھانے لگی۔ عباس نے جن الفاظ میں عروبہ کو مخاطب کیا تھا اور جس طرح اس کے نام کے ساتھ اپنا نام لکھا تھا، وہ مونا کے تن بدن میں آگ لگا گیا لیکن وہ خاموشی سے سب دیکھتی رہی اور پھر پوچھا۔

”کوئی گفٹ نہیں بھیجا اس نے تمہیں؟“

”اتنی دور سے گفٹ بھیجنا آسان ہے کیا۔ کہہ رہا تھا سارے گفٹس اکٹھے شادی کے بعد ہی دوں گا۔ ابھی جمع کر رہا ہوں۔“ عروبہ نے شرماتے مسکراتے اسے بتایا تو وہ بولی۔

”بہت چالاک ہے۔ تمہیں صرف وعدوں سے بہلا رہا ہے۔“

”نہیں یار! وہ کنجوس نہیں ہے لیکن یہ بھی تو دیکھو کہ ابھی وہ خود پڑھ رہا ہے۔ میں اس سے زیادہ ڈیمانڈ کیسے کر سکتی ہوں۔“

”پڑھ تو اطہر بھی رہا ہے لیکن دیکھو اس نے کتنا دل کھول کر خرچ کیا۔ دوسری کلاسز سے لوگ ہماری کلاس کی سجاوٹ دیکھنے آرہے تھے۔“ موتا نے اسے جتایا۔

”اطہر باپ کے پیسے پر عیش کر رہا ہے جبکہ عباس کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ وہ اپنا کیریئر خود بنانا چاہتا ہے۔“ عروبہ نے عباس کی حمایت کی۔ وہ سچ مچ عباس کو بہت پسند کرتی تھی۔ موتا نے بھی اس سے مزید بحث مناسب نہ سمجھی لیکن اس نے ایک دوسرا کام کیا۔ اس نے اپنے موبائل پر بنائی گئی آج کے دن کی ویڈیو عباس کو سینڈ کر دی اور ساتھ ہی کمنٹس لکھے۔

”کنجوس! تم نے میری بہن کو صرف میسجز اور وعدوں پر ٹرخا دیا لیکن اس دل والے کو دیکھو کہ اس نے کیسے عروبہ کو برتھ ڈے سیلیبریٹ کی ہے۔“

”یہ اطہر کون ہے؟“ ہمیشہ خاموش رہنے والے عباس نے اس روز پہلی بار عروبہ سے پوچھا۔

”کون اطہر......؟“ عروبہ حیران ہوئی۔

”وہی جس نے تمہاری برتھ ڈے سیلیبریٹ کی تھی۔ موتا نے مجھے اس کے حوالے سے طعنہ دیا ہے۔“ عباس نے اسے ساری بات تفصیل سے بتائی۔

”موتا بے وقوف ہے۔ اس چھچھورے کو تو میں ذرا اہمیت نہیں دیتی۔“ عروبہ نے عباس کو ٹال دیا لیکن موتا سے اس سلسلے میں باز پرس ضرور کی۔

”میں نے صرف عباس کو احساس دلانے کی کوشش کی تھی۔ وہ تمہاری زندگی میں سب سے اہم ہے تو اسے چاہیے کہ خود کو اس کا اہل بھی ثابت کرے۔“ موتا نے بے پروائی سے اسے جواب دیا۔

”آئندہ تم ایسی کوئی حرکت نہیں کرنا۔ عباس اور میرے درمیان معاملات کس طرح چلنے چاہئیں، اس کا فیصلہ ہم دونوں کے علاوہ کسی کو بھی کرنے کا حق نہیں ہے۔“ عروبہ نے سختی سے اسے ٹوک دیا تو وہ اندر ہی اندر جھلس کر رہ گئی لیکن یہ طے تھا کہ وہ عباس کو کسی صورت عروبہ کا نہیں ہونے دے گی۔

☆☆☆

صہیب جب سے بہن کے گھر سے ہو کر آیا تھا بہت بے چین تھا۔ وہاں اس نے اپنی بھانجی سونیا کی ٹیوٹر کو دیکھا تھا اور ایک لمحے کے لیے بھی اسے بھلا نہیں پایا تھا۔ سونیا اس کی اکلوتی اور لاڈلی بھانجی تھی اور اس سے اتنی قریب تھی کہ اپنی کوئی بات صہیب کو بتائے بغیر اسے چین نہیں آتا تھا۔ پہلے وہ سونیا کی خاطر بہت تواتر سے بہن کے گھر جایا کرتا تھا لیکن پھر اس کی زندگی میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ اسے سب کچھ بہت اجنبی لگنے لگا اور ہر شے سے اس کی دلچسپی ختم ہوتی چلی گئی۔ بہن کے گھر جانے کا سلسلہ بھی نہ ہونے کے برابر رہ گیا۔ اب وہ کئی بار بلانے پر بہت مشکل سے وہاں جاتا تھا لیکن فون پر سونیا کا اب بھی اس سے اکثر رابطہ رہتا تھا۔ اپنے قصے کہانیاں سناتے ہوئے اس نے کئی بار اپنی نئی ٹیوٹر مس امینہ کا ذکر کیا تھا۔ وہ مس امینہ کو بہت پسند کرنے لگی تھی لیکن اتفاقاً صہیب کبھی ان اوقات میں بہن کے گھر نہیں گیا تھا جب مس امینہ، سونیا کو ٹیوشن پڑھاتی تھیں۔ اس روز اس نے پہلی بار مس امینہ کو دیکھا۔ بڑی سی سیاہ چادر میں لپٹی وہ بالکل سادہ سے حلیے میں تھی۔ ماتھے تک اوڑھی گئی چادر کی وجہ سے اس کا چہرہ بہت زیادہ نمایاں نہیں تھا لیکن صہیب نے اسے پہچان لیا تھا اور پہچان کر دنگ رہ گیا تھا۔ اسے امید نہیں تھی کہ وہ اس چہرے کو اپنی زندگی میں دوبارہ دیکھ سکے گا لیکن وہ اسے دوبارہ نظر آگئی تھی اور اس کا رہا سہا چین بھی لٹ گیا تھا۔ اس کی بہن نے اسے بتایا تھا کہ مس امینہ دارالامان میں رہتی ہے اور ایک بیٹی کی ماں ہے۔ دارالامان کی منتظمہ میڈم نیازی سے بہن کے سسرالی مراسم تھے اور ان ہی کی سفارش پر اسے سونیا کے لیے ٹیوٹر رکھا گیا تھا۔

بہن کے مطابق وہ ایک خاموش طبع لڑکی تھی جو بہت توجہ اور دلچسپی سے سونیا کو پڑھاتی تھی اور اس کے آنے سے سونیا کی تعلیمی کارکردگی پہلے سے زیادہ اچھی ہو گئی تھی۔ بہن اس کی قابلیت کی بھی معترف تھی۔ صہیب کو اس کے دیگر کوائف سے اتنی دلچسپی نہیں تھی لیکن اس کا ذہن اس نکتے پر اٹک گیا تھا کہ وہ دارالامان میں رہتی ہے اور ایک بیٹی کی ماں ہے...... کیوں؟ بہن کو اس سوال کا جواب معلوم نہیں تھا لیکن صہیب کو کسی سے یہ سوال کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ تھوڑے سے حساب کتاب کے بعد وہ خود اس سوال کا جواب دے سکتا تھا اور یہ جواب ایسا تھا کہ اس کے ضمیر پر دھرا بوجھ کئی گنا بڑھ گیا تھا۔ کبھی کبھی وہ خود کو دھوکا دینے کی کوشش کرتا تھا کہ یہ وہ لڑکی نہیں ہے لیکن پھر اسے اپنے اندر سے آواز آتی تھی کہ اس نے، اس لڑکی کو پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی ہے۔

چار دن اسی کشمکش میں رہنے کے بعد اس نے ایک بار

پھر مس امینہ کو دیکھنے کا فیصلہ کیا تاکہ اپنا شک دور کر سکے۔ اس روز وہ گھر جانے کے بجائے سیدھا بہن کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کی بہن کا گھر پوش علاقے میں تھا اور اپنی سواری نہ رکھنے والوں کو بہت دور بس اسٹاپ پر اتر کر پیدل ہی اندر تک جانا پڑتا تھا۔ صہیب کے پاس اپنی گاڑی تھی۔ اس کے والد کا اپنا بزنس تھا اور وہ خوش حال لوگ تھے اس لیے حال ہی میں عملی میدان میں قدم رکھنے کے باوجود اس کے پاس گاڑی سمیت ہر طرح کی سہولت موجود تھی۔ درمیانی رفتار میں گاڑی چلاتے ہوئے وہ بہن کے گھر کی طرف جا رہا تھا کہ اسے مس امینہ پیدل جاتی ہوئی دکھائی دی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ سونیا سے پہلے دو اور گھروں میں بھی ٹیوشن پڑھاتی ہے۔ یہ سونیا کی ٹیوشن کا وقت نہیں تھا اور یقیناً وہ کسی دوسرے گھر کی طرف جا رہی تھی۔ وہ کشمکش میں تھا کہ اسے لفٹ کی پیشکش کرے یا نہیں کہ ایک عجیب ہی صورتِ حال سامنے آگئی۔ کہیں سے ایک آلٹو نمودار ہوئی اور عین سر جھکائے چلتی امینہ کے سامنے جا کر رکی۔ اتنے قریب گاڑی رکنے پر وہ بری طرح چونکی اور ردِعمل میں حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتی ہوئی بھاگنے لگی۔ صہیب نے دیکھ لیا تھا کہ آلٹو میں صرف دو افراد موجود تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص اپنی جگہ پر موجود رہا جبکہ دوسرا گاڑی سے اتر آیا اور امینہ کے پیچھے بھاگا۔ اب مزید ہاتھ پر ہاتھ دھرے رکھے بیٹھنا صہیب کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس نے گلوو کمپارٹمنٹ میں سے اپنا پسٹل نکالا اور گاڑی اس سمت میں آگے بڑھا دی جہاں امینہ اور اس کا متعاقب بھاگے جا رہے تھے۔ ان دونوں کے قریب پہنچ کر اس نے اپنا پسٹل کھڑکی سے باہر نکال کر ہوائی فائر کیا۔ متعاقب شخص فائر کی آواز پر چونکا تاہم اس نے امینہ کا تعاقب نہیں چھوڑا۔ مجبوراً صہیب گاڑی مزید آگے لے گیا اور اس کی ٹانگ کا نشانہ لے کر فائرنگ کی۔ اس نے ایک شوٹنگ کلب سے باقاعدہ تربیت لے رکھی تھی اور اس کا نشانہ کافی اچھا تھا چنانچہ پہلا فائر ہی کامیاب رہا اور اس نے اس شخص کو ایک دردناک چیخ کے ساتھ لڑکھڑا کر گرتے ہوئے دیکھا لیکن اس کارروائی کے دوران وہ بھول چکا تھا کہ پیچھے ایک شخص گاڑی میں بھی موجود ہے۔ وہ شخص اپنے ساتھی پر فائر ہوتے دیکھ کر اپنی جگہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے تو بیٹھا نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ فوراً ہی صہیب کی گاڑی کے پیچھے آیا تھا اور اس نے عین اس وقت گولی چلائی تھی جب صہیب کامیاب نشانہ لینے کے بعد اپنا ہاتھ واپس کھڑکی سے اندر کر رہا تھا۔ گولی اس کی کلائی کو چھوتی ہوئی گزری اور اس کے ہاتھ سے پسٹل نکل کر گر گیا۔

وہ کوئی تربیت یافتہ آدمی نہیں تھا۔ پسٹل رکھنا اور اس کے استعمال سے واقف ہونا الگ بات تھی اور اس قسم کی صورتِ حال سے نمٹنا بالکل الگ بات۔ اگر یہ امینہ کا معاملہ نہ ہوتا تو وہ ایسے کسی منظر کو دیکھ کر شاید عام شہریوں کی طرح رخ بدل کر گزر جاتا لیکن یہاں وہ بے ساختہ ہی اس معاملے میں کود پڑا تھا۔ نتیجتاً اب اس کی اپنی زندگی خطرے میں تھی۔ اس نے حفظِ ماتقدم کے تحت اپنا سر نیچے کر لیا کہ کہیں کوئی گولی اس کی زندگی کا فیصلہ ہی نہ کر دے۔ اس کی یہ حکمتِ عملی اس کے لیے سودمند ثابت ہوئی اور پیچھے سے چلائی جانے والی گولیاں اس کے سر کے اوپر سے گزرتی چلی گئیں۔ اسی لمحے اس نے فضا میں رائفل کے فائر کی آواز سنی۔ لگاتار چار پانچ فائر کیے گئے تھے۔ اپنی جگہ دبکے ہوئے ہونے کے باوجود اس نے محسوس کیا کہ اغوا کار بدحواس ہو گئے ہیں اور جواب میں اندھی فائرنگ کرتے ہوئے وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن پھر فوراً ہی پولیس کی گاڑی کا مخصوص سائرن سنائی دیا۔ کچھ اور دھماکے فضا میں گونجے۔ انسانی آوازیں سنائی دیں اور چند منٹوں میں ہی سارا نقشہ بدل گیا۔ خود اس کی کار کے ساتھ ایک پولیس والا آ کھڑا ہوا اور اسے سخت لہجے میں باہر آنے کا حکم دیا۔ اس نے حکم کی پیروی کی۔ اگرچہ پولیس والے کا رویہ ایسا تھا جیسے وہ اسے بھی کوئی مجرم سمجھ رہا ہو لیکن اسے اطمینان ہو گیا تھا کہ امینہ محفوظ ہے۔ بغیر کسی مزاحمت کے وہ پولیس وین میں بیٹھ گیا۔ اس کی کلائی سے اب بھی قطرہ قطرہ خون ٹپک رہا تھا جس پر اس نے جیب سے رومال نکال کر باندھ لیا۔ اس کے ذمے جو قصاص ادا کرنا تھا، اس کے مقابلے میں خون کے یہ چند قطرے کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔

☆☆☆

”اطہر تو تمہارا دیوانہ ہو گیا ہے۔ لیکچرز کے دوران بھی اکثر تمہیں تکتا ہوا نظر آتا ہے۔“ موتا نے رشک زدہ لہجے میں عروبہ سے کہا۔

”کوئی دیوانہ نہیں ہوا۔ دیوانگی کی اداکاری کر کے لڑکیوں کو پٹانا اس کی پرانی ہابی ہے۔ سنا ہے ہائی اسکول کے زمانے سے ہی وہ اس کام میں ماہر ہے۔“ عروبہ نے سر جھٹک کر بے نیازی سے بتایا۔

”کس سے سنا ہے؟“ موتا اس کی بات پر چونکی۔

”فریال نے بتایا ہے مجھے۔ پہلے وہ اور اطہر ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔ اطہر کے کرپٹ ابا جی نے زیادہ دولت

کمائی تو وہ پرانا محلہ چھوڑ کر کلفٹن شفٹ ہوگئے۔ اطہر اپنے باپ کی حرام کی کمائی پر ہی عیش کرتا پھر رہا ہے۔'' عروبہ کے پاس کافی معلومات تھیں۔

''تم اس ملانی فریال کی باتوں میں کہاں آگئیں؟ اسے تو سارے ہی لوگ بے ایمان اور بدمعاش لگتے ہیں۔'' مونا نے اپنی کلاس فیلو پر طنز کیا کیونکہ فریال عبایا اور اسکارف پہن کر کالج آتی تھی اور بہت زیادہ محتاط رہتی تھی۔ اس کی کسی لڑکے سے بے تکلفی نہیں تھی۔

''مجھے تو فریال اچھی لڑکی لگی۔ تمیز سے رہتی ہے اور دل لگا کر پڑھتی ہے، لیکچر کا کوئی پوائنٹ سمجھ نہ آئے تو اس سے ڈسکس کرکے الجھن دور ہوجاتی ہے۔'' عروبہ نے فریال کی طرف داری کی۔

''پڑھائی کی حد تک تو ٹھیک ہے لیکن اس کے ساتھ رہ کر کہیں تم خود ملانی نہیں بن جانا۔ عباس لندن میں رہتا ہے اور فریال جیسے حلیے میں تمہیں قبول نہیں کرسکتا۔'' مونا نے جیسے اسے یاد دہانی کروائی۔

''ڈونٹ وری۔ عباس میرا ہے اور میرا ہی رہے گا۔'' عروبہ کو یہ جواب دیتے ہوئے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ اس کی تقدیر کی کتاب میں کیا لکھا ہے۔ وہ ہر طرف سے بے خبر اپنی پڑھائی میں مصروف ہوچکی تھی۔ فریال کے ساتھ اس کی اچھی ذہنی ہم آہنگی ہوگئی تھی اس لیے وہ اب زیادہ تر وقت اس کے ساتھ گزارنے لگی تھی۔ محبت کا اثر انسان پر لازمی ہوتا ہے۔ وہ جو بچپن سے مطلب پرست اور تھوڑی چالباز تھی، آہستہ آہستہ بدلنے لگی۔ اللہ کا ڈر، لوگوں کے حقوق، تعلقات میں خلوص ان سب چیزوں سے آشنائی ہونا شروع ہوئی تو اپنی غلطیوں کا بھی احساس ہونے لگا اور وہ سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ اللہ نے جو کچھ اس کے نصیب میں لکھا ہے، وہ تو اسے ملنا ہی ملنا تھا۔ خوامخواہ چالاکیاں دکھا کر اس نے اپنے ضمیر پر بوجھ لاد لیا۔ اس میں اتنی جرأت تو نہیں تھی کہ اپنے ماضی کی ان غلطیوں کا اعتراف کر پاتی بس اپنے رویے کو تبدیل کرلیا اور مونا کے لیے اپنے دل سے ہر طرح کا بغض نکال کر اس سے خلوص و محبت سے پیش آنے لگی۔ مونا کے اندر کیا چل رہا ہے اور وہ کیا کچھ جان چکی ہے، اسے علم ہی نہیں تھا۔ وہ پہلے ہی سال میں پوزیشن لانے کے جنون میں جتلا ویسے بھی اپنے اطراف سے بے خبر ہوتی جارہی تھی۔ عباس سے بھی اب اس کی زیادہ بات نہیں ہوتی تھی لیکن مونا روز عباس سے بات کرتی تھی اور اسے باتوں باتوں میں یہ جھوٹی اطلاع دیتی رہتی تھی کہ عروبہ کی اطہر سے دوستی میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کے رابطوں میں بھی مونا کی اطلاعات کی تائید ہو رہی تھی اس لیے جب بھی عروبہ اسے اپنی تعلیمی مصروفیت کی وجہ سے رابطے میں نہ رہ پانے کا عذر دیتی تو وہ اس کی بات پر زیادہ یقین نہیں کر پاتا تھا۔

آخرکار وہ دن آگیا جب عروبہ نے اپنی خواہش کے مطابق ایم بی بی ایس کا فرسٹ پروف سب سے زیادہ نمایاں نمبر لے کر پاس کرلیا۔ مونا کے بھی اچھے نمبرز آئے تھے لیکن عروبہ کے مقابلے میں اس کے نمبر کچھ بھی نہیں تھے۔ دونوں بہنیں اپنی اس کامیابی کے بعد حیدرآباد پہنچیں تو سلیمہ اور بہزاد احمد دونوں ہی بہت خوش تھے۔ بہزاد احمد نے حسب وعدہ عروبہ کو نئی گاڑی بھی دلا دی۔ ان کی یہ عنایت مونا کو بہت کھلی۔ سلیمہ نے اس کی کیفیت کو بھانپ لیا اور دکھاوے کے لیے بہزاد احمد سے بولیں۔

''میری بیٹی مونا بھی تو اتنے اچھے نمبروں سے پاس ہوئی ہے۔ اس کے لیے بھی آپ کو گفٹ لینا چاہیے تھا۔''

''ارے بھئی۔ یہ گاڑی دونوں بہنوں کی ہی سمجھو۔ دونوں ایک ہی میڈیکل کالج میں تو پڑھتی ہیں۔ آرام سے ساتھ آجاسکتی ہیں۔ اکیلی لڑکیاں دو دو گاڑیاں کہاں سنبھالتی پھریں گی۔ اچھا ہے ایک دوسرے کے ساتھ آنا جانا کریں تو دونوں ہی کو سہارا رہے گا۔ میں نے عروبہ سے وعدہ نہ کیا ہوتا تو میں اتنی کم عمری میں انہیں گاڑی دلاتا بھی نہیں۔'' بہزاد احمد نے انہیں جواب دیا تو وہ مسکرانے لگیں جبکہ مونا اپنی جگہ بیٹھی بل کھاتی رہی۔ سلیمہ کی چالبازیاں جان لینے کے بعد اسے ان سے سخت چڑ ہوگئی تھی لیکن وہ مصلحتاً اپنے جذبات کو ظاہر نہیں کررہی تھی۔

''آپ جیسا مناسب سمجھیں لیکن میں تو اپنی بیٹی کو اپنی طرف سے گفٹ ضرور دوں گی۔'' سلیمہ نے کہا اور چار عدد نفیس سی سونے کی چوڑیوں کا بکس مونا کو تھمایا۔ مونا نے بادل ناخواستہ وہ بکس تھام لیا لیکن دل میں سوچے بغیر نہیں رہ سکی کہ یہ عورت کتنی مکار ہے میرے باپ کی کمائی سے مجھے گفٹ دے کر ان کی اور میری نظروں میں اچھا بننے کی کوشش کررہی ہے۔ عروبہ کو بھی اپنی بدلی ہوئی قلبی کیفیت کی وجہ سے ماں کا عمل پسند نہیں آیا تھا۔ ماں کی یہ چالیں اب اسے بے مقصد لگنے لگی تھیں لیکن بہرحال ابھی وہ اتنی تبدیل نہیں ہوئی تھی کہ انہیں اس بات پر ٹوکتی یا ان کی اصلاح کرنے کی کوشش کرتی، اس لیے خاموش ہی رہی۔

☆☆☆

''تھینک یو سو مچ۔ آپ نے میرے لیے بہت زحمت

اٹھائی۔ آج کل کوئی ایسا نہیں کرتا۔ سب کو اپنی جان پیاری ہوتی ہے۔ شکر ہے آپ صرف معمولی زخمی ہوئے۔ خدانخواستہ آپ کو کچھ ہوجاتا تو میرے دل پر بڑا بوجھ آجاتا۔'' اپنی سیاہ چادر کو ماتھے تک نیچے کیے ہوئے وہ جھکی ہوئی نظروں سے صہیب سے مخاطب تھی۔ آج وہ دو دن کی چھٹی کے بعد سونیا کو پڑھانے آئی تھی اور یہاں اسے صہیب مل گیا تھا۔ پیش آنے والے اس ڈراؤنے خواب جیسے واقعے سے سنبھلنے اور معاملات سدھر جانے کے بعد ہی میڈم نیازی نے اسے دارالامان سے قدم باہر رکھنے کی اجازت دی تھی۔

اس کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا وہ جمیلہ اور اس کے ساتھیوں کو پکڑوانے کا ردعمل تھا۔ اصل میں اس وقت پولیس نے جمیلہ کے صرف ان ساتھیوں کو گرفتار کیا تھا جن کا دارالامان سے تعلق تھا۔ باقی مددگاروں کی گرفتاری کے لیے پولیس ابھی تفتیش ہی کررہی تھی کہ ان کی طرف سے انتقامی کارروائی کردی گئی۔ جمیلہ کے آزاد ساتھی اسے اغوا کرکے نشانِ عبرت بنانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ صہیب درمیان میں نہ آتا تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوچکے ہوتے۔ صہیب کی مداخلت پر موقع پر گرفتار ہونے والوں کے علاوہ بھی کچھ لوگ گرفتار کیے گئے تھے۔

صہیب کے اپنے ایک ماموں پولیس میں اعلیٰ عہدے پر تھے اس لیے پولیس والوں کو اس کیس پر خصوصی توجہ دینی پڑی تھی۔ واقعے والے روز بھی قسمت نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ اس وقت جب وہ زخمی ہوگیا تھا اور اس کا پسٹل اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا، قریبی بنگلے کا گارڈ اس کے لیے غیبی مدد بن کر آیا تھا۔ اس نے اپنی رائفل سے پے در پے ہوائی فائر کرکے مجرموں کو گڑبڑانے پر مجبور کردیا تھا۔ اس کی دیکھا دیکھی دوسرے بنگلوں کے گارڈز بھی باہر آگئے تھے اور گشت پر موجود پولیس کی گاڑی بھی متوجہ ہوگئی تھی اس لیے نہ صرف صہیب اور امینہ کی جان بچی بلکہ مجرم بھی گرفتار ہوگئے۔ صہیب کے ماموں کی وجہ سے اسے اور امینہ کو تھانے جاکر زیادہ خوار بھی نہیں ہونا پڑا۔ الٹا صہیب نے شور مچایا کہ جب امینہ سے اتنا اہم کام لیا گیا تھا تو پولیس نے اس کی حفاظت کا انتظام کیوں نہیں کیا۔ بہرحال سب کچھ معمول پر آچکا تھا اور امینہ بھی اپنی جاب پر واپس آگئی تھی۔ صہیب کو امید تھی کہ وہ آج آجائے گی اس لیے وہ پہلے سے بہن کے گھر پہنچ گیا تھا۔ امینہ آئی تو اس نے اس سے اس کی خیریت دریافت کی، جواب میں وہ اس کا شکریہ ادا کرنے لگی۔ اس کے الفاظ صہیب کے لیے تازیانہ تھے۔ وہ انجان تھی اس لیے اس کا شکریہ ادا کررہی تھی اور اس کی تعریف کررہی تھی۔ صہیب اس کے الفاظ پر پھیکی سی ہنسی ہنسا اور بولا۔

''مجھ سے زیادہ تو آپ بہادر ہیں۔ آپ نے دارالامان سے گند صاف کرنے میں جس طرح میڈم نیازی اور پولیس کی مدد کی، وہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ مجھے یقین ہے کہ وہاں رہنے والی دوسری کئی عورتوں کو بھی جمیلہ اور اس کی ساتھیوں کی حرکات کا علم ہوگا لیکن انہوں نے اس ڈر سے زبانیں بند کر رکھی ہوں گی کہ کہیں خود کسی مصیبت میں نہ پڑجائیں۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ہر کوئی خود کو مشکل میں ڈالنا پسند نہیں کرتا لیکن مجھ جیسے لوگ اس لیے نہیں ڈرتے کہ ہمارے پاس گنوانے کے لیے کچھ خاص ہے ہی نہیں۔ صرف نور فاطمہ کی ذمے داری ہے جسے میں اچھی طرح ادا کرنا چاہتی ہوں لیکن ساتھ ہی یہ بھی جانتی ہوں کہ اس کے لیے میری ذات لازم و ملزوم ہیں۔ مجھ سے زیادہ اس کی فکر کرنے والا وہ ہے جس نے اسے پیدا کیا ہے۔ اگر اس نے طے کر رکھا ہے کہ نور فاطمہ کی پرورش میرے ہاتھوں ہوگی تو دنیا کی کوئی طاقت اس کے طے کیے گئے منصوبے کو تبدیل نہیں کرسکتی، بصورت دیگر وہ مجھ سے بہتر کوئی انتظام کردے گا۔'' ٹھہر ٹھہر کر بولتی وہ صہیب کو بے حد متاثر کررہی تھی۔ اب تک وہ اسے کسی اور حوالے سے دیکھتا رہا تھا۔ اسے امینہ سے ہمدردی تھی اور وہ اس سے شرمندہ بھی تھا لیکن متاثر پہلی بار ہوا تھا، وہ بھی اس کی خوب صورتی سے نہیں اس کی سوچ کی خوب صورتی سے۔

''آپ کا اللہ پر ایمان بہت مضبوط ہے۔'' وہ اپنی زبان پر یہ جملہ آنے سے نہ روک سکا۔

''کاش میرے پاس ایمان کی یہ مضبوطی شروع ہی سے ہوتی تو میں ایسے بہت سے گناہوں اور غلطیوں سے بچ جاتی جو آج میرے لیے پچھتاوے کا باعث ہیں۔'' امینہ کی زبان سے بھی جملہ پھسلا تو صہیب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی جھکی ہوئی گھنیری پلکوں پر ہلکی سی نمی کی چمک تھی۔

''آپ مجھ سے شادی کریں گی امینہ؟'' اسے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ یکدم اس سے اتنی بڑی بات کیسے کہہ گیا۔ اس کی بات پر امینہ نے جھٹکے سے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور پہلی دفعہ نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی نظروں میں حیرت ہی حیرت تھی۔

''شاید آپ میرے بارے میں لاعلم ہیں۔'' آخر وہ حیرت سے سنبھل کر بولی۔

"نہیں۔ میں آپ کے بارے میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔" صہیب کے لہجے میں کچھ خاص تھا جسے اینہ محسوس نہیں کرسکی اور دوبارہ سر جھکا کر دھیمے لہجے میں بولی۔

"شاید آپ جذباتی ہوکر ایسی بات کہہ گئے ہیں۔ گھر جاکر آرام سے اس فیصلے پر سوچیے گا۔"

"میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے پروپوزل کے بارے میں سوچیے۔ مجھے جو فیصلہ کرنا تھا کرچکا، اب آپ کو فیصلہ کرنا ہے۔ میں آپ کے فیصلے کا منتظر رہوں گا۔" وہ اپنی بات کہہ کر وہاں سے اٹھ گیا۔ ٹرے میں جوس کے گلاس لیے اندر آتی اس کی بہن نے ناسمجھی سے ان دونوں افراد کی طرف دیکھا جن کے چہرے کے تاثرات اس کے لیے ناقابلِ فہم تھے۔ پھر سر جھٹک کر رہ گئی۔ ان کے ہاں دوسروں کے معاملات میں بے جا مداخلت کرنے کا رواج نہیں تھا۔

☆☆☆

عروبہ کی تو شان ہی الگ ہوگئی تھی۔ سب اس پر رشک کر رہے تھے۔ ایک تو اس کی شاندار کامیابی، دوسرے بہزاد احمد کی طرف سے تحفے میں ملنے والی نئی نکور کار۔ قریبی سہیلیوں نے اس موقع پر اس سے ٹریٹ بھی لی تھی۔ مونا بھی بظاہر ہنستی مسکراتی ان لوگوں کے ساتھ شامل تھی لیکن اس کے اندر حسد اور غصے کی جو آگ لگی ہوئی تھی، اس سے صرف وہی واقف تھی۔ سہیلیاں عروبہ کو مبارکباد بھی دے رہی تھیں اور ساتھ میں تحفے بھی۔ فریال بھی اس کے لیے تحفے میں ایک بہت خوب صورت اور نفیس سا اسکارف لائی تھی۔ اپنا لایا ہوا تحفہ دیتے ہوئے اس نے پہلے عروبہ کو مبارکباد دی اور پھر بولی۔

"خوشیوں اور کامیابیوں پر اللہ کا شکر ادا کرنا نہیں بھولنا اور دعا کرنا کہ تمہاری کوئی کامیابی کبھی تمہارے لیے آزمائش نہ بنے۔ بعض اوقات اللہ بندے کو نواز کر اسے آزماتا ہے اور کبھی اس سے لے کر۔ کامیاب وہی لوگ ہوتے ہیں جو دونوں صورتوں میں اللہ سے جڑے رہیں۔"

عروبہ نے اس کی یہ نصیحت سنی لیکن بہت زیادہ سنجیدگی سے غور نہیں کیا۔ وہ لڑکوں کے اس گروپ کی طرف متوجہ ہوگئی تھی جو اسے مبارکباد دینے آیا تھا۔ ان لڑکوں میں اطہر بھی شامل تھا۔ اس نے بھی مسکرا کر عروبہ کو مبارکباد دی اور ایک مخملیں ڈبیا اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "آج تو تمہیں مجھ سے گفٹ لینا ہی ہوگا۔ آخر اپنی فرینڈز کے گفٹس بھی تو تم نے قبول کیے ہیں۔"

"میں نے اپنی سہیلیوں کے تحفے قبول کیے ہیں۔ آپ میری سہیلی تو نہیں ہیں نا۔" عروبہ نے ہنس کر اسے ٹالنے کی کوشش کی۔ اس کی بات پر آس پاس کھڑے افراد نے قہقہہ لگایا تو اطہر جھینپ گیا لیکن اپنی بات پر اصرار جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"دیکھو عروبہ! یہاں ہم سب مل کر پڑھتے ہیں اس لیے ہم سب فرینڈز ہیں۔ ایسے ماحول میں اس طرح کی تفریق کچھ مناسب نہیں ہے۔"

"یہ آپ کی ذاتی رائے ہے لیکن میری اپنی کچھ حدود ہیں۔ میرے گھر والے اس بات کو پسند نہیں کریں گے کہ میں لڑکوں سے تحفے لوں اس لیے میری طرف سے معذرت۔" اس نے اطہر کے بڑھائے ہوئے تحفے کو تھامنے کے لیے ہاتھ آگے نہیں بڑھایا اور بہانہ بنادیا۔ فریال سے اس کے بارے میں جان کر وہ کافی محتاط ہوگئی تھی اور اس کی کوشش تھی کہ اطہر کو اپنے قریب آنے کا کوئی موقع نہ دے۔ اسے اس کے ارادے میں مضبوط پاکر اطہر کو اپنا ہاتھ پیچھے کرنا پڑا لیکن اسے شدید سبکی کا احساس ہوا تھا۔ اس کے دوستوں نے بھی اس واقعے کے بعد اسے چھیڑنا شروع کردیا تھا۔ وہ مذاق اڑاتے تھے کہ ہائی اسکول کے زمانے سے لیڈی کلر کہلانے والا اطہر ابھی تک عروبہ کا دل جیتنے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ وہ کیا کہتا۔ عروبہ نے ابھی تک اسے قریب آنے کا موقع نہیں دیا تھا تو دل جیتنے کا کیا سوال تھا حالانکہ اس سلسلے میں وہ مونا سے بھی رابطے میں رہتا تھا اور وہ اسے حوصلہ دیتی رہتی تھی کہ تم کوشش جاری رکھو، ایک دن عروبہ کو ضرور جیت لوگے۔ کوشش جاری رکھنے کے اس سلسلے میں ایک دن اطہر اپنی گاڑی لیے بغیر کالج چلا آیا اور دوپہر میں جب عروبہ اور مونا گھر واپس جارہی تھیں تو ان کے راستے میں آکھڑا ہوا۔

"میری گاڑی مکینک کے پاس ہے۔ کیا آج آپ مجھے لفٹ دے دیں گی؟" اس نے مسکراتے ہوئے عروبہ سے درخواست کی۔

"سوری۔ آپ کا اور ہمارا روٹ بالکل مختلف ہے۔" عروبہ نے اسے ٹالا۔

"روٹ ایک ہو بھی سکتا ہے۔ میرا مطلب ہے آج مجھے آپ والی سائڈ پر ہی جانا ہے اس لیے آپ سے لفٹ مانگ رہا ہوں۔ گھر جانا ہوتا تو جبران سے لفٹ لے لیتا۔" اس نے اپنے دوست کا نام لیا۔

"آپ اتنے غریب تو نہیں ہیں کہ ٹیکسی افورڈ نہ کرسکیں۔" عروبہ تھوڑا سا جھنجلائی۔

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن مجھے رکشا ٹیکسی وغیرہ

میں سفر کرنا پسند نہیں ہے۔" وہ پوری ڈھٹائی سے اپنے مطالبے پر جما ہوا تھا۔

"اور مجھے لڑکوں کو اپنی گاڑی میں لفٹ دینا۔ میرے خیال میں تو اتنے عرصے میں آپ کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے تھی کہ یہاں آپ کی دال گلنے والی نہیں ہے کیونکہ میں لڑکیوں کی اس قسم میں سے نہیں ہوں جن سے آپ کا آج تک واسطہ پڑا ہے۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں انگیجڈ ہوں اور محض آپ کی تفریح کا ذریعہ بننے کے لیے آپ کی دوستی قبول نہیں کرسکتی۔" آج کل عباس کا رویہ اس کے ساتھ کچھ عجیب ہوگیا تھا۔ اس نے اس کی کامیابی پر بھی کھل کر مبارکباد نہیں دی تھی۔ عباس کے ساتھ نظر آنے والا روشن مستقبل اپنی جگہ، وہ اس سے ہٹ کر بھی عباس کو پسند کرتی تھی اور منگنی کے بعد اس پسندیدگی میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ اس لیے وہ عباس کے بدلے ہوئے رویّے پر پریشان تھی۔ ذہنی پریشانی کی اس کیفیت میں اطہر جیسے ناپسندیدہ شخص کا زبردستی گلے پڑنا اسے بالکل ہی تپا گیا اور اس نے بغیر کسی لحاظ کے اسے بے نقط سنا ڈالی۔ آس پاس موجود دوسرے طلبہ نے بھی اس کے یہ الفاظ سنے۔ کسی نے حیرت سے دیکھا، کسی کے ہونٹوں پر مضحکہ اڑاتی مسکراہٹ بکھری اور کوئی شانے جھٹک کر بے نیازی سے گزر گیا۔ اطہر نے بھی یہ سارے ردعمل دیکھے اور محسوس کیے۔ نتیجتاً اس کے چہرے پر سرخی پھیل گئی اور وہ ایک جھٹکے سے مڑ کر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا وہاں سے دور ہٹ گیا۔

"تم نے تو اسے چھٹی کا دودھ یاد دلا دیا۔" اس کے جانے کے بعد مونا ہنس کر عروبہ سے بولی۔

"لسوڑا ہی بن گیا تھا۔ اس سے جان چھڑانے کے لیے ایک ڈوز دینا ضروری تھا۔" وہ منہ بنا کر بولی اور بے نیازی سے قدم آگے بڑھائے۔

"کہیں بعد میں کوئی پرابلم کری ایٹ نہ کردے۔" اس کے ساتھ قدم اٹھاتی مونا نے تشویش کا اظہار کیا لیکن دل ہی دل میں وہ اس صورتِ حال پر بہت خوش تھی۔ اسے موقع مل گیا تھا کہ اطہر کو عروبہ کے خلاف اچھی طرح بھڑکا سکے۔

"بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ فی الحال تو گھر چلو۔ مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔ بوا سے اپنی پسندیدہ ڈش کی فرمائش کرکے آئی تھی اس لیے کینٹین سے بھی کچھ نہیں کھایا۔" عروبہ نے اس سے کہا۔ گھر پہنچ کر دونوں نے کھانا کھایا اور اپنے اپنے کمروں میں چلی گئیں۔ مونا نے اپنے کمرے میں جاتے ہی اطہر کو فون ملایا اور مصنوعی ہمدردی جتاتے ہوئے بولی۔

"سوری اطہر! آج عروبہ نے تمہاری بڑی انسلٹ کی۔ میں تو چاہتی تھی کہ تم ہمارے ساتھ چلو لیکن تم جانتے ہو گاڑی اس کی ہے اس لیے مرضی بھی اسی کی چلتی ہے۔ بہرحال مجھے بڑا افسوس ہے۔ عروبہ کو تمہارے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ عروبہ کو میرے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اسے اپنے اس رویّے کا کڑا حساب دینا پڑے گا۔" اطہر کا لہجہ سنگین تھا۔

"تم اس کے ساتھ کیا کروگے؟" مونا نے تجسس سے پوچھا۔

"اس بات کو چھوڑو، بس تم یہ بتاؤ کہ میرا ساتھ دوگی یا نہیں؟" اطہر نے اس سے پوچھا۔

"تم کہو۔ میرے کرنے کا کام ہوا تو ضرور کروں گی۔" مونا کا دل خوش ہوگیا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اطہر عروبہ کے ساتھ کیا کرے گا لیکن وہ یہ تمنا ضرور رکھتی تھی کہ عروبہ کے ساتھ کچھ برا ہو۔

"کام زیادہ مشکل نہیں ہے......" اطہر اسے دھیرے دھیرے اپنے منصوبے سے آگاہ کرنے لگا۔

"کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہوجائے۔" اس کا منصوبہ سن کر مونا تھوڑا سا گھبرائی۔

"ارے کچھ نہیں ہوگا، بس اسے تھوڑا سا ڈرائے دھمکائیں گے اور پھر گھر لاکر چھوڑ دیں گے۔"

اطہر نے اسے تسلی دی تو اس نے ہامی بھرلی۔ اب بس موقع کی تلاش تھی۔ یہ موقع انہیں چار دن بعد ملا۔ ان کی ایک کلاس فیلو کی بڑی بہن کی شادی تھی۔ شادی سے ہفتہ بھر پہلے ڈھولکی رکھی گئی۔ عروبہ اور مونا بھی وہاں مدعو تھیں۔ عروبہ نے شادی میں شرکت کا عندیہ دیتے ہوئے ڈھولکی میں شرکت سے معذرت کرلی لیکن مونا وہاں جانا چاہتی تھی۔ پروگرام یہ طے ہوا کہ وہ کالج سے ہی دو تین سہیلیوں کے ساتھ مل کر وہاں پہنچ جائے گی۔ واپسی کے لیے اس نے عروبہ کو راضی کرلیا کہ وہ ڈنر کے بعد اسے لینے آجائے گی۔ عروبہ خود بھی بدل گئی تھی اور مونا کا رویہ بھی اس کے ساتھ بہت اچھا ہوگیا تھا اس لیے انکار نہیں کرسکی۔ نمایاں کامیابی حاصل کرنے والے دیگر طلبہ کی طرح اس کی بھی کوشش ہوتی تھی کہ اپنا وقت ضائع نہ ہونے دے۔ اس روز بھی گھر واپس آکر اس نے کھانا کھایا اور ایک گھنٹا آرام کرنے کے بعد دوبارہ پڑھنے بیٹھ گئی۔ اسے جنون تھا کہ فرسٹ پروف کی طرح سیکنڈ پروف میں بھی اس کی فرسٹ پوزیشن ہی رہے۔ اس لیے پہلے سے بھی زیادہ سخت محنت کررہی تھی۔ پڑھتے ہوئے اسے تقریباً ایک ڈیڑھ

گھنٹا گزرا تھا کہ مونا کا فون آگیا اور وہ اس سے بولی۔

”عروبہ! انیلا اصرار کر رہی ہے کہ تم جب مجھے لینے آؤ تو ڈنر میں شرکت کر کے جانا۔ میں تمہیں اس لیے بتا رہی ہوں کہ تم کہیں رَف حلیے میں نہ آجانا، تھوڑی سی تیاری کر لینا۔“

”یہ کیا مصیبت ہے یار۔ اب میں کہاں تیاری کے چکر میں پڑ کر اپنا وقت ضائع کروں گی۔“ وہ تھوڑا سا جھنجلائی۔

”اوہو۔ تیاری کا کیا مسئلہ ہے۔ کپڑے بوا استری کر دیں گی۔ تم بس چینج کر کے اور ہلکا پھلکا میک اپ کر کے آجانا۔ انیلا کا تمہیں پتا ہے نا کہ اپنی منوانے پر آئے تو مان کر نہیں دیتی۔ تم لاکھ بھی انکار کرو گی تو تمہیں گاڑی سے کھینچ کر نکال لے گی۔ اس لیے اچھا ہے کہ تم پہلے ہی تیاری سے آؤ۔“ مونا نے اسے سمجھایا۔

”اوکے۔ اب تم مجھے پڑھنے دو۔“ اس نے سخت بیزاری سے مونا کو جواب دیا۔

”تم فون بوا کو دے دو۔ میں انہیں تمہارے کپڑوں کے بارے میں بتا دوں گی۔“ مونا نے اس سے کہا تو اس نے جان چھڑانے کے لیے بوا کو آواز دے کر انہیں موبائل تھما دیا اور ایک بار پھر اپنی کتابوں میں مگن ہوگئی۔ نو بجے بوا نے ہی اسے یاد دلایا کہ اسے انیلا کے گھر جانا ہے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔ ڈرائیونگ اس نے بہت سال پہلے حیدرآباد میں ہی سیکھ لی تھی اور بہزاد احمد کی موجودگی میں ان کی گاڑی چلاتی تھی اس لیے گاڑی چلانا اس کے لیے مسئلہ نہیں تھا لیکن حیدرآباد اور کراچی کے ٹریفک میں فرق تھا۔ یہاں بہت زیادہ رش ہوتا تھا اس لیے بہت محتاط ڈرائیونگ کرنی پڑتی تھی۔ خصوصاً رات کے وقت ڈرائیو کرنا اور بھی مشکل ہو جاتا تھا۔ جب سے بہزاد احمد نے اسے گاڑی دلائی تھی، یہ پہلا موقع تھا کہ... رات کے وقت وہ بھی لانگ روٹ پر جانے والی تھی۔ اس لیے اس کا خیال تھا کہ مزید لیٹ ہوئے بغیر جلدی چلی جائے۔ تیار ہونے کے لیے اس نے بوا کے استری کیے ہوئے کپڑے دیکھے تو تھوڑی جز بز ہوگئی۔ وہ سبز رنگ کا خاصا کامدار سوٹ تھا۔

”ارے بیٹا! تقریبات میں تو ایسے ہی کپڑے پہنتے ہیں۔ مجھ سے مونا بٹی نے کہا تھا اس لیے میں نے یہ کپڑے استری کر دیے۔“ اس کے اعتراض پر بوا نے جواب دیا تو وہ مزید کچھ نہ کہہ سکی۔ وقت کم تھا اس لیے وہی کپڑے پہن لیے۔ بوا نے میچنگ کی جیولری بھی اسے پہنا دی۔ دونوں لڑکیوں کی تعلیمی مصروفیت کی وجہ سے ان کی چیزیں بوا ہی سنبھالتی تھیں اس لیے انہیں ہر شے کا پتا تھا۔ عروبہ نے اس تیاری کے ساتھ ہلکی سی لپ اسٹک لگائی تو چمکنے لگی۔ بوا نے بے ساختہ ہی ماشاءاللہ کہا۔

وہ گھر سے نکلی تو اسے خبر بھی نہیں ہوئی کہ ایک گاڑی اس کی گاڑی کے پیچھے لگ چکی ہے۔ بے خبری میں ہی اس نے ایسے راستوں کا انتخاب کیا جہاں ٹریفک کا دباؤ کم تھا اور اسے گاڑی چلانے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آرہی تھی۔ انیلا کے علاقے میں داخل ہونے کے لیے اسے ایک ایسی سڑک سے گزرنا پڑا جہاں گاڑیوں کی آمدورفت بہت ہی کم تھی کیونکہ اس سڑک کو صرف اہلِ علاقہ ہی استعمال کرتے تھے۔ اسی سڑک پر اس کا تعاقب کرتی گاڑی نے اپنی رفتار تیز کی اور اس کی گاڑی کو اوورٹیک کر کے تیزی سے اس کی گاڑی کے آگے ترچھی کھڑی ہوگئی۔ اس کو بہت ایمرجنسی میں بریک لگا کر اپنی گاڑی روکنی پڑی۔ بدحواسی میں کچھ سجھائی دینے سے پہلے ہی رکاوٹ بنی کھڑی گاڑی سے نقاب پوش اترے اور اس کی جانب کے دروازے کو ایک جھٹکے سے کھول کر اسے باہر کھینچا۔ اس نے بے ساختہ ہی چیخ مارنے کے لیے منہ کھولا لیکن کلوروفام میں ڈوبا رومال کچھ ایسی تیزی سے اس کے منہ اور ناک پر رکھا گیا کہ اس کی آواز اس کے حلق میں ہی گھٹ گئی۔ بے ہوشی ہی کی حالت میں اس کے ساتھ وہ بدترین سلوک کیا گیا جو بنتِ حوا سے اس کا سارا غرور چھین لیتا ہے۔ اسے تو اس کے مجرموں کے چہرے دیکھنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا اور اسے اس کی گاڑی میں ڈال کر گاڑی اس بلڈنگ کے قریب چھوڑ دی گئی تھی جہاں ان بہنوں کی رہائش تھی۔

ادھر مونا جانتی تھی کہ عروبہ، انیلا کے گھر اسے لینے نہیں آسکے گی چنانچہ ڈنر ختم ہونے کے کچھ دیر بعد اس نے انیلا کے سامنے اس طرح ظاہر کیا کہ عروبہ نے اس سے وعدہ خلافی کی ہے اور جان کر اسے لینے نہیں آئی۔ انیلا نے عروبہ کے لیے ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے مونا کو ڈراپ کروا دیا۔ گھر آکر بوا کے سامنے بھی اس نے ایسا ظاہر کیا جیسے اسے عروبہ کے بارے میں کوئی علم ہی نہ ہو۔ بوا پریشانی کا اظہار کرنے لگیں تو وہ خود بھی ان کے ساتھ شامل ہوگئی۔ اسے امید تھی کہ کچھ دیر میں عروبہ خود گھر پہنچ جائے گی لیکن جب بہت زیادہ دیر ہوگئی تو خود اسے بھی تشویش ہونے لگی۔ اس نے اطہر سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تو اس کا نمبر بند جا رہا تھا۔ بوا نے ہوتے ہوئے حیدرآباد فون کرنے کی تجویز دی لیکن اس نے انہیں روک دیا۔ وہ اطہر سے رابطہ کرنے کی کوشش میں تھی، آخرکار خود اطہر کی کال آگئی اور اس نے مونا کو اطلاع دی کہ تمہاری

بہن تمہاری بلڈنگ کے باہر اپنی گاڑی میں موجود ہے، جا کر اسے لے آؤ۔

مونا، بوا سے نظر بچا کر چپکے سے باہر نکلی۔ گیٹ سے باہر نکل کر دائیں جانب کی دیوار کے ساتھ اس نے عروبہ کی گاڑی دیکھ لی۔ وہ تقریباً دوڑتی ہوئی گاڑی تک پہنچی۔ عروبہ پچھلی سیٹ پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر پل بھر کے لیے مونا کا دل بھی کانپ گیا۔ اس کی حالت سے اس کے ساتھ ہونے والے ظلم کا پتا چل رہا تھا۔ اس نے جھپٹ کر دروازہ کھولا اور عروبہ کو آوازیں دینے لگی۔ وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں تھی۔ مونا کی آواز پر اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوئی۔ مونا نے گاڑی میں ہی پڑی پلاسٹک کی پانی کی بوتل کھول کر عروبہ کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تو وہ ذرا حواس میں آئی لیکن اب بھی وہ مکمل ہوش میں نہیں تھی۔

”خود کو سنبھالو عروبہ! میں گاڑی اندر کمپاؤنڈ میں لے جا رہی ہوں۔“ اس نے عروبہ کو جھنجوڑ کر اس سے کہا اور خود آگے جا کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ چابی موجود تھی۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے گاڑی اسٹارٹ کی۔ اس نے بھی عروبہ کے ساتھ ہی بہزاد احمد سے ڈرائیونگ سیکھی تھی لیکن عروبہ جیسی مہارت نہیں تھی۔ اس وقت گھبراہٹ میں اسے کچھ اور مشکل پیش آرہی تھی۔ بہرحال وہ کسی نہ کسی طرح گاڑی کو عمارت کے کمپاؤنڈ میں لے گئی۔ رات کا وقت ہونے کی وجہ سے وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔ چوکیدار بھی گیٹ پر ہی ہوتا تھا اس لیے اسے اس بات کا اندیشہ بہت کم تھا کہ کوئی عروبہ کو دیکھ لے گا۔ وہ رات کا وقت ہونے کی وجہ سے بڑی چادر اوڑھ کر باہر نکلی تھی۔ گاڑی میں پڑا عروبہ کا دوپٹا اس نے خود اوڑھا اور اپنی چادر عروبہ کے گرد لپیٹ دی۔ یہاں مکینوں کی آمدورفت کے لیے لفٹس لگی ہوئی تھیں جنہیں وہ خود آپریٹ کرتے تھے۔ مونا، عروبہ کو لفٹ کی مدد سے اوپر اپنے فلیٹ کی منزل تک لے گئی۔ دروازے کی چابی اس کے پاس تھی سو خود ہی لاک کھول کر آسانی سے عروبہ سمیت اندر داخل ہوئی اور اسے سیدھا اس کے کمرے میں لے گئی۔ بوا شاید واش روم میں تھیں۔ اس نے عروبہ کو اس کے بیڈ پر بٹھایا اور دوڑ کر ایک گلاس دودھ اور اس کے ساتھ ایک گولی لے آئی۔ اس نے عروبہ کو دودھ کے ساتھ وہ گولی کھانے کے لیے دی۔ عروبہ نے خاموشی سے گولی نگل لی۔ دودھ وہ دو گھونٹ سے زیادہ نہیں پی سکی تھی۔ اس کی حالت بہت بری ہو رہی تھی لیکن ابھی ذہنی طور پر وہ اس قابل نہیں ہو سکی تھی کہ اپنے ساتھ بیتی کو پوری طرح محسوس کر سکے۔ مونا نے اسے بستر پر لٹا کر سینے تک چادر اوڑھا دی۔ اسے معلوم تھا کہ سکون آور گولی کے اثر سے عروبہ کو جلد نیند آجائے گی۔ باہر بوا اسے پکار رہی تھیں۔ شاید وہ واش روم سے نکل گئی تھیں۔ وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی تاکہ بوا اندر نہ آسکیں۔

”کہاں چلی گئی تھیں تم بیٹا۔ گھبراہٹ سے میرے پیٹ میں مروڑ ہونے لگی تھی۔“ اسے دیکھتے ہی بوا نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔ ان کے ساتھ یہ مسئلہ تھا کہ جب کوئی پریشانی یا بڑا مسئلہ درپیش ہو تو ان کے پیٹ میں مروڑ ہونے لگتی تھی اور وہ بار بار باتھ روم کے چکر لگانے پر مجبور ہو جاتی تھیں۔

”میں عروبہ کو لینے نیچے تک گئی تھی۔ اس کی گاڑی سے ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا اس لیے وہ پھنس گئی تھی۔ خود اسے بھی چھوٹی موٹی چوٹیں آئی ہیں۔“ مونا نے ان سے بہانہ کیا۔

”یا اللہ خیر! مجھے تو پہلے ہی اتنی سی لڑکی کو گاڑی دلانا کھٹکا تھا۔ لاؤ دیکھوں تو ذرا بچی کو۔“ بوا سینے پر ہاتھ رکھ کر بولیں اور عروبہ کے کمرے کی طرف لپکیں۔

”میں نے اسے دوا کھلا کر سلا دیا ہے بوا! آپ فکرمند نہ ہوں۔ زیادہ چوٹیں نہیں آئی ہیں، بس وہ ڈر گئی ہے۔ رات بھر آرام کرے گی تو ٹھیک ہو جائے گی۔“ مونا نے انہیں روکا۔

”ایک نظر دیکھ تو لوں۔“ بوا نے کہا اور کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ عروبہ دوسری طرف کروٹ لیے لیٹی تھی اس لیے انہیں اس کی شکل نظر نہیں آئی۔ بہرحال انہیں یہ اطمینان ہوگیا کہ وہ گھر واپس آچکی ہے۔

”ابھی تو بہت رات ہوگئی ہے۔ صبح میں فون کر کے تمہارے ماں باپ کو خبر دیتی ہوں۔“ بوا نے لاؤنج میں واپس آکر اپنے ارادے کا اظہار کیا۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے انہیں پریشان کرنے کی۔“ مونا نے فوراً انہیں ٹوکا۔

”ارے واہ ......ضرورت کیسے نہیں ہے۔ اکیلی لڑکیوں کی ذمے داری میرے سر پر ہے۔ کل کلاں کو اس سے بھی بڑی کوئی بات ہوگئی تو میں کیا جواب دوں گی انہیں۔“ بوا بھی ترکی بہ ترکی بولیں۔

”اتنی بھی پریشان نہ ہوں بوا! گاڑی چلانے والوں کے ساتھ ایسے چھوٹے موٹے حادثات ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ڈیڈی کے دو تین ایکسیڈنٹ تو مجھے بھی اچھی طرح یاد ہیں۔ خوامخواہ آپ عروبہ کے بارے میں بتا کر ہمیں گاڑی سے محروم کر دیں گی اور ہمیں دوبارہ دھوپ اور گرمی میں کالج

کے کھچاڑا پوائنٹ میں بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھنس کر آنا پڑے گا۔" وہ اندر سے بہت پریشان تھی۔ اسے ڈر تھا کہ اگر یہ معاملہ کھلا تو اس کے اس سارے چکر میں ملوث ہونے کی بات بھی کھل سکتی ہے اس لیے کوشش کر رہی تھی کہ ماں باپ تک کوئی بات پہنچنے ہی نہ پائے۔ وہ بوا کی لاڈلی تھی چنانچہ آخرکار ان سے اپنی بات منوانے میں کامیاب ہو ہی گئی۔ بوا کی طرف سے اطمینان ہونے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آئی اور اطہر کا نمبر ملایا۔ کئی گھنٹیوں کے بعد اس نے کال ریسیو کی تو اس کا لہجہ خمار آلود تھا۔

"تم نے عروبہ کے ساتھ کیا کیا ہے اطہر! تم نے تو کہا تھا کہ اس کو کچھ دیر روک کر صرف زبانی ڈراؤ دھمکاؤ گے اور اس کے ساتھ دو چار تصویریں کھنچوا کر اسے دوستی کے لیے بلیک میل کرو گے لیکن تم نے تو اس کے ساتھ بہت برا کیا۔"

عروبہ اور سلیمہ سے انتقام لینے کی دھن میں وہ اطہر کے ساتھ شامل ہو گئی تھی لیکن انتقام کی یہ انتہا اس کے ذہن میں بھی نہیں تھی۔ وہ تو بس عروبہ اور عباس کی منگنی ختم کروا کر دونوں ماں بیٹی کو سبق سکھانا چاہتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اطہر کے ساتھ عروبہ کا اسکینڈل منگنی ٹوٹنے کے لیے کافی تھا۔ اس کی کم عمری اور ناتجربہ کاری اطہر جیسے گھاگ شکاری کی اصل حقیقت کو پہچان ہی نہیں سکی تھی۔ کہنے کو اطہر ان کا کلاس فیلو تھا لیکن عمر میں وہ ان سے کافی بڑا تھا۔ لاڈلا ہونے کی وجہ سے والدین نے اسے تاخیر سے اسکول میں داخل کروایا تھا۔ ابتدائی کلاسوں میں وہ دو تین بار فیل بھی ہوا تھا پھر اس کے والد نے اپنے پیسے کے بل پر اس بات کا انتظام کر دیا کہ وہ کبھی فیل نہ ہونے پائے۔ باپ کی مہربانیوں سے وہ اہل نہ ہوتے ہوئے بھی میڈیکل کالج کا طالب علم تھا اور یہاں بھی اس نے اپنی آوارگی کی روش کو قائم رکھا ہوا تھا۔ اب بھی اس نے مونا کی بات سن کر ایک قہقہہ لگایا اور مکاری سے بولا۔

"تم بہت بھولی ہو مونا ڈارلنگ! اتنا رسک لے کر لڑکی کو اس لیے کون کڈنیپ کرتا ہے کہ صرف ڈرا دھمکا کر چھوڑ دے۔ میں نے اور میرے دوستوں نے آج جو مزے کیے اس کے لیے تمہارا اسپیشل تھینکس۔ اس کے بدلے میں، میں تمہیں بہت دھانسو پکچرز سینڈ کروں گا۔ ان پکچرز کو دیکھنے کے بعد عباس تو کیا کوئی بھی عروبہ سے شادی نہیں کرے گا۔" اسے مونا نے کافی کچھ بتا رکھا تھا اس لیے وہ ایسی بات کہہ رہا تھا۔

"تم نے اچھا نہیں کیا اطہر......" مونا کو اس سے خوف آیا۔ وہ محسوس کر سکتی تھی کہ بات کرتے ہوئے اطہر نشے میں ہے۔

"میں نے اچھا کیا یا برا اس کو رہنے دو بے بی! بس یہ یاد رکھنا کہ اگر تم نے اپنا منہ کھولا تو تمہارے ساتھ تمہاری بہن سے بھی زیادہ برا ہو سکتا ہے۔" اطہر نے اسے دھمکی دے کر لائن کاٹ دی۔ اس کا لہجہ اتنا سنگین تھا کہ مونا اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے کانپ گئی۔ وہ ویسے ہی اس سارے سلسلے میں اپنا نام آنے سے خوف زدہ تھی، اطہر کی دھمکی کے بعد تو اس نے اپنے ہونٹ بالکل سی لینے کا فیصلہ کر لیا مگر ایک احساسِ جرم تو بہر حال تھا، اسی سے مجبور ہو کر وہ عروبہ کے کمرے میں آ گئی۔ وہ دوا کے زیرِ اثر سو رہی تھی لیکن اس کے چہرے پر درد کی داستان لکھی تھی۔ مونا نے پوری رات اسی کمرے میں سوتے جاگتے گزاری۔ صبح کے قریب عروبہ کی آنکھ کھلی تو وہ بری طرح کراہ رہی تھی۔ مونا نے چیک کیا تو اسے بخار تھا۔ اس نے زبردستی عروبہ کو بخار کی دوا اور پین کلر دی۔ ٹرنکولائزر کا اثر ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ ان دواؤں کو کھانے کے بعد وہ تھوڑی دیر میں دوبارہ سو گئی۔ مونا بھی اس کے برابر میں ہی لیٹ گئی۔ صبح کالج جانے کے وقت بوا نے کمرے میں جھانکا تو دونوں بہنوں کو سوتے دیکھ کر وہاں سے ہٹ گئیں اور اپنے معمول کے کام نمٹانے لگیں۔ انہیں کالج جانے سے زیادہ بچیوں کا ایک دن آرام کر لینا زیادہ ضروری معلوم ہوا تھا۔ کافی دن چڑھنے کے بعد مونا ہی کی آنکھ پہلے کھلی۔ وہ کچھ سوچ کر کمرے سے باہر آئی۔

"بہت سوئیں بیٹا آج۔ ناشتے میں کیا کھاؤ گی بتا دو؟ عروبہ بیٹی نہیں اٹھی کیا ابھی تک؟" اسے دیکھتے ہی بوا نے بولنا شروع کر دیا۔

"ناشتے کو چھوڑیں بوا۔ چائے کے ساتھ سلائس لے لیں گے۔ آپ ایسا کریں کہ آج لنچ زوردار سا بنا دیں تاکہ ہم چھٹی کو انجوائے کر سکیں۔"

"کیا کھاؤ گی بیٹا بتا دو...... میں تیار کر دوں گی۔" بوا اس کی فرمائش سن کر نہال ہو گئیں۔ اس نے فوراً دو تین ایسی ڈشز کے نام بتا دیے جنہیں بنانے میں بوا کو کافی وقت لگتا۔

"ٹھیک ہے۔ میں ابھی سودا لے کر آتی ہوں۔" بوا فوراً کھڑی ہو گئیں۔ گھر کے کاموں کے علاوہ قریبی مارکیٹ سے روزمرہ گوشت سبزی لانا بھی ان کی ذمے داری تھی۔ مہینے کا راشن البتہ بہزاد احمد جب ملنے آتے تو خود ڈلوا کر جاتے تھے۔ بوا جیسے ہی سبزی لینے نکلیں، مونا نے عروبہ کے کمرے میں پہنچ کر اسے جگایا۔ وہ کافی نیند لے چکی تھی اس لیے جگانے پر فوراً اٹھ گئی۔ اس بار اسے حواس میں آنے میں بھی

دیر نہیں لگی اور اس نے محسوس کر لیا کہ اس کے ساتھ کچھ بہت برا ہوا ہے۔

"کک...... کیا ہوا ہے میرے ساتھ؟" وہ عالمِ وحشت میں اپنے جسم کو ٹٹولنے لگی۔ مونا نے اس کا لباس تبدیل کروا دیا تھا لیکن ٹوٹتے جسم کی بھی تو اپنی ایک کہانی تھی۔

"رات میرے موبائل پر ایک ان نون نمبر سے کال آئی اور بتایا گیا کہ تم باہر اپنی گاڑی میں پڑی ہو۔ میں بہت مشکل سے تمہیں اوپر لے کر آئی تھی۔ اب تم بتاؤ کہ کیا ہوا تھا۔ رات کو تم انیلا کے گھر مجھے لینے بھی نہیں پہنچی تھیں۔" اپنی جان بچانے کے لیے مونا مکمل انجان بن گئی۔ عروبہ کو البتہ یاد آنے لگا کہ اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ اغوا کرنے والوں نے اسے مسلسل بے ہوش رکھا تھا اس لیے وہ ان کے چہرے نہیں دیکھ سکی تھی۔ وہ مونا کو اپنے اغوا کے بارے میں بتاتے ہوئے سسک پڑی۔

"اب...... اب کیا کرو گی تم...... کیا مما اور ڈیڈی کو بتاؤ گی؟" مونا نے تشویش سے پوچھا۔

"بتانا تو پڑے گا۔" عروبہ سسکیوں کے درمیان بولی۔

"اگر بتا دیا تو ہمیں اپنی تعلیم چھوڑ کر واپس حیدرآباد جانا پڑے گا۔ تم ان لوگوں کو پہچانتی بھی نہیں جنہوں نے تمہیں اغوا کیا تھا۔ ان کے خلاف ہم کچھ نہیں کر سکیں گے لیکن ہمارا فیوچر خراب ہو جائے گا۔ بدنامی الگ ہو گی جس کی وجہ سے عباس سے تمہاری منگنی بھی ختم ہو جائے گی۔" وہ پوری کوشش کر رہی تھی کہ عروبہ اس معاملے میں اپنی زبان بند رکھے۔

"میں نے بوا کو بھی کچھ پتا نہیں چلنے دیا ہے۔ ان سے بہانہ کر دیا ہے کہ تمہاری گاڑی سے کوئی ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے جس کی وجہ سے تم شاک میں ہو۔ تمہیں چھوٹی موٹی چوٹیں لگنے کا بھی بتایا ہے انہیں۔ ابھی وہ سودا لینے کے لیے گھر سے باہر گئی ہوئی ہیں۔ تم اس دوران میں خود کو سنبھال لو اور نہا کر فریش ہو جاؤ تو میرا بہانہ چل سکتا ہے۔" اس نے عروبہ کو اس انداز میں سمجھایا کہ وہ اس کی بات ماننے پر مجبور ہو گئی۔ نیم گرم پانی سے نہا کر اس کی حالت میں کچھ بہتری آئی تھی لیکن بہر حال وہ جس درندگی کا نشانہ بنی تھی، اس کے اثرات ایسے ہی جانے والے نہیں تھے۔ جسم اب بھی درد سے ٹوٹ رہا تھا۔ مونا نے اسے چائے کے ساتھ سلائس کھانے کے لیے دیے۔ اس نے مشکل سے آدھا سلائس حلق سے نیچے اتارا اور پین کلر کھا کر دوبارہ لیٹ گئی۔ بوا سودا لے کر آئیں تو تھوڑی دیر اس کے پاس ٹھہر کر اس کا حال پوچھا اور پھر خصوصی کھانے کی تیاری کے لیے کچن میں گھس گئیں۔ عروبہ سارا دن بستر پر پڑی سسکتی رہی۔ مونا وقفے وقفے سے اس کے کمرے میں آ کر اس کی دلجوئی کرنے کے ساتھ ساتھ اسے سمجھاتی بجھاتی بھی رہی۔ بوا کو البتہ وہاں جھانکنے کی فرصت نہیں تھی۔ بہت دیر بعد جب وہ کھانا پکا کر فارغ ہوئیں تو اس وقت تک عروبہ کو تیز بخار چڑھ چکا تھا اس لیے اس کے کھانا کھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مونا نے بھی پریشانی میں ذرا سا ہی کھایا۔ بوا بڑبڑاتی رہ گئیں کہ جب کسی کو کھانا ہی نہیں تھا تو اتنا خرچہ اور محنت کیوں کروائی گئی۔ "کیوں" کا جواب جسے معلوم تھا وہ اس وقت اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کے لیے اپنی ساری توانائیاں صرف کرنے میں مصروف تھی۔

امینہ بہزاد احمد عرف مونا کو عروبہ کے ساتھ ہونے والے ظلم سے بھی زیادہ اس بات کی فکر تھی کہ کسی طرح یہ معاملہ دب جائے لیکن قدرت نے کچھ اور طے کر رکھا تھا۔

☆☆☆

وہ اب تک صہیب کے پروپوزل کے بارے میں بے یقینی کا شکار تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس اچھے خاصے ہینڈسم، ویل آف اور خاندانی لڑکے نے اسے کیوں پروپوز کیا ہے؟ اس پر سے اس کا دعویٰ تھا کہ وہ اس کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے لیکن وہ اس کے بارے میں کیا جان سکتا تھا؟ اسے زیادہ سے زیادہ یہی معلوم ہوگا کہ وہ ایک بے سہارا عورت ہے جو اپنی بچی کے ساتھ دارالامان میں رہتی ہے۔ بچی کیسے اس کی زندگی میں آئی؟ یہ وہ نہیں جان سکتا تھا۔ جان لیتا تو کبھی اس کو پروپوز نہیں کرتا۔ خوب صورتی سے متاثر ہو کر عورت کو اپنانے کا خواہش مند مرد اور تو بہت سی باتوں پر سمجھوتا کر سکتا ہے لیکن عورت کی پاکیزگی اور شفافیت پر سمجھوتا کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ ایک دفعہ تو اس کے دل میں آیا بھی کہ نور فاطمہ کے اچھے مستقبل کی خاطر صہیب سے سچ چھپا لے لیکن پھر اسے یہ ممکن نہیں لگا۔ میاں بیوی کا رشتہ جھوٹ کی بنیاد پر نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ جو مرد آج جذبات میں اس کے بارے میں "کچھ" نہیں جاننا چاہتا تھا، کل وہ اس سے "کچھ" بھی پوچھ سکتا تھا۔

"کیا بات ہے امینہ! تم آج کل کچھ ڈسٹرب لگ رہی ہو۔ کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ۔" میڈم نیازی نے اس کی الجھن محسوس کر کے ایک دن اسے ٹوک ہی دیا۔ ان کے خلوص اور دیانتداری کی وہ خود بھی قائل ہو چکی تھی اس لیے انہیں صہیب کے بارے میں بتانے میں حرج نہ سمجھا۔

"صہیب کی فیملی کو میں پرسنلی جانتی ہوں۔ اس لیے میں سمجھتی ہوں کہ تمہیں اس پروپوزل کو ریجیکٹ کرنے کے

بجائے اس پر غور کرنا چاہیے۔ اگر وہ تمہیں اپنانے کی بات کر رہا ہے تو کچھ سوچ کر ہی کر رہا ہوگا۔'' ساری بات سن کر میڈم نیازی نے اسے مشورہ دیا۔

''آپ کو میرے ماضی کے بارے میں علم نہیں ہے میڈم! میں نہیں سمجھتی کہ صہیب مجھے میرے ماضی سمیت قبول کرسکتا ہے۔'' اس نے آہستہ سے انہیں جواب دیا۔

''اس سلسلے میں تم اس سے بات کرسکتی ہو۔ میں تم دونوں کی ایک میٹنگ ارینج کروا دیتی ہوں۔ تم پہلے اپنے سارے خدشات دور کرلو پھر کوئی فیصلہ کرنا۔'' انہوں نے اسے مشورہ دیا۔

''ٹھیک ہے جیسا آپ کہیں۔'' اس نے بھی زندگی کے دیے اس موقع کو آزمانے کا فیصلہ کرلیا۔

☆☆☆

روح پر لگے زخموں کا تو کوئی علاج نہیں تھا البتہ جسمانی طور پر عروبہ ہفتہ بھر میں کسی حد تک سنبھل ہی گئی۔ اس عرصے میں مونا مسلسل اس کی برین واشنگ کرکے اسے یہ سمجھاتی رہی تھی کہ جو ہوگیا اس کا اظہار کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا، الٹا وہ دونوں اپنی تعلیم سے محروم ہوجائیں گی۔ عروبہ کو بھی اس کی بات میں وزن محسوس ہو رہا تھا۔ وہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ راہ چلتے غنڈوں کا کارنامہ تھا یا کسی نے اس سے دشمنی نکالی تھی۔ دشمنی کے خیال سے ذہن میں صرف اطہر کا نام آتا تھا لیکن پھر یہ سوچ کر رہ جاتی تھی کہ کالج میں ہونے والی معمولی جھڑپوں کا اس انتہا پر جاکر کیونکر انتقام لیا جاسکتا ہے۔ ہفتہ بھر گھر میں پڑی وہ انہی معاملات پر سوچتی رہی اور آخرکار اس نے بھی یہی فیصلہ کیا کہ جو کچھ ہوچکا ہے، اسے بھلا کر نئے سرے سے زندگی کا آغاز کرے۔ ہفتے بھر کی چھٹی کے بعد وہ کالج پہنچی تو اساتذہ سمیت سب ہی نے اس کا حال دریافت کیا۔ مونا نے وہاں سب کو یہی بتایا تھا کہ عروبہ کو ٹائیفائڈ ہوگیا ہے۔ اس کے چہرے پر کھنڈی زردی اور کمزوری اس بات کی تصدیق بھی کررہی تھی۔ حال پوچھنے والوں میں اطہر بھی شامل تھا اور یوں انجان بنا ہوا تھا جیسے کسی بات کی خبر ہی نہ ہو۔ مونا کو البتہ اس نے عروبہ کی نظر بچا کر آنکھ ماری تھی جس پر اس نے گھبرا کر اپنا رخ بدل لیا تھا۔ وہ اطہر سے اب کسی طرح کا بھی واسطہ نہیں رکھنا چاہتی تھی لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ اس نے جس پنڈورا بکس کو کھول دیا تھا، اس میں سے ابھی اور بھی مصیبتیں برآمد ہونی تھیں۔ عروبہ کے دوبارہ کالج جانا شروع کرنے کے بعد پانچویں دن کی بات تھی ابھی وہ دونوں نیند سے نہیں جاگی تھیں کہ مونا کے فون پر اطہر کی کال آگئی۔ وہ نیند میں تھی اس لیے نمبر دیکھے بغیر کال ریسیو کرلی۔

''تمہیں جو تصویریں چاہیے تھیں، وہ میں نے سوشل میڈیا پر اپ لوڈ کردی ہیں۔ بڑی شاندار تصویریں ہیں۔ عباس سے عروبہ کی منگنی تو لازمی ٹوٹ جائے گی۔'' اپنی بات کے اختتام پر اس نے ایک خبیثانہ قہقہہ لگایا اور سلسلہ منقطع کردیا۔ مونا ہڑبڑا کر اپنی جگہ سے اٹھی اور نیٹ کھول کر دیکھا۔ جلد ہی اس نے وہ تصویریں دیکھ لیں۔ وہ شرمناک تصویریں تھیں اور کمال یہ تھا کہ ان تصویروں میں موجود کسی بھی مرد کو شناخت نہیں کیا جاسکتا تھا۔ مونا ان تصویروں کو دیکھ کر کانپ گئی اور اپنی جگہ سن بیٹھی رہی۔ اپنی اس کیفیت میں اسے اندازہ بھی نہیں ہوا کہ کب عروبہ اسے پکارتی ہوئی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ وہ اس کی زوردار چیخ پر چونکی اور پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ اپنی جگہ کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ مونا نے جلدی سے اسے سہارا دے کر بستر پر بٹھایا۔ تسلی کے لیے کوئی لفظ نہیں تھا۔ وہ دونوں ہی اندازہ کرسکتی تھیں کہ بدنامی گھر گھر پہنچ چکی ہوگی۔ ان تصویروں کو دیکھنے کے بعد تو وہ کالج جانے کی ہمت بھی نہیں کرسکتی تھیں اس لیے گھر میں ہی رکی رہیں۔ بوا نے ناشتے کا پوچھا تو اس سے بھی انکار کردیا۔ کچھ دیر گزری تو دونوں کے موبائل فونز بجنا شروع ہوگئے اور پھر وقفے وقفے سے بجتے ہی چلے گئے۔ یہ ان کے کلاس فیلوز اور دیگر جاننے والوں کی فون کالز تھیں اور وہ دونوں جانتی تھیں کہ فون کرنے والے ان تصویروں کے بارے میں تصدیق کے لیے ہی فون کررہے ہیں۔ اس لیے انہوں نے کوئی کال ریسیو نہیں کی؟ انہیں کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اس صورت حال میں وہ کیا کریں۔ بس کبوتر کی طرح آنکھیں بند کیے بیٹھی تھیں۔ دوپہر بارہ بجے کے قریب دروازے کی گھنٹی بجی تو وہ دونوں بری طرح چونکیں۔ بوا نے دروازہ کھولا اور بہزاد احمد اور سلیمہ اندر داخل ہوئے۔ ان دونوں کی صورتوں سے ظاہر تھا کہ وہ اتنی اچانک وہاں کیوں آئے ہیں۔ سلیمہ نے تو اندر داخل ہوتے ہی عروبہ کو گالیوں اور کوسنوں کے ساتھ بری طرح پیٹنا شروع کردیا۔ بہزاد احمد بھی گرجتے برستے رہے۔ ان کی ساری تقریر کا لب لباب یہ تھا کہ عروبہ نے جو کالک ان کے چہرے پر ملی ہے اس کے لیے وہ اسے کبھی معاف نہیں کریں گے۔ سلیمہ، عروبہ کو مار مار کر تھکنے کے بعد جب ایک طرف بیٹھیں تو بہزاد احمد نے فیصلہ سنا دیا۔

''تمہیں اپنی بیٹی یا مجھ میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا سلیمہ بیگم۔ میں گندگی کی اس پوٹ کو ہرگز بھی اپنے ساتھ

اپنے گھر لے کر نہیں جاؤں گا۔'' سلیمہ لاکھ گڑگڑائیں اور التجائیں کیں لیکن بہزاد احمد ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ جس سوتیلے پن کا انہوں نے اتنے برسوں میں اظہار نہیں کیا تھا، وہ آج کھل کر سامنے آگیا۔ انہوں نے واضح الفاظ میں کہہ ڈالا۔

''تمہاری بیٹی کی وجہ سے میری بیٹی نے ہمیشہ بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ میری بیٹی نے اس کے ساتھ اپنا باپ، گھر اور ساری چیزیں بانٹیں، تمہیں اپنی ماں کی جگہ اپنے گھر میں برداشت کیا اور نتیجہ کیا نکلا۔ یہ لڑکی عباس کو لے اڑی حالانکہ میرے بھانجے پر سب سے پہلے میری بیٹی کا حق بنتا تھا۔ میں اس بات کو بھی برداشت کرلیتا لیکن اب کچھ برداشت کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ تمہیں معلوم ہے اتنی بدنامی کے بعد اب مونا بھی میڈیکل کالج میں نہیں پڑھ سکے گی۔ مجھے اسے اپنے ساتھ واپس حیدرآباد لے جانا پڑے گا۔ اس کا تعلیمی کیریئر برباد ہونے کے ساتھ ساتھ آگے بھی کئی مشکلات سامنے کھڑی ہیں۔ اتنی بدنامی کے بعد، میں کہاں سے اپنی بچی کے لیے اچھا بر ڈھونڈوں گا۔ تمہاری بیٹی نے تو سب کچھ برباد کرکے رکھ دیا سلیمہ بیگم۔'' بہزاد احمد جنہوں نے اتنے برسوں میں خود کو ایک خوش اخلاق اور منصف مزاج انسان ثابت کیا تھا، آج بالکل آنکھیں بدل بیٹھے تھے اور صرف مونا کے باپ بن کر سوچ اور بول رہے تھے۔ ماں کی مار سے ادھ موئی ہوکر ایک کونے میں پڑی عروبہ میں تو کچھ بولنے کا حوصلہ ہی نہیں تھا۔ مونا بھی چپ بیٹھی ہوئی تھی۔ عروبہ کے حق میں صفائی پیش کرکے وہ اپنی جان مصیبت میں نہیں ڈال سکتی تھی۔ ویسے بھی وہاں کوئی صفائی طلب ہی نہیں کررہا تھا۔ بہزاد احمد غصے سے بھرے ہوئے آئے تھے اور سلیمہ کو بھی راستے بھر انہوں نے اتنا زچ کیا تھا کہ انہوں نے عروبہ سے حقائق جاننے کی کوشش ہی نہیں کی تھی اور آتے ہی اسے مارنا شروع کردیا تھا لیکن بہرحال وہ اس کی ماں تھیں اس لیے بہزاد احمد سے ان کا فیصلہ بدلنے کے لیے التجائیں کرنے لگیں۔

''نہیں سلیمہ بیگم...... میرا فیصلہ اٹل ہے۔ تمہیں بیٹی اور مجھ میں سے لازماً ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔'' وہ بالکل کٹھور بن گئے تھے اور سلیمہ کے پاس انتخاب کی گنجائش نہیں تھی۔

حیدرآباد سے کراچی آتے ہوئے راستے میں ہی ان کے بڑے بھائی کا فون ان کے موبائل پر آیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا۔ ''اگر بہزاد احمد تمہاری بیٹی کے کارنامے کے بعد تم ماں بیٹی کو اپنے گھر سے نکال دے تو اپنی بیٹی کو لے کر ہمارے گھر کا رخ نہیں کرنا۔ ہمارے گھر کے دروازے تم دونوں کے لیے ہمیشہ بند رہیں گے۔'' شوہر کے گھر سے نکل کر میکے جانے کی راہ بھی بند تھی تو پھر وہ جوان بیٹی کو لے کر کہاں جاتیں لیکن بیٹی کہاں جاتی؟ یہ بھی تو ایک سوال تھا جو انہوں نے بہزاد احمد کے سامنے رکھ دیا۔

''میری طرف سے جہنم میں جائے۔'' وہ سرد مہری سے بولے اور باہر نکل گئے۔ اس موقع پر اب تک خاموش تماشائی بنی کھڑی بوا سلیمہ کے قریب آئیں اور انہیں مشورہ دیا کہ فی الحال عروبہ کو کسی دارالامان میں چھوڑ دیں، بعد میں بہزاد احمد کا غصہ اترنے کے بعد اس کی گھر واپسی کی راہ ہموار کی جاسکتی ہے۔ سلیمہ کو ان کا یہ مشورہ مناسب لگا اور انہوں نے بے جان سی پڑی عروبہ کو بازو سے پکڑ کر بے دردی سے کھڑا کردیا۔ وہ درد بھرے لہجے میں مما مما پکارتی رہ گئی اور وہ اسے اپنے ساتھ گھسیٹتی ہوئی باہر لے گئیں۔ نکلتے نکلتے عروبہ نے مونا کے بستر پر پڑا اپنا موبائل جانے کس امید کے سہارے اٹھالیا۔ بوا اور سلیمہ اسے ٹیکسی میں بٹھا کر دارالامان تک لے گئیں اور خود نیچے اترنے کے بجائے اسے اتار کر انگلی سے دارالامان کے گیٹ کی طرف اشارہ کردیا تھا۔

''کسی کو اپنا نام پتا مت بتانا اور بھول جانا کہ تمہارا کوئی ماضی تھا۔ اگر ہوسکا تو میں کسی دن خود تمہیں لینے آجاؤں گی۔'' ٹیکسی آگے بڑھنے سے پہلے سلیمہ نے اسے آخری نصیحت کی تھی۔ اس نے دور ہوتی ٹیکسی اور دارالامان کے گیٹ کو باری باری دیکھا اور آخری بار اپنی قسمت آزمانے کا فیصلہ کرکے عباس کا نمبر ڈائل کیا۔

''عروبہ! اتنا سب کرنے کے بعد تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھے کال کرنے کی۔ میں پہلے بھی تمہارے بارے میں بہت کچھ سن کر نظرانداز کرتا رہا ہوں لیکن اب کوئی گنجائش باقی نہیں ہے۔ میری طرف سے ہمارا رشتہ ختم سمجھو۔'' اسے کچھ بولنے کا موقع دیے بغیر ہی عباس نے کہا اور کال منقطع کردی۔ یقیناً یہ پاکستان میں مقیم مشترکہ رشتے داروں کا کارنامہ تھا کہ چند گھنٹوں کے اندر اندر عباس بھی وہ تصویریں دیکھ چکا تھا۔ عروبہ نے اس کا فیصلہ سنا اور ہاتھ میں تھاما سیل فون دارالامان کی دیوار کے ساتھ بہتے نالے میں اچھال دیا۔ دارالامان کے گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہوئے وہ اپنا ہر رشتہ پیچھے چھوڑ چکی تھی لیکن پھر بھی پتا نہیں کیسے میڈم نیازی کے نام پوچھنے پر اس کے لبوں پر امینہ نام آگیا تھا اور اب وہ امینہ بن کر ہی جی رہی تھی۔

☆☆☆

''میڈم نیازی نے بتایا کہ آپ کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے مجھ سے ایک ملاقات کرنا چاہتی ہیں اس لیے میں یہاں

حاضر ہوگیا ہوں۔ آپ پوچھیے، آپ کو مجھ سے کیا پوچھنا ہے؟'' ملاقاتیوں کے کمرے میں صہیب اس کے روبرو بیٹھا اس سے پوچھ رہا تھا۔ اس نے دلکش شخصیت کے مالک صہیب کو پلکیں اٹھا کر ایک نظر دیکھا اور ایک بار پھر حیران ہوئی کہ یہ اتنا شاندار شخص اس کا طلب گار کیوں ہے؟

''مجھے آپ سے کچھ پوچھنا نہیں بلکہ آپ کو اپنے بارے میں کچھ بتانا ہے۔'' اپنی نظروں کو صہیب پر سے ہٹا کر اس نے اپنے ہاتھوں پر مرکوز کیا اور پھر آہستہ سے بولی۔

''لیکن میں نے تو آپ سے آپ کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔''

''میں نہیں جانتی کہ آپ نے مجھ سے شادی کا فیصلہ کس بنیاد پر کیا ہے لیکن میں یہ سمجھتی ہوں کہ اتنا اہم فیصلہ کرتے ہوئے فریقین کو ایک دوسرے کے بارے میں ہر بات کا علم ہونا چاہیے تاکہ بعد میں مسائل پیدا نہ ہوں۔''

''میں آپ کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں عروبہ! آپ مجھے کچھ مت بتائیں۔'' یہ چھوٹا سا جملہ ادا کرتے ہوئے صہیب کی آواز میں آنسوؤں کی نمی گھلی ہوئی تھی۔ وہ اس کے لہجے کا بھیگا پن محسوس کرنے کے بجائے اس کے منہ سے اپنا نام سن کر بری طرح چونکی۔

''آپ میرا نام کیسے جانتے ہیں؟''

''کاش نہ جانتا۔ میں نے اپنی ہستی کا غرور کھو کر آپ کو جانا ہے۔ آپ وہ لڑکی ہیں جس کی وجہ سے میں روز مر مر کر جیتا رہا ہوں اور جس کا سامنا کرنے سے خوف زدہ ہونے کے باوجود میں نے ہر روز جس سے ملنے کی دعا کی ہے۔'' وہ کیا کہہ رہا تھا اسے بالکل سمجھ نہیں آرہی تھی، بس کسی انہونی کے احساس سے جسم کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے تھے۔

''آپ نے ابھی کہا تھا نا کہ شادی جیسا اہم فیصلہ کرنے سے پہلے فریقین کو ایک دوسرے کے بارے میں ہر بات کا علم ہونا چاہیے۔ میں آپ کے بارے میں سب جانتا ہوں اور آپ کو اپنے بارے میں بتانا چاہتا ہوں کہ......'' اس کی کیفیت سے انجان تسلسل سے بولتا ہوا وہ ایک ثانیے کے لیے یوں رکا جیسے جو کہنا ہو اسے زبان سے ادا کرنا دشوار محسوس ہو رہا ہو۔ اسی دشواری کے سبب اس نے اپنی زبان کی نوک پر موجود جملے کو روک لیا اور دوسرے ڈھنگ سے اپنی بات کہنا شروع کی۔

''میرے بارے میں آپ کو علم ہوگا کہ میں ایک ویل آف فیملی سے تعلق رکھتا ہوں، ہماری کلاس میں اکثر بہت سی ایسی باتوں کو جائز سمجھا جاتا ہے جو مذہب اور اخلاق دونوں کے دائرے سے باہر ہوتی ہیں لیکن اللہ کے فضل سے میرے گھر کا ماحول بہت مختلف ہے۔ ایسا میرے دادا اور دادی کی تربیت کی وجہ سے ہے لیکن میرا جن لوگوں سے میل جول رہتا ہے، ان میں زیادہ تر ہائی سوسائٹی کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ میرے ہم عمر لڑکوں میں سے بھی کئی ایسے ہی تھے۔ شراب پینا، گرل فرینڈز بنانا، موج مستی کرنا سب ان کی ہابیز تھیں۔ وہ اکثر میرا مذاق اڑاتے تھے کہ میں کیسی بور لائف گزار رہا ہوں۔ میں ان کے مذاق اڑانے پر جھینپ جاتا تھا لیکن کبھی ان کی ایکٹیویٹیز میں شامل ہونے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ یہ پچھلے سال میرے ایگزامز سے فارغ ہونے کے بعد کی بات ہے۔ میرے ایک دوست نے مجھے کال کرکے بلایا کہ دوسرے دوستوں کے ساتھ کچھ موج مستی کا پروگرام ہے، میں بھی انہیں جوائن کرلوں۔ میں فارغ تھا اس لیے اس کی کال پر چلا گیا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ ایک اپارٹمنٹ میں لے گیا۔ اس کا کہنا تھا کہ باقی لوگ بھی وہیں آئیں گے اور اس کے بعد کہیں تفریح کے لیے نکلیں گے۔ انتظار کا وقت گزارنے کے لیے وہ گلاسوں میں کولڈ ڈرنک لے آیا۔ اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس نے کولڈ ڈرنک میں کچھ اور بھی ملا رکھا ہے۔ میں نے وہ کولڈ ڈرنک پی لی اور نشے کا عادی نہ ہونے کی وجہ سے بہت جلد ترنگ میں آگیا۔ اس ترنگ میں مجھے اپنے انسان سے حیوان بننے کا احساس بھی نہ ہوسکا اور میں اس لڑکی کی زندگی برباد کرنے میں ان لوگوں کے ساتھ شریک ہوگیا جسے وہ کچھ دیر بعد ہی بے ہوشی کی حالت میں وہاں لائے تھے۔ میں اتنا مدہوش تھا کہ مجھے یہ بھی پتا نہیں چل سکا کہ بعد میں انہوں نے اس لڑکی کے ساتھ کیا کیا۔ اگلے دن ہوش میں آنے کے بعد ان لوگوں نے مجھے میری اور اس لڑکی کی ویڈیو دکھائی تو میں ندامت سے زمین میں گڑ گیا لیکن ان لوگوں کو برا بھلا کہنے کے سوا کچھ نہیں کرسکا۔ انہوں نے بہت چالاکی سے مجھے ٹریپ کیا تھا۔ انہیں اپنی عیاشیوں کے لیے ہمیشہ لمبی رقوم کی ضرورت رہتی تھی اور وہ گھر سے ملنے والے کھلے جیب خرچ کے باوجود تنگی کا شکار ہوجاتے تھے اس لیے مزید رقم کے حصول کے لیے انہوں نے یہ راہ نکالی اور مجھے بلیک میل کرکے مجھ سے اچھی خاصی رقم وصول کرلی۔ اصل میں انہیں معلوم تھا کہ میں اپنی پاکٹ منی جمع کرکے ایک بہت شاندار سی کار لینا چاہ رہا ہوں اور میرے پاس ٹھیک ٹھاک رقم جمع ہوچکی ہے بس اسی کے حصول کے لیے انہوں نے یہ چکر چلایا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ انہوں نے صرف مجھے نشانہ نہیں بنایا ہے بلکہ اس لڑکی

سے بھی ان کا کوئی انتقام وغیرہ کا چکر تھا اس لیے انہوں نے اس کی تصویریں سوشل میڈیا پر ڈال دی تھیں اور وہ لڑکی جو میڈیکل کی اسٹوڈنٹ تھی، اس دن کے بعد سے اپنی بہن سمیت کبھی کالج میں دکھائی نہیں دی۔'' بہت دھیمی آواز میں اس نے جو داستان سنائی تھی، اسے سن کر وہ یوں بیٹھی تھی جیسے جسم میں جان ہی نہ ہو اور وہ پتھر کے مجسمے میں ڈھل گئی ہو۔

''آپ یہ سب سن کر سمجھ گئی ہوں گی کہ میرے اس دوست کا نام اطہر تھا اور میں آپ کے مجرموں میں سے ایک مجرم ہوں۔ اپنے جرم کا کفارہ ادا کرنے کے لیے میں بہت عرصے سے آپ کو تلاش کررہا تھا لیکن کامیاب نہیں ہو پارہا تھا۔ میں کالج ریکارڈ میں سے آپ کے حیدرآباد والے گھر کا ایڈریس حاصل کرکے وہاں بھی گیا تھا لیکن اس ایڈریس پر آپ کی فیملی موجود نہیں تھی۔ محلے والوں نے یہی بتایا کہ بہزاد احمد کا خاندان کسی کو اپنا اتا پتا دیے بغیر اچانک ہی وہاں سے کہیں اور شفٹ ہوگیا تھا۔ آپ کے نہ ملنے پر میرا ہر دن بڑے اضطراب میں گزر رہا تھا اور جب میں آپ کے ملنے کی طرف سے بالکل مایوس ہوگیا تھا تو اچانک آپ مجھے سونیا کی ٹیچر کی حیثیت سے نظر آگئیں۔ اپنی بہن سے معلومات حاصل کرنے پر مجھے پتا چلا کہ آپ دارالامان میں رہتی ہیں اور آپ کی ایک بیٹی بھی ہے، بس تب ہی میں نے فیصلہ کرلیا کہ آپ سے شادی کرکے اپنے جرم کا کفارہ ادا کروں گا۔ میں شاید آپ کو یہ سب بتانے کی ہمت نہ کر پاتا لیکن آپ کی ہمت اور دیانت داری کو دیکھتے ہوئے سچ کو چھپانے کی جرأت نہیں کرسکا اور سب کچھ آپ سے کہہ ڈالا۔ اب فیصلے کا اختیار آپ کے ہاتھ میں ہے کہ آپ مجھے اس کرب سے نجات دلاتی ہیں یا نہیں۔'' وہ بڑی آس سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن فی الحال وہ کچھ بھی کہنے کی حالت میں نہیں تھی چنانچہ بہت خاموشی سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں آپ کو ایک اطلاع اور دینا چاہتا ہوں۔'' اسے کھڑا ہوتا دیکھ کر صہیب جلدی سے بولا تو وہ اپنے قدم روک کر اپنی جگہ تھم گئی اور اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''اطہر اور اس کے دوست اس واقعے کے صرف تین مہینے بعد ہی ہلاک ہوگئے تھے۔ اطہر نشے کی حالت میں ہائی وے پر گاڑی چلاتے ہوئے گاڑی کو ایک ٹرالر کے سامنے لے آیا تھا اور ٹرالر نے گاڑی کو اس بری طرح روند دیا تھا کہ گاڑی میں سے کسی ایک کی لاش بھی سالم حالت میں نہیں نکالی جاسکی۔ یوں سمجھیے کہ ان کے جسموں کا قیمہ بن گیا تھا۔'' آخری جملہ ادا کرتے ہوئے صہیب نے جھرجھری سی لی۔ خود عروبہ کے سارے بدن میں کپکپی دوڑ گئی اور وہ بڑی مشکل سے اپنے قدموں کو گھسیٹتے ہوئے ملاقاتی کمرے سے باہر آگئی۔

☆☆☆

بستر پر بالکل چت لیٹی وہ چھت کو گھور رہی تھی۔ سفید چونا کی ہوئی سپاٹ چھت اس وقت اس کے لیے ایسی اسکرین بنی ہوئی تھی جس پر وہ اپنی پوری زندگی کی فلم دیکھ سکتی تھی۔ ماں کی طلاق کے بعد ماموؤں کے گھر گزاری ہوئی حسرت زدہ زندگی نے اس کے اندر تلخی کا جو بیج بویا تھا، وہ بہزاد احمد کے گھر میں آکر ایک تناور درخت بن گیا تھا۔ ایک طرف ماں کی اپنی مجبوریوں کے تحت خود پر کی گئی سختی اسے رلاتی تھی تو دوسری طرف مونا کی گھر میں حکمرانی اس کے لیے سوہانِ روح تھی۔ بہزاد احمد کے اپنے ساتھ اچھے رویے کے باوجود اس کا ننھا سا دل محبت کے اس فرق کو محسوس کرسکتا تھا جو اس کے اور مونا کے درمیان تھا۔ بہزاد احمد اس کا خیال رکھتے تھے لیکن وہ اس سے محبت نہیں کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ باپ کے پیار کے لیے ترستی ہی رہی تھی۔ اپنی اس محرومی کا انتقام مونا سے لینے کے لیے وہ چپکے چپکے اسے کوئی نہ کوئی نقصان پہنچاتی رہتی تھی اور وہ بھی اتنی خاموشی اور چالاکی سے کہ کبھی گرفت میں نہیں آئی تھی۔ سلیمہ نے اس کی پرورش بھی اس طرز پر کی تھی کہ اسے سازشوں کے جال بننا اور ہوشیاری سے اپنا مطلب نکال لینے کا گر آگیا تھا۔ فطری ذہانت نے بھی ان حالات میں پورا ساتھ دیا تھا چنانچہ وہ خود کو لوگوں کے سامنے ایک عمدہ امیج کے ساتھ پیش کرنے میں پوری طرح کامیاب رہی تھی۔ عباس سے منگنی اس کامیابی کا سب سے بڑا ثبوت تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ جس رشتے کے بننے کو وہ اپنی سب سے بڑی کامیابی سمجھ رہی ہے، وہی اس کے زوال کا سبب بن جائے گا اور ہر جگہ اس سے پیچھے رہ جانے والی مونا اپنی اس ناکامی کو قبول کرنے کے بجائے اس کے خلاف سازشیں کرنے لگے گی۔ افسوس کی بات یہ تھی کہ یہ سب اس وقت ہوا تھا جب وہ خود تبدیل ہونے لگی تھی۔ اپنے روشن اور تابناک مستقبل کی امید نے اس کے اندر بھی تلخی کو خود بخود ہی کم کرنا شروع کردیا تھا اور وہ سمجھداری سے کام لیتے ہوئے پہلی بار یہ سوچنے لگی تھی کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ اس کے نصیب میں لکھا تھا اور کم از کم بہزاد احمد یا مونا کا اس کی محرومیوں پر کوئی قصور نہیں تھا۔

سوچ کی اس تبدیلی میں فریال سے دوستی کا بھی بہت ہاتھ تھا۔ وہ دینی رجحان رکھنے والی، ایک مثبت سوچ کی حامل

لڑکی تھی جس کی صحبت میں خود اس کے اندر بھی مثبت تبدیلیاں آنے لگی تھیں۔ پڑھائی کی مصروفیت کی وجہ سے بھی دماغ اب ادھر ادھر کی فضول باتوں میں نہیں الجھتا تھا۔ اپنی اس تبدیلی میں اس نے مونا کی تبدیلی کو محسوس ہی نہیں کیا لیکن اب حساب کتاب کرتی تھی تو خود بخود واضح ہو جاتا تھا کہ مونا اس کے ساتھ کیا کرتی رہی تھی۔ عباس کے دل میں اس کے لیے میل ڈالنے سے لے کر اس کے اغوا تک وہ ہر سازش کا حصہ تھی لیکن جانے کیوں عروبہ کو اب اس پر غصہ نہیں آتا تھا بلکہ وہ بہت ہمدردی سے اس کے بارے میں سوچتی تھی۔ وہ سوچتی تھی کہ جو کچھ میرے ساتھ ہوا، وہ یقیناً ان سب سازشوں اور چالاکیوں کی سزا تھی جو میں نے کامیابی کے حصول کے لیے کیں اور اللہ پر بھروسا کرنے کے بجائے اپنی تقدیر سنوارنے کے لیے ہر جائز و ناجائز ترکیب لڑاتی چلی گئی اور اللہ نے عین اس وقت رسی کھینچ لی جب میں اپنے حساب سے سب کچھ پا چکی تھی۔ اسے خوف آتا تھا کہ اللہ نے اگر مونا سے بھی اسی کی طرح حساب لیا تو وہ نازوں میں پلی کیسے اس سختی کو سہہ سکے گی؟ خود وہ تو اپنی سوچ میں آنے والی تبدیلی کی وجہ سے سب کچھ سہہ گئی تھی اور اس نے تسلیم کر لیا تھا کہ وہ اپنی کرنی کا بھگتان ہی بھگت رہی ہے۔

اپنی غلطیوں کے احساس کے بعد اس نے جو کام سب سے زیادہ کیا تھا، وہ اللہ سے توبہ کرنے کا تھا۔ توبہ کے اس عمل میں وہ اتنی مصروف رہی تھی کہ اسے خود پر ظلم کرنے والوں کو بددعا تک دینے کا خیال نہیں آیا تھا لیکن اس رب نے ثابت کر دیا تھا کہ اس سے بڑھ کر کوئی منصف نہیں، اس نے مجرموں کو خود عبرت ناک انجام تک پہنچا دیا تھا۔ دولت، جوانی اور طاقت کے نشے میں چور ان سرکشوں کو اللہ کے عذاب نے ایسے پکڑا تھا کہ وہ دوسروں کے لیے عبرت کا نشان بن گئے تھے اور اسے ان شیطانوں کے انجام کی خبر دینے والا صہیب احسان اپنے انجانے میں کیے گئے جرم کا کفارہ دینے کے لیے خود اس کے روبرو حاضر ہو گیا تھا۔ اب اسے فیصلہ کرنا تھا کہ وہ صہیب احسان کو شرفِ قبولیت بخش کر اسے اس کے کرب سے نجات دلاتی ہے یا نہیں۔

اس وقت وہ اسی فیصلے کی کشمکش میں الجھی خود سے جواب طلب کر رہی تھی کہ پہلو میں سوئی ہوئی ننھی نور فاطمہ کسمسا کر رونے لگی۔ بچی کے رونے کی آواز پر وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی اور اسے گود میں اٹھا لیا۔ ہر ماں کی طرح وہ بھی سمجھ سکتی تھی کہ بچی کس ضرورت کی وجہ سے رو رہی ہے۔ وہ بھوکی تھی۔ اس نے اسے فیڈ کروایا تو وہ دوبارہ پُرسکون ہو کر سو گئی۔ یوں بھی وہ بہت سکون والی بچی تھی اور بہت کم تنگ کرتی تھی۔ عروبہ کے ساتھ کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ اسے بچی کی وجہ سے پوری رات جاگ کر کاٹنی پڑی ہو۔ عروبہ نے جان لیا تھا کہ اللہ اپنے بندوں پر صرف آزمائشیں ہی نہیں ڈالتا، وہ ان پر اپنے رحم و کرم کی بارش بھی کرتا ہے۔ وہ اگر اپنے سگے باپ کی چھت سے محروم ہوئی تھی تو اللہ نے اسے بہزاد احمد کی چھت کا سایہ بھی فراہم کیا تھا۔ بے شک وہ اس سے مونا کی طرح محبت نہیں کرتے تھے لیکن ان کی چھت کے نیچے اسے دنیا کی ہر نعمت تو حاصل تھی۔ عمدہ کھانا، عمدہ لباس، شہر کا سب سے بہترین اسکول، کیا کچھ نہیں ملا تھا اسے۔ سلیمہ نے ایک بار اسے بتایا تھا کہ اس کا سگا باپ بہت معمولی حیثیت کا مالک تھا اور یقیناً وہ اپنے سگے باپ کے گھر میں رہتی تو اسے اتنی نعمتیں میسر نہیں ہوتیں لیکن اس وقت نہ تو سلیمہ نے یہ بات سمجھی تھی اور نہ ہی وہ سمجھ سکی تھی کہ وہ دنیا کا مالک جب بندے کو کسی محرومی میں مبتلا کرتا ہے تو اس محرومی کے مداوے کے لیے بہت کچھ عطا بھی کر دیتا ہے جسے بندہ اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے سمجھ نہیں پاتا۔ اللہ نے اسے اس وقت بھی نہیں چھوڑا تھا جب اس کی سگی ماں اسے دارالامان کے باہر چھوڑ گئی تھی۔ یہ اللہ ہی کی مہربانی تھی کہ اسے اس دارالامان میں میڈم نیازی جیسی خاتون کی سرپرستی میسر آئی اور انہوں نے زندگی کے اس مشکل دور میں اسے ہر وہ سہولت فراہم کی جو ان کے دائرۂ اختیار میں تھی۔

کالج میں ملنے والا فریال کا سال ڈیڑھ سال کا ساتھ بھی ایک نعمت تھا۔ فریال کے ساتھ رہ کر اس نے وہ ساری اچھی باتیں سیکھیں اور جانیں جو اس کی ماں نے اسے نہیں سکھائی تھیں۔ انہوں نے اسے صرف وہ چیزیں سکھائی تھیں جو اس کی ظاہری شخصیت کو پرکشش بنا سکیں۔ انہوں نے اس کی اخلاقی تربیت نہیں کی تھی۔ اس تربیت کا آغاز فریال کی ذات سے ہوا پھر اس نے حالات کی سختی سے بہت کچھ سیکھا اور آخر میں میڈم نیازی کا ساتھ مل گیا۔ فریال کے ذریعے ملنے والی دین کی شُدبُد اور میڈم نیازی کی نصیحتیں ہی تھیں کہ وہ کبھی نور فاطمہ کو اپنی کوکھ میں ہی ختم کر دینے کے بارے میں نہیں سوچ سکی اور اس کے دنیا میں آنے کے بعد بھی کبھی ایک پل کے لیے اس سے نفرت نہیں کی۔ اس نے تسلیم کیا کہ قصور چاہے کسی کا بھی تھا، نور فاطمہ بہرحال کسی سزا کی مستحق نہیں تھی۔ وہ اللہ کی تخلیق تھی اور اللہ نے اسے نور فاطمہ کی ماں کے رتبے پر فائز کر کے اس کی ذمے داری اس کے سپرد کر دی تھی۔ وہ اس ذمے داری کو احسن طریقے سے نبھانے کے

لیے اپنے طور پر جدوجہد کر رہی تھی کہ اچانک صہیب اس کی زندگی میں چلا آیا۔ وہ اس کے ساتھ نور فاطمہ کی ذمے داری بانٹنے کا خواہش مند تھا اور اب اسے فیصلہ کرنا تھا کہ وہ صہیب کو یہ موقع دیتی ہے یا نہیں۔ بے شک وہ جرم کا مرتکب ہوا تھا لیکن انجانے میں۔ اسے بھی اس ہی کی طرح ایک سازش کا نشانہ بنایا گیا تھا اور اس شخص کی اچھائی کے لیے ایک یہ دلیل ہی کافی تھی کہ اس نے اپنے آپ کو بے قصور قرار دینے کی کوشش نہیں کی تھی حالانکہ وہ خود کو یہ کہہ کر مطمئن کر سکتا تھا کہ اس نے ارادتاً کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا اور وہ خود سازش کا شکار ہوا ہے۔ وہ عالمِ بے اختیاری میں ہونے والے گناہ پر بھی اتنا مضطرب تھا کہ اس کے مداوے کے لیے مسلسل اسے ڈھونڈتا رہا تھا۔ ایسا شخص بھلا ٹھکرایا جاتا تو کس بنیاد پر......؟

☆☆☆

''تنگ نہیں کرو نور فاطمہ ورنہ مما پٹائی لگائیں گی۔'' اس نے اپنی گود میں موجود بچی کا ہاتھ پکڑ کر اسے پیار بھری ڈانٹ پلائی۔ بچی جو اس کے چہرے پر موجود نقاب کو مسلسل کھینچنے کی کوشش کر رہی تھی، بات سمجھے بغیر ہی کھلکھلا کر ہنسی اور پھر لپک کر قریب کھڑے صہیب کی گود میں چڑھ گئی۔

''بہت شریر ہو گئی ہے۔ آپ کے لاڈ پیار نے اسے بہت بگاڑ دیا ہے۔'' عروبہ نے بچی کے گال پر ہلکے سے چٹکی لیتے ہوئے صہیب سے شکوہ کیا۔

''چھوٹی چھوٹی شرارتیں کرنا بچوں کا حق ہوتا ہے لیکن آپ فکر نہ کیجیے۔ میں بیلنس رکھوں گا اور ہرگز بھی لاڈ پیار میں بگاڑنے کی غلطی نہیں کروں گا۔'' صہیب نے اسے جواب دیا اور نور فاطمہ کی پیشانی پر بوسہ لینے لگا۔ اس منظر کو دیکھتی عروبہ کے ہونٹوں پر طمانیت بھری مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ لوگ اس وقت جناح انٹرنیشنل ائرپورٹ کے ڈیپارچر لاؤنج میں موجود تھے۔ فی الحال ان کی فلائٹ کی اناؤنسمنٹ نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی انہوں نے بورڈنگ کارڈ لیا تھا۔ وہ آج ہمیشہ کے لیے کینیڈا روانہ ہو رہے تھے۔ ایک ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کرنے کے بعد انہیں زندگی کو نئے سرے سے شروع کرنے کا فیصلہ بھی کرنا پڑا تھا۔ صہیب کے گھر والے اچھے لوگ تھے لیکن بہرحال عام سے انسانوں میں ہی سے تھے جنہیں دارالامان میں مقیم ایک بے اماں عورت جو کہ ایک بچی کی ماں بھی تھی، بہو کے طور پر بہت زیادہ نہیں بھائی تھی۔ وہ معاشرے کے مروجہ اصولوں سے ہٹ کر بیٹے کا گھر بسنے پر زیادہ خوش نہیں تھے اور صہیب نے یہ محسوس کر کے کہ اس کے گھر کے درودیوار عروبہ اور نور فاطمہ کے لیے تنگ ہیں، اپنا ایک الگ جہان بسانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ عروبہ کا ہر فیصلہ اس کے فیصلے کا تابع تھا اس لیے وہ کیسے انکار کر سکتی تھی البتہ اس کے دل میں کسک تھی کہ وہ اپنی ماں سے نہیں مل سکی۔ صہیب نے اپنے طور پر انہیں تلاش کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس بار بھی اسے کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی اور عروبہ نے اس ناکامی کو تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔

''آپ نے نوٹ کیا ہے عروبہ...... اس کی شکل کے ساتھ ساتھ مسکراہٹ بھی بالکل آپ جیسی ہے۔ اللہ نے اسے ہو بہو آپ کی کاپی بنایا ہے۔'' نور فاطمہ، صہیب کے پیار کرنے پر مسکرائی تھی اور اس کے مسکرانے پر صہیب نے یہ تبصرہ کیا تھا۔ وہ عروبہ کو ہمیشہ ''آپ'' کہہ کر ہی مخاطب کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ عروبہ اس کے لیے بہت قابلِ احترام ہے اس لیے عمر میں چھوٹا ہونے کے باوجود وہ اسے تم کہہ کر مخاطب نہیں کر سکتا۔ عروبہ کو اس کی یہ ادا بھی بھائی تھی۔ حقیقتاً اسے صہیب کی ہر بات اچھی لگتی تھی۔ وہ تھا ہی اتنا اچھا کہ اسے پا کر اسے یاد بھی نہیں رہا تھا کہ اس نے کبھی عباس کو پانے کی اس شدت سے تمنا کی تھی کہ اس کی تکمیل میں بہت کچھ برباد ہو گیا تھا۔

''عروبہ......'' وہ صہیب کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کر سکی تھی کہ اس پکار پر متوجہ ہوئی۔ بلاشک و شبہ وہ بہزاد احمد تھے جو اس کے سامنے کھڑے تھے لیکن ان کی صحت بہت گر چکی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ انہوں نے عمر کے کئی سال ایک ساتھ طے کر لیے ہوں۔

''ڈیڈی آپ؟'' وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

''میں بہت دیر سے تم لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے شک ہوا تھا کہ یہ تم ہی ہو لیکن نقاب کی وجہ سے کنفیوز تھا۔ ان صاحب نے تمہارا نام لے کر پکارا تو شک دور ہو گیا۔''

''یہ میرے شوہر صہیب احسان ہیں۔'' اس نے بہزاد احمد سے صہیب کا تعارف کروایا۔

''آپ سے مل کر خوشی ہوئی بیٹا۔'' بہزاد صاحب نے صہیب سے ہاتھ ملایا۔

''مما کیسی ہیں ڈیڈی...... آپ لوگ آج کل کہاں رہ رہے ہیں؟ ہم نے آپ کو تلاش کرنے کی بہت کوشش کی لیکن آپ کا کچھ پتا ہی نہیں چلا۔'' عروبہ کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا اس لیے اس نے جلدی جلدی ان سے پوچھا۔

''آئی ایم سوری بیٹا! میری کم ظرفی سے تمہارا بہت نقصان ہو گیا۔ میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔ میرے دباؤ کی وجہ سے ہی سلیمہ کبھی تم سے ملنے کی کوشش نہیں کر سکیں۔ یہ



دباؤ ان کے دل ودماغ پر اس حد تک اثر انداز ہوا کہ ایک رات وہ سوئیں تو صبح اٹھ ہی نہیں سکیں۔'' بہزاد احمد نے کسی جرم کے اعتراف کے طور پر اسے اس کی ماں کی موت کی خبر دی۔ اس نے صبر کرنا سیکھ لیا تھا لیکن ماں کے مرنے کا سن کر ساکت رہ گئی۔ صہیب نے چپکے سے اس کا ہاتھ تھام کر اسے خاموش دلاسا دیا۔

''میں یہاں ایک دوست کو سی آف کرنے کے لیے آیا تھا۔ میرے خیال میں تم لوگ بیرونِ ملک جارہے ہو۔ وقت کی کمی کو محسوس کرتے ہوئے میں تم سے لمبی بات نہیں کروں گا۔ میں تمہارے روبرو صرف یہ اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ مجھ سے تمہارے حق میں ناانصافی ہوئی۔ خود کو ایک اچھا انسان سمجھنے کے باوجود میرے اندر ایک سوتیلا باپ چھپا بیٹھا تھا جو موقع پاتے ہی باہر نکل آیا۔ آج سوچتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ جو کچھ تمہارے ساتھ پیش آیا، وہ مونا کے ساتھ پیش آیا ہوتا تو میں چاہے کتنے بھی غصے میں ہوتا اس کے ساتھ وہ برتاؤ نہیں کرتا جو میں نے تمہارے ساتھ کیا۔ حقیقتاً عباس کی مونا کے بجائے تم سے منگنی نے میرے دل میں ایک گرہ سی باندھ دی تھی جو کبھی کھل ہی نہیں سکی اور موقع ملتے ہی میں نے تمہیں اپنی بیٹی کے راستے سے ہٹا دیا لیکن میری یہ تدبیر کسی کام نہیں آئی۔ میں نے جب شازیہ کے سامنے تمہاری جگہ مونا کا نام رکھا تو اس نے صاف انکار کردیا اور بولی کہ جیسی آپ کی ایک بیٹی ہے، دوسری بھی ویسی ہی ہوگی۔ میں اتنی بدنامی کے بعد آپ کی کسی بھی بیٹی سے اپنے بیٹے کا رشتہ نہیں جوڑ سکتی۔ شازیہ کے انکار اور سلیمہ کی موت نے مونا کو شدید ڈپریشن میں مبتلا کردیا۔ اس کی تعلیم کا سلسلہ پہلے ہی منقطع ہوگیا تھا اور بے کاری میں انسانی دماغ پر زیادہ اثر پڑتا ہے۔ اس نے ڈپریشن کی کیفیت میں مجھے بتادیا کہ تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا کیسے ہوا اور اس نے سب کچھ کیوں کیا۔ اس نے تمہاری اور سلیمہ کی گفتگو سنی تھی جس سے اسے پتا چلا تھا کہ تم دونوں ایک منصوبے کے تحت عباس کو اس سے ہتھیا چکی ہو، بس وہ انتقام کی راہ پر چل نکلی، اگر صبر کرلیتی تو اتنی تباہی نہ آتی۔ انتقام کے چکر میں حاصل کسی کو بھی کچھ نہیں ہوا، الٹا اتنی زندگیاں برباد ہوگئیں۔ مونا کا ڈپریشن تو اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ وہ باقاعدہ سائیکو ہوگئی۔ آج کل اس کا علاج چل رہا ہے۔ کوشش کرنا کہ اسے معاف کردو۔ تم معاف کروگی تو اللہ بھی اس پر مہربانی کرے گا۔'' بہزاد احمد کی آواز آخر میں بھیگنے لگی۔

''میں پہلے ہی اسے معاف کرچکی ہوں ڈیڈی! اللہ سے اس کی صحت یابی کے لیے دعا بھی کروں گی۔ آپ مجھے اپنا کونٹیکٹ نمبر دے دیں۔ میں کینیڈا پہنچ کر آپ لوگوں سے رابطہ کروں گی۔'' اس نے بہت سبھاؤ سے بہزاد احمد سے کہا۔ بہزاد احمد نے اسے اپنا نمبر نوٹ کروادیا۔ اسی وقت ان کی فلائٹ کا اعلان ہونے لگا تو انہوں نے بہزاد احمد سے اجازت چاہی۔ انہوں نے بہت پیار سے عروبہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے رخصت کیا۔ صہیب سے بھی محبت سے ہاتھ ملایا اور اس وقت تک ان لوگوں کو جاتا ہوا دیکھتے رہے جب تک وہ ان کی نظروں سے اوجھل نہ ہوگئے۔

صہیب کے ساتھ چلتی عروبہ کا دل بھی بہت بوجھل تھا۔ ماں کی دائمی جدائی پر بے آواز روتی وہ دل ہی دل میں ان کی مغفرت کی دعا بھی کررہی تھی۔ ساتھ ہی مونا کی صحت یابی کی دعائیں بھی جاری تھیں۔ اندر ہی اندر کہیں حساب کتاب بھی ہورہا تھا کہ عظیم ترین نقصان اٹھا کر بھی وہ اوروں کے مقابلے میں فائدے ہی میں رہی۔ صہیب کا مل جانا اللہ کی طرف سے ایک بہت بڑا انعام ہی تھا اور وہ اس انعام کی حق دار یقیناً اس وجہ سے ٹھہری تھی کہ اس کو توبہ کی توفیق عطا کردی گئی تھی۔ یہ توفیق صہیب کو بھی ملی تھی، اس کے علاوہ باقی سب محروم رہے تھے اسی لیے اپنے کیے کی سزا بھی پائی تھی۔ اس نے سوچا کہ جب وہ کینیڈا پہنچ کر بہزاد احمد کے دیے نمبر پر رابطہ کرے گی تو انہیں اور مونا کو توبہ کی نصیحت ضرور کرے گی کہ توبہ بگڑے ہوئے معاملات کو سدھار دیتی ہے۔

بہزاد احمد کی پریشانی کا اندازہ تو وہ اس بات سے بھی لگا سکتی تھی کہ انہوں نے اس سے اس کا احوال جاننے کی کوشش بھی نہیں کی تھی اور اپنی ہی سناتے رہے تھے۔ اپنا حال نہ پوچھنے پر اسے ان سے کوئی شکوہ نہیں تھا کیونکہ وہ اپنا حال صرف اس رب سے کہنے کی عادی ہوتی جارہی تھی جس سے بڑھ کر کوئی غفور الرحیم نہیں۔ جو غلطیوں پر سزا تو دیتا ہے لیکن ساتھ ہی توبہ کے در بھی ہمیشہ کھلے رکھتا ہے۔ درِ توبہ کا کھلا رہنا ہی سب سے بڑی خوش قسمتی ہے۔ عام انسانوں سے غلطیاں، جرم اور گناہ سرزد ہو ہی جاتے ہیں۔ انسان کی بھلائی اس میں ہے کہ اسے توبہ کی توفیق ہوجائے اور وہ اپنے رب کے حضور سربسجود ہو کر اس سے اپنی غلطیوں اور گناہوں کی معافی طلب کرلے۔ انسانوں میں سے جو اپنے رب کے حضور جتنا جھک کر اور گڑگڑا کر توبہ کا طلب گار ہوتا ہے، رب اسے اتنا ہی نوازتا ہے جیسے اس نے عروبہ کو نوازا تھا۔